قرآنِ مجید کا معاشی نظام

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور

نام کتاب	----	نظام ربوبیت
مصنف	----	علامہ غلام احمد پرویزؒ
ناشر	----	طلوع اسلام ٹرسٹ
		25- بی گلبرگ II لاہور 54660
		فون 576-4484
طابع	----	دوست ایسوسی ایٹس
		الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 54000
		فون 712-2981
مطبع	----	عصمت اسلم پرنٹرز
ایڈیشن	----	چہارم 1995ء

طلوع اسلام ٹرسٹ کی شائع کردہ کتب کی
جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات

مضمون	صفحہ
لوح پیشانی	۱
فہرست مشمولات	۳
تعارف (طبع اول)	۱۷
پیش لفظ (طبع دوم)	۳۱
پہلا باب — **اسلام کیا ہے؟**	
کائنات کی ہر شے ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔	۳۳
سلسلۂ ارتقاء سے مقصود کیا ہے؟	۳۵
تمام اشیاء کی مضمر صلاحیتوں کی نشو ونما۔	
اسے ربوبیت کہتے ہیں۔	۳۵
ربوبیت کے لئے ضروری ہے کہ	
(i) مختصر عناصر میں باہمی تعاون ہو۔ اور	
(ii) ان عناصر میں توازن و تناسب قائم رہے۔	۳۶
اس طریق کو صراطِ مستقیم پر چلنا کہتے ہیں۔	۳۷
لہٰذا، ترقی کے لئے	۳۸
(i) نقطۂ آغاز۔ (ii) سیدھی راہ۔ اور	
(iii) منزلِ مقصود کا تعین ضروری ہے۔	
یہی مفہوم ہے کائنات کے بالحق پیدا ہونے کا۔	۳۹
حاصلِ بحث۔	
اشیائے کائنات کو ان کی منزل تک پہنچنے کی راہنمائی کہاں سے ملتی ہے؟	۴۱
سائنس کہتی ہے کہ یہ سب کچھ ان کے اندر جبلی طور پر موجود ہوتا ہے۔	..

مضمون	صفحہ
قرآن کہتا ہے کہ جو قوت ان کی تخلیق کی ذمہ دار ہے،	۴۱
وہی انہیں یہ جبلّی راہ نما عطا کرتی ہے۔	..
اس کا نام قرآنی اصطلاح میں وحی ہے۔	۴۲
کائنات کی ہر شے اس وحی کے اتباع میں سرگرمِ عمل ہے	۴۲
کسی کو مجالِ سرکشی نہیں۔	..
اس کا نام اسلام ہے۔	۴۳
یعنی نظامِ ربوبیت کی تکمیل ـــ	..
انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں فرق۔	۴۴
انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔	..
قانونِ ربوبیت اور اس کی اتباع اس کے	..
اندر جبلّی طور پر موجود نہیں۔	۴۶
انسان کو یہ قانون انبیائے کرامؑ کی وساطت سے ملا ہے۔	..
اسے اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو اسے اختیار	..
کرے اور چاہے کوئی اور راہ اپنے لئے تجویز	۴۷
کرلے۔	..
خلاصۂ مبحث۔	۴۹

دوسرا باب ۲
انسان کیا ہے؟

مضمون	صفحہ
انسانی جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتیں	۵۰
نشو و نما پا کر تکمیل تک پہنچ جائیں۔	..
اس کے لئے ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان کی مضمر صلاحیتیں	..
کون کون سی ہیں۔	..
یعنی یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان کہتے کسے ہیں۔	..
اس باب میں دو نظریئے۔	..
ایک نظریۂ میکانکی تصورِ حیات"	..
یعنی زندگی بس جسمانی زندگی ہے۔	۵۱
لیکن عصرِ حاضر کے سائنس دان اور مفکرین خود اس نظریہ	..
کے خلاف ہیں۔	۵۲
ان کے نزدیک انسان میں جسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔	..
جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔	..
انسانی ذات طبعی قوانین کے ماتحت فنا نہیں ہوتی۔	..
قرآن اس دوسرے نظریئے کا حامل ہے۔	۵۴
قرآن کی رُو سے انسانی زندگی کے تخلیقی مراحل اور	..
ارتقائی مدارج۔	..
مادیئین کے مقابلہ میں افلاطونی نظریۂ حیات۔	۵۶
دنیا سراب ہے اور قابلِ نفرت۔	..
ترکِ آرزو سے انسانی روح اپنی اصل میں	..
جا کر مدغم ہو جاتی ہے۔	..
یعنی جسم کو فنا کر کے روح کی آزادی کے لئے اور روح اپنی	۵۷
اصل میں مل کر اپنا جداگانہ تشخص کھو بیٹھتی ہے۔	..

تیسرا باب
ربوبیت، مادیئین کا نقطۂ نگاہ

مضمون	صفحہ
تحفظِ خویش کا جذبہ ہر حیوان میں موجود ہے۔	۵۹

مضمون	صفحہ
انسان کی عقل تحفظِ خویش ہی کی تدابیر بہم پہنچاتی ہے	..
میری عقل میرے تحفظ کی، آپ کی عقل آپ	..
کے تحفظ کی۔	..
حیوانات اپنی حفاظت کا سامان جمع کرکے نہیں رکھتے	۶۰
لیکن انسان ہمیشہ جمع کرنے کی فکر میں منہمک رہتا ہے	..
انسانوں میں استعداد کا تفاوت ہوتا ہے۔	۶۲
اس لئے بعض انسان دوسرے انسانوں سے	..
زیادہ کما لیتے ہیں۔	..
اس سے طبقات وجود میں آجاتے ہیں۔	..
سرمایہ داری کا نظام۔ میکانکی تصورِ حیات کا لازمی	۶۳
نتیجہ ہے	..
آپ اس کے خلاف کوئی عقلی دلیل نہیں لا سکتے	..
حتیٰ کہ کارل مارکس بھی نہیں لا سکا۔	..
نظام سرمایہ داری کے خلاف کارل مارکس کی دلیل	..
تاریخی وجوب۔	..
حاصل مبحث۔	۶۳
آپ کسی شخص کو عقلی دلائل سے اس پر آمادہ نہیں کر	..
سکتے کہ وہ غریب کی مدد کرے۔	۶۴
آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہیں گے کہ اس میں خود	..
اس کا فائدہ ہے۔	۶۵
"عقل" کی سمجھ میں بس یہی ایک دلیل آسکتی ہے۔	..
وہ سب کچھ ضرورت کے ماتحت کرتی ہے	..

مضمون	صفحہ
"مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں جھوٹ بولتا؟"	..
لیکن میکانکی نظریۂ حیات کے حامل بھی غریبوں کی مدد	۶۶
کرتے ہیں۔	..
یہ کیوں؟	..
ضمناً، عقل کی حیثیت — ایک ملکہ	۶۷
میکانکی تصورِ حیات میں معاشرہ کا نقشہ	۶۸
نفسانفسی اور افراتفری	..
یہی کیفیت افراد سے آگے بڑھ کر اقوام کی ہوتی ہے	..
نیشنلزم کا تیار کردہ جہنم۔	۶۸
اس کی بنیاد میکیاولی سیاست پر ہے۔	۶۹
یعنی وہ سیاست جس میں	..
لہٰذا انسان کی ربوبیت کا تصور نہ مادیین کے ہاں	۷۱
مل سکتا ہے نہ روحانیین کے ہاں۔	..

چوتھا باب
قرآنی نظریۂ حیات

مضمون	صفحہ
قرآن نے ایک تیسرا نظریہ پیش کیا ہے۔	۷۴
اس نے پہلے "روحانیین" کے مسلک رہبانیت کی	۷۴
تردید کی ہے۔	..
اس نے کہا ہے کہ دنیا کی زینتیں اور آرائشیں انسان	۷۵
ہی کے لئے ہیں۔	..
یہی تمام انبیائے سابقہ کی تعلیم تھی۔	۷۸

مضمون	صفحہ
قانونِ خداوندی کے اتباع سے رزق کی فراوانی ہوتی ہے	۸۰
اور اس کے ترک کر دینے سے بھوک کا عذاب۔	۸۰
دوسرا نظریہ مادئیین کا۔	۸۳
قرآن اس کی بھی مخالفت کرتا ہے۔	..
تیسرا نظریہ قرآن کا ہے۔	۸۳
نفسِ انسانی کی بحث۔	۸۴
مفکرین غرب کے خیالات و آراء	..
"روحانیین" کے عقیدہ اور قرآنی تصور میں بنیادی	۸۶
فرق۔	..

پانچواں باب
قرآنی نظامِ ربوبیت

مضمون	صفحہ
ہر دو نظریاتِ زندگی کی توضیح۔ کھلے کھلے الفاظ میں۔	۸۷
مفادِ خویش کے نظریہ کی وضاحت،	۸۹
قرآنی روشنی میں۔	..
ایسے معاشرے کا انجام —	۹۰
جہنم ہی جہنم	..
دوسرا نظریہ	۹۷
"انفاق" کا صحیح مفہوم۔	۹۸
"شحِ نفس" سے بچنے سے تربیتِ ذات ہوتی ہے۔	..
انفاق خود تمہاری اپنی ذات کے لئے ہے۔	۱۰۰
قصۂ آدم، جنت کی زندگی اور اس سے ہبوط	۱۰۱

مضمون	صفحہ
اسی فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی، مقصودِ حیات ہے۔	۱۰۲
قرآنی روشنی میں ان دونوں نظریوں کا تقابل۔	۱۰۴
مفادِ کلی کا نظریہ صرف وحی کی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے	۱۰۶
عقل اور عقل میں فرق۔	۱۰۷
کائنات کی شہادت کہ یہ نظام مفادِ کلی کے نظریہ ہی پر	..
قائم ہے۔	--
جسمِ انسانی کی مثال۔	..
خارجی اشیائے کائنات کی مثال۔	..
انسانی تاریخ کے شواہد۔	۱۰۸
انفرادی مفاد کے نظریہ میں انسانی کاوشیں	۱۰۹
لہو و لعب سے زیادہ کچھ نہیں پیدا کرتیں۔	۱۱۰
اس کا مفہوم۔	..
مفادِ کلی کے نظریہ سے مفہوم یہ ہے انسانی معاشرہ	۱۱۲
میں وہی قانون نافذ ہو جو کائنات میں	..
جاری و ساری ہے۔	..
کائنات میں اور قانون اور انسانی زندگی میں اور قانون	۱۱۳
ماننے والے مشرک ہیں خواہ وہ خدا کی ہستی کے	..
قائل ہی کیوں نہ ہوں۔	..
انسان کی تخلیق اور کائنات کی تخلیق ایک ہی قانون کے	۱۱۴
مطابق ہوئی ہے۔	..
اس لئے ان دونوں میں ایک ہی قانون نافذ ہونا	..
چاہیئے۔	..

مضمون	صفحہ
اس سے حال اور مستقبل کی خوشگواریاں حاصل ہوتی	۱۱۶
ہیں۔	..

چھٹا باب ۶
ایک بنیادی اعتراض حقِ ملکیت

مضمون	صفحہ
عقلِ بیباک ہر وقت یہ کہتی رہتی ہے کہ اپنی دولت دوسروں	۱۱۹
کو دیدینا کہاں کی دانائی ہے؛	..
اس لئے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنی محنت کی کمائی	..
کو اپنی ذات تک محدود رکھنا گویا انسانی فطرت	..
کا تقاضا ہے۔	..
یہ غلط ہے۔ یہ درحقیقت نظامِ سرمایہ داری کی طرف	۱۲۰
سے پیش کردہ دلیل ہے۔	..
قارون نے یہی کہا تھا کہ جو کچھ میں اپنی ہنرمندی سے	۱۲۰
کماتا ہوں اس پر میرا پورا پورا حق ہے۔	..
یہی ہر سرمایہ پرست کہتا ہے۔	..
اس دلیل کا تجزیہ، قرآن کی روشنی میں۔	۱۲۱
علم و ہنر کی استعداد انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں۔	..
نہ ہی وسائلِ پیداوار اس کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔	۱۲۲
یہ سب خدا کی طرف سے ملتے ہیں۔	..
انسان صرف محنت کرتا ہے اور محنت ہی کے معاوضے	۱۲۵
کا حقدار ہے۔	..
زمین تمام پیداوار کا بنیادی ذریعہ ہے۔	۱۲۵
اور زمین پر کسی کو حقِ ملکیت حاصل نہیں۔	..
معاوضہ صرف محنت کا ہوگا۔	۱۲۷
البتہ جو معذور ہوں گے ان کی کمی پوری کی	..
جائے گی۔ اسے احسان کہتے ہیں۔	..
ذہنی استعداد میں اس قدر فرق کیوں ہوتا ہے؟	۱۲۹
تاکہ دنیا کے مختلف کام سرانجام پاتے رہیں۔	..
لیکن اس اختلافِ استعداد سے انسان طبقات میں تقسیم	۱۳۰
نہیں کئے جائیں گے۔ ہر انسان ابنِ آدم ہی	..
رہے گا۔	..
ذہنی استعداد کا فرق ضرور باقی رہتا ہے۔	۱۳۱
یہودی ذہنیت	۱۳۳
تقاضائے ایمان — بطیبِ خاطر ایثار	۱۳۴

ساتواں باب
بنیادی اصول

مضمون	صفحہ
صحیح نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان، دوسروں کی پرورش	۱۳۵
کی فکر کرے۔	..
لیکن یہ نظریہ کس بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے؟	..
مارکس کو اپنے تصور کے لئے کوئی بنیاد نہیں مل سکی۔	..
اس لئے کمیونزم محض جذباتِ نفرت کے سہارے قائم	۱۳۶
ہوتی ہے۔	..
"تاریخی وجوب" کا نظریہ غلط ہے۔	۱۳۶

مضمون	صفحہ
قرآنی نظریہ۔ حق و باطل کی کشمکش۔	۱۳۶
قرآن کا بنیادی اصول ——	..
باقی وہی رہ سکتا ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت	۱۳۷
کے لئے ہو۔	..
خیر و شر کا قرآنی تصوّر۔	۱۳۸
خیر وہ جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے ہو۔	..
شر وہ جو اس کے خلاف ہو۔	..
قرآنی تعلیم کا ماحصل کیا ہے؟	۱۳۸
خیر!	۱۳۹
خیر کا مفہوم۔ ہر قسم کی خوشحالیاں اور خوش گواریاں۔	..
انبیائے سابقہ نے بھی اپنی اقوام سے یہی کہا۔	۱۴۰
یہی قرآن کی تعلیم ہے۔	۱۴۰
آٹھواں باب — عملی پروگرام	
دونوں نظریئے سامنے آگئے۔	۱۴۲
انسان، مفادِ خویش کے نظریئے کو آسانی سے اختیار	..
کر لیتا ہے۔	..
مفادِ کلّی کا راستہ پہاڑ کی بلندی پر چڑھنے کے مرادف	۱۴۳
ہوتا ہے۔	..

مضمون	صفحہ
اس دشوار گذار راستے پر سے جانے کے لئے قرآنی	۱۴۳
پروگرام۔	..
بنیادی حقائق کا بطور ایمان تسلیم کرنا۔	۱۴۴
اوّل۔ وحی پر ایمان۔	..
دوسرا مسلّمہ۔ کائنات میں ایک ہی قانون	۱۴۴
جاری و ساری ہے۔	..
تیسرا مسلّمہ۔ نوعِ انسانی ایک ہی برادری ہے۔	۱۴۴
چوتھا مسلّمہ۔ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی،	۱۴۵
آگے بھی چلتی ہے۔	..
اسی کا لازمی جزو قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان	..
لانا بھی ہے۔	..
پروگرام کی اگلی کڑی۔ تعلیم کتاب کے ذریعے اس نظام	۱۴۶
کی اہمیت کو دل نشین کرانا۔	..
اس سے آگے، ان افراد میں باہمی رابطہ اور ایک ایسی	..
فضا کی تخلیق جس میں یہ تصوّر ہر وقت سامنے رہے	..
اِسے "قیامِ صلوٰۃ" کہتے ہیں۔	۱۴۶
نظامِ صلوٰۃ کا صحیح مفہوم۔	..
قومِ شعیبؑ کا اعتراض۔	۱۴۷
قرآن کی رُو سے مصلّی کون ہے؟	۱۴۸
جس کے دل کی گہرائیوں سے نظامِ ربوبیت اُبھرے۔	۱۵۰
ایک اہم سوال۔ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جس پہ کسی معاشی	۱۵۳
نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔	..

مضمون	صفحہ
اس کے ساتھ ہی انہیں زیادہ سے زیادہ حصہ مال و	۱۵۴
دولت کو اجتماعی امور میں صرف کرنے کی	..
ترغیب دی جاتی ہے۔	..
اس طرح انہیں رفتہ رفتہ نظامِ ربوبیت کے آخری	..
مراحل تک پہنچایا جاتا ہے۔	..
اس عبوری دور میں بھی ایسی کیفیت پیدا کر دی جاتی	۱۵۵
ہے جس میں ذاتی املاک اور جائیداد کی گنجائش نہیں	..
رہتی۔	
اس طرح ان افراد پر مشتمل ایک پارٹی متشکل ہو جاتی	۱۵۶
ہے	..
اس کے بعد ان افراد اور معاشرہ میں ایک معاہدہ	۱۵۷
ہوتا ہے۔	..
یہ اپنی محنت کا ماحصل معاشرہ کی تحویل میں دیدیتے	-
ہیں اور معاشرہ ان کی جملہ ضروریاتِ زندگی	-
کا کفیل بن جاتا ہے۔	..
اس معاہدہ میں اللہ سے مراد وہ معاشرہ ہے جو خدا	۱۵۸
کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے متشکل ہو	..
اس کے بعد کسی کو ضرورت ہی نہیں رہتی کہ وہ رزق	۱۶۰
سمیٹ کر جمع رکھے۔	..
اس میں اربابِ حل و عقد بھی کسی دوسرے کی کمائی	۱۶۱
پر عیش نہیں کرتے۔	..
وہ بھی "دیتے" ہیں "لیتے" نہیں۔	..
اس معاشرہ میں عزت و تکریم کے معیار بھی بدل جاتے ہیں	۱۶۲
معیار دولت نہیں بلکہ فرائض کی ادائیگی قرار	..
پاجاتا ہے۔	..
اور تجارت کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔	۱۶۲
اس معاشرہ میں عقل کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس کی	۱۶۰
ذمہ داریاں خود بخود پوری ہو رہی ہیں۔	..
ایسے معاشرہ کی بے پناہ قوتیں۔	۱۶۳
فرد اور جماعت کے تعلق کا مسئلہ۔	۱۶۴
یورپ نے سب کچھ سوسائٹی یا اسٹیٹ کو قرار دیدیا ہے	۱۶۵
فرد کی کوئی ہستی باقی نہیں رکھی۔	..
یہ ایک بت پرستانہ مسلک ہے۔	..
قرآن کے نزدیک مقصود بالذات فرد کی تکمیلِ ذات ہے،	۱۶۶
لیکن یہ تکمیل جماعت کے ذریعے ہوتی ہے۔	۱۶۷
اس لئے فرد کے لئے ضروری ہے کہ جماعت کے ساتھ	..
رہے۔	..
نظام کی اطاعت بھی اس لئے ہے کہ فرد کی تکمیلِ ذات	۱۶۸
ہو جائے۔	..
یہ بڑا مشکل مرحلہ ہے کہ نظام کے ڈسپلن کو بھی قائم	۱۶۸
رکھا جائے اور افراد کی حریت و آزادی بھی	..
قائم رہے۔	..
نظامِ ربوبیت یہی کچھ کرتا ہے۔	۱۶۹
اس کی اولین مثال خود رسول اللہ نے قائم فرمائی۔	۱۶۹

مضمون	صفحہ
اب خود یورپ کے مفکر بھی اثباتِ ذات اور حریتِ فکر کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔	۱۷۰
لیکن اس کا امکان صرف وحی کی رُو سے قائم کردہ نظامِ ربوبیت میں ہے۔	۱۷۲
ایک شبہ کا ازالہ	..
نظامِ ربوبیت میں "ضروریات" کے تعین میں یکسانیت نہیں ہوگی۔	۱۷۳
افراد کے انفرادی ذوق کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا۔	..
کمیونزم اور اسلام۔	۱۷۳

نواں باب
کشمکش

مضمون	صفحہ
اسی دعوتِ انقلاب کو رسول اللہ نے قریش کے سامنے پیش کیا۔	۱۷۶
مخالفت کی انتہا۔ ہجرت کا زمانہ	۱۷۷
مخالفین کو آخری تنذیر۔	۱۷۹
اقوامِ سابقہ کے انجام سے عبرت انگیزی کی تلقین۔	۱۸۰
عمل اور اس کے نتائج کے درمیان مہلت کا وقفہ۔	۱۸۳
انتظار کرو، نتیجہ خود بتا دے گا کہ کس کا پروگرام کامیاب رہا۔	۱۸۶
انہوں نے مکہ بھی چھوڑ دیا۔	۱۸۷
لیکن مخالفین نے وہاں بھی تعاقب کیا۔	..
اب اس مخالفت کا مقابلہ شمشیر سے کرنے کی اجازت دی گئی۔	۱۸۸
یہ ربوبیت کے نظام کی آخری کڑی ہوتی ہے۔	..
یعنی — تسلیم جاں۔	..
ایک ضمنی گوشہ — روایات سے سند نہیں پیش کی گئی۔	۱۸۹
اس کی وجہ؟	..
تاریخ کو قرآن کی روشنی میں پرکھیے۔	۱۹۱
ایک اہم اعتراض۔	۱۹۲
اگر انفرادی ملکیت نہیں تو صدقہ و خیرات اور ترکہ و میراث کے احکام کس لئے ہیں؟	..
اس کا جواب	۱۹۴
یہ عبوری دور کے احکام ہیں۔	۱۹۴
قانونِ وراثت کے متعلق قرآنی تصریح۔	۱۹۵

دسواں باب
پس چہ باید کرد؟

مضمون	صفحہ
رسول اللہ نے اس نظام کو قائم کیا لیکن اس کے بعد یہ نظام درہم برہم ہوگیا۔	۱۹۸
ایک شبہ کا ازالہ۔	..
کیا اب مسلمانوں کی بازآفرینی کی کوئی صورت ہے؟	۲۰۰

مضمون	صفحہ
اس کا جواب "ہاں" میں ہے۔	۲۰۲
لیکن آغازِ کار کس طرح کیا جاتے ؟	۲۰۲
اس کے لئے اس نظام کے نتائج پر یقینِ محکم	۲۰۳
کی ضرورت ہے۔	..
اس کی مخالفت ہوگی مترفین کے گروہ کی طرف سے۔	۲۰۷
اس لئے کہ ان کے منہ کو انسانی خون لگ چکا ہے۔	..
سرمایہ پرستوں کی طرف سے مخالفت،	۲۰۷
اور مذہبی پیشواؤں کی طرف سے بھی۔	۲۰۸
لیکن آخر الامر کامیابی اسی جماعت کی ہوتی ہے۔	۲۱۱
اگر مسلمانوں نے اس کے لئے کوشش نہ بھی کی، تو بھی	۲۱۳
یہ انقلاب آکر رہے گا۔	..
لیکن خدا کے آفاقی قانون کے مطابق۔	..
دنیا آہستہ آہستہ اس انقلاب کے قریب آرہی ہے۔	۲۱۵

گیارہواں باب
حرفِ آخر

مضمون	صفحہ
کتاب کی تفصیلات کا خلاصہ	۲۲۰
مسلمان اس آواز پر بہت کم توجہ دے گا۔	۲۲۷
اعتراض یہ ہوگا کہ یہ نئی آواز ہے۔	۲۲۸
مسلمان کی حالت زمانہ نزولِ قرآن کے اہلِ کتاب	۲۲۹
کی سی ہے۔	..
ایک اور اعتراض۔	۲۳۰
یہ تعبیر "اشتراکیت" سے متأثر ہو کر کی گئی ہے	..
اس کا جواب۔	۲۳۱
وہ قوت کون سی ہے جس کے زور پر یہ نظام قائم ہو کر	۲۳۵
رہے گا ؟	..
یہ قوت قانونِ خداوندی کی قوت ہے۔	۲۳۵
اس اجمال کی تفصیل۔	۲۳۶
انسانوں کے خود ساختہ نظام اور نظامِ ربوبیت کا	۲۴۱
تفصیلی تقابل۔	..
یہ انقلاب کس طرح لایا جائے گا ؟	۲۴۲
ایک نرالے طریقہ سے۔	..
روس کا انقلاب، انقلاب نہیں، شورش تھی۔	۲۴۴
صحیح انقلاب قرآن کی رُو سے آتا ہے۔	۲۴۵
انسانی مشکلات درحقیقت "فالتو روپے" کی پیدا کردہ ہیں	۲۴۶
قرآن اس کا حل بتاتا ہے۔	۲۴۷
اور ایسی جماعت تیار کرتا ہے جو اس روپے کو	..
نوعِ انسانی کی منفعت کیلئے لئے لئے پھرے۔	..
اسی کا نام اسلام ہے اور اس پر عمل کرنیوالوں کا نام مسلم۔	..
زمانہ کو اسی جماعت کا انتظار ہے۔	۲۴۹

(٠)

تکملہ

مضمون	صفحہ
سوشلزم۔ کمیونزم۔ سرمایہ داری	۲۵۲

مضمون	صفحہ
ہماری مذہبی پیشوائیت کا موقف	۲۵۳
مارکسزم	۲۵۴
اس نظریہ کے بانی	۲۵۴
انسانی زندگی کا تصور	۲۵۵
تاریخ کی مادی تعبیر	۲۵۷
ضابطۂ اخلاق واقدار	۲۵۸
مذہب ایک افیون	۲۵۹
فلسفۂ جدلیت	۲۶۱
اس فلسفہ پر تنقید	۲۶۳
سوشلزم ۔ عبوری دور کا نظام ۔	۲۶۷
اس نظام کی کمزوریاں ۔	۲۶۸
کمیونزم ـــ اساسِ محکم کے بغیر	۲۷۰
قرآنی نظام ۔	۲۷۲
انسانی زندگی ۔	۲۷۳
ذاتِ انسانی کی اہمیت	۲۷۳
مستقل اقدار	۲۷۴
کشمکشِ تضادات	۲۷۶
تغیرِ نفس	۲۷۸
قرآن کا معاشی نظام	۲۷۸
بھوک خدا کا عذاب ہے ۔	۲۷۸
زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی ۔	۲۷۹
الارض للہ	۲۸۰

مضمون	صفحہ
معاشی نظام کا بتدریج نفاذ ۔	۲۸۱
منزلِ اوّل ـــ انفرادی زندگی	۲۸۱
انفرادی اپیل	۲۸۱
صدقات	۲۸۲
مال و دولت میں اصلاح	۲۸۲
زرعی اصلاح	۲۸۳
منزلِ دوم ۔ اجتماعیت کی طرف اقدام	۲۸۳
صدقات کا اجتماعی نظم ونسق ۔	۲۸۴
مال و دولت کے نظام میں اصلاح	۲۸۵
سائل ومحروم کا حق ۔	۲۸۵
مالِ غنیمت	۲۸۵
دولت کا اکتناز	۲۸۶
ربٰو قرآنی نظام کے خلاف جنگ ہے ۔	۲۸۶
مضاربت	۲۸۷
مزارعت	۲۸۷
کمرشل انٹرسٹ	۲۸۷
زمین کے متعلق اگلا قدم	۲۸۷
معاوضہ صرف محنت کا ہے ۔	۲۸۹
پیداوار میں انسان کا حصہ ۔ کھیتی کی مثال ۔	۲۸۹
رقبوں کی تحدید ۔	۲۹۱
تیسری منزل ۔ تکمیلِ کار	۲۹۱
اسلامی مملکت کی وجہ جواز ـــ اقامتِ صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ	۲۹۱

مضمون	صفحہ
خدا سے معاہدہ۔	۲۹۲
اختلافِ صلاحیت۔	۲۹۳
قارونیت۔ میرا مال میری ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔	۲۹۳
قل العفو	۲۹۳
زمین کا مسئلہ۔ سواءً للسائلین۔	۲۹۴
تکذیبِ دین کون کرتا ہے؟	۲۹۵
مارکسزم کے عبوری دور اور قرآنی نظام کے عبوری دور میں فرق۔	۲۹۵
اقبال اور مارکسزم	۲۹۸
اسلامک سوشلزم۔ ایک اصطلاح۔	۳۰۰
اس اصطلاح کا اولین استعمال۔	۳۰۲
پروفیسر ٹوئن بی کا سوال اور اس کا جواب۔	۳۰۳
پاکستان میں کاشتکاروں کے مسئلہ کا حل۔	..
اسلامی سوشلزم کی اصطلاح کے استعمال میں حرج کیا ہے؟	۳۰۴
اسلامی سوشلزم ۔ جمع بین النقیضین۔	۳۰۶
آخری مرحلہ	
مارکسزم اور اقبالؒ	۳۰۶
مارکسزم اور قائداعظمؒ	۳۰۷
مملکت کا سیکولر تصور	۳۰۷
تتمہ — قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد۔	۳۰۹
قلب و نظر کا انقلاب — ایمان	۳۱۰
مارکسزم کے فلسفہ کا عملی نتیجہ۔	۳۱۰

مضمون	صفحہ
۱۔ جرائم عام ہوگئے اور احساسِ ندامت جاتا رہا۔	۳۱۱
۲۔ غلط کاریوں کے ذمہ دار ہم نہیں، باطل کا اقتصادی نظام ہے۔	۳۱۱
۳۔ جرائم ہجوم میں شامل ہو کر کئے جاتے ہیں تاکہ انفرادی ذمہ داری متعین نہ ہو سکے۔	۳۱۱
صرف احساسِ ندامت ہی بازآفرینی کی بنیاد بن سکتا ہے	۳۱۲
ابلیس اور آدم میں فرق۔	۳۱۲
زمانہ انسان کو قرآنی فلسفۂ حیات کی طرف لا رہا ہے	۳۱۲
فرد کی انفرادیت کا اقرار	۳۱۲
حقوق اور ذمہ داریوں کا تعلق	۳۱۴
طریقِ کار — ایک اہم سوال	۳۱۵
جہاں مارکس ناکام رہ گیا (اس سے آگے)	
انسانی تاریخ کا ابتدائی دور	۳۱۸
مغربی مفکرین کی کوشش	۳۲۰
افلاطون اور ارسطو کے نظریات	۳۲۰
مرکنٹلزم ۔ ذاتی مفاد کا جذبہ	۳۲۰
حکومت کی عدم مداخلت کا نظریہ	۳۲۱
مبادلۂ اشیاء کا نظام	۳۲۱
سکہ	۳۲۱
نظامِ سرمایہ داری۔ آدم سمتھ اور اسکے متبعین	۳۲۲
سرمایہ داری کے خلاف ردِ عمل	۳۲۳

مضمون	صفحہ
رابرٹ اوون کا نظریۂ اشتراکیت ۔	۳۲۳
لوئی بلان اور پراؤھن کے خیالات	۳۲۴
کارل مارکس	۳۲۴
کارل مارکس کا فلسفہ	۳۲۵
مارکس کا معاشی نظام	۳۲۸
مارکس کا عجز ۔ جذبۂ محرکہ ؟	۳۲۹
سوشلزم اور تشدد لازم وملزوم ہیں ۔	۳۳۰
لینن اور سٹالن کی وضاحتیں ۔	"
اشتراکی اخلاق ۔ عندالضرورت اپنوں سے بھی فریب دہی ۔	۳۳۲
مقاصد اور ذرائع کا تعلق	۳۳۲
چین کا نظامِ سوشلزم اور ماؤ ۔	۳۳۳
مارکس سے آگے ۔	۳۳۴
جذبۂ محرکہ ۔ ایمان	۳۳۵
مبنی بر وحی راہنمائی	۳۳۶
قرآن کی رُو سے ایمان کا مفہوم	۳۳۷
معاشی نظام کے دو اہم ستون	۳۳۹
وما بکم من نعمۃ فمن اللہ ۔	۳۳۹
نعمت کا مفہوم	۳۴۰
رزق خدا کی نعمت ہے ۔	۳۴۱
اقوامِ عالم پر فضیلت نعمت ہے	۳۴۳
قارونی ذہنیت ۔	۳۴۵
سوشلزم اور نظام سرمایہ داری میں چنداں فرق نہیں ۔	۴۵
اجرتیں مقرر کرنے کا پیمانہ ۔ صلاحیتِ کار	۳۴۵
سوشلزم نظامِ سرمایہ داری سے بدتر نتائج پیدا کرتا ہے ۔	۳۴۶
غلامی اور آزادی میں بنیادی فرق	۳۴۶
فرعون اور قومِ موسیٰ کی مثال	۳۴۶
سوشلزم کی ناکامی کی بنیادی وجہ	۳۴۷
مسئلہ کا حل ؟	۳۴۷
انسانی صلاحیتیں منجانب اللہ (نعمت) ہیں	۳۴۷
صلاحیتوں میں اختلاف	۳۴۹
گھر کی مثال	۳۴۹
مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا ۔ کتاب ہدیٰ کا پہلا سبق	۳۴۹
کفرانِ نعمت سے مراد	۳۵۰
رزقِ حلال	۳۵۰
غیر اللہ کی طرف منسوب رزق حرام ہے	۳۵۱
رزق اللہ سے مفہوم	۳۵۱
ایمان بالآخرت	۳۵۳
خارجی حالات میں تبدیلی کا تغیرِ نفس کے ساتھ تعلق ۔	۳۵۴
احساسِ بازپرس	۳۵۵
اعتراض ۔ محنت کے معاوضے کے بجائے ضرورت کے مطابق دینا ظلم ہے	۳۵۶
جواب ۔ قرآنی نظام میں ہر کام کرنیوالا بطیبِ خاطر یہ چاہتا ہے	۳۵۶
ماؤزے تنگ اور قرآن	
اسلام ایک دین ہے ۔	۳۵۸
اسلام اور کمیونزم کا تقابلی مطالعہ	۳۵۸
کمیونزم کا فلسفہ	۳۵۹
قانونِ اضداد	۳۶۰
ایک اہم استثنار ۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں ۔	۳۶۲
علم کسے کہتے ہیں ؟	۳۶۳
اس فلسفہ کا جائزہ	۳۶۴
کیا موت سے ایک فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے ؟	۳۶۵
دوسرا اہم نکتہ ۔ قانونِ اضداد کے علاوہ بھی مطلق حقیقتیں ممکن ہیں	۳۶۶
نمبر ۳ نکتہ ۔ کمیونزم مکمل ترین اور معقول نظام ہے ؟	۳۶۷

مضمون	صفحہ
چوتھا نکتہ — نظامِ ملوکیت و استعمارِ شرانگیز ہے مٹ جائیگا۔	٣٦٧
یہ بھی قانونِ اضداد کے خلاف ہے۔	..
بابِ دوم — قرآنی فلسفۂ حیات	
بحث کے مختلف گوشے	
قرآن کا طریقِ افہام و تفہیم۔	٣٦٩
تخلیقِ کائنات	٣٧٠
انسانی تخلیق	٣٧٣
انسانی زندگی کی کشمکش	٣٧٧
قانونِ اضداد	٣٧٩
(قوموں کے استبدال و استخلاف کا ابدی قانون کیا ہے؟)	..
کائنات میں غیر متبدل کیا ہے؟	٣٨٢
مستقل اقدار	٣٨٣
کشمکشِ حق و باطل	٣٨٥
اضداد میں توافق	٣٨٩
علم کے متعلق تصور	٣٩٠
فلسفہ کا اثر معاشی نظام پر	٣٩٢
طبیعی زندگی کے تین بنیادی تقاضے	٣٩٣
میں دوسروں کی مدد کیوں کروں؟	٣٩٣
کمیونزم کی بنیادی کمزوری	٣٩٥
قرآنی معاشی نظام کے اصولی خدوخال	٣٩٥
مارکس کا فلسفۂ اضداد — فلسفۂ جبریت کی ایک شاخ	٣٩٩
حرفِ آخر۔	٤٠٠
جنتِ ارضی اور اسکی تشکیل کی صورتیں	٤٠٢
"اشتراکیت کے ساتھ خدا کو شامل کر لیا جائے تو وہ	٤٠٦
اسلام کے مماثل ہو جاتی ہے" علامہ اقبالؒ	..
یارب! ایں آرزوئے من	٤٠٨

مضمون	صفحہ
ربٰو کی بحث	
قرآن کی رُو سے ربٰو کی تعریف	٤٠٩
معاوضہ کس چیز کا جائز ہے؟	٤١١
ربٰو کی مختلف شکلیں	٤١١
جو کچھ ہم لیتے ہیں — عطیہ، اجرت، ربٰو، منافع، قمار	٤١١
معاوضہ محنت کا ہے۔	٤١٢
بیع اور ربٰو میں فرق	٤١٢
دشواریاں کیوں پیش آتی ہیں؟	٤١٣
پیوند سازی سے کام نہیں چلے گا۔	٤١٣
دو متضاد نظام — ربٰو ترجمان ہے اس معاشی نظام	٤١٤
کا جو قرآن کے معاشی نظام کی یکسر ضد ہے۔	..
زکوٰۃ	
مروجہ مفہوم	٤١٥
زکوٰۃ — قرآنِ کریم کی روشنی میں۔	٤١٦
(سامانِ نشوونما بہم پہنچانا)	..
زکوٰۃ کا مروجہ تصور، قرآن کے معاشی نظام میں	٤١٨
فٹ نہیں بیٹھتا۔	..
زکوٰۃ کیسے فرض ہوئی؟	٤١٩
زکوٰۃ کا نصاب اور شرح غیر متبدل ہے۔	٤٢١
اس موقف میں تبدیلی۔	..
ایتائے زکوٰۃ — اسلامی حکومت کا فریضہ۔	٤٢٢

— (٠) —

اس ایڈیشن میں ترمیمات کے علاوہ

حسبِ ذیل اضافے ہیں

(١) سوشلزم اور کمیونزم

(٢) جہاں مارکس ناکام رہ گیا۔ اس سے آگے

(٣) ماؤزے تنگ۔ اور۔ قرآن

(۴) ربٰو

(۵) زکوٰۃ

ان اضافوں سے بحث مکمل ہو گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

(طبع اوّل - بادنٰی لفظی تغیر)

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر | سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ | در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

آپ کسی مسجد کے منبر سے سنیئے یا جلسہ گاہ کی اسٹیج سے، ہر مقام اور ہر گوشہ سے یہ آواز آپ کے کانوں میں آئے گی کہ اسلام ایسی تعلیم پیش کرتا ہے جس کی مثال اور نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ وہ ضابطہ حیات ہے کہ اگر ساری دنیا کے مفکرین، سیاسیین اور مصلحین اکٹھے ہوجائیں تو بھی اس جیسا مکمل ضابطہ حیات مرتب کرنا تو ایک طرف وہ اس کی کسی ایک شق کے مثل بھی مدون نہیں کرسکتے۔ یہ نوعِ انسانی کی تمدنی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، اجتماعی اور انفرادی مشکلات کا واحد اور عدیم النظیر حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ دعویٰ (جس کی صداقت میں کوئی کلام نہیں) آپ کو ہر گوشہ سے سنائی دے گا۔ لیکن اگر آپ ان حضرات سے پوچھیں کہ اسلام کی وہ کونسی تعلیم ہے جو بے مثل و بے نظیر ہے اور جس کی مثال دنیا بھر کے مفکرین اکٹھے ہو کر بھی پیدا نہیں کرسکتے تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ اُن کے ہاں سے اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں مل سکے گا۔ وہ اگر کہیں گے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولو چوری نہ کرو۔ بددیانتی نہ کرو۔ بے انصافی نہ کرو۔ کسی کو ستاؤ نہیں۔ ہر ایک سے حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ سب کو بھائی بھائی سمجھو۔ ہر ایک سے ایک جیسا برتاؤ کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ یا دوسری طرف وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ احکام کے مصالح اور منافع کو سامنے لے آئیں گے۔ سوال یہ ہے کہ جہاں تک اس اخلاقی تعلیم کا تعلق ہے وہ کونسی چیز ہے جو اسلام کے سوا کہیں نہیں ملتی؟ یہ اخلاقی تعلیم دنیا کے تمام مذاہب میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے حتیٰ کہ جو لوگ کسی مذہب میں اعتقاد نہیں رکھتے اور خدا کی ہستی تک کے منکر ہیں وہ بھی اس اخلاقی تعلیم کے قائل ہیں۔ وہ

بھی یہ نہیں کہتے کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے، چوری ضرور کرنی چاہیئے۔ لوگوں کو ستانا اور اُن پر ظلم کرنا قابلِ ستائش ہے۔ بدزبانی قابلِ فخر ہے۔ لہٰذا اگر اسلام کی مابہ الامتیاز تعلیم یہی ضابطۂ اخلاق ہے تو اس سے اس دعویٰ کی صداقت تو ثابت نہیں ہو سکتی کہ اس کی تعلیم بے مثل و بےنظیر ہے۔ باقی رہا نماز روزہ وغیرہ کا سوال تو آپ انہیں زیادہ سے زیادہ باقی مذاہب کے طریقِ عبادت اور رسوم پرستش سے بہتر ثابت کر دیں گے لیکن جب فریقِ مقابل آپ پر یہ اعتراض کریگا کہ ان تمام شعائر کی پابندیوں کے باوجود خود مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں تو اس کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اگر آپ کچھ کہیں گے تو فقط اتنا کہ ان کی دُنیاوی حالت تو بیشک خراب ہے لیکن اس سے اُن کی "روحانی ترقی" ہوتی ہے اور عاقبت سنورتی ہے اور یہ چیزیں دوسرے مذاہب میں حاصل نہیں کی جا سکتیں۔ لیکن یہ وہ دعویٰ ہے جس کا آپ کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ "روحانی ترقی" کسی خارجی معیار سے ماپی نہیں جا سکتی۔ نہ کسی محسوس ترازو سے اسے تولا جا سکتا ہے۔ دنیا میں ہر مذہب، روحانی ترقی کا مدعی ہے اور آپ کے پاس کوئی معیار ایسا نہیں جس سے آپ علیٰ وجہ البصیرت ثابت کر سکیں کہ آپ کے مسلک و مشرب کے مطابق تو روحانی ترقی ہو سکتی ہے اور دیگر مذاہب کی روش پر چلنے سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ باقی رہا آخرت کی نجات کا سوال تو اس کا ثابت کرنا روحانی ترقی سے بھی زیادہ مشکل ہے ہر مذہب اس کا یکساں مدعی ہے اور کوئی مذہب بھی اس کا مرئی اور محسوس ثبوت پیش نہیں کر سکتا۔

(۲) آپ نے غور کیا کہ وہ دعویٰ جسے ہم تمام عمر سنتے اور دُہراتے رہتے ہیں ذرا سے غور و فکر کے بعد کس طرح بلا دلیل نظر آنے لگتا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ دعویٰ غلط ہے۔ یہ دعویٰ تو اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے اور اس کے سچا ہونے میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں لیکن ہم جن گوشوں میں اس کی صداقت کی دلیل تلاش کرتے ہیں وہ اس کی دلیل ہم نہیں پہنچاتے۔ اس کی دلیل کہیں کسی اور گوشے میں ملے گی۔

قرآن کریم سے پہلے دنیا کے تمام مذاہب نے مذہب کا منتہیٰ "روحانی ترقی" اور "اُخروی نجات" قرار دے رکھا تھا۔ دنیاوی معاملات سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ انہوں نے زمین کی بادشاہت "قیصر" کے سپرد کر رکھی تھی اور اپنے لئے آسمان کی بادشاہت مخصوص کر لی تھی۔ دنیا اور دنیا والوں کے معاملات ان کی نگاہوں میں اس قدر قابلِ نفرت تھے کہ وہ ان کے متعلق بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔ دنیوی چیزوں کی کشش و جاذبیت ان کے نزدیک روحانی ترقی کے مانع اور اُخروی نجات کے راستہ میں سنگِ گراں تھی۔ چونکہ روحانی ترقی اور اُخروی نجات کا دعویٰ ایسا تھا جس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی اس لئے ہر مذہب کے پیرو اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے کہ وہ حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔ قرآن نے اس تصور میں کیا تبدیلی پیدا کی، اس کا ذکر ذرا بعد میں آئے گا۔ لیکن مسلمانوں نے قرآن کو عملاً چھوڑ دینے کے بعد بعینہٖ وہی مسلک اختیار کر لیا جو دیگر مذاہب نے اختیار کر رکھا تھا۔ انہوں نے بھی دنیا اور اس کے دھندے سلاطین کے سپرد کر دیئے اور مذہب کا دائرہ روحانی ترقی اور آخرت کی نجات قرار دے لیا۔ لہٰذا اگر آپ

چاہیں کہ آپ اس معیار کے مطابق اسلام کو مذاہبِ عالم کے مقابلہ میں بےمثل و بےنظیر ثابت کر دیں تو یہ ناممکن ہے اس کے لئے نہ اُن کے پاس بیّن ثبوت ہے نہ آپکے پاس۔

(۳) قرآن کریم نے پہلے ہی پارہ کے شروع میں "قصۂ آدم"[1] کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲/۳۶) تمہیں ایک مدت تک کے لئے اس دنیا میں قیام کرنا اور متاعِ ارض سے بہرہ یاب ہونا ہے۔ اس کے لئے یاد رکھو کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ جو قوم ہمارے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات (وحی) کے مطابق زندگی بسر کریگی اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ لیکن جو قوم اپنے خود ساختہ نظریوں کیمطابق زندگی کے مسائل حل کرنے کی کوشش کریگی اور مذکورہ بالا ضابطۂ حیات کیخلاف چلے گی۔ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ (۲/۳۹) ان کی کشتِ حیات جل کر راکھ کا ڈھیر ہوجائے گی۔ لہٰذا قرآن نے انسان کو وہ راہ نمائی عطا کی ہے جو اُسے **اس دنیا** میں رہنے کے طور طریق سکھاتی ہے اور اس کی حیاتِ ارضی کے اس بنیادی مسئلہ کا حل بتاتی ہے جس کا حل تنہا عقلِ انسانی آج تک دریافت نہیں کرسکی اور نوعِ انسانی کی ساری تاریخ جس کے حل کی تلاش کی مضطربانہ کوشش اور خونی داستان ہے۔ اور حل بھی ایسا بتاتی ہے کہ اس سے اس زندگی کی سرفرازیاں بھی حاصل ہوجاتی ہیں اور اس کے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں بھی۔ یہ ہے وہ مقام جہاں اسلام کے بےمثل و بےنظیر ہونے کی حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے اور انسان دیکھ لیتا ہے کہ اس کے بتائے ہوئے اصول اور احکام کس طرح اس حل کے لاینفک اجزا ہیں۔

(۴) وہ بنیادی مسئلہ کیا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور عقلِ انسانی اُس کے حل میں کس طرح ناکام رہی ہے اس کے متعلق میں نے تفصیل سے اپنی اس کتاب میں لکھا ہے جس کا موضوع انسانی فکر کی تاریخ ہے اور جس کا عنوان ہے "انسان نے کیا سوچا؟" اُس کتاب کی تدوین کے بعد میرے سامنے ڈاکٹر (REINHOLD NIEBUHR) کی کتاب (MORAL MAN AND IMMORAL SOCEITY) کا ۱۹۵۳ء کا ایڈیشن آیا۔ اس کتاب کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

> اگرچہ انسانی معاشرہ کی جڑیں ایسی ہیں جو تاریخ (کی زمین) میں خود انسانی زندگی کے آغاز سے بھی زیادہ گہرائی تک پہنچی ہوتی ہیں لیکن نوعِ انسانی نے اپنی اجتماعی زندگی کے بنیادی مسئلہ کے حل میں مقابلۃً بہت ہی کم ترقی کی ہے .... وہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ طبعی اور ثقافتی اسباب و ذرائع جو انسانی زندگی کے قیام اور نشوونما کے لئے ضروری ہیں ان کی عادلانہ تقسیم کس طرح سے کی جائے۔

یعنی انسان کی حیاتِ ارضی کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ سامانِ نشوونما جو فطرت کی طرف سے بلامزد و معاوضہ عطا ہوا ہے اس کی تقسیم کس طرح سے کی جائے کہ وہ تمام افرادِ انسانیہ کی نشوونما کا ذریعہ بن سکے۔ ایسی نشوونما کا ذریعہ کہ اُن کی طبعی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور ان کی مضمر صلاحیتیں بھی ابھرتی چلی آئیں۔ یہ ہے وہ بنیادی مسئلہ جس کا صحیح حل نہ ملنے کی وجہ سے انسان اس قدر

[1] قصۂ آدم کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کی تفصیل میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

جگر سوز مشقتوں میں مبتلا چلا آتا ہے۔ قرآن کریم نے اس مسئلہ کو تین لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ اس نے جب آدم (یعنی آدمی) سے کہا کہ تم نے زمین میں رہنا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶)۔ تمہارے مفاد میں ٹکراؤ ہوگا۔ تم میں سے ہر ایک چاہے گا کہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹ لے خواہ دوسروں کے لئے کچھ بھی نہ بچے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ کچھ لوگ اتنا کچھ سمیٹ لیں گے کہ اس کے رکھنے کے لئے بھی جگہ نہیں ہوگی اور دوسرے لوگ زندگی کی بنیادی ضرورتوں تک کے محتاج ہو جائیں گے۔ جو لوگ اس طرح رزق کے سرچشموں پر قابض ہو جائیں گے وہ دوسروں سے اپنی مرضی منوائیں گے اور ان پر اپنا حکم چلائیں گے۔ اس سے انسانی معاشرہ میں فساد برپا ہوگا اور خونریزیاں ہوں گی۔ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ۔

یہ ہے انسان کی تمدنی زندگی کی بنیادی کشمکش جس کے اطمینان بخش حل کے لئے عقلِ انسانی تمام عمر سرگرداں رہی ہے۔ اور اسے قدم قدم پر اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔ (JEREMY BENTHAM) انیسویں صدی کا ایک مشہور ریفارمر گزرا ہے۔ اس نے عمر بھر کوشش کی کہ مختلف افراد اور طبقات کی خود غرضی کا کوئی کامیاب حل تلاش کر سکے۔ اس کے لئے اس نے مختلف تحریکیں چلائیں لیکن وہ ایک ایک کر کے ناکام ہوتی چلی گئیں۔ آخر الامر اس نے انتہائی مایوسی کے عالم میں اس کا اعتراف کیا کہ:۔

> اب میں کسی فریب میں نہیں رہا۔ اب میری نگاہوں کے سامنے سے خوش آیند خوابوں کے تمام پردے اٹھ چکے ہیں۔ اب میں نے اپنی ناکامیوں کا راز پا لیا ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کی خلقت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ اگر تمام نوعِ انسانی کی مسرت ایک طرف ہو اور ایک فرد کی اپنی مسرت ایک طرف تو وہ تمام نوعِ انسانی کی مسرت پر اپنی مسرت کو ترجیح دیگا۔
>
> (WORKS, VOL. X. P. 80)

ڈاکٹر (NIEBUHR) اس کی تائید کرتا ہوا اس پر اضافہ کرتا ہے کہ انسانی تہذیب نے جو کچھ کیا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ جو خرابی ایک فرد کے اندر تھی اس نے اسے ایک قوم کو تفویض کر دیا ہے[1] یعنی اب قوموں کی وہی حالت ہے جو بنتھم کے الفاظ میں افراد کی حالت تھی۔ اس مشکل کی وجہ یہ ہے کہ مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی استعداد مختلف ہوتی ہے۔ حیوانوں میں یہ بات نہیں ہوتی۔ ان کی کسی ایک جنس میں (مثلاً ہرنوں کے گلہ میں) اس استعداد کا فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے ان میں مفاد کا تصادم بھی نہیں ہوتا۔ اسی طرح غیر مہذب قبائل میں یہ اختلاف جسمانی قوت تک محدود رہتا ہے اور مختلف افراد کی دماغی استعداد میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں ہوتا۔ اس لئے وہاں بھی طبقاتی تقسیم نہیں ہوتی۔ لیکن جوں جوں انسان ذہنی ترقی کرتا جاتا ہے، مختلف افراد میں اکتسابی استعداد کا فرق نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے اور اسی نسبت سے باہمی مفاد میں تصادم بڑھتا جاتا ہے (JAMES MADISON) لکھتا ہے کہ:

---

[1] ایضاً۔ (ص ۹۹)

ذاتی ملکیت یا جائیداد کے حق کا تصور انسانی استعداد کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو مختلف افراد کے مفاد میں مساوات پیدا نہیں ہونے دیتی۔ گورنمنٹ کا اولین مقصد اس استعداد کا تحفظ ہوتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف افراد کی ملکیت کی مقدار بھی مختلف ہوتی ہے۔ اس سے معاشرہ میں مختلف معاشی گروہ اور پارٹیاں بن جاتی ہیں۔ (NIEBUHR - P.113)

یہ ہے تفسیرِ قرآن کے ان تین الفاظ کی جنھیں اوپر درج کیا جا چکا ہے یعنی بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کی حالت۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا تنہا عقل کی رُو سے اِس تصادم کا کوئی کامیاب حل دریافت کیا جا سکتا ہے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ منٹیسکو نے اس سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا کہ یہ بات انسان کی فطرت کے اندر ہے لہٰذا اسے دور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر (NIEBUHR) اس کے متعلق لکھتا ہے:۔

> اگر عقلِ انسانی معجزانہ طور پر ترقی کر جائے تو اور بات ہے ورنہ اس کے ذریعہ اس تصادم کا مٹانا ناممکن ہے جو مختلف طبقوں اور قوموں میں اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔ عقل کو کتنی ہی وسعت اور ثبات کیوں نہ حاصل ہو جائے اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ یہ اس فرد کے علاوہ جس کی یہ عقل ہے کسی اور کی زندگی کے لئے اثبات میں جواب دے سکے ..... لہٰذا یہ پیش گوئی نہایت آسانی سے کی جا سکتی ہے کہ مستقل امن اور نوعِ انسانی کی اخوت کا خواب اپنی مکمل شکل میں کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا ..... ہمیں اس کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے کہ علم و عقل کی ترقی اور وسائل رسل و رسائل کی وسعت سے بین الاقوامی اخلاق میں کوئی نمایاں ترقی ہو جائے گی۔ (PP. 16 ; 21 ; 26 ; 85)

یہ ہے وہ نتیجہ جس تک اس باب میں ہمارے دور تک کے مفکرین پہنچے ہیں۔ یعنی یہ عقل کے بس کی بات ہی نہیں کہ وہ انسان کی حیاتِ ارضی کے اس بنیادی مسئلہ کا حل دریافت کر سکے۔ تنہا عقل نے اس مسئلہ کا جو حل دریافت کیا ہے وہ ہمارے دور میں کمیونزم کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ کمیونزم کوئی نیا تصور نہیں۔ ذہنِ انسانی نے صدیوں پہلے اس بات کو محسوس کیا تھا کہ اس ساری کشمکش کی جڑ "ذاتی ملکیت" کا وجود ہے۔ اگر ذاتی ملکیت کو مٹا دیا جائے تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ یہ تصور بڑا خوش آیند تھا۔ لیکن یہ وسیع پیمانے پر (بحیثیت ایک عام نظامِ زندگی کے) کبھی عمل میں نہ آ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ کتنی ہی محنت کیوں نہ کریں فالتو روپیہ (SURPLUS MONEY) ان کے پاس نہیں رہ سکتا تو ان کے دل میں زیادہ محنت کرنے کا جذبہ باقی نہیں رہتا۔ اور اگر ان کے اس جذبۂ محرکہ کی بقا کے لئے ذاتی ملکیت کی اجازت دی جاتی ہے تو پھر وہی معاشی اور معاشرتی ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہی حل مارکس نے پیش کیا اور اس کا عملی تجربہ روس میں ہو رہا ہے۔ اس وقت تک اس کا نتیجہ کیا نکلا ہے؟ اس کے متعلق موافق اور مخالف لٹریچر کا

ایک طومار آپ کو دکھائی دے گا۔ لیکن یہ واقعہ ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس مملکت نے اپنے چاروں طرف سخت آہنی پردے لٹکا رکھے ہیں جن کے اندر جھانک کر دیکھنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس نظام کے نظریات کو عام کرنے کے لئے کمیونزم کے مدعی دنیا کے ہر گوشہ میں اپنا خون پسینہ ایک کر رہے ہوں اور اسے آدم کی فردوسِ گم گشتہ قرار دے رہے ہوں، اس نظریہ کی عملی تجربہ گاہ کو باہر کی دنیا سے اس طرح آہنی پردوں میں چھپا کر رکھنا، اس حقیقت کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہاں یقیناً ایسا نقشہ نہیں ہے جسے دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کے پاس کوئی ایسی محکم اساس نہیں جس پر وہ ایسے بلند نظام کی عمارت قائم کر سکے کہ لوگ اکتسابِ رزق کے لئے نہ دن کا چین دیکھیں نہ رات کا آرام اور اس کے بعد سب کچھ دوسروں کی بہبود اور مرفہ الحالی کے لئے عام کر دیں۔ اس صورت میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہو سکتا کہ کام کرنے والوں سے مار مار کر کام لیا جائے، اور انہیں حیوانوں کی طرح اتنا ہی دیا جائے جس سے ان کے جسم کی پرورش ہوتی رہے تاکہ وہ کام کرنے کے قابل رہیں۔ کمیونزم کا جو تجربہ روس میں ہو رہا ہے نوعِ انسانی کے لئے بدترین تجربہ ہے جس میں اوّل تو انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ دونوں کی زندگی محض طبعی زندگی سمجھی جاتی ہے جس کا خاتمہ موت کر دیتی ہے۔ لہٰذا اس میں انسانیت کے تقاضے طبعی تقاضوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھے جاتے اور دوسرے یہ کہ جن انسانوں کے یہ طبعی تقاضے پورے کئے جاتے ہیں ان کی انفرادیت یکسر ختم کر دی جاتی ہے۔ میں نے ایک مدت تک اس تحریک کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا (اس لئے کہ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے' مجھے ہمیشہ اس کی تلاش رہی کہ معلوم کر سکوں کہ تنہا عقلِ انسانی، کیا انسان کے اس بنیادی مسئلہ کا حل پیش کر سکتی ہے یا نہیں) اور اس مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ تحریک' انسانیت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اس تصور سے میری روح کانپ اٹھتی ہے کہ اگر یہ نظام کہیں ساری دنیا پر مسلط ہو گیا تو اس سے وہ کس عذابِ الیم میں مبتلا ہو جائے گی[1]۔

یہ تھا وہ شدید احساس جس کے ماتحت میں نے انسان کے اس بنیادی مسئلہ کے حل کے لئے قرآن کی طرف رجوع کیا۔ میں قرآن کا ایک ادنیٰ سا طالبِ علم ہوں، میری عمر کا بیشتر حصہ اس پر غور و فکر میں گزرا ہے۔ قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے میرا ہمیشہ یہ انداز رہا ہے کہ میں پہلے سے کوئی خیال قائم کر کے قرآن کے اندر نہیں جاتا۔ میں ایک سوال کو سامنے رکھتا ہوں اور خالی الذہن ہو کر کوشش کرتا ہوں کہ مجھے قرآن سے اس کا کوئی حل مل جائے۔ جو حل مجھے قرآن سے ملتا ہے' اُسے

---

[1] یہ کچھ میں نے ۱۹۵۵ء میں لکھا تھا۔ اس کے بعد روس میں یہ نظام کس بُری طرح سے ناکام رہا ہے اس کا علم ساری دنیا کو ہے۔ روس کے بعد چین بھی اسی دعویٰ کو لے کر اٹھا تھا لیکن ماؤزے تنگ کی وفات کے بعد وہاں جس قسم کا انتشار رونما ہو رہا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس نظام کا شیرازہ وہاں بھی بکھر رہا ہے۔ (فروری ۱۹۷۸ء)

قبول کرتا ہوں، خواہ وہ ساری دنیا کے مسلمات کے خلاف ہی کیوں نہ جاتے حتیٰ کہ خود میرے اپنے معتقدات اور تصورات کے بھی خلاف کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنوں اور بیگانوں، قریب قریب سب کی نگاہوں میں ہدفِ ملامت بنا رہتا ہوں۔ میں نے اس مسئلہ کے حل کے لئے بھی اسی انداز سے قرآن پر غور کیا، اور میری اس کوشش نے مجھے جس نتیجہ تک پہنچایا ہے اسے میں نے آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ قرآن تو وحیٔ الٰہی ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ لیکن میں اپنی قرآنی بصیرت کو کبھی وحیٔ الٰہی قرار نہیں دیتا اس لئے اس میں سہو اور خطا دونوں کا امکان ہوتا ہے۔ بنا بریں میں اس پر اصرار نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ اس باب میں حرفِ آخر ہے اور وحیٔ الٰہی کی طرح منزہ عن الخطاء۔ البتہ مجھے اس پر ضرور اصرار ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس پر آپ قرآن کی روشنی میں غور کریں اور آپ کو جہاں سقم نظر آئے اسے مجھ پر قرآن ہی کی تائید سے واضح کریں۔

(۵) اس مسئلہ کے حل کے لئے جو کچھ قرآنِ کریم سے میں سمجھا ہوں وہ یہی ہے کہ قرآن کسی کے پاس فاضلہ دولت رہنے نہیں دیتا اور وسائلِ پیداوار پر (خواہ وہ فطری ہوں یا مصنوعی) کسی کی ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتا۔ خواہ ملکیت افراد کی ہو اور خواہ اسٹیٹ (مملکت) کی۔ اس مقام پر اکثر سطح بین حضرات فوراً کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو وہی بات ہے جو کمیونزم کہتی ہے۔ اس کے بعد وہ کہیں گے کہ یہ عجیب بات ہے کہ میں ایک طرف کمیونزم کو انسانیت کا بدترین دشمن قرار دیتا ہوں اور دوسری طرف اسلام کو، جو وہی کچھ پیش کرتا ہے جسے اشتراکیت پیش کرتی ہے، نوعِ انسانی کے حق میں آبِ حیات تصور کرتا ہوں۔ بعض لوگ شاید اس سے بھی آگے بڑھیں اور کہہ دیں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے یہ اشتراکیت ہی ہے جسے اسلام کا لیبل لگا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ آپ متنِ کتاب میں دیکھیں گے، اس قسم کی باتیں ان لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہیں جو نہ یہ جانتے ہیں کہ کمیونزم کیا ہے اور نہ یہ کہ اسلام کیا ہے۔ اسی قبیل کے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے آجکل "اسلامی اشتراکیت" کی عجیب و غریب اصطلاح وضع کر رکھی ہے۔ یہ اصطلاح ایسی ہے جیسے کوئی "قرآنی دہریت" کہہ دے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کمیونزم میں بھی ذاتی ملکیت کی نفی ہوتی ہے لیکن صرف اتنی سی بات سے کمیونزم جیسا خلافِ اسلام تصورِ حیات اسلام تو نہیں بن سکتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہہ دے کہ آریہ سماجی بھی بُت شکنی کی تعلیم دیتے ہیں اور اسلام بھی بتوں کی پرستش سے روکتا ہے اس لئے اسلام اور آریہ سماجی مذہب دونوں ایک ہی ہیں۔ کمیونزم ایک معاشی نظام ہی نہیں وہ ایک فلسفۂ حیات ہے جو اُن بنیادوں پر قائم ہے جو قرآنی تصورِ حیات سے یکسر متضاد ہیں۔ قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے یہ تمام کائنات ایک حکیم و خبیر ہستی کی پیدا کردہ ہے اور اسی کے غیر متبدل قوانین کے تابع چل رہی ہے۔ اس کی تخلیق ایک عظیم مقصد کو لئے ہوئے ہے۔ انسانوں کی تخلیق بھی اُسی خدا کے پروگرام کے مطابق عمل میں آئی ہے۔ اُس

نے انسانی زندگی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے اپنی طرف سے راہ نمائی عطا کی ہے، جسے وحی کہا جاتا ہے۔ یہ وحی اُن مستقل اقدار اور غیر متبدل قوانین پر مشتمل ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے بطور ضابطۂ حیات کام کرتے ہیں۔ اس ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس زندگی کی خوشگواریاں بھی نصیب ہوتی ہیں اور وہ اس قابل بھی ہو جاتا ہے کہ مرنے کے بعد زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا جائے۔ جو معاشرہ اس ضابطۂ حیات کے مطابق متشکل ہوتا ہے اسے قرآنی نظام کا حامل کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے اور تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہوتی چلی جائے۔ اسی کا نام تکمیلِ ذات یا استحکامِ خودی ہے۔ یعنی ہر فرد کی انفرادیت کا اثبات اور اس کی تکمیل۔ اس نظام میں یہ کچھ نہ میکانکی طور پر رونما ہوتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کے جبر و تشدد سے پیدا کیا جاتا۔ یہ چیز اس معاشرہ کے افراد کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی، اُن کے ذہن کی کاوشوں سے نشو و نما پاتی اور اُن کے بازوؤں کی قوت سے پروان چڑھتی ہے اس لئے کہ ان افراد کا ایمان ہوتا ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے دنیا میں کوئی عمل حتیٰ کہ کوئی خیال تک بھی بلا نتیجہ نہیں رہتا۔ انسانوں کا ہر عمل اور ارادہ جو وحی خداوندی (یعنی مستقل اقدار) سے ہم آہنگ ہوتا ہے وہ فرد اور معاشرہ دونوں کے لئے خوشگوار نتائج پیدا کرتا ہے اور اسی میں شرفِ انسانیت کی تکمیل کا راز پوشیدہ ہے اور ہر وہ کام جو ان اقدار کے خلاف سرزد ہو، اُس سے مقامِ انسانیت چھین لینے کا موجب بنتا ہے۔ اس نظام میں ہر فرد پوری محنت سے کام کرتا ہے اور اپنے لئے صرف اتنا لیتا ہے جو اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ باقی سب کچھ اپنے دل کی پوری رضامندی کے ساتھ نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہے کیونکہ اس کا ایمان ہوتا ہے کہ اس سے اس کی اپنی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور وہ ابدی مسرتوں کا مستحق بن جاتا ہے۔ اس طرح اس معاشرہ میں نہ فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی ہے اور نہ ہی پیداوار کے ذرائع پر ذاتی ملکیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

ان حقائق کو سامنے رکھیے اور پھر سوچیے کہ ان میں اور کمیونزم میں کوئی قدر بھی مشترک ہے؟ کمیونزم نہ خدا کی قائل ہے، نہ کائنات اور انسانی زندگی کے کسی مقصد کی، نہ وہ وحی کو مانتی ہے نہ مستقل اقدار کو، نہ وہ انسانی ذات کی قائل ہے، نہ مرنے کے بعد زندگی کے تسلسل کی۔ نہ وہ قانونِ مکافات کو تسلیم کرتی ہے اور نہ اس کے غیر متبدل اصولوں کو۔ آپ سوچیے کہ ایک ایسے نظامِ زندگی کو جو ان تمام اقدار کے انکار پر مبنی ہو، اسلام سے کوئی تعلق بھی ہو سکتا ہے؟ کمیونزم اور اسلام دو متضاد عناصر ہیں جو کبھی ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ قرآن کی رُو سے کوئی مسلمان، کمیونسٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تحریک جو ایک "دین" (نظامِ زندگی) کی حیثیت سے سب سے پہلی بار اسلام کے مقابل

آئی ہے کمیونزم ہے۔ اسلام اس وقت ایک بہت بڑی جنگاہ میں کھڑا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کو شکست دے کر اپنی صداقت کی نمود کرے۔ لیکن یہ اُس نظامِ ربوبیت کی رُو سے ہو سکتا ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے۔

(۶) جہاں تک میرا مطالعہ میری راہنمائی کرتا ہے۔ قرنِ اوّل کے بعد (کہ جس میں یہ نظام اُس زمانے کے حالات کیمطابق اپنی عملی شکل میں قائم ہوا تھا) یہ پہلی کوشش ہے جس میں قرآن کریم میں پیش کردہ نظامِ ربوبیت کو اس طرح مدون شکل میں سامنے لایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے "قدامت پرست" طبقہ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوگی اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہے کہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے وہی مسلکِ حقہ ہے اور اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل الحاد اور بے دینی ہے۔ ہمارے ہاں وسائلِ پیداوار پر ذاتی ملکیت کا تصور صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اس لئے یہ تصور ان حضرات کے نزدیک بڑا مقدس اور عین اسلام بن چکا ہے۔ بنا بریں وہ کسی ایسی بات کے سننے تک کے لئے بھی تیار نہیں ہوں گے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ وسائل پیداوار ذاتی ملکیت میں نہیں رہنے چاہئیں۔ ان سے اگر کہا جائے گا کہ یہ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کیا کہتا ہے تو ان کا پہلا جواب تو یہ ہوگا کہ ہمارے بزرگ قرآن کو ہم سے زیادہ سمجھتے تھے اور دوسرا جواب یہ کہ اگر کسی معاملہ میں قرآن میں اور اسلاف کے مسلک میں اختلاف نظر آئے تو ہمیں قرآن کی ایسی تاویل کرنی چاہیئے جس سے وہ اسلاف کے مسلک کے مطابق ہو جائے۔ لیکن میرے نزدیک یہ کوئی دلیل نہیں۔ میرے عقیدہ کے مطابق دین کی سند اللہ کی کتاب ہے اور ہر دور کے مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دیکھیں کہ ان کے ہاں جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے وہ قرآن کے مطابق ہے یا نہیں جہاں وہ دیکھیں کہ کوئی بات قرآن کے خلاف ہے اُسے قرآن کے مطابق کر لینا چاہیئے۔ باقی رہا یہ کہ ہمارے اسلاف بھی قرآن کو سمجھتے تھے۔ سو اس ضمن میں عرض کروں گا کہ قرآن کریم نے تدبر اور تفکر پر جو اس قدر زور دیا ہے تو وہ کسی خاص دور یا خاص افراد تک محدود نہیں۔ قرآنِ کریم قیامت تک کے انسانوں کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے اس لئے اس میں تدبر و تفکر کا حکم تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ سو جب اللہ تعالیٰ ہمیں بھی تدبرنی القرآن کا حکم دیتا ہے تو قرآن کریم میں تدبر ارشادِ خداوندی کی تعمیل ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ اس ارشادِ خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

اس کے بعد یہ سمجھئے کہ زمانہ من حیث الکل اس طرح آگے بڑھتا چلا آرہا ہے کہ ہر دور میں نئے نئے تقاضے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جس دور میں جو تقاضا زیادہ نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ اُس دور کے انسان لامحالہ اس پر زیادہ غور و فکر کرتے ہیں۔ رزق کی تقسیم کا تقاضا جس شدّت سے ہمارے دور میں اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ گذشتہ تیرہ سو سال میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے ہاں ہوتا کیا چلا آرہا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس تقاضے

کا حل قرآن کیا پیش کرتا ہے۔

لیکن اتنا کچھ کہنے کے بعد میں اسے پھر دُہرا دوں کہ ہمارا "قدامت پرست" طبقہ ان میں سے کسی بات پر بھی کان نہیں دھریگا۔ وہ برابر یہی کہتے چلے جائینگے کہ یہ ایک بالکل نیا اسلام ہے جسے ہمنے اسلاف میں سے کسی کے ہاں نہیں سُنا۔ لہٰذا یہ الحاد ہے، بیدینی ہے۔ ان لوگوں کے ہاں اسلاف کی تقلید کا جذبہ کس حد تک پہنچ چکا ہے اس کا اندازہ ایک تاریخی واقعہ سے لگائیے۔ عہدِ اموی کی جامعہ دمشق بہت مشہور ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس مسجد کا رُخ، قبلہ سے ذرا ہٹا ہوا بن گیا۔ اس کے بعد جتنی مسجدیں بنیں وہ سب اسی جامعہ دمشق کی سمت کے مطابق تھیں۔ نتیجہ یہ کہ اُن تمام مساجد کا رُخ قبلہ سے ہٹ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس فن کے ماہرین نے اس غلطی کو محسوس کیا۔ بات بالکل صاف تھی کہ اُن کے پیش کردہ علمی نظریہ کی رو سے دیکھ لیا جائے کہ سمت غلط ہے یا صحیح اور اگر سمت غلط نکلے تو اُسے درست کر لیا جائے۔ لیکن تقلید اس کی اجازت کب دیتی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق ائمہ فقہ نے فتویٰ صادر فرما دیا کہ:-

> اگر کوئی فلکیات کا عالم یا معتمد آدمی یہ کہتا ہے کہ ان مساجد کا رُخ غلط ہے تو اس کی اس بات پر قطعاً اعتماد نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اسے درخورِ توجہ سمجھا جائے گا۔ اس لئے کہ اموی مسجد کا قبلہ صحابہؓ کے وقت سے چلا آرہا ہے اور انہوں نے اور ان کے بعد آنے والوں نے اسی قبلہ کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھی ہیں۔ وہ لوگ اس فلکی کی نسبت زیادہ عالم اور زیادہ قابلِ اعتماد تھے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ فلکیات کا ماہر درست کہہ رہا ہے یا غلط لیکن یہ حقیقت کہ اسلاف نے اسی رُخ پر نمازیں پڑھی ہیں خود اس امر کی دلیل ہے کہ اس فلکی کا قول غلط ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کی بات نہیں ماننی چاہیئے۔ یاد رکھو کل خیر فی اتباع من سلف اسلاف کی اتباع ہی میں تمام بھلائی ہے۔
>
> (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فقہ کی مشہور کتاب شامی۔ جلد اول صفحہ ۴۴۸)

چنانچہ نمازیں اُسی رُخ پر پڑھی گئیں اور پڑھی جا رہی ہیں۔ جو قوم تقلید میں اس حد تک پہنچ چکی ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کسی ایسی بات کو سننا گوارا کرے گی جس کی تائید اُسے اسلاف کے ہاں سے نہ ملے امیدِ موہوم ہے۔

باقی رہا ذاتی ملکیت کا "تقدس"۔ سو اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ یہ تصور یورپ کے ان فلاسفروں اور معاشی رہنماؤں کا پیدا کردہ ہے جو نظامِ سرمایہ داری کے بنیادی ستون ہیں۔ بوڈن (BODIN)، ہابز (HOBBES)، لاک (LOCKE)، والٹیر (VOLTAIRE)، ہیوم (HUME) سب اسی زمرہ کے لوگ ہیں۔ انہوں نے ذاتی ملکیت کو انسان کے فطری حقوق (NATURAL RIGHTS) کی فہرست میں شامل کیا اور اس کا تحفظ حکومت کا اولین فریضہ قرار دیا۔ ان کے برعکس قرآنِ کریم کو دیکھئے۔ وہ حضرات انبیاء کرام کے مسلک کو نوعِ انسانی کے لئے بطورِ

دلیل راہ پیش کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے کسی رسول کی ذاتی ملکیت کا ذکر نہیں کیا۔ خود حضور خاتم النبیین صلعم کے متعلق یہ حقیقت سب کو تسلیم ہے کہ (روزمرہ کی اشیاءِ مستعملہ کے سوا) نہ حضورؐ کی کوئی ذاتی ملکیت تھی نہ فاضلہ دولت بلکہ ایک حدیث کے مطابق (جو قرآن کریم کے مطابق ہے اور اس لئے قابلِ قبول) حضورؐ نے فرمایا کہ انا لا نورث۔ ہمارا کوئی وارث نہیں۔ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ۔ ہم جو کچھ چھوڑ رہے ہیں وہ سب مفادِ عامہ کے لئے ہے (بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۹۶) چنانچہ اس اصول کے مطابق، باغِ فدک، جو حضورؐ کے ذاتی گذارے کے لئے تھا، بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوا، بلکہ امت کی مشترکہ تحویل میں آگیا۔

اب رہا یہ سوال کہ اگر اسلام میں ذاتی ملکیت نہیں تو پھر قرآن کریم میں وراثت وغیرہ کے احکام کس لئے دیئے گئے ہیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسانی معاشرہ کو اپنے متعین کردہ پروگرام کی آخری منزل تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچاتا ہے اس لئے وہ جہاں اُس پروگرام کی آخری منزل کے متعلق اصول اور احکام متعین کرتا ہے' عبوری دور کے لئے بھی ساتھ کے ساتھ راہنمائی دیتا چلا جاتا ہے۔ وراثت، قرضہ، لین دین، صدقہ و خیرات وغیرہ سے متعلق احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں سے گزر کر معاشرہ انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں ایسے ممالک بھی ہوں گے جہاں مسلمان اقلیت میں غیر مسلم (یا غیر قرآنی) نظامِ حکومت کے تابع زندگی بسر کر رہے ہوں گے۔ وہاں ان کی زندگی انفرادی مسلمانوں کی سی ہوگی۔ اس لئے ان کے لئے انہی احکامِ قرآنی پر عمل پیرا ہونا ممکن ہوگا جنہیں ہم نے عبوری دور کے احکام کہہ کر پکارا ہے۔ ان کے لئے کشاد کی راہ تو یہی ہوگی کہ وہ آخرالامر اس مملکت کیطرف ہجرت کر جائیں جہاں قرآنی نظام نافذ ہو لیکن جب تک یہ ممکن نہ ہو انہیں بہرحال انفرادی احکام پر عمل پیرا رہنا ہی ہوگا۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح کوئی ایک معاشرہ جو قرآنی پروگرام پر عمل پیرا ہوتا ہے' بتدریج آخری نقطہ تک پہنچتا ہے اسی طرح تمام نوعِ انسانی بھی رفتہ رفتہ اس انتہائی نقطہ کی طرف جا رہی ہے جس کی نشاندہی قرآن نے کی ہے۔ جو شخص ذرا دقتِ نظر سے کام لے گا وہ اس حقیقت کو محسوس کر لیگا کہ انسانی معاشرے کے تقاضے اب کچھ ایسے شدید ہو چکے ہیں کہ ان کا حل ان قوانین کے بغیر ممکن نہیں جو قرآن نے انتہائی منزل کے لئے تجویز کئے تھے اور جس کا نمونہ نبی اکرم صلعم نے اپنی ذاتِ اقدس میں دکھا دیا تھا۔ تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے مسلسل محنت و کاوش لیکن فاضلہ دولت اور ذاتی ملکیت کی نفی۔ یہی ہے وہ نظامِ ربوبیت جسے قرآن معاشرہ کی آخری شکل قرار دیتا ہے اور جسے آئندہ اوراق میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ذاتی ملکیت کا تصور انسان کی "فطرت" میں داخل

ہے، ان کی خدمت میں عرض ہے کہ جسے وہ انسان کی "فطرت" سمجھتے ہیں وہ اس کے آباء واجداد کی روایات، موروثی اثرات، تعلیم وتربیت کے نقوش اور گرد وپیش کی فضا کے مجموعہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں (ان امور کو میں "سلیم کے نام خطوط" کے مجموعہ میں وضاحت سے بیان کرچکا ہوں)۔

قرآن کریم کے تجویز کردہ نظام تک پہنچنے سے پہلے جس طرح یہ بتانا ضروری ہے کہ کمیونزم کا پیش کردہ نظام کس طرح انسانیت کُش ہے اسی طرح یہ دکھانا بھی ضروری ہے کہ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام جو اس مفروضہ پر قائم ہے کہ ملکیت کا جذبہ انسان کی فطرت کے اندر ہے، اس لئے جو نظام، پیداوار کے ذرائع کو افراد کی ذاتی ملکیت میں رکھتا ہے وہ عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے، وہ بھی کتنے بڑے فریبِ نفس اور رابلہ فریبی میں مبتلا ہے۔ جب تک ان غلط مفروضوں کی اصلیت کو بے نقاب نہ کیا جائے، ہم حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت (یعنی غلط اور باطل تصورات اور نظام سے انکار) کو ضروری قرار دیا ہے۔ برفا (ROBERT BRIFFULT) کے الفاظ میں:۔

> آپ استبداد کے مقابلہ کے لئے کبھی نہیں اٹھ سکتے، نہ ہی اس کی قوت کو توڑ سکتے ہیں جب تک آپ ان جھوٹی سندوں کو سچا سمجھتے رہیں جو اس استبداد کے لئے وجہِ جواز بہم پہنچاتی ہیں۔ جب تک آپ اس (مقدس) جھوٹ کو اچھی طرح بے نقاب نہیں کردینے اور واضح طور پر نہیں بتا دیتے کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے، اس وقت تک آپ اس استبداد، اس ظلم اور بے انصافی کا کبھی مقابلہ نہیں کرسکتے۔ (RATIONAL EVOLUTION - Cf NIEBUHR P. 31)

قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ وہ تمام غیر قرآنی تصورات، جو ہم نے غیروں سے مستعار لئے ہیں لیکن جو بدقسمتی سے "عین اسلام" بن چکے ہیں، ان کی پردہ دری کی جائے تاکہ قرآنی حقیقت نکھر کر سامنے آجائے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے ہمارے قلب و نگاہ کی تطہیر ہوسکے گی جو قرآنی انقلاب کے لئے اولین مرحلہ ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

> زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کرسکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کرسکتی جب تک اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ (پیامِ مشرق)

قرآنی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنگامی شورشیں برپا کرنا نہیں سکھاتا۔ وہ اپنی اساس فکری تبدیلی پر رکھتا ہے جسے وہ علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان جذبات کی بھی حسن کارانہ انداز سے پرورش اور تربیت کرتا ہے جو انقلاب کی قوتِ محرکہ ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ اس کی داخلی اور خارجی دنیا میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس میں ہر قدم تعمیر کے لئے اٹھتا ہے اور جو چیزیں بظاہر تخریبی نظر آتی ہیں وہ بھی درحقیقت تعمیر ہی کی تمہید ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر (NEIBUHR) اپنی (محولہ بالا) کتاب کے آخری صفحہ پر لکھتا ہے:۔

نوعِ انسانی کی نجات ان افراد کے ہاتھوں ممکن ہے جنہوں نے قدیم "خوابوں" کو جدید "خوابوں" سے بدل دیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم خواب، یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی اجتماعی زندگی میں مکمل عدل پیدا کر دینا ممکن ہے۔ یہ "خواب" بڑا ہی بیش بہا ہے۔ اس لئے کہ انسان 'عدل سے زیادہ قریب تر مقام کو بھی حاصل نہیں کر سکتا جب تک مکمل عدل کی امید اس کے دل میں ایک بلند قسم کا جنون پیدا نہ کرے۔ اس جنون کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جو اربابِ اقتدار کے استبداد اور بلند مسندوں پر متمکن شدہ روحانی پیشوائیت کی ابلیسانہ کارستانیوں کے خلاف جہاد کر سکے۔

لیکن یہ جنون خطرناک بھی ہو سکتا ہے — اس لئے کہ اس سے مذہبی دیوانگی (FANATICISM) کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ لہٰذا اس جنون کو عقل کے کنٹرول کے تابع رکھنا ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ دعا بھی کرتے رہنا چاہیئے کہ قبل اس کے کہ یہ جنون اپنا کام مکمل کرے کہیں عقل اس کا خاتمہ ہی نہ کر دے۔ (P. 277)

اس قسم کا عقل اور جنون کا امتزاج، جس میں نہ تو جنون، مذہبی دیوانگی سکھا دے اور نہ ہی عقل اس جنون کی چنگاری کو اپنی خاکستر کے نیچے دبا کر بجھا دے، قرآن کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی ہیں وہ اربابِ "خرد و جنون" جنہیں وہ اُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (۳/۱۹۰) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ اربابِ عقل و بصیرت جو زندگی کی ہر ساعت اور ہر گوشے میں وحی کی راہ نمائی کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں اور کائنات کی گہرائیوں اور بلندیوں پر بھی غور و فکر کرتے ہیں۔ یہی ہیں وہ مکمل عدل کا "خواب" دیکھنے والے جو اس خواب کو ایک زندہ حقیقت بنا دینے کے اہل ہیں۔ اور اس کا زمانہ کچھ دور نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ۱۹۲۳ء کے قریب لکھا تھا کہ "فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے"۔ اس سے قریب دس بارہ برس بعد انہوں نے کہا تھا کہ

جو حرفِ قُلِ الْعَفْو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار (ضربِ کلیم)

اور اس کے بعد انہوں نے اپنی آخری تصنیف 'ارمغانِ حجاز' میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا تھا کہ

مزدکیت "فتنۂ فردا" نہیں اسلام ہے

میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے جس آسمانی انقلاب کی طرف حکیم الامتؒ نے یہ اشارے کئے تھے اس کے لئے فضا بڑی تیزی سے تیار ہو رہی ہے۔ بنا بریں میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس باب میں جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا ہے اسے ملت کے اربابِ فکر و نظر کے سامنے واضح الفاظ میں پیش کر دوں۔ اس کی ضرورت صرف اس لئے نہیں کہ وہ خود اس

قرآنی معاشرہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کی زیادہ ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اس وقت انسانیت ایک بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے اور وہ دوراہہ بہت جلد سامنے آجائے گا جب اُسے آخری فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کس سمت کیطرف مُڑے۔ اگر اس وقت اس کا قدم پھر غلط راستہ کی طرف اُٹھ گیا تو نہ معلوم اُسے صحیح راستہ کی طرف آنے کے لئے کتنی صدیوں تک انتظار کرنا پڑے اور کتنے خون کے دریا بہیرنے اور آگ کی خندقیں پھاندنی پڑیں۔ اس وقت نوع انسانی سرمایہ داری کے اس نظام سے تنگ آچکی ہے جس نے اتنا عرصہ اس کا گلا گھونٹے رکھا ہے۔ اگر اس وقت اسے صحیح راستہ نہ ملا تو وہ ناچار کمیونزم کو قبول کرے گی اور یہ نظام اس کے لئے خودکشی کے مرادف ہوگا۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ جو قوم وراثتِ قرآن کی مدعی ہے، یہ ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے کہ ایسے نازک وقت میں وکاروانِ انسانیت کی راہ نمائی صحیح راستہ کی طرف کرے۔ صحیح راستے سے مراد ہے ایسا راستہ جس پر چل کر انسان کی معاشی زندگی کا وہ مسئلہ بھی حل ہوجائے جس کے حل کرنے سے تنہا عقلِ انسانی اس بُری طرح سے ناکام رہی ہے اور انسان اس زندگی کے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل کرے۔ ایسا نظریۂ زندگی جو انسانی زندگی کے مسئلہ کو محض معاشی مسئلہ قرار دے کر حیاتِ آخرت سے انکار کردے، یا اس کے معاشی مسئلہ کو حقارت سے ٹھکرا کر صرف "روحانی ترقی" کو مقصدِ زندگی قرار دیدے، قرآنی نظریۂ حیات نہیں ہو سکتا۔ قرآن، ایک ہی کنجی سے انسان کی دنیا اور آخرت دونوں کے دروازے کھولتا ہے اور اسی جہت سے اسکی تعلیم بے مثل و بےنظیر ہے۔ اخلاقی ضابطہ اور دین کے شعائر و مناسک اسی بے مثل و بے نظیر پروگرام کے اجزا ہیں۔

(۸) آخر میں میری درخواست ہے، کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے سرسری نگاہ سے نہ دیکھا جائیے اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے اور سوچئے کہ میں نے قرآن کا مفہوم صحیح طور پر سمجھا ہے یا نہیں اور اگر آپ متفق ہوں کہ یہ قرآن کی صحیح تعبیر ہے تو پھر سوچئے کہ نوعِ انسانی کو سرمایہ داری کے جذام اور کمیونزم کے سرطان سے بچانے کے لئے آپ پر کیا فریضہ عائد ہوتا ہے؟

پرویز

(مارچ ۱۹۵۵ء)

پیش لفظ
(طبع ثانی)

یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی اور چند ہی روز میں اس نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور وہ اڈیشن جلدی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے دوسرے اڈیشن کے تقاضے موصول ہونے شروع ہو گئے۔ لیکن اس دوران میں پاکستان میں معاشی موضوع نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی کہ اس سے پیدا شدہ مختلف مسائل بحث و تمحیص کا مرکز بن گئے۔ کمیونزم اور سوشلزم کے حامیوں نے اپنے نقطۂ نگاہ سے اس بحث میں حصہ لیا۔ ہمارے قدامت پرست طبقہ نے اپنے مؤقف و مسلک کی تائید میں بہت کچھ کہا اور لکھا۔ ایک گروہ نے مفاہمت (COMPROMISE) کی ناکام کوشش کی اور "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح سے ایک نیا مسلک تراشا، جس میں نہ اسلام تھا نہ سوشلزم۔ یا یوں کہیے کہ وہ، سوشلزم پر ان کے خود ساختہ اسلام کی ملمع کاری کی سعیٔ ناکام تھی۔ ان مباحث میں جو کچھ مجھے قرآنِ کریم کے خلاف نظر آیا، میں نے اس پر پوری جرأت سے، دو ٹوک الفاظ میں تنقید کی، اور اس کے ساتھ اپنے مقالات اور خطابات میں قرآنی نظامِ معیشت کو اور بھی وضاحت و صراحت کے ساتھ پیش کرتا رہا۔ بحث و مباحثہ کی اس ہیجان خیز فضا میں نظامِ ربوبیت کے جدید اڈیشن کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب جبکہ اس طوفان میں قدرے سکون پیدا ہوا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اسے دوبارہ شائع کر دیا جائے۔ لیکن جو کتاب اب آپ کے سامنے آئے گی وہ سابقہ کتاب "نظامِ ربوبیت" کا دوسرا اڈیشن نہیں، وہ اس موضوع پر از سرِ نو مرتب کردہ تصنیف ہے جس میں ان تمام مباحث کی روشنی میں جو اس تمام دوران میں سامنے آئے ہیں، ضروری ردّ و بدل کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود، قرآنِ کریم کے معاشی نظام کے سلسلہ میں جو کچھ میں نے اصولی طور پر پہلے اڈیشن میں پیش کیا تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ قرآن کے حقائق ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں۔

سابقہ اڈیشن میں ردّ و بدل کے علاوہ، آخر میں، میں نے دو چار ایسے خطابات اور مقالات کا اضافہ ضروری سمجھا ہے جن میں اس موضوع سے متعلق منتشر حقائق سمٹ کر یکجا سامنے آ گئے ہیں۔ پہلے خطاب میں سوشلزم، اسلامی سوشلزم، اور قرآنی نظام کی تفصیلات آ گئی ہیں۔ دوسرے میں مارکس اور مارکسزم کا صحیح مقام

متعین کیا گیا اور اس کی ناکامی کی بنیادی وجہ سے بحث کی گئی ہے اور تیسرے مقالہ میں ماوزے تنگ کے فلسفہ کو سامنے لایا گیا ہے۔ یوں قرآن کے معاشی نظام کے تقابل میں روسی کمیونزم اور چینی کمیونزم کے نقوش آئینہ وار ایک دوسرے کے بالمقابل آویزاں ہو گئے اور آخر میں ربو اور زکوٰۃ جیسے اہم موضوعات کو سمٹائی ہوئی شکل میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس طرح، اب یہ کتاب میری کوشش کے مطابق، معاشیات کے موضوع پر ایک جامع تصنیف قرار پا سکتی ہے۔

(۲) اس کتاب میں قرآنی اصطلاحات بکثرت سامنے آئیں گی۔ ان کا واضح مفہوم میری لغات القرآن میں ملے گا۔ جہاں تک قرآنی آیات کا تعلق ہے ان کے ترجمہ کی بجائے ان کا مفہوم پیش کیا گیا ہے۔ اس کے لئے میرے "مفہوم القرآن" کا زیرِ نظر رکھنا مفید ہو گا۔

(۳) متن میں انگریزی کتابوں کے حوالے، ساتھ کے ساتھ دینے کے بجائے متعلقہ باب کے آخر میں دیئے گئے ہیں (مثلاً، متن میں کسی کتاب کے اقتباس کے سامنے جو نمبر دیا گیا ہے جیسے ① تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس باب کے آخر میں نمبر ① کے سامنے اس کتاب کا نام وغیرہ دیا گیا ہے۔

(۴) میری زندگی کا مشن قرآنی فکر کی تحصیل اور اس کی نشر و اشاعت ہے اور میں قریب پچاس سال سے اسی مقصد کی تکمیل میں مصروف ہوں۔ قرآنی حقائق کے اس قدر طویل عرصہ پر مشتمل مطالعہ، فکر اور تدبر کے باوجود میں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں وہ سہو و خطا سے منزہ اور حرفِ آخر ہے۔ اس قسم کا دعویٰ، میں سمجھتا ہوں، کوئی انسان بھی نہیں کر سکتا۔ بنا بریں، اس کتاب میں بھی میں نے جو کچھ پیش کیا ہے، وہ فکرِ قرآنی کے متعلق ایک انسانی کوشش ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو ھوالمراد۔ اور اگر آپ کو اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو میں شکرگزار ہوں گا اگر آپ مجھے اس سے مطلع فرمائیں۔ بشرطیکہ جو کچھ آپ کہیں اس کی تائید میں قرآنی سند پیش کی جائے۔

(۵) آخر میں، میری جبینِ نیاز بدرگاہِ رب العزت سجدہ ریز ہے جس نے مجھے یہ توفیق ارزانی فرمائی کہ میں اپنی عمر کے بیشتر حصہ کو اس کی کتابِ عظیم کے سمجھنے سمجھانے میں صرف کر سکا۔ یہ بہت بڑی سعادت ہے جسے وہ مبدأ فیض عطا کرے۔ والسلام

پرویز

دیکم نومبر ۱۹۷۸ء)

۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور

کتبہ: سعید قطبی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

نظامِ ربوبیّت

پہلا باب

اسلام کیا ہے؟

اشیائے کائنات پر غور کیجئے۔ یہ شروع ہی سے ایسی نہیں تھیں جیسی آج نظر آ رہی ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، زمین، خشکی، تری، پہاڑ، صحرا، شروع میں کچھ اور تھے اور اس کے بعد نہ معلوم کتنے ارتقائی منازل طے کرتے اپنی موجودہ شکل تک پہنچے ہیں۔ ان جامد اور غیر ذی حیات اشیاء سے آگے بڑھئے اور اس دنیا میں پہنچئے جہاں زندگی مشہود انداز میں سامنے آتی ہے۔ وہاں بھی یہی کیفیت نظر آئے گی۔ علمائے نظریۂ ارتقاء (EVOLUTION THEORY) کا کہنا ہے کہ صفحۂ ارض پر ابتداء پانی سے ہوئی۔ پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جرثومۂ اوّلیں کو پیکر عطا ہوا۔ زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخ کی طرح مختلف سمتوں میں بڑھنے اور پھیلنے لگے۔ جراثیمِ حیات کے ان اولین پیکروں میں ہزارہا سال کے مراحل کے بعد، مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔ ان طویل المیعاد مراحل کو طے کر کے سلسلۂ تخلیق، حیوانی منزل تک پہنچا اور اس کے بعد لاتعداد مدارجِ نشو و ارتقاء کرتے کاروانِ حیات، مقامِ انسانیت میں داخل ہوا۔

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحرگاہی — ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ زم و گرما تپ و تراش و خراش — زخاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقام بست و کشاد و فشار و سوز و کشید — میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی
مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند (اقبالؒ)

کائنات کی ہر چیز کو اپنے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچنے کے لئے ہزاروں کروٹیں بدلنی پڑتی ہیں۔ اور یہ مراحل اس قدر طویل المیعاد ہوتے ہیں کہ کہیں ہزار ہزار سال میں ایک ایک مرحلہ طے ہوتا ہے اور کہیں پچاس پچاس ہزار سال میں۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۔ (۳۲/۵-۶)

اللہ اپنے امر (اسکیم) کی ابتدا آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ پھر وہ اسکیم (اپنے تدریجی مراحل طے کرتی ہوئی) اس کی طرف بلند ہوتی جاتی ہے، ایک ایک دن (منزل) میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ہزار ہزار سال ہوتی ہے[1] یہ سلسلۂ نشو و ارتقاء اس خدا کی طرف سے جاری و ساری ہے جو ہر شے کی موجودہ حالت سے بھی واقف ہے (شہادۃ) اور اس مقام سے بھی جہاں اس نے آخر الامر پہنچنا ہے اور جو ہنوز عام نگاہوں سے اوجھل ہے (غیب) اس کا قانون تبدّل و تحوّل بڑی قوتوں کا مالک ہے (العزیز) اور ہر شے کو وہ قالب (PATTERN) عطا کرتا ہے جس میں وہ اس طرح نشو و نما پاتی ہے جس طرح بچہ رحمِ مادر میں پرورش پاتا ہے۔ (الرحیم)

بیج کو درخت، قطرے کو گہر، اور خاک کے ذرّے کو انسان بننے کے لئے ان تدریجی مراحل میں سے گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ ان تدریجی مراحل میں ہوتا کیا ہے؟ اگر کسی بیج کو گھن کھا جاتے تو اسے ہزار تدریجی مراحل میں سے گزار دیجئے وہ کبھی درخت نہیں بنے گا۔ یا ببول کے بیج کو لاکھ ارتقائی منازل طے کرا دیجئے اس درخت میں کبھی انگور نہیں لگ سکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس بیج میں درخت بننے (بالیدگی اور نشو و نما) کی صلاحیت نہیں وہ کبھی درخت نہیں بن سکتا۔ جس درخت میں پھل لانے کی صلاحیت نہیں وہ کبھی بار آور نہیں ہوسکتا۔ اور جس شاخ میں جس قسم کا پھل لانے کی صلاحیت ہے اس میں اسی قسم

---

[1] دوسرے مقام پر ان تدریجی مراحلِ ارتقاء کو پچاس پچاس ہزار سال بھی بتایا گیا ہے۔ (۷۰/۴)

کا پھل لگے گا۔

سلسلۂ ارتقاء سے مقصود اب سوچئے کہ سلسلۂ ارتقاء (یا نشو و نما) کے تدریجی مراحل (جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) کرتے کیا ہیں؟ فقط یہ کہ یہ ان صلاحیتوں کو جو بیج کے اندر پوشیدہ ہوتی ہیں نشو و نما دے کر اس کی آخری شکل میں مشہود کر دیتے ہیں۔ لہٰذا، سلسلۂ ارتقاء کی تمام تگ و تاز سے مقصود یہ ہے کہ اشیائے کائنات کی مضمر صلاحیتیں (POTENTIALITIES) نشو و نما (DEVELOPMENT) پاکر اپنے نقطۂ تکمیل آخری منزل (DESTINATION) تک پہنچ جائیں۔ بالفاظِ دیگر سلسلۂ کائنات کی تمام ہنگامہ آرائیاں اشیائے کائنات کی مضمر صلاحیتوں کو مشہود کرنے کے لئے ہیں۔[1]

ربوبیت کے معنی عربی زبان میں اس پورے طریقِ عمل (PROCESS) کے لئے ایک جامع لفظ ہے ربوبیت۔ یعنی کسی شے کا اپنے نقطۂ آغاز سے بتدریج، آہستہ آہستہ نشو و نما پاکر نقطۂ تکمیل تک پہنچ جانا۔ اسی کو تربیت کہتے ہیں اور ایسا کرنے والے کو ربّ۔ لہٰذا، اگر ہم سابقہ بحث کو ایک فقرے میں سمٹانا چاہیں تو یوں کہا جائے گا کہ کائنات کی ساری تگ و تاز اور سعی و کاوش کا مقصود ہے ربوبیت۔ چونکہ قرآن کریم کی رو سے یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کی رُو سے ہو رہا ہے اس لئے اللہ کا قانون، ربوبیتِ عامہ (تمام اشیائے کائنات کی ربوبیت) کا کفیل ہے۔ ربّ العالمین کے یہی معنی ہیں اور اسی کی وجہ سے وہ درخورِ ہزار حمد و ستائش ہے۔ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) یعنی مستحق ہزار حمد و ستائش ہے اللہ کا وہ قانون جو تمام اشیائے کائنات کی ربوبیت کا کفیل ہے۔ ربوبیت کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کی ہر حرکت ٹھوس تعمیری نتیجہ پیدا کرے۔ اس بات کا ثبوت کہ بیج کی ربوبیت شروع ہو گئی ہے، صرف یہ ہے کہ بیج سے کونپل پھوٹ نکلے۔ کونپل ایک تعمیری (CONSTRUCTIVE) نتیجہ ہے جس سے اس امر کی شہادت بہم پہنچتی ہے کہ نظامِ ربوبیت نے اپنا عمل شروع کر دیا ہے۔ لیکن اگر بیج سے کونپل نہ پھوٹے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس عملِ تخم ریزی کا نتیجہ تعمیری کے بجائے تخریبی (DESTRUCTIVE) رہا۔ یعنی بیج کی ربوبیت شروع نہیں ہوئی اور اس طرح بیج کا درخت بننا تو ایک طرف، خود بیج بھی ضائع ہو گیا۔ (اسے قرآن کریم میں "خبیث" کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کی ضد "طیّب" ہے)۔

---

[1] FOR THE DEVELOPMENT AND MANIFESTATION OF THEIR LATENT FACULTIES.

حق اور باطل کا مفہوم قرآنِ کریم کی زبان میں ٹھوس تعمیری نتائج کو حق کہتے ہیں اور تخریبی نتائج کو باطل۔ چونکہ نظامِ ربوبیت کا قیام و بقا اس محکم اصول پہ ہے کہ اس میں ہر حرکت کا رُخ تعمیری نتائج (حق) کی طرف ہوتا ہے، اس لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ کائنات کو بالحق پیدا کیا گیا ہے۔

خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۔ (۲۹/۴۴)

اللہ نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو تعمیری نتائج کا حامل بنایا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لئے (بڑی اہم) نشانیاں ہیں جو (قانونِ ربوبیت) پر ایمان لاتے ہیں۔

پروفیسر وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ

باطل کے غیر محکم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں ایسا نظم پایا جاتا ہے جو حق پر مبنی ہے۔ (۱)

لیکن ربوبیت کے ان مثبت اور تعمیری نتائج (حق کے مشہود ہونے) کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ ان تمام عناصر (ELEMENTS) اور عوامل (FACTORS) میں جو کسی شے کی ربوبیت کا ذریعہ بنتے ہیں، باہمی تعاون ہو۔ مثلاً بیج کی بالیدگی کے لئے مٹی، پانی، سورج کی حرارت اور روشنی اور ہوا کی ضرورت ہے۔ لیکن آپ کسی بیج کو جو بالکل صحیح و سلامت ہو اور اس میں بالیدگی اور برومندی کی تمام صلاحیتیں موجود ہوں، کسی میز پر رکھ چھوڑیئے۔ اس کے پاس ہی (ایک دوسرے سے الگ) اِدھر اُدھر تھوڑی سی مٹی اور کچھ پانی رکھ دیجئے۔ ان سب کو دھوپ میں کھلا چھوڑ دیجئے اور ہوا بھی لگنے دیجئے۔ لیکن ان تمام اشیاء کی موجودگی کے بعد بھی اس بیج سے کونپل نہیں پھوٹے گی۔ بیج کی بالیدگی کے لئے ضروری ہے کہ بیج کے ساتھ مٹی۔ پانی۔ روشنی۔ حرارت۔ ہوا اس طرح تعاون کریں کہ وہ ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں۔ ان اجزاء کے اس قسم کے باہمی تعاون (CO-OPERATION) بلکہ استلاف (ABSORPTION) سے بیج کی مضمر صلاحیتوں کی ربوبیت ہو سکے گی۔ لہٰذا، کائنات کے نظامِ ربوبیت میں مختلف اجزائے متعلقہ کا باہمی تعاون و استلاف لاینفک ہے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور چیز بھی نہایت ضروری ہے۔ بیج کو مٹی میں دبانے کے بعد، بہت زیادہ پانی دے دیجئے یا تھوڑا سا پانی دے کر بہت زیادہ حرارت پہنچا دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس طرح بھی ربوبیت کے تعمیری نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ بیج کبھی کونپل بن کر بے نقاب نہیں ہوگا۔ گل سڑ کر ضائع ہو جائے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ تعمیری نتائج کی ترتیب و ظہور کے لئے ضروری ہے کہ مختلف اجزائے متعلقہ میں خاص تناسب و توازن (PROPORTION AND BALANCE) قائم رہے۔ جہاں یہ تناسب بگڑا، تعمیری کی جگہ تخریبی۔ مثبت

کی جگہ منفی نتائج برآمد ہونے شروع ہو گئے اور سلسلۂ ربوبیت رک گیا۔ قرآنِ کریم نے اس توازن و تناسب کو کہیں "حسنات" سے تعبیر کیا ہے[1] اور اس کے مقابلے میں عدمِ توازن کے لئے "سیآت" کا لفظ آیا ہے۔ کہیں اسے اعمالِ صالحہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی ایسے کام جن سے ہمواریاں پیدا ہوں اور صلاحیتیں ابھریں۔

توازن و تناسب

اس کے مقابلے میں فساد کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ناہمواری ہیں۔ کہیں اسے قوام سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معانی توازن کا صحیح ہونا اور قائم رہنا ہیں۔ اسی سے دینِ قیّم ہے۔ یعنی وہ نظام جو خود بھی تناسب و توازن کی صحت پر استوار ہو اور افرادِ معاشرہ کی صلاحیتوں میں بھی صحیح صحیح توازن قائم کر سکے۔ اسی سے صراطِ مستقیم ہے۔ یعنی توازن (EQUILIBRIUM) قائم رکھنے والی راہ۔ چونکہ ربوبیت کے لئے توازن کا قائم رہنا ضروری ہے اس لئے قرآنِ کریم میں ہے۔

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ (۱۱/۵۶)

یعنی اللہ کا قانونِ ربوبیت توازن بدوش سیدھی راہ پہ جا رہا ہے[2]۔ اور جو معاشرہ اس قانون کا اتباع کریگا اس میں بھی توازن قائم ہو جائے گا۔

یونانی مفکرین کا خیال تھا کہ کائنات کی حرکت دوری (CYCLIC) ہے یعنی اس میں حرکت تو ہے لیکن اس حرکت سے کائنات آگے نہیں بڑھ رہی بلکہ ایک دائرہ میں گردش کرتی رہتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کائنات نے جو کچھ بننا تھا بن چکی۔ اب اس میں نہ کسی قسم کا اضافہ ہو سکتا ہے نہ ترقی۔ اس کی حرکت محض محوری حرکت ہے جس میں آگے بڑھنے کا امکان ہی نہیں ہوتا۔ ایک ہی جگہ گھومنے کا تصور ہوتا ہے۔ یہ تصور ارتقاء کے تصور کے خلاف تھا۔ قرآنِ کریم نے کائنات کی حرکت کو صراطِ مستقیم قرار دے کر یہ بتا دیا کہ اس کی حرکت دوری نہیں بلکہ آگے بڑھنے والی (LINEAR) ہے۔ اس لئے کائنات کی ہر شے ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھے جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ

کائنات میں ارتقاء

کائنات صرف ایک ہموار راستہ پر ہی نہیں جا رہی بلکہ وہ راہ سیدھی بھی ہے اور بلندیوں کی طرف لے جانے والی بھی۔ اسی لئے اللہ کو ذِی الْمَعَارِج (۷۰/۳) کہا گیا ہے۔ (معارج کے معنی ہیں بلندیوں کی طرف

---

[1] "حسن" صحیح تناسب (JUST PROROR TION) ہی کا نام ہے۔

[2] قرآن میں قسطاس مستقیم "ترازو کو کہا گیا ہے جو ٹھیک ٹھیک وزن قائم رکھتی ہے۔ اس لئے صراط مستقیم کے معنی "توازن بدوش" راہ ہیں۔

لے جانے والی سیڑھیاں، لہٰذا، قانونِ ربوبیت کی رُو سے کائنات کی ہر شے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور بلندیوں کی طرف اُبھرتی چلی جاتی ہے۔ اس میں جو تخلیقی اعادے ہوتے ہیں وہ بھی آخرالامر اس کی تکمیل کے لئے ہوتے ہیں۔ سورۂ سجدہ کی اس آیت کو سامنے لائیے جو پہلے درج کی جا چکی ہے حقیقت واضح ہو جائے گی۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ۔ اللہ اپنی اسکیم کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ یعنی اس شے کا آغاز خدا کے متعین فرمودہ نقشے کے مطابق پست ترین نقطہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ قانونِ ربوبیت کے مطابق اوپر کی طرف ابھرنی شروع ہوتی ہے۔ " ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ " اس کا عروج اس کی طرف ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ فاطر میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ ۔ ہر خوشگوار نظریۂ حیات قانونِ ربوبیت کے مطابق اُس کی طرف بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ۔ (۳۵/۱۰) اور اس کی یہ بلند پروازی عملِ صالح کے سہارے پر ہوتی ہے۔ یعنی قانونِ ربوبیت کے مطابق ہر شے ہمواریاں اور توازن پیدا کرنے والے پروگرام کے مطابق ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے نقطۂ تکمیل کی طرف عروج کرتی چلی جاتی ہے۔ اس طریق (PROCESS) کو صراطِ مستقیم پر گامزن رہنا کہا جاتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز اپنے نقطۂ آغاز سے نقطۂ تکمیل تک پہنچے گی تو وہ نقطۂ تکمیل اس کے سفرِ زندگی کی منزلِ مقصود یا منتہیٰ (DESTINATION) کہلائے گا۔[1] لہٰذا، قانونِ ربوبیت کی رو سے ہر شے کے لئے ایک منزلِ مقصود یا منتہیٰ کا ہونا ضروری ہے۔[2] اور چونکہ (جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں) پوری کی پوری کائنات نظامِ ربوبیت

---

[1] اسی کو (DESTINY) یا اس شے کی "تقدیر" کہا جائے گا۔

[2] آپ غور کیجئے کہ ترقی (PROGRESS) کے لئے کون کون سے عناصر ضروری ہیں۔

(i) کسی شے کا نقطۂ آغاز۔ (ii) ایک متعین راہ جس پر اسے چلنا ہے۔

(iii) وہ منزلِ مقصود جس تک اسے پہنچنا ہے۔

ترقی کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ شے قدم بہ قدم اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھے جا رہی ہے۔ لیکن اگر کسی راہرو کے سامنے منزلِ مقصود ہی نہ ہو تو وہ (خواہ دن بھر چلتا رہے) ہم یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ وہ ترقی کر رہا ہے۔ ترقی کا لفظ بے معنی ہوتا ہے جب تک منزلِ مقصود سامنے نہ ہو۔ ہم اپنے زمانے کو (PROGRESSIVE AGE) کہتے ہیں۔ لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں کہ وہ منزلِ مقصود کونسی ہے جس کی طرف ہمارا زمانہ ترقی کرتے ہوئے جا رہا ہے۔ ترقی (PROGRESS) بغیر تعینِ مقصود (WITHOUT OBJECT IN VEIW) بے معنی لفظ ہے۔

کے تابع چل رہی ہے۔ اس لئے ساری کائنات کا ایک مقصد یا منتہیٰ ہے۔ بالفاظِ دیگر کائنات بلا مقصود و منتہیٰ پیدا نہیں کی گئی۔ یہ حقیقت کہ کائنات بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی بلکہ یہ ایک بلند مقصد کی طرف بڑھتے جا رہی ہے، دورِ حاضر کے مفکرین کے نزدیک بھی ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ مثلاً (LESLI PAUL) لکھتا ہے کہ:

> یہ بات بڑی غیر معقول دکھائی دیتی ہے کہ ایک طرف تو یہ تسلیم کر لیا جائے کہ زندگی (DYNAMIC) ہے اور ایک خاص سمت میں حرکت کر رہی ہے تاکہ وہ باقی رہے اور آگے بڑھے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ کہا جائے کہ زندگی کے پیشِ نظر کوئی مقصد نہیں۔ اگر مقصد نہیں تو پھر زندگی کی حرکت کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہتا۔ (۲)

اور مانچسٹر یونیورسٹی کا اناٹومی کا پروفیسر (F. W. JONES) رقمطراز ہے کہ:

> اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمام ذی حیات اشیاء اور غیر ذی حیات اشیاء غرضیکہ پوری کی پوری کائنات بامقصد پیدا کی گئی ہے .... تاریخ کے جس دور میں سے ہم گذر رہے ہیں اس میں یہ احساس اور بھی شدید ہو گیا کہ کائنات کا یہ تمام عظیم القدر سلسلہ ایک مقصد کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ (۳)

قرآن کریم نے ایک طرف تو مثبت انداز میں یہ کہا کہ کائنات بالمقصد پیدا کی گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف منفی انداز میں یہ کہا کہ اسے یونہی بطور لہو ولعب پیدا نہیں کیا گیا۔ جو چیز حرکت تو کرے لیکن کسی منزلِ مقصود کی طرف نہ بڑھے (جیسے گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی) عربی میں اس کے اس انداز کو لعب کہتے ہیں۔ چونکہ کائنات

لہو و لعب

بلا مقصود و منتہیٰ پیدا نہیں کی گئی اس لئے قرآنِ کریم میں ہے کہ

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۴۴/۳۸-۳۹)

اور ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے (یعنی پوری کی پوری کائنات کو) بلا مقصد و منزل (لٰعبین) نہیں پیدا کیا۔ کائنات کو بالحق (یعنی تعمیری نتائج کے ساتھ ایک منزل تک پہنچنے کے لئے) پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے (اور بلا علم و دلیل، سمجھتے ہیں کہ کائنات یونہی بلا مقصد منزل ظہور میں آگئی ہے)۔

ماحصلِ بحث

سابقہ تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآنِ کریم کی رُو سے:

(۱) کائنات کی ہر شے اپنے اندر کچھ صلاحیتیں رکھتی ہے۔

(۲) ہر شے کا مقصدِ زندگی یہ ہے کہ اس کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پا کر تکمیل تک پہنچ جائیں۔

(۳) جس نہج و اسلوب یا نظام و قانون کے مطابق کسی شے کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاکر آہستہ آہستہ بتدریج اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائیں، اسے نظامِ ربوبیت کہتے ہیں۔ اور ایسا کرنے والے کو رب۔

(۴) ربوبیت کے لئے ضروری ہے کہ اس شے کی ہر حرکت کا رُخ تعمیری نتائج مرتب کرنے کی طرف ہو۔ کیونکہ تعمیری نتائج کے بغیر ربوبیت ناممکن ہے۔ تعمیری نتائج کو حق کہا جاتا ہے۔ اس لئے کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے۔

(۵) نظامِ ربوبیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف اجزائے کائنات، باہمی تعاون و ائتلاف سے ایک دوسرے کی ربوبیت کا ذریعہ بنیں۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ان اجزاء میں ایک خاص تناسب اور توازن ہو۔ ان اجزاء کے الگ الگ رہنے (انفرادی زندگی بسر کرنے) یا اُن کا توازن بگڑ جانے سے ربوبیت نہیں ہو سکتی۔ وہ توازن بدوش راہ جس پر چل کر اشیائے کائنات ربوبیت کی منازل طے کرتی ہیں، صراطِ مستقیم کہلاتی ہے اور جس طریقِ کار سے انہیں ربوبیت حاصل ہوتی ہے اسے حسنِ عمل یا عملِ صالح کہا جاتا ہے۔

(۶) ربوبیت کی راہ (یعنی اشیائے کائنات کے ارتقائی منازل کی راہ) سیدھی بھی ہے اور بلندیوں کی طرف چڑھتی ہوئی بھی۔ اس لئے حسنِ عمل کا نتیجہ آگے بڑھنا اور سربلند ہونا ہے۔

(۷) ربوبیت میں ہر شے کے لئے ایک نقطۂ تکمیل کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی وہ منزل جس میں پہنچ کر اس چیز کی تمام مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جائے۔ یہی اس شے کا مقصود و منتہیٰ ہوگا۔ چونکہ ساری کائنات نظامِ ربوبیت کے تابع سرگرمِ عمل ہے اس لئے کائنات بلا مقصد و منزل نہیں پیدا کی گئی۔ اس کی ایک منزل ہے، اور ایک منتہیٰ۔

(۰)

ہم نے یہ دیکھ لیا کہ کائنات کی سعی و عمل اور تگ و تاز کا مقصود یہ ہے کہ اشیائے کائنات کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے تاکہ یہ چیزیں (اس طرح) اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائیں کائنات کی ہر شے اسی تگ و تاز میں سرگرمِ عمل دکھائی دیتی ہے۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے اور سائنس کے انکشافات اس کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنی اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے ان چیزوں کی راہنمائی کون کرتا ہے، وہ کس ذریعے سے پہچانتی ہیں کہ ان کی منزل کا رُخ کس طرف ہے۔ اور اس کے حصول کے لئے انہیں کیا کرنا چاہیئے؟ اس سوال کے جواب کے لئے آپ بڑی بڑی چیزوں (اجرامِ سماوی وغیرہ) کو چھوڑ دیئے اور اپنے گرد و پیش

کی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر غور کیجئے، بات ابھر کر سامنے آجائے گی۔ آپ کسی مرغی کے نیچے بط اور مرغی کے ملے جلے انڈے سینے کے لئے رکھ دیجئے۔ جب وقتِ معینہ پر ان انڈوں سے بچے نکلیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ انڈے کا خول توڑتے ہی بط کا بچہ پانی کی طرف لپکے گا لیکن مرغی کا چوزہ خشکی پر رہے گا۔ یہ زمین سے دانہ دنکا چُننے لگ جائے گا اور وہ اپنا سامانِ پرورش پانی سے تلاش کرے گا۔ بلّی کا بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے تھنوں کی طرف جائے گا۔ بکری کے سامنے ڈھیروں گوشت رکھا رہے وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ اس کے برعکس شیر بھوکوں مر جائے گا لیکن گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں چبائے گا۔ مرغی کا چوزہ چیل کی پرچھائیں سے سہم کر ماں کے پروں کے نیچے چھپ جائے گا اور بلّی کا بچہ اُچھل کر چوہیا دبوچنے کی کوشش کرے گا۔ آپ غور کیجئے کہ وہ کون ہے جو ان پرندوں اور جانوروں کی راہ نمائی اُن کے سامان و اندازِ ربوبیت (پرورش) کی طرف کرتا ہے؟ انہیں اس کی تعلیم کون دیتا ہے؟ آپ اس کا ایک ہی جواب دیں گے کہ یہ سب کچھ ان کی فطرت میں داخل ہے۔ سائنس کی دنیا میں اس کا نام جبلت (INSTINCT) ہے۔ ان پرندوں اور جانوروں سے یہ کام از خود جبلی طور پر (INSTINC-TIVELY) سرزد ہوتے ہیں۔ حیوانات سے ہٹ کر آپ دوسری چیزوں کو دیکھئے۔ پانی جب تک سیّال ہے نشیب کی طرف بہتا ہے۔ ایک خاص درجہ برودت پر پہنچ کر منجمد ہو جاتا ہے اور ایک خاص درجہ حرارت پر بھاپ بن کر اُڑنے لگتا ہے۔ آگ ہمیشہ حرارت پہنچاتی ہے۔ آم کی گٹھلی سے ہمیشہ آم ہی پیدا ہوتا ہے۔ اشیائے کائنات کی ان خاصیتوں کو دنیائے سائنس میں قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے لیکن جبلت (INSTINCT) ہو یا قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) یہ سب الفاظ ہیں جو ہم نے باہمی سمجھوتے سے وضع کر رکھے ہیں تاکہ ایک دوسرے کا مفہوم سمجھنے میں آسانی رہے۔ ورنہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان اشیاء کے اندر یہ خاصیتیں کیوں ہیں؟ اور کون ہے جو ان پرندوں اور جانوروں پر ان کی پرورش کی راہیں کشادہ کرتا ہے؟ ہم صرف اسی قدر کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کے اندر (INHERENT) از خود موجود ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے وہی ان کے سامانِ ربوبیت کی طرف ان کی راہ نمائی کرتا ہے۔ تخلیق اور ھدایت (پیدا کرنا اور راہنمائی کرنا) دونوں خدا کی طرف سے ہیں۔

حیوانی جبلت

تخلیق و ھدایت خدا کی طرف سے

رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔ (۲۰/۵۰)

خدا وہ ہے جو ہر شے کو اس کی خلقت عطا کرتا ہے اور اس کے بعد اس کی راہ نمائی کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی۔ (۸۷/۳-۲)

وہ خدا جس نے (ہرشے کو) پیدا کیا اور اسے ہرطرح کی موزونیت عطا کر دی۔ پھر (اس کی مضمر صلاحیتوں کے) پیمانے مقرر کر دیئے (کہ وہ کس حد تک برومند ہو سکتی ہیں) اور پھر (ان کی ربوبیت کی) راہ نمائی کر دی۔

نظریہ فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کا مؤید (بلکہ ایک معنی میں موجد) پروفیسر لائڈ مارگن (C. LLOYD MORGAN) لکھتا ہے کہ۔

میرا عقیدہ ہے کہ جاندار وں میں ارتقاء نفس خدا کے عمل تخلیق اور ہدایت کا رہین منت ہے۔ (۴)

خدا کی یہ راہ نمائی (ہدایت) مختلف اشیاء کی کائنات میں کس طرح کارفرما ہے، قرآن کریم نے اسے وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ وحی کے معنی ہیں "نہایت خفیف لیکن بہت تیز اشارہ"۔ قرآن کریم میں ہے کہ خدا کی یہ راہ نمائی (وحی) تمام کائنات میں کارفرما ہے۔

کائنات میں وحی

وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا۔ (۴۱/۱۲)

اور خدا نے ہر ایک آسمان (سماء۔ بلندی) میں اپنے امر (تدبیر) کو وحی کر دیا۔

ارض کے متعلق ہے۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰی لَهَا۔ (۹۹/۵)

یہ اس لئے کہ تیرے رب نے اسے ایسا کرنے کی وحی کر رکھی ہے۔

اسی طرح شہد کی مکھی کے متعلق ہے کہ:۔

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ۔ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (۱۶/۶۸-۶۹)

اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کر دی کہ پہاڑوں میں، درختوں پر اور ان ٹٹیوں پر جو اس غرض سے بلندی پر بنائی جاتی ہیں اپنا چھتہ بناتے۔ پھر ہرطرح کے پھولوں سے رس چوستی پھرے اور اپنے رب کے قانون کے مطابق پوری فرمانبرداری کے ساتھ مصروفِ عمل ہو جاتے۔ (اس عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ) اس کے پیٹ سے مختلف اقسام کا رس نکلتا ہے جس میں انسان کے لئے شفا ہے۔ بلاشبہ ان کوائف میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں،

دلیلِ راہ ہے۔

ان آیات میں وحی (خدا کی راہ نمائی کی صفت) کے علاوہ ایک اور اہم حقیقت بھی سامنے آگئی۔ کائنات کی ہر شے اس قانون (ہدایت) کے مطابق جو اس کے لئے تجویز کر دیا گیا ہے، نہایت حزم و احتیاط اور کمال مستعدی اور فرماں پذیری کے ساتھ مصروفِ عمل ہے۔ آسمان کے عظیم الجثہ اور مہیب کرّے، چاند، سورج، ستارے، زمین اور اس کے آسمان بوس پہاڑ، تلاطم انگیز سمندر اور دریا، دوسری طرف چھوٹے سے چھوٹے زندگی کے خلیات (LIFE-CELLS) اور فضا میں پھیلے ہوئے غیر مرئی جراثیم غرضیکہ ہر شے اپنے اپنے قانونِ ربوبیت کی فرمانبرداری میں منہمک ہے۔ کسی کو اس سے یارائے سرکشی نہیں، مجالِ انکار نہیں۔ اگر سورج اپنی رفتار میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے برابر بھی کمی بیشی

کائنات میں اتباعِ قانون

کر دے۔ اگر زمین اپنے راستے سے ایک انچ کے کروڑویں حصے کے برابر بھی ہٹ جائے۔ اگر پانی ایک ثانیہ کے لئے بھی اپنی "فطرت" بدل لے۔ اگر ہوا ایک لمحہ کے لئے بھی اپنا رُخ آپ متعین کر لے۔ تو کائنات کی یہ تمام محیّر العقول کارگہ "نظم و ضبط" فضا کی پہنائیوں میں بھک سے اُڑ جائے۔ یہ تمام نظم و ضبط صرف اس لئے قائم ہے کہ کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کے سامنے سربسجود ہے:۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ (۱۳/۱۵)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے قانون کے سامنے سجدہ ریز ہے۔

ہر شے اس کے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور اپنے اپنے فرائضِ مفوضہ کی انجام دہی میں سرگرمِ عمل ہے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ (۵۷/۱)

کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرمِ عمل ہے۔

ہر شے اپنی تمام قوتوں کو ان مقاصد کے حصول کے لئے صرف کرتی ہے جو اس کے لئے متعین کر دیئے گئے ہیں۔ كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ۔

اسلام کا مفہوم

قانونِ خداوندی کی اس طرح اطاعت کا نام اسلام ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۔ (۳/۸۲)

کائنات کی ہر شے اس کے قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہے۔ طوعاً و کرہاً۔ اور ان اشیاء کی تمام حرکتیں اسی

محور کے گرد گردش کرتی ہیں۔

اس سے اُس "اسلام" کے معنی سامنے آ گئے جو آفاقی کائنات میں نافذ العمل ہے۔ یعنی اس قانون اور نظام کی اطاعت جس سے ہر شے کی مضمر صلاحیتیں نشو و نما پا کر نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائیں۔ سَلام کے معنی ہیں نقائص اور نامکملیت سے بری ہونا۔ مُسلَّم مکمل کو کہتے ہیں جس میں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ اِسْتَسْلَمَ الزَّرْعُ کے معنی ہیں کھیتی کا اس حد تک نشو و نما پا جانا کہ اس میں بال آ جائیں۔ (اس سے نشو و نما کی تکمیل کا مقصد سامنے آ جاتا ہے) تَسَالَمَتِ الْخَيْلُ کے معنی ہیں گھوڑوں کا آپس میں اس طرح پاؤں ملا کر چلنا کہ کوئی آگے پیچھے نہ رہے اور ایک دوسرے کو مشتعل نہ کرے (اس سے باہمی ائتلاف کا تصور سامنے آ جاتا ہے جو ربوبیت کے لئے نہایت ضروری ہے)۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ گئی کہ

(۱) اسلام کے معنی ہیں اس نظام کا قیام اور تکمیل جس میں ہر شے کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشو و نما ہو جائے۔

(۲) کائنات کی تمام اشیاء اس نظام کے قیام و تکمیل کے لئے بلاچون وچرا سرگرمِ عمل ہیں۔ اسی کا نام صراطِ مستقیم پر چلنا ہے۔

(٠)

ہم نے اس وقت تک صرف "اشیائے کائنات" کا ذکر کیا ہے۔ انسان کا ذکر نہیں کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان بھی کائنات کا ایک جزو ہے۔ لیکن اس میں اور دیگر اشیائے کائنات میں ایک ایسا بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے یہ کائنات میں ہوتے ہوئے بھی کائنات سے الگ ہے۔ یہ بنیادی فرق ہے اس کا اختیار و ارادہ۔ ہم نے دیکھا ہے کہ کائنات کی ہر شے قانونِ خداوندی کے اتباع و اطاعت میں بلاچون وچرا سرگرمِ عمل ہے۔

انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں فرق

ان میں سے کسی کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ اس قانون سے ذرا بھی سرکشی اختیار کر سکے یا اپنے لئے کوئی دوسرا قانون تجویز کر لے۔ پانی کو یہ اختیار نہیں کہ جی چاہے تو نشیب کی طرف بہے اور جی چاہے تو فراز کی طرف رخ کر لے۔ آگ کو اس کا اختیار نہیں کہ کبھی حرارت پہنچائے اور کبھی ٹھنڈک کا موجب بن جائے۔ سورج کو اس کا اختیار نہیں کہ کسی دن جی میں آئے تو آدھا سفر کر کے پھر پیچھے لوٹ جائے۔ زمین کو یہ اختیار نہیں کہ کبھی تھوڑے سے وقت کے لئے ستانے کو ٹھہر جائے۔ مرغی کے چوزے کو یہ اختیار نہیں کہ وہ خشکی کے بجائے پانی میں جا گھسے۔ بکری کو یہ اختیار نہیں کہ وہ گھاس

کی بجائے گوشت کھانا شروع کر دے۔ حتیٰ کہ شیر جیسے صاحبِ قوت و دبدبہ شاہِ نیستاں کو بھی اتنا اختیار نہیں کہ وہ گوشت کے بجائے سیب اور انگور کھانا شروع کر دے۔ لیکن اس کے برعکس، انسان کے بچے کو دیکھئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی وہ بھی اپنے رزق کے سرچشموں کی طرف اُسی طرح لپک کر جاتا ہے جس طرح ایک بکری کا بچہ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی کو بھی اسی بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح مصری کے ٹکڑے کو۔ وہ کبھی آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے کبھی پانی میں کود پڑتا ہے۔ کبھی آنکھوں پر مرچیں لگا لیتا ہے کبھی صابن کھا لیتا ہے۔ یہ تو اس کے بچپن کی کیفیت ہے۔ بڑا ہو جاتا ہے تو اس کا اختیار و ارادہ اور گُل کھلاتا ہے۔ جہاں تک اس کی جسمانی پرورش کا تعلق ہے اس کے لئے بھی وہی قوانین وضوابط مقرر ہیں جو دوسرے حیوانات کے لئے متعین ہیں۔ بھوک کے لئے کھانا، پیاس کے لئے پانی، تکان کے بعد نیند۔ اسی سے اس کے جسم کی پرورش (ربوبیت) ہوتی ہے۔ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) کا جذبہ ہر ذی حیات کی جبلّت میں موجود ہے۔ یہی جذبہ انسان کے اندر بھی ہے۔ یہ بھی اپنی جان کی حفاظت کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انسان ایک ایسی چیز بھی کر سکتا ہے جو کوئی دوسرا حیوان نہیں کر سکتا۔ یعنی خودکشی۔ یہ اس لئے کہ حیوانات، قانونِ ربوبیت پر کاربند رہنے کے لئے مجبور ہیں اور انسان صاحبِ اختیار ہے۔ جی چاہے تو قانونِ ربوبیت کی اطاعت کرے اور جی چاہے تو اسے توڑ دے۔ شٹین کے الفاظ میں:۔

> جمادات اور حیوانات کی زندگی کا مقصد خدا کی طرف سے عاید کردہ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ ایک متعین پروگرام پر چلنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس انسان اپنے اختیار و ارادہ کی بنا پر اپنا مقصد اور نصب العین آپ متعین کرنے پر قادر ہے۔ (۵)

اس کا یہی اختیار ہے جس نے اس مسئلہ کو جو باقی کائنات میں کوئی مسئلہ ہی نہیں اس کے لئے مشکل ترین مسئلہ بنا دیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ذرا آگے چل کر بیان کی جائے گی کہ وہ سوال (یعنی مسئلہ ربوبیت) جو باقی کائنات میں اس قدر سادہ اور آسان تھا، انسان کی دنیا میں اس قدر مشکل اور پیچیدہ کیسے بن گیا کہ اس کی ساری تگ و تاز اسی مسئلہ کے حل کی نذر ہو گئی۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ جس مسلک و منہاج پر دیگر کائنات کا کاروبارِ ربوبیت چل رہا ہے انسان کی دنیا میں پہنچ کر وہ مسلک و منہاج بالکل بدل جاتا ہے۔ باقی کائنات میں ہر شے کے اندر وہ قانون از خود موجود ہے جس کی رُو سے اُس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکتی ہے اور ہر شے اس قانون کی اطاعت پر مجبور ہے۔ اس کے برعکس انسان کا قانونِ ربوبیت (یعنی وہ قانون جس کی رو سے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو گی) نہ تو خود اس کے

اندر موجود ہے[1] اور نہ ہی یہ اُس کی اطاعت پر مجبور پیدا کیا گیا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب

(۱) ہر شے کی ہدایت (راہ نمائی) کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا۔

(۲) باقی اشیائے کائنات میں یہ راہ نمائی ان چیزوں کے اندر رکھ دی گئی۔

(۳) اور انسان کے اندر یہ ہدایت نہیں رکھی گئی۔

تو پھر انسان کو ہدایت کیسے ملے گی؟ انسان کو یہ ہدایت (راہ نمائی) بھی خدا ہی کی طرف سے ملے گی لیکن اس کا طریق مختلف ہوگا۔ باقی اشیائے کائنات کی صورت میں، ہدایت کی وحی، ہر شے کے اندر از خود رکھ دی گئی ہے لیکن انسان کی صورت

انسان کے لئے ھدایت

میں، یہ وحی خدا کے فرستادہ بندوں کی وساطت سے ملتی ہے جنہیں رسول کہا جاتا ہے۔ یہی وہ ھدایت ہے جس کے متعلق اولادِ آدم (نوعِ انسان) سے کہا گیا کہ:-

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (۲/۳۸)

اور یاد رکھو! ہماری طرف سے تمہارے پاس ھدایت آئے گی۔ سو جو لوگ اس ھدایت کا اتباع کریں گے، انھیں نہ خوف ہوگا نہ حزن۔

دوسری جگہ ہے:-

اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (۷/۳۵)

---

[1] یہ تصور کہ نیکی اور بدی کی تمیز، خیر و شر کی تفریق، حق و باطل کا امتیاز خود انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے، صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں۔ فطرت مجبور اشیاء کی ہوتی ہے۔ جسے اختیار و ارادہ حاصل ہو اس کی کوئی فطرت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے فیصلوں سے اپنے لئے راہِ عمل اختیار کرتا ہے، کسی خاص راہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں ہوتا۔ انسان کے اندر مختلف قسم کی صلاحیتیں ہیں جن کی نشو و نما اور صحیح استعمال اس کا مقصودِ زندگی ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب "سلیم کے نام خطوط" یا "ابلیس و آدم" میں ملے گی)

جب ایسا ہوگا کہ تمہارے پاس تم میں سے پیغامبر آئیں گے جو ہمارے پیغامات تم تک پہنچائیں گے۔ سو جو لوگ اس ہدایت کی نگہداشت کریں گے اور صلاحیت بخش روش اختیار کریں گے تو انہیں نہ خوف ہوگا نہ حزن۔

لہٰذا باقی کائنات اور انسان میں پہلا فرق یہ ہے کہ دیگر اشیائے کائنات کی صورت میں ہدایتِ خداوندی (وحی) ہر شے کے اندر ودیعت کرکے رکھ دی گئی ہے۔ لیکن انسان کی صورت میں یہ ہدایت (وحی) ان ہی میں سے منتخب کردہ پیغامبروں کی وساطت سے ملتی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ دیگر اشیائے کائنات، قانونِ ربوبیت کی اطاعت پر مجبور ہیں۔ اس کے برعکس انسان کو ربوبیت کا راستہ دکھا دیا گیا ہے اور اس کے بعد یہ اس کے اختیار پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہے ربوبیت کی صحیح راہ اختیار کرے اور چاہے دوسری راہ پر چل نکلے۔

وَهَدَيْنَٰهُ ٱلنَّجْدَيْنِ۔ (۹۰/۱۰)

"ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں"

دوسری جگہ ہے:۔

إِنَّا هَدَيْنَٰهُ ٱلسَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا۔ (۷۶/۳)

ہم نے صحیح راستہ دکھا دیا ہے۔ اب چاہے وہ اس راہ کو اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔

قانونِ ربوبیت عطا کرنے والے (خدا) کی طرف سے انسان کو تعمیری نتائج پیدا کرنے والا نظام دے دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس پر کوئی زبردستی نہیں کی گئی۔ اگر اس کا جی چاہے تو اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے اور چاہے تو اسے چھوڑ کر دوسرا نظام اختیار کرلے۔

وَقُلِ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (۱۸/۲۹)

ان سے کہہ دو کہ ربوبیت کا قانون دینے والے کی طرف سے تعمیری نتائج کا ضامن نظامِ حیات (الحق) آچکا ہے۔

اب جس کا جی چاہے اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

یہ ہے دوسرا فرق انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ

(۱) جہاں تک مقصود و منتہیٰ کا تعلق ہے انسان اور دیگر اشیائے کائنات کے لئے ایک ہی نصب العین متعین کیا گیا ہے۔ یعنی ہر شے (اور انسانوں کی دنیا میں ہر فردِ انسانیہ) کی مضمر صلاحیتوں کی مکمل نشوونما۔ اسے ربوبیت کہتے ہیں۔

(ii) اس مقصد کے حصول کے لئے خدا کی طرف سے راہ نمائی ملتی ہے۔ اشیائے کائنات میں یہ راہ نمائی از خود موجود ہوتی ہے اور انسانوں کو خارجی طریق (اللہ کے رسولوں کی وساطت) سے ملتی ہے۔

(iii) اس ہدایت کے مطابق ربوبیت کی تکمیل کا نام اسلام ہے۔

(iv) دیگر اشیائے کائنات، اسلام کو از خود (مجبورًا) اختیار کئے ہوتے ہیں۔ لیکن انسان کو یہ مسلک (نظامِ ربوبیت) اپنے اختیار و ارادہ سے اختیار کرنا ہوگا۔ بس یہ فرق ہے انسان اور دیگر کائنات میں۔ یعنی دونوں کے سامنے نصب العین ایک ہے اور اس نصب العین کے حصول کا ذریعہ بھی ایک۔ لیکن اشیائے کائنات اس ذریعہ کو مجبورًا اختیار کئے ہوتے ہیں اور انسان کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس نظام کو اپنی مرضی سے اختیار کرے۔ سورۂ آلِ عمران میں اس حقیقت کو نہایت واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے جب کہا کہ

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ - (۳/۸۳)

کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس نظام کے سوا جو خدا نے مقرر کیا ہے کوئی دوسرا نظام اختیار کرلیں۔ حالانکہ (یہ حقیقت ان کے سامنے بے نقاب ہے کہ) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی ہر شے اسی نظام کو طوعًا و کرہًا اختیار کئے ہوتے ہے اور ان کی ہر حرکت اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے۔

یعنی ساری کائنات اس مسلک اور نظام (دین) کو اختیار کئے ہوتے ہے جو اسے ربوبیت کے حصول کے لئے دیا گیا ہے۔ انسان بھی اسی کائنات کا ایک جزو ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اسے بھی وہی نظام اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ بات بالکل واضح اور بصیرت پر مبنی ہے، اس لئے عقل و دانش کا یہی تقاضا ہونا چاہیئے۔ یہ نظام وہ ہے جو حضرات انبیائے کرام کی وساطت سے نوعِ انسانی کو دیا جاتا رہا۔ اس لئے ہر صاحبِ فہم و بصیرت انسان کو یہی نظام اختیار کرنا چاہیئے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ - (۳/۸۴)

ان سے کہہ دو کہ ہم اسی نظام کو اپنا نصب العین بناتے ہیں جو ہماری ربوبیت کے ضامن (خدا) کی طرف سے ہمیں ملا ہے اور جو اس سے پہلے ابراہیم۔ اسمٰعیل۔ اسحاق۔ یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل کیا گیا تھا۔ اور جو موسیٰ۔ عیسیٰ اور دیگر انبیاء کی وساطت سے انسانوں کو ملا۔ (یہ ایک ہی نظام تھا جو شروع سے آخر تک انسانوں کو ملتا رہا۔ اس لئے ہم) اس

نظام کے لانیوالوں میں باہم دگر کوئی فرق نہیں کرتے۔ ہم اسی نظام کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں۔

اِسلام اس کا نام اسلام ہے یعنی ربوبیت کی تکمیل کا وہ ضابطہ جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے اور جس کی اطاعت میں خود نوعِ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا راز مربستہ ہے۔ لہٰذا، اس نظام کے علاوہ کوئی اور نظام ایسا نہیں ہوسکتا جو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکے۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (۳/۸۵)

جوشخص اس ضابطہ (اسلام) کے علاوہ کسی اور ضابطہ کو اپنا نظام بنائے۔ وہ نظام قابلِ قبول نہیں ہوگا (کیونکہ وہ ربوبیت کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتا)۔ جوشخص کسی دوسرے نظام کو اختیار کرے گا وہ (ابتداءً کیسا ہی خوش آیند کیوں نہ ہو) آخرالامر نظر آجائے گا کہ اس کا نتیجہ خسارہ ہی رہا۔

(٥)

خلاصہ مبحث اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ:

اسلام اس نظامِ زندگی کا نام ہے جس میں ہر شے کی مضمر صلاحیتیں پوری نشوونما پاکر اپنے نقطۂ تکمیل تک جا پہنچتی ہیں۔ کائنات اس نظام کو ازخود اختیار کئے ہوتے ہے۔ لیکن انسان نے یہ نظام اپنے اختیار و ارادہ سے اختیار کرنا ہے۔ یعنی خدا کا ایک ہی قانون ہے جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ انسان سے باہر خارجی کائنات میں یہ قانون ازخود نافذ العمل ہے لیکن انسان نے اس قانون کو اپنی مرضی سے اختیار کرنا ہے۔ لہٰذا، جہاں تک انسان کا تعلق ہے، اسلام کے معنی ہیں، انسانی معاشرہ کو قانونِ خداوندی کے مطابق متشکل کرنا۔ انسانوں کے لئے یہ کائناتی قانون وحی کے ذریعے ملتا ہے اور آج یہ وحی قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ بنابریں، اسلام کے معنی ہیں انسانی معاشرہ میں قرآن میں بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق خدا کے نظامِ ربوبیت کو قائم کرنا۔

P.36 - (1) Quoted by Aldous Huxley, in "Ends & Means" (P.301)
P.39 - (2) The Meaning Of Human Existence -p.72
(3) Design and Purpose. pp.77 & 82
P.42 - (4) The Great Design
P.45 - (5) Fulton Sheen - in "Philosophy of Religion" p.284

دوسرا باب

اِنسان کیا ہے ؟

ہم سابقہ باب میں دیکھ چکے ہیں کہ کائنات کی ہر شے کی تگ و تاز کا مقصد یہ ہے کہ اس کی مضمر صلاحیتیں پورے طور نشو و نما پا کر مقامِ تکمیل تک پہنچ جائیں۔ یہی مقصد انسانی زندگی کا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ انسان اس مقصد میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں اور اگر ہوا ہے تو کس حد تک۔ تو اس کے لئے ہمیں پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان کی مضمر صلاحیتیں (REALISABLE POTENTIALITIES) ہیں کیا؟ اس سلسلہ میں ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ خود انسان کیا ہے؟ اس باب میں دو نظریئے ہیں جو انسانی تاریخ میں شروع سے آج تک برابر چلے آ رہے ہیں۔ ایک نظریہ وہ ہے جسے میکانکی تصورِ حیات (MECHANICAL CONCEPT OF LIFE) کہا جاتا ہے۔ اسی نظریہ کو فلسفۂ مادیت (MATERIALISM) بھی کہتے ہیں۔ اس مقام پر اس کی ضرورت نہیں (اور نہ ہی اس

میکانکی نظریۂ حیات

کتاب کا یہ موضوع ہے) کہ یہ بتایا جائے کہ اس فلسفہ کی تاریخ کیا ہے اور اس میں یونانی مفکر دیمقریطس (DEMOCRITUS - B.C. 470) کے زمانے سے جو اس فلسفہ کا موجد تصور کیا جاتا ہے) آج تک کیا کیا تغیرات واقع ہوتے رہے ہیں[1]۔ اس وقت موضوع زیرِ بحث کے اعتبار سے صرف اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس نظریہ کی رو سے انسان کی زندگی، فقط طبعی زندگی

---

[1] ان امور کی تفصیل میری کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں ملے گی۔

(Physical Life) تک محدود سمجھی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسان سے مفہوم (دیگر حیوانات کی طرح) صرف اس کا جسم ہے۔ جسم کی مشین طبعی قوانین کے مطابق چل رہی ہے۔ جب یہ مشین چلتے چلتے رُک جائے گی تو انسان کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد اس مشین کے اجزا منتشر ہو جائیں گے اور یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ انسان، نہ گوشت، پوست، ہڈیوں، خون وغیرہ کے سوا کچھ اور ہے اور نہ ہی موت کے بعد اس کا کچھ باقی رہتا ہے۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ (۴۵ : ۲۴)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اسی میں ہم پیدا ہوتے اور مر جاتے ہیں اور ہماری موت زمانہ کی گردش سے واقع ہو جاتی ہے۔ ان کا یہ خیال علم پر مبنی نہیں محض ظن و قیاس کا اتباع ہے۔

چنانچہ فرائڈ کا قول ہے کہ:-

(۱)

"کاروانِ زندگی کا منتہیٰ موت ہے"

اس تصور کی رُو سے نہ تو کائنات کے سامنے کوئی مقصد ہے اور نہ ہی انسان کے لئے کوئی منزل۔

درنگاہش آدمی آب و گل است ‌ ‌ ‌ کاروانِ زندگی بے منزل است

لہٰذا، اس نظریہ کی رُو سے انسانی تگ و تاز کا مفہوم جسمِ انسانی کی پرورش (اور افزائشِ نسل) کے سوا اور کچھ نہیں یعنی ان کے نزدیک، ربوبیت سے مراد جسمِ انسانی کی پرورش ہے، اور بس۔ اس اعتبار سے، انسان اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہیں۔

اسی نظریہ کے مطابق کائنات کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ مادہ کے ذرّات اور توانائی (Energy) کسی نہ کسی طرح وجود میں آ گئے۔ اس کے بعد ان ذرّات اور توانائی میں اندھی فطرت کے قوانین کے تحت تغیّرات واقع ہونے شروع ہو گئے۔ ان ہی تغیّرات سے یہ سلسلۂ کائنات جاری ہے۔ جب توانائی کم ہو جائے گی تو ان ذرّات کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اور اس طرح یہ تمام سلسلۂ کائنات درہم برہم ہو کر فنا ہو جائے گا۔ لیکن نہ تو کائنات کے پیچھے کوئی ایسی اعلیٰ ہستی ہے جو اپنے حکیمانہ تدبّر سے اس سلسلہ کو چلا رہی ہے اور نہ ہی انسانوں سے اوپر کوئی ایسی ذات ہے جو سفرِ زندگی میں ان کی راہ نمائی کر سکتی ہے۔ انسانی راہنمائی کے لئے عقلِ انسانی کافی ہے۔ عقل کے سوا کوئی سرچشمۂ علم نہیں ہے اس لئے خدائی راہنمائی کے لئے (وحی) کا تصور بھی باطل ہے۔ چنانچہ لینن کہتا ہے کہ:-

مادہ پرست ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ حقِ مطلق وہی ہے جسے ہمارے حواس ہم پر منکشف

(۲) کر دیں۔ عقلِ انسانی اس قابل ہے کہ یہ حقِ مطلق کا علم بہم پہنچا دے۔ درحقیقت اسی نے یہ علم بہم پہنچایا ہے۔

مختصر الفاظ میں اس نظریہ کی رُو سے

(i) انسان کی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی ہے۔ موت کے بعد انسان کا کچھ باقی نہیں رہتا۔

(ii) انسانی زندگی کا سارا مسئلہ" روٹی کا مسئلہ" ہے۔ اور

(iii) اس مسئلہ کا حل انسانی عقل کی رُو سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔

یہ میکانکی نظریۂ حیات یورپ میں انیسویں صدی میں اپنے شباب پر تھا۔ مغرب کی موجودہ تہذیب اسی نظریہ کے برگ و بار کا نام ہے۔ لیکن بیسویں صدی میں خود یورپ کے سائنس دان اور مفکرین، کائنات اور انسانی زندگی کے متعلق مزید انکشافات اور تحقیقات کے بعد ایک اور نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ :-

اب اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی دشواری نہیں رہی کہ زندگی محض طبیعاتی اور کیمیاوی کیفیات کی پیدا کردہ نہیں بلکہ یہ ان مادی کیفیات سے پہلے موجود تھی اور ہمیشہ سے موجود تھی اور اس امر کے باور کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں کہ اس مادی کائنات کے پیچھے ایک اور دنیا ہے جس کی تعبیرات کی روشنی میں ہمارے حیاتیاتی پہلوؤں کو عملاً منطبق ہونا چاہیئے۔ لہٰذا، زندگی کے مسئلہ کو طبیعیاتی اور کیمیاوی مسئلہ سمجھنا ہی غلط ہے۔ زندگی اور انسان کی ذات کا وجود اس حقیقت کی دلیل ہے کہ کائنات کی محض مادی تعبیر ناممکن ہے۔" (۳)

زندگی کی ابتداء کے متعلق، اور تو اور، ڈارون (جو مغرب میں نظریۂ ارتقاء کا امام تصور کیا جاتا ہے) اپنی کتاب (ORIGIN OF SPECIES) کے آخیر میں لکھا ہے کہ

زندگی کے اس تصور میں ایک عظمت ہے۔ زندگی مختلف قوتوں کی مظاہر ہے۔ سب سے پہلے خالقِ حیات نے زندگی کی روح متعدد پیکروں میں پھونکی ہو یا ایک ہی پیکر میں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ اس تمام عرصہ میں جبکہ یہ کرۂ ارض فطرت کے اٹل قانون کے ماتحت اس طرح گردش کرتا رہا۔ زندگی کی اس سادہ سی ابتداء سے اس قدر متنوع پیکر اس حسن و رعنائی کے ساتھ نمودار ہوتے گئے اور ہوتے جا رہے ہیں۔ (۳A)

انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کے متعلق جس کی طرف پروفیسر ہالڈین نے اوپر اشارہ کیا ہے — (SORELY) لکھتا ہے کہ

انسانی ذات چند خصائص و رجحانات ہی کا مجموعہ نہیں۔ بلکہ یہ شعوری زندگی کا ایک نیا مرکز اور شعوری سرگرمیوں کا ایک نیا سرچشمہ ہے۔ (۴)

نفسِ انسانی

انسانی ذات نفس (SELF) کے وجود کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر لائڈ مارگن (جس کا تعارف پہلے ہو چکا ہے) لکھتا ہے کہ:-

میں اپنے اس عقیدہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ نفسِ انسانی کے ارتقاء کو ایک "نفسِ اعلیٰ" کا مظہر سمجھنا چاہیئے۔ "نفسِ اعلیٰ" جو ان تمام اشیاء کا خالق ہے جسے ہم "جدید" سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں اس ارتقائے نفس کے اندر یہی دیکھتا ہوں کہ اوپر سے نیچے اور اول سے آخر تک ایک عظیم الشان تدبیر عمل پیرا ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ فطرت کی ہر شے میں یہ ارتقائی بالیدگی خدا کی عاملیت (DIVINE AGENCY) ہی کا مظاہرہ ہے .... "نفسِ اعلیٰ" لامحدود ہے اور زمان و مکان کی قیود سے بے نیاز۔ اس کی ذات کے لئے اول اور آخر، اور حدوث اور اعادہ کے الفاظ ان معانی میں استعمال نہیں کئے جا سکتے جن معانی میں نفسِ انسانی سے بحث کرتے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ وہ ذات قدیم اور واجب الوجود ہے، ارتقا کی پیدا وار نہیں بلکہ خود ارتقاء کی بڑھتی ہوتی صورت اس کا پرتو ہے۔ (۵)

نفسِ انسانی (روح یا ذات یا آنا) کے متعلق برگسان لکھتا ہے:-

یہ ایک ایسی چیز کا نام ہے جو منتشر (DECOMPOSE) نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ یہ مرکب نہیں بسیط ہے۔ یہ (INCORRUPTIBLE) ہے۔ اس لئے کہ یہ غیر منقسم (INDIVISIBLE) ہے اور اپنی ذات کے اعتبار سے ناقابلِ فنا (IMMORTAL) ہے۔ (۶)

اس موضوع پر مغربی مفکرین اور ائمہ طبیعیات کے بہت سے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ عنوانِ زیرِ نظر کے لئے اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں نفسِ انسانی کے خصائص۔ اس کی نشوونما و ارتقاء کے ذرائع و اسباب اور اس کے مستقبل کے متعلق مزید گفتگو باب چہارم (قرآنی نظریۂ حیات) میں کی جائے گی جو اس موضوع کے لئے مناسب مقام ہے۔ اس مقام پر ہم صرف اس قدر بتانا چاہتے تھے کہ مغرب کے مفکرین اور سائنس دان اب خود میکانکی نظریۂ حیات کو چھوڑ کر ایک جداگانہ نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں جس کی رُو سے

(۱) انسان صرف مادی جسم کا نام نہیں جو عام قوانینِ طبعی کے ماتحت ایک مشین کی طرح چل رہا ہے اور اس کے اجزاء کے انتشار سے اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ

(۲) انسان، جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی رکھتا ہے جسے اس کی ذات یا نفس کہا جاتا ہے اور جو ناقابلِ فنا ہے۔ اور (لائڈ مارگن کے الفاظ میں) اس نفسِ اعلیٰ کا پرتو ہے جو زمان و مکان کی حدود سے ماورا اور مادی

سہاروں سے مستغنی ہے۔

قرآنِ کریم اس دوسرے نظریے کا حامل ہے اور اس نے اس حقیقت کو اپنے بلیغ حکیمانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی اپنے مختلف مدارج طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی آئی ہے۔ اس کی ابتدا طین (درجۂ جمادات) سے ہوئی۔

قرآنی تصورِ حیات

بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ۔ (۳۲/۷)

تخلیقِ انسانی (کی اسکیم) کا آغاز مٹی سے ہوا۔

زندگی، جمادات کی تہوں میں محوِ خواب تھی کہ پانی کے چھینٹے نے اس میں حرکت پیدا کر دی۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ۔ (۲۱/۳۰)

اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا۔ کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے!

یہاں سے سلسلۂ ارتقاء آگے بڑھا اور نباتات کی طرح مختلف اطراف میں پھیل گیا۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا۔ (۷۱/۱۷)

اللہ نے تمہیں زمین سے اُگایا۔ ایک طرح کا اُگانا۔

اس کے بعد یہ سلسلۂ ارتقاء حیوانات کے درجے میں پہنچا جہاں تخلیقی کاروبار، تولید و تناسل کی رو سے آگے بڑھا۔

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ۔ (۸۶/۶)

اسے پیدا کیا اس پانی (نطفہ) سے جو اچھل کر رحم میں گرتا ہے[1]۔

درجۂ حیوانات تک یہ سلسلہ اسی طرح چلا آیا۔ اب اس کے بعد زندگی اس منزل میں داخل ہوتی ہے جسے مقامِ انسانیت کہا جاتا ہے۔ یہیں سے وہ اہم فرق پیدا ہوتا ہے جو انسان کو دیگر تمام حیوانات سے ممتاز کر دیتا ہے۔ اس کے لئے سورۂ سجدہ کی متعلقہ آیات کو مسلسل سامنے رکھئے (جن میں سے ایک آیت اوپر دی گئی ہے)

الَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ۔ (۳۲/۷)

اللہ وہ ہے جس نے ہر چیز کی خلقت میں حسن کارانہ تناسب قائم کیا۔ (اور یہ سب کچھ تدریجاً ارتقائی طور پر ظہور میں لایا)

---

[1] ہم نے اس مقام پر سلسلۂ ارتقاء کے ضمن میں ایک ایک آدھ آدھ آیت پر اکتفا کیا ہے۔ قرآن اور نظریۂ ارتقاء کی تفاصیل کے لئے میری کتاب "ابلیس و آدم" ملاحظہ فرمائیے۔

گیا (چنانچہ اس سلسلہ میں) انسان کی تخلیق کی ابتدا طین سے کی گئی۔

اس کے بعد ہے:-

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۔ (۳۲/۸)

پھر وہ (اسے مختلف تخلیقی مدارج طے کراتے ہوئے اس مقام تک لے آیا) جہاں اس کی نسل کا سلسلہ حقیر سے پانی (نطفہ) کے خلاصہ سے ٹھہرایا۔

اس درجۂ حیوانی کے بعد (ثُمَّ سَوّٰىهُ - ۳۲/۹) اس میں ہر طرح کا اعتدال پیدا کیا۔ اس کے بعد (وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ - ۳۲/۹) "اللہ نے اس میں اپنی توانائی پھونک دی"۔ یہ ہے وہ مقام جہاں یہ دیگر حیوانات سے متمیز

نفخِ رُوحِ خداوندی

ہوگیا۔ یعنی اس میں الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) آگئی۔ جو کسی اور حیوان کے حصے میں نہیں آئی۔ اسی کا نام انسانی ذات یا نفس ہے۔

یہ "روحِ خداوندی" کی کرشمہ سازیاں ہیں جن سے ایک پیکرِ آب و گِل، دانا و بینا انسان، کائنات کا جانِ مدعا بن گیا۔ یہ نفخِ روح کیا ہے؟ اور انسان پر اس کا کیا اثر پڑا؟ یہ ایک الگ داستان ہے۔ اس وقت ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کی رو سے انسان کا ایک گوشہ تو وہ ہے جو عام حیوانات کی طرح طبیعی جسم پر مشتمل ہے اور جو ان ہی قوانین کے تابع سرگرمِ عمل ہے جو دوسرے حیوانات پر نافذ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے "روحِ خداوندی" کہا گیا ہے۔ قرآن اسے "نفسِ انسان" کہہ کر پکارتا ہے۔ لہٰذا انسان مشتمل ہے (۱) جسم اور (۲) نفس (BODY AND MIND)[1] پر (یعنی اس کا بدن جو طبیعیاتی قوانین کے ماتحت مصروفِ حرکت رہتا ہے۔ اور انسانی ذات (خودی یا انا یا نفس) جو ان قوانین کے تابع نہیں)

———— (۰) ————

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مغرب کے مادیین نے یہ نظریہ قائم کیا کہ کائنات مادی گردشوں کا نام ہے اور انسان مادی عناصر کی ترتیب سے وجود میں آگیا ہے۔ جب یہ ترتیبِ عناصر بکھر جائے گی تو انسان ختم ہو جائے گا۔ یعنی ان کے نزدیک سب کچھ مادہ ہی مادہ ہے۔ مادہ ہی اصلِ کائنات ہے۔ مادہ کے سوا کسی شے کی کوئی حقیقت نہیں۔

---

[1] ہم نے نفس کے لئے (MIND) کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے کہ انگریزی میں عام طور پر (BODY) کے مقابلے میں (MIND) ہی آتا ہے۔ ورنہ نفس، انسانی ذات (PERSONALITY) یا خودی (SELF) کا نام ہے۔ سائیکالوجی والے اسے (PSYCHE) کہہ کر پکارتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس نظریہ کی ابتدا، یونان کے مفکر دیمقراطیس سے ہوئی تھی۔

افلاطونی نظریہ

لیکن یونان کے ایک دوسرے مفکر افلاطون (PLATO) نے ایک اور نظریہ پیش کیا جو مذکورہ صدر نظریہ کی ضد تھا۔ اس نے کہا کہ یہ تمام کائنات فریبِ تخیل ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔ اس کا وجود محض سایہ ہے، حقیقت نہیں۔ یہ نظریہ افلاطون کے زمانہ سے لے کر آج تک مختلف زمانوں میں مختلف مذاہب اور مختلف مکاتبِ فکر کے ہاں مختلف پیکروں میں چکر لگا چلا آرہا ہے۔ ہندومت (کے ہاں ویدانت) میں اسی تصور کے ماتحت کائنات کو مایا (فریب) اور سراب قرار دیا گیا ہے۔ اسی کے ماتحت بدھ مت کے ہاں دنیا کو قابلِ نفرت ٹھہرایا گیا۔ اسی تصور کو (سینٹ پال کی[1]) عیسائیت نے اپنایا اور حقیقی دنیا "آسمان کی بادشاہت" کو قرار دیا اور جسم کے تقاضوں سے فرار کو رہبانیت کے مقدس نقاب میں چھپانے کی کوشش۔ یہی نظریہ تصوف کی روح بنا جس نے دنیا کو ناثبات قرار دے کر اس سے ترکِ علائق کی تلقین کی۔

اگر ربوبیت کے نقطۂ خیال سے دیکھئے (جس کے لئے یہ تمام تفاصیل بیان کی گئی ہیں) تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مادیین کے نزدیک ربوبیت سے مقصود ہوگا جسم کی پرورش (کیونکہ وہ انسان میں جسم کے علاوہ اور کسی شے کے قائل نہیں) اور اس کا ذریعہ قرار دیا جائے گا عقلی وسائل کو (کیونکہ وہ عقل سے ماورا کسی اور سرچشمۂ علم و ہدایت کو نہیں مانتے)۔ اس تصورِ حیات کا نتیجہ انسانیت کے حق میں کیا ہوگا اس کے متعلق آئندہ باب میں گفتگو کی جائے گی۔ باقی رہے دوسرے نظریہ کے قائل۔ سو ان کے متعلق آپ کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ اُن کے نزدیک ربوبیت سے مراد ہوگی "روح کی پرورش" یعنی ایسا مسلک جس سے انسان کی روح نشوونما پا کر ایک مستقل حیثیت اختیار کرلے۔ لیکن آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ ان کے نزدیک بھی مقصودِ حیات یہ نہیں۔ ان کا عقیدہ یہ

نفس کشی

ہے کہ روحِ انسانی (آتما) برھما (خدا) کی روحِ اعلیٰ (پرماتما) کا ایک جزو ہے۔ یہ جزو اپنے اصل سے الگ ہوکر مادی دنیا (پراکرتی) کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مقصدِ حیات یہ ہے کہ اس روح کو ان زنجیروں سے آزاد کرایا جائے تاکہ یہ جزو اپنی اصل سے جا ملے۔ انسانی آرزوئیں اس مقصد کے حصول میں حائل ہوتی ہیں اس لئے اس کا علاج ترکِ آرزو ہے۔ یعنی دنیا اور اس کے متعلقات سے اس طرح

---

[1] یاد رہے کہ موجودہ عیسائیت، سینٹ پال (اور اس کے متبع مفکرین) کی اختراع ہے۔ جنابِ مسیحؑ کی عیسائیت اس سے مختلف تھی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں"۔

کنارہ کشی کی جائے کہ انسان کے دل میں کوئی آرزو ہی پیدا نہ ہو۔ انسان جس قدر جسمانی لذائذ اور دنیاوی حظائظ سے اجتناب برت کر نفس کشی کرتا جائے گا، اسی قدر یہ بندھن ڈھیلے پڑتے جائیں گے۔ جب نفس کو پوری طرح فنا کر لیا جائے گا تو یہ زنجیریں ٹوٹ جائیں گی اور پھر انسانی روح اپنی اصل میں جا کر ضم (ABSORB) ہو جائے گی۔ یہی منتہائے زندگی ہے۔ یہ نظریہ بدھ مت، ویدانت، عیسائیت سب میں چکر لگاتا چلا آ رہا ہے۔ فرق صرف نام اور لباس میں ہے۔ روح ہر جگہ ایک ہے۔ اور بدبختی سے' یہی روح ہمارے ہاں کے تصوف میں بھی کارفرما چلی آ رہی ہے۔ اس کی رو سے ترکِ دنیا، ترکِ لذائذ، ترکِ خواہشات انسانی سعی و عمل کا منتہیٰ ہے۔ اس لئے کہ دنیا جیل خانہ ہے جس میں انسانی روح مقیّد ہے۔ انسان نفس کشی سے وہ مقام حاصل کر لیتا ہے جس میں تمام دنیاوی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور روح' ذاتِ خداوندی میں پھر سے مدغم ہو جاتی ہے۔ اسی کو واصل بالحق ہونا کہتے ہیں۔ یعنی روح کا حق (خدا) کے ساتھ جا کر مل جانا۔ (یہی وجہ ہے کہ بزرگوں کی موت کو موت نہیں کہتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ ان کا "وصال" ہو گیا۔ یعنی جزو اپنی اصل سے جا کر مل گیا)۔ یہی روح کا منتہیٰ ہے۔ اسی میں اس کی مسرتوں کا راز پنہاں ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

وحدتِ وجود اور ویدانت اسی فکر کے مظاہر ہیں جس کا چشمہ سرزمینِ یونان سے پھوٹا اور ساری دنیا میں ایسی دلدل پیدا کر گیا کہ آج تک انسانیت اس میں تا بکمر ڈوبی ہوئی ہے اور اس سے نجات کی کوئی راہ نہیں ملتی۔ یہ افلاطونی فکر، بقول اقبالؒ:

گوسفندے در لباسِ آدم است ۔۔۔ حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است

بر تخیلہائے او فرماں روا ست ۔۔۔ جامِ او خواب آور و گیتی رباست

قومہا از سُکرِ او مسموم گشت

خفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی کہ

(۱) مادیئین کے نزدیک ربوبیت سے مراد جسمِ انسانی کی پرورش ہے جسے انسانی عقل کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور

(۳) "روحانیین" کے نزدیک زندگی کا مقصود نفس (یا روح) کی ربوبیت نہیں بلکہ نفس کشی ہے۔ اور روح کا منتہیٰ اپنے آپ کو روحِ اعلیٰ میں فنا کر دینا۔

اوّل فنا۔ آخر فنا۔ ظاہر فنا۔ باطن فنا۔

لہٰذا، ربوبیت کے نقطۂ نظر سے روحانیین کا مسلک تو اس قابل ہی نہیں کہ اس کے متعلق کوئی بحث کی جائے۔ البتہ مادیین کا مسلک مزید گفتگو کا متقاضی ہے۔ اسے آیندہ باب میں دیکھئے۔

P.51 - (1) Quoted by Harry Slochower, in "No Voice is Wholy Lost"

P.52 - (2) - do -

P.52 - (3) J.S.Haldane, in "The Philosophical Basis of Biology" pp.38;112;120

- (3A) vide "Dawn" dated 7.12.1952

- (4) Moral Value And The Idea Of God.

P.53 - (5) The Great Design

- (6) The Two Sources Of Morality & Religion

تیسرا باب

مادئین کا نقطۂ نگاہ

مادئین (میکانکی تصورِ حیات) کے مطابق:-

(۱) انسان سے مراد صرف جسمِ انسانی ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک ربوبیت سے مراد ہے جسم کی پرورش یعنی روٹی، کپڑا اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا مہیا ہو جانا۔

(۲) جسم کی ربوبیت کا مسئلہ عقل کی رو سے حل ہو سکتا ہے۔ عقل کے سوا کوئی قانون ایسا نہیں جس کا فیصلہ ماننے کے قابل ہو۔

آیئے ہم دیکھیں کہ اس نظریہ کا عملی نتیجہ کیا ہے؟ یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ تحفظِ خویش (PRESER-VATION OF SELF) ہر ذی حیات کا طبعی تقاضا ہے یعنی جہاں بھی زندگی ہے، اس کا تقاضا اپنے آپ کی حفاظت ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے کیڑے سے لے کر انسان تک ہر نفس میں تحفظِ خویش کا تقاضا موجود ہے۔ یعنی ہر ذی حیات اپنی حفاظت اور بقا کے لئے انتہائی جدوجہد کرتا ہے۔ حیوانات کی سطح تک یہ تقاضا جبلّی طور پر پورا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن انسان کی دنیا میں جبلّت سے آگے عقل بھی آجاتی ہے۔ یعنی انسانی زندگی میں تحفظِ خویش

عقل کا تقاضا

عقل کا تقاضا ہے۔ اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اُس فرد کی حفاظت کرے جس کی وہ عقل ہے۔ میری عقل میری حفاظت کرے گی۔ آپ کی عقل آپ کی حفاظت۔ یعنی ہر فرد کی

عقل اس کی حفاظت چاہے گی۔ اسے کسی دوسرے فرد کی حفاظت سے سروکار نہیں ہوگا۔ اگر کسی سینما ہال میں آگ لگ جائے تو تماشائیوں میں سے ہر شخص بے تحاشا دروازے کی طرف بھاگ اُٹھے گا۔ اس بھگدڑ میں کسی کو دوسرے کا ہوش نہیں رہے گا۔ اس افراتفری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آگ سے اتنی جانیں ضائع نہیں ہوتیں جتنی ہال کے دروازوں میں اس بھیڑ کی وجہ سے تلف ہوجاتی ہیں۔ ہر شخص دوسروں کو روندتا ہوا آگے نکل جانے کی فکر کرتا ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر شخص کو اپنی جان پیاری ہے۔ وہ ہر حالت میں اپنی جان بچانا چاہتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ لیجئے کہ وہ اپنے ساتھ اپنے بچوں کی جان بچانے کی بھی فکر کرتا ہے۔ یہ بھی وہی جذبہ ہے جو حیوانات میں جبلی طور پر موجود ہوتا ہے۔ دیکھئے بلی۔ کتیا۔ گائے۔ بکری۔ کس طرح اپنے بچوں کی حفاظت کرتی ہیں۔ لیکن اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ ماں اور بچے میں سے صرف ایک کی جان بچ سکتی ہو تو ماں اپنی جان بچانے کی فکر پہلے کرے گی۔ بچوں کو چھوڑ جائے گی۔ مثل مشہور ہے کہ بندریا کے پاؤں جلنے لگے تو اس نے اپنے بچے کو پاؤں تلے رکھ لیا تھا۔ انسانوں میں بھی یہ واقعات دیکھنے میں آتے رہتے ہیں کہ ماں باپ نے اپنے بچوں کو بیچ کر اپنے لئے سامانِ زیست خرید لیا۔ بہر حال اگر ہم اس لطیف بحث میں نہ بھی پڑیں تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ

> انسانی عقل صرف اس فرد کا تحفظ چاہتی ہے جس کی وہ عقل ہے۔ اسے اپنی حفاظت کے مقابلے میں دوسروں کی حفاظت کی فکر نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے ساتھ اپنے بچوں کی حفاظت بھی کرتا ہے۔

یہ ہوا پہلا کلیہ۔

اب آگے بڑھیئے۔ تحفظِ خویش کا تقاضا حیوانات میں بھی ہے۔ لیکن حیوانات کل (TOMORROW) کا تصور نہیں رکھتے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے کہ وہ فردا کا تصور بھی کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی عقل آج کی روٹی

حیوانات فردا کا تصور نہیں رکھتے

کے فکر سے فارغ ہو کر کل کی روٹی کی فکر بھی شروع کر دیتی ہے اور چونکہ انسان کو اس کا علم نہیں کہ اس نے کتنا عرصہ زندہ رہنا ہے اس لئے اس کی فکر فردا لامتناہی ہوجاتی ہے۔ آپ ایک گائے کو دیکھئے۔ جب تک اس کا اپنا پیٹ نہیں بھرتا وہ کسی دوسری گائے کو چارے کے پاس نہیں آنے دیتی۔ اسے اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ دوسری گائے کس قدر بھوکی ہے۔ اس کی ضرورت اس سے کتنی زیادہ ہے۔ اسے فقط اپنے پیٹ کی فکر ہوتی ہے۔ لیکن جونہی اس کا پیٹ بھر جاتا ہے وہ نہایت اطمینان سے بیٹھ کر جگالی کرنے میں مصروف ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد

اسے کی پرواہ نہیں ہوتی کہ باقیماندہ چارہ کون لے جا رہا ہے اور کون کھا رہا ہے۔ وہ اس چارے کو شام کے لئے سنبھال کر نہیں رکھتی۔ اسے جمع کرنے کی فکر نہیں ہوتی۔ [اس میں شبہ نہیں کہ بعض چیونٹیاں وغیرہ خوراک جمع کرتی رہتی ہیں لیکن اول تو یہ مستثنیات میں سے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کا یہ عمل غیر شعوری طور پر محض عادتاً ہوتا ہے۔ ان کی عقل اس کا فیصلہ نہیں کرتی کہ انہیں خوراک جمع کر کے رکھنی چاہیئے تاکہ کل کے کام آسکے۔ عام حیوانات کا بہرحال یہی شیوہ ہے کہ وہ 'کل' کی فکر سے بے نیاز ہوتے ہیں] لیکن انسانی عقل کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ہمیشہ جمع کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔ بڑھاپے میں انسان کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی موت قریب آرہی ہے۔ اس سے امکان تھا کہ انسان جمع کرنے کی ہوس کو مختصر کر دے لیکن یہاں اسے اولاد کی فکر دامنگیر ہو جاتی ہے۔ یعنی انسان اپنے مرنے کے بعد اپنی اولاد کی شکل میں زندہ رہنے کی آرزو رکھتا ہے۔ اپنے لئے جمع کرنے کے بعد اپنی اولاد کے لئے جمع کرنے کا جذبہ کارفرما ہونے لگ جاتا ہے۔ حیوانات میں نہ کل کی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی کچھ وقت کے بعد اولاد کی فکر۔ اس لئے ان کی انفرادی زندگی ان کی ذات تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن انسان پہلے اپنے لئے، پھر اپنی اولاد کے لئے جمع کرنے اور اسے سمیٹ کر رکھنے کی دُھن میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ اسے کسی دوسرے کے مفاد اور بہبود کا خیال ہی نہیں آنے پاتا اور اس کی یہ ہوس قبر کے کناروں تک ساتھ رہتی ہے۔ آہستہ آہستہ جمع کرنے کا یہ جذبہ اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ انسان محض جمع کرنے کی خاطر جمع کرتا رہتا ہے۔ وہ کسی ضرورت کے احساس کے ماتحت ایسا نہیں کرتا محض اپنے جذبۂ اکتناز کی تسکین (تسکینِ ہوس) کی خاطر ایسا کرتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ کہیں جا کر ختم ہی نہیں ہوتا۔

یہ ہوگئی دوسری بات۔ یعنی

(i) عقل کا تقاضا اس فرد کا تحفظ ہے جس کی وہ عقل ہے۔

(ii) انسان اپنے تحفظ کے لئے جمع کرنے اور اسے سمیٹ کر رکھنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔ اور

(iii) اس کے ساتھ ہی اپنے بعد اپنی اولاد کے لئے جمع کرنے کی فکر میں الجھ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ جذبہ اس کی ہوس بن جاتا ہے۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ حیوانات کی کسی نوع (SPECIES) کو لیجئے۔ (مثلاً جنگل کے ہرن) ان میں سے ہر ایک ہرن کی ذہنی استعداد کم و بیش یکساں ہوتی ہے[1]۔ اس لئے ان میں اونچ نیچ کا سوال نہیں ہوتا۔ ان

---

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

میں سے کوئی ہرن دوسرے ہرن کو دھوکا نہیں دیتا۔ وہ دھوکا دینے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ دھوکا دینے کے لئے ضروری ہے کہ ایک کی ذہنی استعداد دوسرے سے زیادہ ہو۔ نہ ہی ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ایک ہرن اپنے لئے زیادہ "کماکر" رکھ لے۔ وہاں نہ تو کمانے کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی کماکر جمع رکھنے کا۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں ایک فرد کی ذہنی استعداد دوسرے سے مختلف ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک فرد میں دوسرے فرد کی نسبت کمانے کی استعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ایک فرد دوسرے فرد کو دھوکا دے سکتا ہے۔ آپ غور کیجئے۔ انسانی معاشرہ میں چھین جھپٹ کی بنیاد کیا ہے؟ عقول کی جنگ (BATTLE OF WITS)۔ جس کی عقل تیز ہے وہی کامیاب ہے۔ کوئی کند ذہن، غبی۔ بیوقوف کسی عقلمند کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ ہمیشہ دھوکا کھاتا ہے۔ مختلف منصوبے، تدابیر، اسکیمیں۔ سب عقل و خرد کے کرشمے ہیں۔ اسی سے انسان زیادہ سمیٹتا ہے۔ اسی سے معاشی طبقات (ECONOMIC CLASSES) وجود میں آتے ہیں۔ جس کی عقل زیادہ ہے اس میں اکتسابِ دولت کی استعداد زیادہ ہے۔ وہ دوسروں کو دھوکا بھی دے سکتا ہے اور اسے اس کی ہنرمندی اور چابک دستی قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک فرد زیادہ دولت سمیٹ کر جمع کرتا ہے اور اپنی اولاد کے لئے وراثتاً چھوڑ جاتا ہے۔ اب یہ اولاد اس وراثتی سرمایہ کی بنیاد پر سوسائٹی میں ممتاز حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کا شمار طبقۂ اعلیٰ میں ہوتا ہے۔ ان کے برعکس، جن میں عقل کی کمی ہو (یا وہ غریب جنہیں وراثت میں جائیداد نہ ملے)، وہ محنت کش (مزدور) رہتے ہیں۔ اور اسی نسبت سے معاشرہ میں ان کا مقام متعین کیا جاتا ہے۔ اس کے جواز میں دلیل بھی بڑی واضح ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جو شخص اپنی ذہنی استعداد کی بنا پر زیادہ کماتا ہے وہ اس کمائی کا مالک ہے۔ اسے اس سے محروم کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ اس دلیل کی بنا پر آپ اس کی ملکیت کی کوئی حد نہیں مقرر کر سکتے۔ وہ جس قدر کما سکتا ہے کمائے اور اس دولت سے

ذہنی استعداد کا فرق

---

[1] (فٹ نوٹ صفحہ گزشتہ) حیوانات میں استعداد نوعی ہوتی ہے، انفرادی نہیں۔ مثلاً جس قسم کا گھونسلا ایک بیا بناتا ہے اسی قسم کا سب بیے بناتے ہیں۔ جس قسم کا چھتہ ایک شہد کی مکھی بناتی ہے اسی قسم کا ہر مکھی بناتی ہے۔ پھر، ان کی یہ استعداد عمر کے ساتھ بڑھتی نہیں۔ مکھی کی جو استعداد پہلے دن تھی، وہی استعداد ساری عمر رہتی ہے۔ اسی طرح مکھیوں کی جو استعداد ہزار سال پہلے تھی وہی آج ہے۔ ان کے برعکس، انسان میں ہر فرد میں اختلافِ استعداد ہوتا ہے۔ ایک فرد کی عمر کے مختلف حصوں میں اختلافِ استعداد ہوتا ہے اور انسانوں کا اختلافِ استعداد تاریخ کے مختلف ادوار میں بھی ہوتا ہے۔

مشینیں۔ فیکٹریاں۔ فرمز (FIRMS)۔ بینک۔ جو جی میں آئے خریدتا اور بناتا چلا جائے۔ اس طرح اس کی آمدنی اور زیادہ ہو جائے گی اور اس کی املاک بھی آگے بڑھتی چلی جائیں گی۔ یوں رزق کے سرچشمے اس کی انفرادی ملکیت میں آتے جائیں گے اور دوسرے افراد پر اسی نسبت سے رزق تنگ ہوتا جائے گا۔ اس کا نام سرمایہ داری (CAPITAL-LISM) ہے۔ لہٰذا نظامِ سرمایہ داری کے خلاف آپ کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ اس

نظامِ سرمایہ داری

لئے کہ سرمایہ داری کا نظریہ اور نظام خود "عقل" ہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے اور چونکہ میکانکی نظریۂ حیات کی رو سے عقل سے ماوراء کوئی اور دلیل اور برہان نہیں، اس لئے آپ میکانکی تصورِ حیات کو صحیح مانتے ہوئے سرمایہ داری کو ناجائز قرار دے ہی نہیں سکتے۔ کارل مارکس سرمایہ داری کے نظام کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس نظام کے خلاف وہ بھی کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کر سکا اور چونکہ وہ خود میکانکی تصورِ حیات کا قائل تھا اس لئے وہ اس کے خلاف عقل سے ماوراء کوئی اور (مثلاً اخلاقی) دلیل بھی نہیں لا سکتا تھا۔ آپ کو معلوم

کارل مارکس کی دلیل

ہے کہ اس نے سرمایہ داری کے نظام کی مخالفت کس "دلیل" پر کی ہے؟ اس نے کہا کہ ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں کوئی نظام علیٰ حالہٖ قائم نہیں رہ سکتا۔ ہر ایک نظام کچھ وقت تک چلتا ہے۔ اس کے بعد اس نظام کے اندر سے خود اس نظام کے خلاف شگوفے پھوٹتے ہیں اور اس طرح یہ پہلا نظام تباہ ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے لیتا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ چونکہ آج کل نظامِ سرمایہ داری رائج ہے۔ اس لئے مذکورۂ صدر تاریخی اصول کی بنا پر یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ نظام بدلے گا اور اس کی جگہ ایک ایسا نظام آئے گا۔ جو اس نظام کی ضد ہوگا۔ یعنی موجودہ نظام، دولت مندوں، کارخانہ داروں، سرمایہ داروں اور زمینداروں کا ہے اور وہ آنے والا نظام (اس کی ضد) یعنی غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کا نظام ہوگا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ دنیا کے نظاموں کا یہ سلسلۂ استبداد و استخلاف کس قوت کی بنیاد پر جاری ہے تو اس نے کہا کہ یہ سب کچھ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔ اس وقت ہمیں اشتراکیت کی تفاصیل میں جانے اور اس نظریۂ تاریخی وجوب پر بحث و تنقید کی ضرورت نہیں۔ اس وقت صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ اور تو اور، سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن کارل مارکس بھی نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کوئی عقلی دلیل نہیں لا سکا۔ اسے اس کے لئے "تاریخی وجوب" کی اندھی قوت کا سہارا لینا پڑا۔

حاصلِ مبحث

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ میکانکی تصورِ حیات کی رو سے۔

(۱) انسانی ربوبیت سے مراد جسمِ انسانی کی پرورش ہے۔

(ii) انسانی جسم کی پرورش کا نظام عقل کی رُو سے قائم ہوتا ہے۔
(iii) عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس فرد کا تحفظ کرے جس کی وہ عقل ہے۔ اسے کسی دوسرے کی حفاظت سے سروکار نہیں ہوتا۔
(iv) ہر شخص (یا اس کی عقل) اپنی حفاظت کے لئے زیادہ سے زیادہ جمع کرنے اور سمیٹنے کی فکر میں منہمک رہتا ہے۔ اور جب اپنے آپ سے آگے بڑھتا ہے تو اپنی اولاد کی حفاظت کے لئے جمع کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور پھر محض تسکینِ ہوس کی خاطر۔
(v) مختلف افراد میں عقل کا تفاوت ہوتا ہے۔ اس لئے مختلف افراد میں دولت کمانے کی استعداد بھی مختلف ہوتی ہے۔
(vi) جس کی عقل زیادہ ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ کما کر اپنی ملکیت میں اضافہ کرتا جاتا ہے اور جوں جوں انفرادی ملکیتیں زیادہ ہوتی جاتی ہیں، عامۃ الناس کا رزق تنگ ہوتا جاتا ہے۔ اسی کو سرمایہ داری کہتے ہیں۔
(vii) انسان کی عقل سرمایہ داری کے خلاف کوئی دلیل نہیں بہم پہنچا سکتی۔ اس لئے کہ یہ نظام خود عقل ہی کی پیداوار ہے۔
(viii) اس طرح انسانی معاشرہ میں طبقات کی تقسیم ہوتی جاتی ہے اور اس کی زنجیروں کے حلقے دن بدن تنگ اور مضبوط ہوتے چلے جاتے ہیں۔
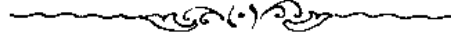
اب اور آگے بڑھیئے۔ آپ کسی دولت مند سے کہتے ہیں کہ وہ ایک غریب آدمی کی مدد کرے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس کی مدد کیوں کروں؟ غور کرنے پر آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ کے پاس اس سوال کا عقلی جواب کوئی نہیں۔ آپ یہی کہہ سکتے ہیں کہ انسانی

غریب کی مدد کیوں کی جائے

ہمدردی کا تقاضا ہے کہ غریبوں کی مدد کی جائے لیکن یہ اپیل تو اس کے جذبات سے ہے۔ انسانی ہمدردی کا تعلق جذبات سے ہے، عقلی دلیل نہیں۔ اگر وہ اس پر بھی آپ کی بات نہیں مانتا تو آپ اس کے متعلق یہی کہیں گے کہ وہ بڑا سنگدل شقی القلب ..... بے رحم انسان ہے۔ یہ نہیں کہیں گے کہ بڑا بے وقوف ہے۔ یعنی آپ یہ نہیں کہیں گے کہ اس کا یہ انکار بے عقلی کی دلیل ہے۔ یہی کہیں گے کہ وہ انسانیت کے بلند جذبات و خصائص سے عاری ہے لیکن میکانکی نظریۂ حیات کی رُو سے انسانیت کے بلند اور پست جذبات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک

انسان نام ہے صرف جسم کا۔ لہٰذا' وہاں کمزور جسم اور طاقت ور جسم کا تو سوال پیدا ہوگا، جسمانی راحت اور تکلیف کا موازنہ ہوگا لیکن جسم سے آگے کسی اور چیز کا سوال ہی سامنے نہیں آئے گا۔

آپ اس دولت مند کو زیادہ سے زیادہ یہ عقلی دلیل دے سکتے ہیں کہ اگر کل کو تم بھی غریب ہو گئے تو تمہیں بھی دوسروں کی امداد کی ضرورت پڑے گی۔ اس لئے تمہیں چاہیئے کہ آج اس غریب کی مدد کرو۔ لیکن اگر وہ اس کے جواب میں کہہ دے کہ شکریہ! میں نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ میں کسی کا محتاج نہ ہوں، اس لئے مجھے اس "کاروبار" کی ضرورت نہیں کہ میں آج اس غریب کی مدد اس لئے کروں کہ اگر کل کو میں غریب ہو گیا تو کوئی میری مدد کرے گا۔ یہ سودا بہت کمزور بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ میں نے اپنا انتظام اس سے مضبوط بنیادوں پر کر رکھا ہے۔ اس عقلی جواب کے بعد آپ اسے کوئی اور دلیل نہیں دے سکتے۔

اب اسی حقیقت کا ایک اور پہلو سامنے لایئے۔ آپ نے اس دولت مند کو دلیل یہ دی تھی کہ اس غریب کی مدد

اپنا فائدہ

کرنے میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے۔ اس نے اس پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ نہیں میرا اپنا فائدہ اس میں نہیں میرا فائدہ اس انتظام میں ہے جو میں نے اپنے لئے کر رکھا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ آپ کی دلیل کی تہ میں کیا بات پوشیدہ تھی؟ یہی کہ آپ نے اس دولتمند کی عقل کو یہ سمجھایا تھا کہ ایسا کرنے میں اس کا اپنا فائدہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ عقل کو کسی کام پر آمادہ نہیں کر سکتے جب تک آپ اسے یہ نہ بتائیں کہ اس میں اس کا کیا فائدہ ہے۔ اسی نکتہ کو ذرا اور آگے بڑھایئے۔ آپ ایک شخص سے کہتے ہیں کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا ہے۔ وہ تڑاخ سے جواب دیتا ہے کہ مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں جھوٹ بولتا۔ ہم آپ صبح سے

مجھے کیا ضرورت تھی؟

شام تک ہر روز برابر اس قسم کے الفاظ دہراتے رہتے ہیں۔ "مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں جھوٹ بولوں" "مجھے غلط بیانی سے کیا فائدہ؟"۔ "مجھے جھوٹی گواہی دینے سے کیا مل جاتا"؟

آپ نے کبھی غور کیا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ ہم کہتے یہ ہیں کہ میں کیوں جھوٹ بولتا۔ میرا اس میں کیا فائدہ تھا۔ یعنی میں نے اس لئے جھوٹ نہیں بولا کہ جھوٹ بولنے میں میرا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر جھوٹ بولنے میں میرا فائدہ ہوتا تو میں جھوٹ بول دیتا۔ یا "مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں جھوٹ بولتا"؛ یعنی میں نے جھوٹ اس لئے نہیں بولا کہ اس کے بغیر میری کوئی ضرورت رُکی نہیں رہتی تھی۔ اگر میری کوئی ضرورت رُکتی تو میں جھوٹ بول کر اسے حاصل کر لیتا! یہ بات آپ کہتے تو رہے ہوں گے ساری عمر، لیکن آپ کو اس پر غور کرنے کا اس سے پہلے شاید موقعہ نہیں ملا ہوگا۔ آپ سوچیئے کہ ہم

ایک ایک بات میں غیر شعوری طور پر اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم اس وقت تک سچ بولتے ہیں جب تک ہمیں جھوٹ بولنے میں فائدہ نظر نہیں آتا۔ اگر جھوٹ بولنے میں فائدہ ہو تو ہم جھوٹ بول دیں گے۔ یہ بھی وہی بات ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یعنی عقل کو اس سے واسطہ نہیں کہ جھوٹ بُرا ہے اور سچ اچھا۔ اسے تو صرف اس سے تعلق ہے کہ اس کا فائدہ کس میں ہے۔ اگر اس کا فائدہ سچ بولنے میں ہے تو وہ سچ بولے گی اور اگر وہ دیکھے کہ اس کے مفاد کا تحفظ جھوٹ بولنے میں ہے تو وہ جھوٹ بول دے گی۔ اسے غرض اپنے مفاد کے تحفظ اور حصول سے ہے اور بس! اس لئے کہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) عقل کا فریضہ ہی یہ ہے کہ وہ اپنے (یعنی فردِ متعلقہ) کے مفاد کی حفاظت کرے۔ وہ اس سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔

آپ کہیں گے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ میکانکی تصورِ حیات کے حاملین (یعنی مادہ پرست، جو خالص عقل کے پیرو ہیں) غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ جھوٹ کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اپنے اوپر دیگر اخلاقی پابندیاں بھی عاید کرتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجوہات کی تفصیل بہت طول طویل ہے۔ خود مغرب کے علمائے اخلاقیات نے ان امور کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس باب میں سب متفق ہیں کہ عقل کبھی اخلاقیات کی محرک نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی اس کا معیار بن سکتی ہے۔ کیونکہ اخلاقیات کا مدار مفادِ خویش سے بلند ہو جانے پر ہے اور یہ عقل کے بس کی بات نہیں کہ وہ مفادِ خویش کو نظر انداز کر کے دوسرے کے مفاد کی فکر کرنے لگ جائے۔ راشڈل، جسے علم الاخلاق میں بلند پایہ مفکر کہا جاتا ہے، لکھتا ہے کہ:-

نہ اخلاقیات کے متعلق اور نہ ہی علمِ انسانی کے کسی دوسرے شعبے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقل ہمیں دھوکا نہیں دیتی۔ (۱)

اور میکس پلانک (MAX PLANK) کہتا ہے کہ:-

حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو اپنے شعوری افعال کے فیصلہ کن محرکات کے متعلق محض علّت و معلول کے قانون کی رو سے کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لئے کسی اور قانون کی ضرورت ہے یعنی قانونِ اخلاقیات کی۔ یہ قانون وہ ہے جس کی جگہ نہ تو بلند ترین عقل لے سکتی ہے اور نہ ہی لطیف ترین تجزیۂ نفس۔ (۲)

لہٰذا، عقل کا تقاضا محض تحفظِ خویش ہے — اس کے لئے وہ کسی اور قانون یا ضابطہ کو نہیں جانتی۔ اس باب میں انسان اور حیوان ایک ہی سطح پر ہیں۔ گائے کو بھوک ستاتی ہے تو وہ باہر کھیتوں کی طرف نکل جاتی ہے وہاں

پہنچ کر اسے اس کی تمیز نہیں ہوتی کہ اپنے مالک کے کھیت سے گھاس چرے۔ اس کے سامنے جو کچھ بھی آجائے وہ اسی میں چرنے لگ جائے گی۔ اس کے سامنے جائز اور ناجائز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی کام عقلِ انسانی کا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ حیوانات کی جبلت حصولِ مقصد کا صرف ایک ہی راستہ جانتی ہے۔ لیکن انسان کی عقل حیلہ جو اپنے مفاد کے حصول کے لئے ہزار تدبیریں اور لاکھ سازشیں کر سکتی ہے۔ واضح رہے کہ مفادِ خویش کا تحفظ اور اس کی خاطر حیلہ جوئیاں اور فریب تراشیاں عقل کا نقص نہیں، اس کا فریضہ ہی یہی ہے۔ وہ مامور ہی اس پر ہے کہ اس فرد کے مفاد کا تحفظ کرے جس کی وہ عقل ہے۔ نہ وہ کسی دوسرے کے مفاد کی محافظ بن سکتی ہے اور نہ ہی وہ جائز اور ناجائز کی تمیز جانتی ہے۔ صرف خوف (قانون کی گرفت اور سزا کا ڈر۔ خواہ اس کا حکم عدالت کے کٹہرے سے نافذ ہو یا سوسائٹی کی پیشانی کی شکن سے) اُسے حدود شکنی سے روکتا ہے۔ اسی لئے فلسفۂ افادیت (UTILITARIANISM) کے موید ہربرٹ اسپنسر نے کہا تھا کہ :-

(۳)

اخلاقیات کی بنیاد انتقام کا خوف ہے۔
لیکن اگر عقل اس کا انتظام کر لے کہ وہ عدالت کی زنجیروں یا سوسائٹی کی طعن و تشنیع سے مامون رہ سکتی ہے تو پھر اسے روکنے والی کوئی چیز نہیں رہ جاتی۔

اس مقام پر اتنی وضاحت ضروری ہے کہ ہم نے گذشتہ صفحات میں عقل کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے کہ ہم عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں اور اسے دنیا کی تمام خرابیوں کی جڑ قرار دے رہے ہیں۔ یہ بات نہیں۔ عقل تو ایک ملکہ ہے جس سے مختلف کام لئے جا سکتے ہیں۔ جب انسان کے انفرادی مفاد کے جذبات اس سے کام لینا چاہیں گے تو یہ ذاتی مفاد کے حصول کے لئے ہر قسم کی تدابیر سجھاتی چلی جائے گی۔ لیکن اسی عقل کو جب، بلند اقدار کے تابع رکھیں گے تو یہ انسانیت کی فلاح و بہبود کی تدابیر سامنے لاتی جائے گی۔ اس وقت چونکہ ہم "مادی تصورِ حیات" سے بحث کر رہے ہیں جس کی رو سے بلند اقدار کو تسلیم ہی نہیں کیا جاتا، اس لئے عقل کا بھی صرف وہی گوشہ سامنے لایا گیا ہے جس میں یہ انفرادی مفاد کے حصول اور تحفظ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ آگے چل کر جب ہم بلند انسانی اقدار کا ذکر کریں گے تو وہاں نظر آئے گا کہ یہی عقل کس طرح نوعِ انسانی کے لئے رحمت کا موجب بن جاتی ہے۔

(۱۰)
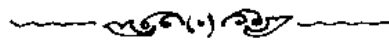
اس ضمنی وضاحت کے بعد آگے بڑھیئے۔ اگر ایک انسان کسی ایسے جزیرے میں رہتا ہوں جہاں کوئی دوسرا

انسان نہ ہو تو وہاں جائز و ناجائز، مفادِ خویش اور مفادِ غیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ یہ سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دو انسان اکٹھے مل کر رہیں۔ مل کر رہنے سے انسانوں کے مفاد میں ٹکراؤ (CLASH OF INTERESTS) ہوتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے معاشرتی قوانین اور اخلاقی ضوابط کی ضرورت کا آغاز ہوتا ہے۔ انسانوں نے اس دنیا میں مل کر رہنا ہے۔ کوئی انسان تنہا نہیں رہ سکتا۔ انسانوں کے مل جل کر رہنے سے معاشرہ (SOCIETY) کا وجود عمل میں آتا ہے۔ اب سوچئے کہ میکانکی تصورِ حیات کے ماتحت معاشرہ کا نقشہ کیا بنتا ہے؟

معاشرہ کا نقشہ

اس معاشرہ میں:-

(i) ہر فرد کی عقل کا تقاضا اس کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کے لئے اس کی عقل زیادہ سے زیادہ جمع کرنے اور سمیٹ لینے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔

(ii) اس کھینچا تانی میں زیادہ عقل و تدبیر کے مالک، زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

(iii) عقل مفادِ غیر کو پہچان ہی نہیں سکتی۔ نہ ہی وہ اخلاقی ضوابط کی پابند ہوتی ہے۔ اس لئے ہر فرد کی عقل۔ جائز و ناجائز، ہر طریق سے زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے کی فکر کرتی ہے۔

(iv) معاشرہ، نظامِ عمرانی (SOCIAL ORDER) کو قائم رکھنے کے لئے قوانین اور سزائیں وضع کرتا ہے تاکہ انکے خوف سے عقل حدودِ معاشرہ کے اندر رہے۔ لیکن عقلِ حیلہ جُو ان قوانین سے بچ نکلنے کی ہزار ترکیبیں سوچ لیتی ہے اور قانون کی گرفت میں بھی بالعموم وہی آتے ہیں جن کی عقل کمزور ہوتی ہے۔

اب آپ خود ہی سوچئے کہ ایسے معاشرہ میں دوسروں کی پرورش یا دوسروں کے مفاد کے تحفظ کا سوال کس کے سامنے آئے گا؟ اس میں ہر فرد اپنی اپنی پرورش (یا زیادہ سے زیادہ اپنی اولاد کی پرورش) کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہے گا کسی کو کسی دوسرے کے ساتھ کوئی قلبی علاقہ نہ ہوگا۔

یہ کیفیت تو ہوگی کسی ایک مقام کے معاشرہ کے اندر۔ اب ذرا اور آگے بڑھیئے۔ گروہ بندی کا جذبہ (HERD INSTINCT) تحفظِ خویش کا پیدا کردہ ہے۔ گروہ کے اندر رہتے ہوئے' افراد اپنے آپ کو زیادہ محفوظ تصوّر کرتے ہیں۔ اسی جذبہ کے ماتحت انسان نے شروع میں قبائلی زندگی اختیار کی جس کی آخری شکل آج

نیشنلزم

قومیت (NATIONALISM) کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ جو کچھ ایک فرد کی عقل دوسرے فرد کے ساتھ کرتی ہے، وہی کچھ ایک قوم کی اجتماعی عقل، دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ ایک قوم کی اجتماعی عقل صرف اپنی قوم کے مفاد کو دیکھ سکتی ہے۔ اس کے لئے ناممکن ہے کہ

وہ کسی دوسری قوم کے مفاد کو پیشِ نظر رکھ سکے۔ پھر جس طرح انفرادی عقل جائز و ناجائز کا فرق نہیں کر سکتی اسی طرح قومی شعور بھی اپنے قوم کے مفاد کے حصول میں جائز و ناجائز کی تمیز نہیں جانتا۔ جائز وہ جس سے اپنی قوم کا فائدہ ہو۔ ناجائز وہ جس سے اپنی قوم کا نقصان ہو۔ اپنی قوم کے فائدے کا خیال حب الوطنی یا (PATRIOTISM) ہے جس سے بڑا کارِ ثواب "نیشنلزم کی لغت میں اور کوئی نہیں۔ اس کے برعکس، اپنی قوم کا نقصان وہ جرمِ عظیم (HIGH TREASON) ہے جس کی سزا موت ہے۔ "میرے ملک اور قوم کا تحفظ" یہ ہے سب سے بڑا حسنِ عمل خواہ وہ ملک یا قوم حق پہ ہو یا بر سرِ ناحق۔ یہ قومی شعور کا فیصلہ ہے جس پہ اقوامِ عالم کی سیاست کا دارومدار ہے۔ اس سیاست کا امام میکیاولی (MACHIAVELLI) تھا جس کی کتاب (THE PRINCE) دورِ حاضر کی سیاست کی بائیبل سمجھی جاتی ہے۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے کہ:

دورِ حاضر کی سیاست

> حاکم (بادشاہ) کے لئے صفتِ روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل و فریب کا جال پھیلا سکے۔ اس کے ساتھ ہی خوئے شیری بھی تاکہ وہ بھیڑوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں۔ اس لئے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن حالات کے پیشِ نظر وہ معاہدہ کیا تھا وہ باقی نہیں رہے تو وہ اس معاہدہ کو بلا تامل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کیلئے نہایت نگاہ فریب دلائل بہم پہنچاتے جائیں۔ (باب ۱۸)

دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔

> نیکی ایک واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ اصل شے تو برائی ہے، اس لئے جو بادشاہ اپنی بنیادیں مستحکم رکھنا چاہتا ہے، اس کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ بدی کس طرح کی جاتی ہے اور اس کے لئے کون سا وقت سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس میں خوبیوں کا ہونا ضروری نہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ بظاہر ایسا دکھائی دے کہ اس میں یہ خوبیاں ہیں۔ اس میں اگر کوئی خوبی سچ مچ پیدا ہو جاتے تو بھی مضائقہ نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کے دل کی حالت ہمیشہ ایسی رہے کہ جونہی وہ دیکھے کہ مصلحتِ وقت کا تقاضا ہے کہ اس خوبی کو الگ کر دیا جائے تو وہ بلا تامل و توقف اس کے خلاف بھی کر سکے۔ (باب ۱۵)

فریڈرک دوم، میکیاولی سیاست کا بڑا پرستار تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

> کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ تم اپنے عزائم کو چھپاؤ اور اپنے کیریکٹر کو ہمیشہ زیرِ نقاب رکھو۔ صحیح حکمتِ عملی یہ نہیں کہ پہلے ہی متعین کر لیا جائے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ حکمتِ عملی یہ ہے کہ حسبِ موقع جو صورت اپنے فائدے کی نظر آئے اختیار

کر لی جائے۔ اس لئے میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ دوسری سلطنتوں سے معاہدات کر کے اپنے ہاتھ نہیں باندھ لینے چاہئیں۔
میکیاولی نے کہا تھا کہ جو سلطنت معاہدوں کی پابند ہو جاتی ہے وہ اپنے مفاد سے غافل ہو جاتی ہے۔ (۴)

اسی مکتبِ فکر کا ایک اور مبلّغ (RUMELIN) لکھتا ہے کہ:-

مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کا تحفظ اور اپنی قوت کو نشوونما دینا ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف اسی صورت میں رکھنا چاہیئے جب اس سے اس کے اپنے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو۔ اپنی مملکت کا استحکام اخلاقی تقاضوں پر مقدم ہے۔ اس کے لئے ہر (اصول اور قاعدے کی) قربانی روا ہے۔ (۵)

آپ نے غور کیا کہ اس مسلکِ سیاست کی بنیاد کیا ہے؟ وہی عقل کا تقاضا کہ اپنے مفاد کی حفاظت ہر شے پر مقدم ہے

اقوامِ عالم کی حالت

جو چیز وہاں افراد میں تھی وہی یہاں اقوام میں کارفرما ہو رہی ہے۔ اس سیاست کا نتیجہ کیا ہے؟ اسے مسٹر (WAKEMAN) کے الفاظ میں سنیئے۔ وہ کہتا ہے کہ اس سیاست کا نتیجہ یہ ہے کہ:-

قومیں ایک دوسرے کے سامنے وحشی درندوں کی طرح کھڑی ہیں اور ان کے سامنے صرف ایک اصول رہ گیا ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ (۶)

یہ تو ہے اقوام کی حالت۔ اس معاشرے میں خود انسان کی کیا حالت ہے۔ اس کے متعلق (LEWIS MUMFORD) لکھتا ہے کہ:-

ہم نے ایک نئی نسل پیدا کی ہے۔ عمدہ توانائی۔ خوبصورت جسم۔ لیکن دل بالکل خالی۔ وہ نسل جس کے نزدیک زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ یہ "مہذب وحشی" حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ میں کھڑے آفتابی غسل لے رہے ہیں۔ سمندر کے کنارے یا اپنے کمرے میں لیمپ کے سامنے۔ کبھی بیکار جنسی میلان کے تحرک سے رقص کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ لوگ کھاتے ہیں۔ پیتے ہیں۔ شادی کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ایسی زندگی جی کر، جو اگر کامیاب ہو تو محض حیوانی نشاط انگیزی کی زندگی اور اگر ناکام ہو تو حسد، خوف اور پریشانی کی زندگی حیوانی سطح پر حیوانی تسکین کے علاوہ انہیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے۔ انہیں ان حیوانی حظ ِ نفس سے محروم کر دیجئے تو ان کے لئے جینا وبالِ دوش ہو جائے گا۔ یہ ہے انسانی زندگی کا مآل۔ (۷)

یہ ہے دورِ حاضر کے اس انسان کا نقشہ جس کے متعلق (DEAN INGE) نے کہا تھا کہ:-

یہ انسان شاہراہِ حیات پر بے مقصد چلا جا رہا ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اور یہ سفر کیوں اختیار کیا ہے۔

(۸)

نہ اس کا کوئی عقیدہ ہے نہ ضابطۂ حیات۔ نہ معیار نہ اقدار۔

اسی انسان کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:-

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

(۰)

خلاصۂ مبحث

گذشتہ صفحات میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ دنیا میں دو نظریات متداول چلے آرہے ہیں۔ ایک مادیّین کا نظریہ جن کے نزدیک زندگی کا مقصد صرف جسمانی پرورش ہے۔ اس کے لئے انسان کو ہمیشہ اپنا مفاد سامنے رکھنا چاہیئے۔ اسی طرح ہر قوم کو اپنا قومی مفاد دیکھنا چاہیئے۔ ہر وہ تدبیر یا عمل جس سے اپنے مفاد کا تحفظ ہو، قابلِ ستائش ہے۔ اور ہر وہ کام جس سے اس مفاد کو نقصان پہنچے مذموم ہے۔ دنیا میں اچھے اور بُرے کا یہی معیار ہے۔ اسی معیار کے مطابق انفرادی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اور اسی کے مطابق بساطِ سیاست متشکل کرنی چاہیئے۔ اور دوسرا افلاطونی روحانیین کا نظریہ جن کے نزدیک دنیا فریب ہے، اسکی کوئی حقیقت نہیں۔ اصلِ حیات یہ ہے کہ انسان دنیا سے دور بھاگے۔ اسے قابلِ نفرت سمجھے۔ ترکِ آرزو اور ترکِ لذائذ میں مقصودِ حیات کا راز پوشیدہ ہے۔ زندہ اسے کہتے ہیں جو مرنے سے پہلے ہی مرجائے۔ انسان جس قدر اپنے نفس کو مارے گا اتنا ہی خدا کے قریب ہوتا جائے گا۔ روح کی عزّت جسم کی ذلّت میں ہے۔ خدا اسی کو ملتا ہے جو دنیا کو چھوڑتا ہے۔

اگرچہ، جیسا کہ ہم نے لکھا ہے۔ پہلا نظریہ ان لوگوں کا ایجاد کردہ ہے جو میکانکی تصوّرِ حیات کے قائل ہیں اور جنھیں مذہبی اصطلاح میں دہریئے یا خدا کے منکر (ATHEISTS) کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ بغور دیکھیں تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ یہ نظریہ منکرینِ خدا ہی سے وابستہ نہیں بلکہ دنیا کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جو خدا کی ہستی کا قائل بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس نظریہ پر عامل بھی۔ لہٰذا یہ نظریہ خدا کے اقرار یا انکار سے وابستہ نہیں (SPALDING) اس نظریہ کو (THIS WORLDLINESS) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ (۹) یہ وہی بات ہے جسے

ہمارے ہاں عام طور پر "دنیا داری" کہا جاتا ہے۔

دوسرا نظریہ افلاطونی فلسفۂ زندگی کا پیدا کردہ تھا جسے بعد میں ویدانت یا تصوّف نے اپنایا۔ لیکن اب یہ نظریہ نہ تو افلاطونی فلسفہ کے ساتھ وابستہ ہے اور نہ ہی ویدانت اور تصوف سے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اسے "دنیا داروں" کے مقابلہ میں "خدا پرستوں" کا نظریہ سمجھا جاتا ہے۔ آج دنیا کے تمام مذاہب اسی نظریہ کے حامل ہیں۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی بھی یہی حالت[1] ہے۔ ان کے ہاں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ "دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتّے"۔ "دنیا جیل خانہ ہے اور کوئی خدا پرست اس سے دل نہیں لگا سکتا۔ جو شخص جتنا یہاں ذلیل ہوگا خدا کے ہاں مقرّب کہلائے گا۔ دنیا کی دولت وحشمت کوئی شے نہیں۔ اصل مقصد عاقبت کی سرخروئی ہے"۔ "اسلام غریبوں میں آیا، غریبوں میں رہا۔ اور پھر غریبوں ہی میں لوٹ کر آئے گا"۔ خدا کی بادشاہت، کمزوروں اور ناداروں کے لئے ہے۔ یہ عقائد دنیا کے تمام مذاہب میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں۔ (SPALDING) اسی نظریہ کو (OTHER - WORLDLINESS) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ (۱۰) وہی چیز جو ہمارے ہاں عرفِ عامہ میں "آخرت سنوارنا" کہلاتی ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ دنیا انہی دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ یہ تقسیم دورِ حاضر کی پیداوار نہیں۔ شروع سے ایسا ہی چلا آرہا ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ربوبیت (انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما) نہ پہلے گروہ کے ہاتھوں ممکن ہے۔ نہ دوسرے کے۔ پہلے گروہ کا نظریہ صرف انسانی جسم کی پرورش ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک انسان نام ہی جسمانی زندگی کا ہے۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان صرف جسم کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ میکانکی نظریۂ حیات میں انسانی ذات کی پرورش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جسم کی پرورش کے سلسلے میں بھی وہ کھینچا تانی ہوتی ہے جس سے دنیا جہنم میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے۔

دوسرا نظریہ ترکِ دنیا کا حامل ہے۔ جس میں جسم کی پرورش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ باقی رہی انسانی ذات

---

[1] مسلمانوں کی یہ حالت اس لئے ہے کہ ان کا مروجہ مذہب وہ نہیں جو قرآن نے دیا تھا۔ یہ مذہب بعد کی پیداوار ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی مجوسیوں (ایرانیوں) کی اشخاص پرستی اور تقدیر کا عقیدہ۔ یہودیوں کی رسومات اور روایات پرستی اور عیسائیوں (افلاطونیت) کا تصوف ہیں۔ قرآن ان سب کے خلاف صدائے احتجاج تھا۔ لیکن مسلمان نے قرآن کو "مردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے" رکھ لیا اور مذہب وہ اختیار کر لیا جو اسے غیر قرآنی سرچشموں سے ملا۔ یہی مذہب ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔

سوا اس کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ یہ جس قدر جلد اپنا جداگانہ تشخص کھو کر اپنی اصل میں جا ملے، اتنا ہی اچھا ہے۔ لہٰذا، اس میں بھی انسانی ذات کی پرورش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ربوبیت کے پہلے نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا درندوں کا بھٹ بن رہی ہے اور دوسرے نظریئے سے انسانوں کی بستیاں قبرستانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اقبالؒ پہلے نظریے کو "مغرب" اور دوسرے کو "مشرق" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور سرد آہ بھر کر کہتا ہے کہ

مغرب ز تو بیگانہ ــــ مشرق ہمہ افسانہ

اب آیئے دیکھیں کہ اس باب میں قرآن کیا کہتا ہے۔

P.66 -(1) The Theory Of Good And Evil, Vol. II; p.280
(2) The Universe In The Light Of Modern Physics

P.67 - (3) The Principles of Ethics, quoted by H.L.Mencken, in "Treatise on Right & Wrong"

P.70 -(4) Political Testament; quoted by R.Murray in "The Individual And The State" p.212
-(5) Quoted by Murray -do- p.216
-(6) The Ascendancy of Power. p.178
-(7) Quoted by Sheen in "Philosophy of Religion" p.33

P.71 -(8) The Fall of The Idols. p.236
-(9) Civilisation in East and West.

P.72 -(10) -do-

چوتھا باب

قرآنی نظریۂ حیات

گذشتہ باب میں زندگی کے جو دو نظریئے پیش کئے گئے ہیں انہیں ایک مرتبہ پھر سامنے لے آیئے۔ کیونکہ اب ان ہی نظریوں پر بحث ہوگی۔ قرآن نے ان دونوں نظریوں کی تردید کی ہے اور ان کے خلاف ایک تیسرا نظریۂ حیات پیش کیا ہے۔ لیکن اس نظریہ تک پہنچنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ قرآن، ان دونوں نظریوں کے متعلق کیا کہتا ہے۔

"روحانیین" کا نظریۂ حیات اتنا کمزور اور بدیہیات سے چشم پوشی پر مبنی ہے کہ قرآنِ کریم نے اس کی تردید میں کچھ زیادہ دلائل کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ :-

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ..... (۵۷/۲۷)

یہ مسلکِ رہبانیت ان لوگوں کا خود تراشیدہ ہے۔ ہم نے انہیں اس مسلک کا حکم نہیں دیا تھا۔ ہم نے (اس کے برعکس ان سے یہ کہا تھا[1] کہ تم اپنی زندگی کو قانونِ خداوندی کے ساتھ ہم آہنگ رکھو۔ (انہوں نے اس کی بجائے اس روش کو

---

[1] اس ٹکڑے کا یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے "رہبانیت" اس خیال کے ماتحت وضع کی تھی کہ اس سے زندگی کے وہ نتائج حاصل

(باقی ۷۵ پر)

اختیار کرلیا) اور پھر لطف یہ کہ اپنے خود اختیار کردہ مسلک کو بھی نباہ نہ سکے (کیونکہ یہ نبھنے والا تھا ہی نہیں)

رہبانیت زندگی کی کشمکش سے فرار کا نام ہے۔ یہ زمانے کے ٹھوس تقاضوں کے مقابلے سے شکست خوردگی کا اعلان ہے۔ بھلا اس قسم کے مسلک کا حکم اس خدا کی طرف سے کس طرح مل سکتا تھا جس نے انسان سے علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ:۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ۔ (۴۵/۱۳)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے قانون اور قاعدے کی زنجیروں میں اس لئے جکڑ رکھا ہے کہ تم اسے اپنے کام میں لاسکو۔

دنیاوی متاع وجہ جاذبیت ہے

اس نے کہا کہ دنیاوی مال و منال اور معاشی سہولتیں اور خوشگواریاں انسان کے لئے وجہ جاذبیت ہیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ......[1] (۳/۱۴)

انسان کے لئے عورت مرد کے تعلقات۔ اولاد۔ مال و متاع۔ چنے ہوئے گھوڑوں اور مویشیوں اور کھیتی (کی پیداوار) میں جاذبیت رکھ دی ہے.......

حقیقت یہ ہے کہ اگر اس نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو قرآن کے عجیب و غریب حقائق سامنے آتے ہیں۔ آپ کائنات میں غور کیجئے۔ دو نمایاں پہلو آپ کے سامنے آئیں گے کائنات کے مختلف عناصر میں یا تو قوت و جلال دکھائی گا اور یا حسن و جمال۔ اس میں بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج کے ساتھ قوسِ قزح کی رنگینیاں اور ابرِ رحمت کی زینت آفرینیاں دکھائی دیں گی۔ اس میں اگر تیز ہواؤں کا جھکڑ اور طوفان ہے تو دوسری طرف نسیمِ سحری کا خرامِ ناز بھی ہے۔ اس کے جنگلات میں اگر بڑے بڑے تناور درخت اکڑے کھڑے ہیں تو صحنِ گلستان میں سبزۂ نورستہ کا قالین بھی

---

[1] (بقیہ فٹ نوٹ از صفحہ ۷۴) ہو جائیں گے۔ جو مقصودِ حیات ہیں۔ لیکن اول تو ان کا یہی خیال غلط تھا۔ دوسرے یہ روش بجائے خویش ایسی ناممکن العمل تھی کہ انہوں نے اس کو اختیار کرنے کو تو کرلیا لیکن نباہ نہ سکے۔

[1] (صفحہ ہٰذا) قرآن نے جن آیات میں حیوٰۃ الدنیا اور حیاتِ آخرت کا مقابلہ کیا ہے ان کا ذکر بعد میں آگے آئے گا۔ سردست ان آیات کا اتنا حصہ ہی درج کیا جاتا ہے جس کا تعلق حیاتِ دنیاوی سے ہے۔

بچھ رہا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھئے کہ اگر پھلوں اور فصلوں میں سامانِ ربوبیت اپنے افادی پہلو کو لئے ہوئے ہیں تو ان ہی پھلوں کا رنگ اور خوشبو، جانفزائی کی ہزار جنتیں اپنے آغوش میں رکھتے ہیں۔ یہاں صرف غلّہ ہی پیدا نہیں ہوتا پھول بھی مہکتے ہیں۔ یعنی کائنات میں صرف افادی پہلو ہی نہیں، حُسن کا پہلو بھی ہے۔ اس میں صرف جلال ہی نہیں جمال بھی ہے۔

آپ تاریخِ انسانی پر غور کیجئے۔ اس نے ہمیشہ یہ کیا کہ کائنات کے جلال (یا افادیت) کے پہلو کو لیا۔ لیکن حسن و جمال کے پہلو کو نظر انداز کر دیا۔ اور کبھی جمالیاتی (AESTHETIC) پہلو کو لیا اور قوت و اقتدار کو پس پشت ڈال دیا۔ لیکن قرآن نے آکر کہا کہ یہ انسان کی بھول ہے، اس کی نگاہ کی غلطی ہے۔ یہاں جلال اور جمال ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ حسن اور قوت دونوں کا سرچشمہ ایک ہے جسے اللہ کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ دیکھو۔ کائنات کی مختلف قوتیں دن اور رات سرگرمِ عمل ہیں۔ (یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (۶۴/۱) یہ کس لئے سرگرمِ عمل ہیں؟ اس لئے کہ کائنات کے جلالی اور جمالی گوشوں کو بے نقاب کریں۔ اور اس طرح بتا دیں کہ قوت اور حسن دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ (لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ۔ ۶۴/۱)۔ مُلک کے معنی قوت اور اقتدار ہیں اور حمد کے معنی ہیں (APPRECIATION) تحسین، تاثرِ جمال، کسی حسین شے کو دیکھ کر آپ کی زبان سے بے اختیار واہ! واہ! نکل جاتا ہے۔ یہ ہے اس کی حمد۔ لہٰذا، قوت اور اقتدار اور جمالیاتی پہلو دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔

اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں قرآن نے ایک اور اہم حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جلال اور جمال، مُلک اور حمد، قوت اور حسن دو متضاد عناصر نہیں ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی ضد یا نقیض نہیں ہیں۔ جنہیں تم ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہو، وہ ایک دوسرے کے زوج (COMPLEMENTARY) ہیں۔ اسلئے قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے ہر شے کی زوج پیدا کی ہے۔ رات اور دن، ظلمت اور نور، قوت اور حسن، ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ یہ باہمدگر متماثل ہیں۔ ان کا باہمدگر متضاد ہونا تو ایک طرف ان کی تو کیفیت یہ ہے کہ ان میں سے ایک، دوسرے سے نمودار ہوتا ہے۔ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ (۳/۲۶)۔ رات کی تاریکی غیر محسوس طور پر دن کی روشنی میں داخل ہوجاتی ہے اور دن کی روشنی رات کی تاریکی میں جا چھپتی ہے اس لئے جن چیزوں کو تم ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہو وہ صرف قانونِ خداوندی کے "پیمانوں کے اختلاف" کی نمود ہیں۔ ان پیمانوں کے بدلنے سے، کائنات کے تغیرات سامنے آتے رہتے ہیں۔

اس لئے جلال اور جمال باہمدگر متضاد نہیں۔ قوت اور حُسن ایک دوسرے کی نقیض نہیں۔ جو ایک جگہ اکٹھے نہ ہو سکیں۔ (یہ ایرانی ذہن کی غلط نگہی تھی کہ اس نے نور اور ظلمت کو دو متضاد قوتیں سمجھ کر" دینِ مجوس" کی طرح ڈال دی)۔ لہٰذا، وہ نظریۂ زندگی جس میں حسن و جمال اور تزئین و آرائش سے نفرت سکھائی جاتی ہو، کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ صحیح نظریۂ حیات، مختلف عناصر میں اعتدال، تناسب اور توازن کا قائم رکھنا ہے۔ اس نے کہا (اور ایسا کہتے وقت اس کے پیشِ نظر خانقاہیت کی زندگی کے علمبردار تھے جو کائنات کی ہر حسین سے آنکھیں بند کر کے عزلت نشینی اور گوشہ گیری کی روش اختیار کر چکے تھے) کہ تم سمجھتے ہو کہ تزئین و آرائش اور تحسین و تجمیل اطاعتِ خداوندی کی راہ میں حائل ہوتی ہے، ہمارا قانون یہ ہے کہ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ[1] وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ (۷/۳۱) تم قانونِ خداوندی کی اطاعت کے ہر پہلو سے زینت و جمال اخذ کرو۔ اور زینت و جمال۔ صحیح تناسب و توازن کا نام ہے۔ تم دنیا کی تمام خوشگوار چیزوں کو کھاؤ پیو، لیکن ان میں اعتدال رکھو اور ان سے حاصل کردہ قوتوں کو اس طرح صرف نہ کرو کہ ان سے تعمیری نتائج پیدا نہ ہوں۔

اس کے بعد بتایا کہ اس تصور کے مطابق جو معاشرہ مرتب ہوگا اس کا نقشہ کیا ہوگا؟ اس نقشے کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ زینت و جمال کی کونسی چیز ہے جو اس کے اندر نہیں آگئی۔ وہ کہتا ہے کہ گھنی چھاؤں کے باغات جن کے نیچے آب رواں ہو۔ اس باغ میں چھپر کھٹ بچھے ہوئے۔ تکیے لگے ہوئے۔ ان پہ آرام کرنے والے دبیز اور باریک ریشم میں ملبوس، سونے کے کنگن پہنے ہوتے (جو اس زمانے میں سرداری کی علامت ہوتے تھے۔) یہ ہے نقشہ اس معاشرے کا۔ (دیکھئے ۱۸/۳۱)

قرآنِ کریم زندگی کے جمالیاتی پہلو کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ جن مقامات میں عام نگاہیں صرف افادی پہلو پر رُک کر رہ جاتی ہیں وہ ان کے سامنے جمالیاتی پہلو بھی لے آتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے مویشی پیدا کئے ہیں۔ ان کی اون سے تم گرم لباس بناتے ہو۔ ان کی دوسری چیزوں کو کئی اور منفعت بخش کاموں میں لاتے ہو۔ ان کا گوشت کھاتے ہو۔ یہ سب ان کے افادی پہلو ہیں۔ عام نگاہیں یہیں تک پہنچ کر رُک جاتی ہیں۔ لیکن وہ اس

---

[1] ظاہر ہے کہ اس جگہ مسجد کے معنی "مسلمانوں کی مسجد" نہیں ہو سکتی۔ ایک تو اس لئے کہ یہاں خطاب یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ سے ہے یعنی تمام نوعِ انسانی سے نہ کہ مسلمانوں سے۔ اور دوسرے یہ کہ مسجد کے بعد وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا (کھاؤ پیو) کا حکم اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد کوئی عمارت نہیں ہے۔ مسجد سے یہاں مراد خود سجدہ (یعنی اطاعت) ہے۔

سے آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ ذرا اس منظر کو سامنے لاؤ جب شام کے وقت تمہارے مویشی باہر سے چرچگ کر گاؤں کی طرف واپس آتے ہیں۔ وہ منظر کس قدر حسین ہوتا ہے۔ یا علی الصبح نور کے تڑکے جب تم انھیں باہر کھیتوں میں لے جاتے ہو، وہ منظر بھی کس قدر دلکش ہوتا ہے۔ اس لئے اُن کے افادی پہلو کے ساتھ ہی یہ جمالیاتی پہلو بھی ہے۔ (وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ﴿۱۶/۶﴾)۔ اسی طرح دو تین آیتوں کے بعد فرمایا۔ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً۔ (۱۶/۸)۔ اس نے گھوڑے، خچریں اور گدھے پیدا کئے جن پر تم سوار ہوتے ہو، اور یہ تمہارے لئے باعثِ زینت بھی ہیں۔

قرآنِ کریم نے اس طرح واضح الفاظ میں بیان کر دیا کہ زینت و آرائش کی یہ سب چیزیں ہم نے انسان ہی کے لئے پیدا کی ہیں۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ جب ان چیزوں کو ہم نے وجۂ جاذبیت بنایا ہے، تو وہ کون ہے جو انھیں حرام قرار دے سکتا ہے؟

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ (۷/۳۲)۔

ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو حرام قرار دے دے جو اللہ نے اپنے بندوں کے فائدے کے لئے پیدا کی ہیں (اور رزق کی خوشگواریوں کو ممنوع قرار دیدے؟

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کس زجر و توبیخ سے کہا ہے کہ کون ہے جو دنیاوی جاذبیتوں اور معاشی خوشگواریوں کو حرام قرار دے کر ایسی حسین و جمیل دنیا کو ماتم کدہ بنا دے جس میں ہر چہرہ یبوست آمیز اور ہر پیشانی شکن آلود نظر آئے؟ اس نے کہا کہ دنیاوی دولت و حشمت، قوت و سطوت، حکومت اور سلطنت، اقتدار و اختیار، خدا کی نعمتیں ہیں۔ خدا کے جتنے رسول آئے وہ اپنی قوموں کو ان نعمتوں کے حصول کی تلقین کرتے رہے اور ان کی طرف توجہ دلاتے رہے۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم خدا کی ان نوازشات کو یاد کرو کہ اس نے تمہیں قومِ نوحؑ کے بعد استخلاف فی الارض (حکومت و سطوت) عطا فرمائی۔

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (۷/۶۹)

تم اللہ کی ان نوازشات کو سامنے رکھو تاکہ تم کامیاب زندگی بسر کر سکو۔

یہی حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے کہا۔

تم خدا کی اس نوازش کو سامنے رکھو کہ اس نے تمہیں قومِ عاد کے بعد ملک میں تمکن عطا کیا۔ تم نرم زمین پر محلات بناتے ہو اور سخت پہاڑوں کو تراش تراش کر (محفوظ) قلعے تعمیر کرتے ہو۔ (۷/۷۴)

حضرت شعیبؑ نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ "تم خدا کی اس نوازش کو فراموش نہ کرو کہ تم ملک میں بہت قلیل تعداد میں تھے۔ اس نے تمھیں کثرت عطا کی" (۷/۸۶) جس سے تم ایک طاقتور قوم بن گئے۔ آلِ ابراہیم کے متعلق ہے کہ "ہم نے انھیں کتاب و حکمت عطا کی" اور اس کے ساتھ ہی

وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا۔ (۴/۵۴)

ہم نے انھیں ایک عظیم الشان سلطنت بھی دی۔

حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تمام داستان اسی قوت و حشمت اور تمکن و تسلّط کی مسلسل تاریخ ہے۔ اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ قرآن نے اس داستان کو بڑی شدّت و تکرار سے دہرایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس قوم کی پیہم کشمکش اور مسلسل جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ:-

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۔ (۷/۱۳۷)

اور ہم نے (اس طرح اس قوم کو جو دنیا میں نہایت کمزور اور حقیر شمار کی جاتی تھی، اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا مالک بنا دیا جو اپنے اندر سامانِ پیدائش کی فراوانیاں رکھتی تھی۔ اور اس طرح خدا کا قانون حسن کارانہ انداز سے قوم بنی اسرائیل کے حق میں اُن کے استقلال و استقامت کی وجہ سے پورا ہوا۔ اور فرعون اور اس کی قوم کا ساختہ پرداختہ اور ان کی فلک بوس عمارات سب درہم برہم ہوگئیں۔

خدا کا یہ قانون (کہ حکومت و سلطنت اور غلبہ و اقتدار صلاحیتوں کے بیدار کرنے اور جدوجہد اور سعی و عمل سے حاصل ہوتا ہے) صرف بنی اسرائیل ہی کے حق میں پورا نہیں ہوا۔ بلکہ جس قوم نے بھی اس قانون کے مطابق عمل کیا، وہ صاحبِ تخت و نگیں ہو گئی۔ چنانچہ خود (صدرِ اوّل کے) مسلمانوں سے کہا گیا کہ تمھاری سعی و کاوش کا نتیجہ یہ نکلا کہ:-

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـــُٔوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۔ (۳۳/۲۷)

اور اس نے تمھیں (تمھارے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کی دولت کا مالک بنا دیا اور (اس کے علاوہ) اس سرزمین کا بھی جہاں (اس سے پہلے) تمھارے قدم بھی نہ پہنچے تھے۔ اللہ (کے قانون) نے ہر شے کے

پیمانے مقرر کر رکھے ہیں (اور ہر نتیجہ ان ہی پیمانوں کے مطابق برآمد ہوتا ہے)۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے حجاز کی بے برگ وگیاہ وادی میں کعبہ کی بنیاد رکھی تو اس بستی کے متعلق جو دعا کی تھی، اس میں یہی عرض کیا تھا کہ "اے میرے پروردگار! اس بستی کو امن و سکون کا مقام بنا اور اس کے باشندوں کو پھلوں کا رزق عطا فرما" (۱۴/۳۷)۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے قریشِ مکہ پر جو اپنے انعامات گنائے ہیں ان میں یہی کہا ہے کہ "خدا نے انھیں بھوک رفع کرنے کے لئے رزق عطا کیا اور خوف سے انھیں مامون کیا" (۱۰۶/۴)۔ خود نبی اکرمؐ سے فرمایا کہ "تم غریبی کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے، اللہ نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے کہ تم غنی ہو گئے" (۹۳/۸)۔ سامانِ خورونوش ہی سے مردہ بستیاں زندہ ہوتی ہیں۔ (۵۰/۱۱) اور قانونِ خداوندی کے اتباع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "زمین اور آسمان سے رزق کی فراوانیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ (۵/۶۶)۔ صرف رزق ہی نہیں بلکہ "رزقِ کریم" (عزت کی روٹی) جس کے معنی حکومت و سلطنت ہیں۔ چنانچہ اُس نے کہا کہ "ہمارا وعدہ ہے کہ جو قوم ہمارے قانون کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے اور پھر صلاحیت بخش کام کرے۔ ہم اسے حکومت عطا کر دینگے" (۲۴/۵۵)۔ ہم ایسے لوگوں کو نہایت خوشگوار زندگی بسر کرائیں گے (۱۶/۹۷)۔ ان کے لئے خوشحال زندگی کی زندہ بشارتیں ہیں۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ... (۱۰/۶۴)

ان کے لئے دنیاوی زندگی میں خوش خبریاں ہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ اس قانون کی خلاف ورزی کریں گے ان کے لئے

خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ..... (۵/۳۳)

دنیاوی زندگی میں رسوائی ہے۔

اس رسوائی کی تفصیل کیا ہے؟ بھوک اور خوف کا عذاب۔ رزق کی تنگی۔

.... فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔ (۱۶/۱۱۲)

پس اس قوم کے جرائم کی پاداش میں اللہ نے انھیں بھوک اور خوف کی سزا کا مزہ چکھایا۔ (نیز ۲/۱۵۵)

یعنی رزق کی فراوانی معاشی سہولتیں اور خوشگواریاں خدا کی نعمتیں ہیں، اور اس کے برعکس رزق کی تنگی۔ بھوک اور خوف خدا کا عذاب ہے۔ دوسری جگہ ہے:۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ (۲۰/۱۲۴)

جو کوئی قانونِ خداوندی سے اعراض برتے گا۔ تو اس کی معیشت اس پر تنگ ہو جائے گی۔

اتنا ہی نہیں قرآن نے اس حقیقت کو اور بھی زیادہ واضح الفاظ میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے " خدا پرستوں " کے نزدیک انسانی زندگی کا منتہیٰ یہ ہے کہ جنّت مل جائے۔ تمام نیکیاں حصولِ جنّت کی خاطر کی جاتی ہیں جنّت کی دوسری تفاصیل کو (سردست) چھوڑیئے۔ قرآن میں قصۂ آدمؑ[1] کے ضمن میں ہے کہ آدم سے کہا گیا تھا کہ ابلیس تمہارا دشمن ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکلوا دے۔ اور اس کے بعد تمہیں مشکلات کا سامنا ہو (فَتَشْقٰى) حالانکہ تمھاری یہاں یہ حالت ہے کہ:۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸-۱۱۹)

تمھیں نہ بھوک کی تکلیف ہے نہ لباس کی۔ نہ پیاس کی، نہ مکان (دھوپ) کی۔

جنّت کی زندگی

یعنی جنت کی زندگی میں بھوک، پیاس، لباس اور مکان کی تنگی نہیں ہوتی۔ غور کیجئے کہ یہی چیزیں انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں۔ لہٰذا جنّت کی زندگی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسان اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا اور دوسری جگہ ہے کہ جنت میں " آدم اور اس کی بیوی " سے کہہ دیا گیا تھا کہ، وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا[2] (۲/۳۵) " تم اس میں جہاں سے جی چاہے بافراغت کھاؤ پیو " یعنی جنت کی زندگی میں سامانِ خور و نوش کی طرف سے بالکل اطمینان ہوگا۔ اس کے حصول میں نہ کسی قسم کی مشقت اٹھانی پڑے گی نہ تکان ہوگی (۳۵/۳۵) اس رزق کی فراوانی کو دیکھ کر اہلِ جنت خدا کا شکر ادا کریں گے۔ (اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ۔ ۳۵/۳۴) کہ اس نے ہر قسم حزن دور کیا۔ اس کے علاوہ متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے کہ جنّت کی زندگی میں (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ)۔ نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ ہر قسم کی حفاظت بھی ہوگی اور فکرِ معاش کی طرف سے اطمینان بھی۔ صرف فکرِ معاش کی طرف سے اطمینان ہی نہیں بلکہ وہاں سامانِ خور و نوش اور آرائش و زیبائش کی فراوانیاں ہوں گی۔ قرآن میں جنت کی زندگی کی تفاصیل دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ آسائشوں اور خوشگواریوں کی کونسی چیز ہے جس کی وہاں فراوانی اور ارزانی نہیں۔ ریشم و کمخواب کے ملبوسات (جَنَّةً وَّحَرِيْرًا (۷۶/۱۲)) مسندیں اور صوفے (مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ۔ (۷۶/۱۳))۔ پھلوں کے ڈھیر (ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا۔ (۷۶/۱۴)) چاندی کے برتن اور شیشے کے کنٹر (بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا (۷۶/۱۵)) باریک اور دبیز حریر و اطلس

---

[1] قرآن کی رو سے قصۂ آدم سے مفہوم کیا ہے۔ اس کے لئے میری کتاب " ابلیس و آدم " دیکھئے۔

[2] یہی الفاظ ہیں جو بنی اسرائیل سے اس وقت کہے گئے جب انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر سینا کی وادیوں میں لایا گیا ہے (۲/۵۸)

کے پردے اور ملبوسات (ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ۔ (۷۶/۲۱) ہیرے اور جواہرات کے مرصع زیور (اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا (۲۲/۲۳)(۳۵/۳۳) زیور ہی نہیں بلکہ سونے کے طباق اور آبخورے (بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ۔ (۴۳/۷۱) دودھ اور شہد اور خمر لذیذ کی نہریں۔ (۴۷/۱۵)، ہر قسم کے پھل اور گوشت (بِفَاكِهَةٍ وَّ لَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ۔ (۵۲/۲۲) نرم و نازک قالین اور ریشمی فرش (رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ۔ (۵۵/۷۶) ایسے مشروبات جن پر مشک کی مہریں لگی ہوں گی۔ (رَحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ۔ (۸۳/۲۵) غرضیکہ ہر وہ چیز جسے وہ چاہیں گے (لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا۔ (۵۰/۳۵) جو مانگیں گے ملے گا۔ (وَلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ۔ (۳۶/۵۷) ہر وہ شے جس سے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہو۔ (فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ۔ (۴۳/۷۱) اور ان آسائشوں اور نعمتوں کے اثرات ان کے چہرے کی تازگی سے نظر آئیں گے۔ (تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ۔ (۸۳/۲۴) یہ ہے قرآن کی رو سے جنت کی زندگی جو قرآنی پروگرام کے مطابق عمل کرنے سے ملتی ہے۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے جنت کی زندگی، صرف مرنے کے بعد حاصل نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں جو معاشرہ، قرآنِ کریم کے قوانین کے مطابق متشکل ہوتا ہے اسے بھی جنتی زندگی کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ جنت کی آسائشیں اور زیبائشیں، وہاں کی فراوانیاں اور خوش حالیاں، اسی دنیا کی زندگی میں حاصل ہو جاتی ہیں۔ مرنے کے بعد کی جنت کے سلسلہ میں ان کا بیان تمثیلی ہے۔ وہاں کی آسائشوں کی حقیقت کیا ہوگی، اسے ہم انسانی شعور کی موجودہ سطح پر نہیں سمجھ سکتے۔ نہ ہی یہ چیز اس وقت ہمارے زیرِ نظر ہے۔ اس وقت ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے جنتی زندگی، آسائشوں اور خوش حالیوں کی زندگی ہے اور اس دنیا میں بھی حاصل ہو سکتی ہے اور اگلی دنیا میں بھی۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ قرآن کی رُو سے اس دنیا کی خوشحالی اور خوشگواری کی زندگی اللہ کی نعمت ہے۔ انسان کے حسنِ عمل کی جزا حکومت و سلطنت اور دولت و ثروت ہے۔ رزق کی فراوانی اور ضروریاتِ زندگی کی طرف سے اطمینان کامرانیوں کی جنت ہے۔ دنیا کی زیب و زینت کی چیزیں وجہِ جاذبیت ہیں۔ جن کی طلب اور تمتع عین منشائے خداوندی کے مطابق ہے۔ اس کے برخلاف ذلت اور رسوائی، محکومی اور کمزوری، بے بسی اور بے کسی۔ بھوک اور خوف خدا کا عذاب ہے۔ جو اس قوم پر مسلط ہوتا ہے جو اس کے قانونِ کائنات سے سرکشی یا اعراض برتتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ "روحانیین" کا وہ نظریہ جس کی رُو سے دنیا اور اس کی جاذبیتوں کو قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے اور یہاں کی ذلت و خواری اور فقر و فاقہ کو جنت کی نشانی قرار دیا جاتا ہے، قرآنی

تصورِ حیات کے یکسر خلاف ہے۔

یہ تو ہوا پہلے نظریہ کے متعلق۔ اب دوسرا نظریہ لیجئے۔ جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے۔ اس لئے ربوبیت سے مراد صرف جسمِ انسانی کی پرورش ہے اور بس۔ جب (موت سے) جسمِ انسانی کی طبعی زندگی ختم ہو جائے گی تو انسان بھی ختم ہو جائے گا۔ اس لئے انسانی تگ و تاز کا ماحصل یہ ہے کہ اس کی موجودہ زندگی کسی نہ کسی طرح عیش و آرام سے گزرے۔ کھانے کو عمدہ غذا۔ پہننے کو اچھے اچھے کپڑے۔ رہنے کو کشادہ مکان۔ ان کے علاوہ دیگر آسائش کے سامان۔ اگر یہ سب کچھ میسر آجائے تو سمجھا جاتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک انسان سے مراد صرف اس کا جسم ہے اور ربوبیت سے مراد انسانی جسم کی پرورش۔

قرآن اس نظریہ کی بھی تردید کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک

(۱) یہ نظریہ حقیقت کے خلاف ہے۔ انسان صرف جسم ہی کا نام نہیں۔ جسم کے علاوہ انسانی ذات (نفس) بھی ہے جو حیاتِ جاوداں حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔

(۲) دوسرے یہ کہ مادیّین کے نظریہ کے ماتحت مستقبل کی زندگی تو چھوڑیئے، خود اس دنیا میں تمام انسانوں کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکتا۔

اس کے خلاف قرآن ایک ایسا نظام متعین کرتا ہے جس میں تمام نوعِ انسانی کی نہ صرف ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی ہی کا اطمینان بخش انتظام ہو جاتا ہے بلکہ ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشو و نما پانے کا بھی بطریقِ احسن بندوبست ہو جاتا ہے اور اس طرح

(۳) خود انسانی ذات کی نشو و نما بھی ہوتی جاتی ہے جس سے وہ اس زندگی کے بعد اگلی زندگی کی منزلیں طے کرنے قابل بھی ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ انسانی زندگی کی موجودہ منزل میں، انسانی ذات کی نمود اس کے طبعی پیکر (جسم) کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس لئے انسانی جسم (یعنی اس کی طبعی زندگی) کا تندرست و توانا اور نشو و نما یافتہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ لہٰذا، اس سطحِ زندگی پر انسان کی مادی ضروریات کا نہایت خوشگوار طریق سے پورا ہونا، خود اس کی ذات کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ مادی ضروریات کا پورا ہونا ضروری تو ہے لیکن مقصود بالذات نہیں۔ یہ انسانی ذات کے نشو و نما کے بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے جس طرح گھوڑا، مسافر کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

اب آگے چلیئے:۔

نفسِ انسانی ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ منزلِ انسانیت میں پہنچ کر زندگی کی ارتقائی حالت وہ نہیں رہی جو حیوانات تک تھی۔ انسان میں ایک اور چیز کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ جسے قرآن نے "نفخِ روحِ خداوندی" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے (جیساکہ باب دوم میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) اب خود مغرب کے مفکرین بھی تسلیم کر رہے ہیں۔ مثلاً (OUSPENSKY) کہتا ہے:-

> ہر انسان دو ہستیوں کا مجموعہ ہے۔ ایک وہ جو جمادات۔ نباتات اور حیوانات کا مرکب ہے۔ یعنی وہ انسان جو زمان و مکان کی دنیا میں رہتا ہے۔ اور دوسرا وہ جس کی دنیا اس سے الگ ہے۔ اول الذکر انسان ماضی سے متعلق ہے اور ثانی الذکر مستقبل کا انسان ہے...... انسانی انا میں اس ماضی اور مستقبل کی کشمکش جاری رہتی ہے انسانی روح درحقیقت اسی کشمکش کی رزمگاہ ہے۔ (۱)

نیٹشے نے زرتشت کی زبان سے اسی حقیقت کا اعلان کیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ:-

> میں دیروز اور امروز ہوں۔ لیکن مجھ میں کچھ ایسا بھی ہے جو فردا اور مستقبل سے متعلق ہے۔ (۲)

یعنی زندگی، جمادات، نباتات، حیوانات کے مراحل سے گذرتی ہوئی درجۂ انسانی میں پہنچی ہے۔ یہ انسان کی سابقہ (ماضی کی) تاریخ ہے۔ لیکن انسان کا مستقبل اس ماضی کی بڑھتی ہوئی شکل نہیں بلکہ مستقبل کا انسان ماضی کے انسان سے مختلف ہے، اس لئے کہ انسان کے درجہ میں پہنچ کر ایک نئی چیز کی نمود ہوتی ہے جسے انسانی ذات (-PER SONALITY) یا نفس (SELF) کہا جاتا ہے۔ اب مستقبل اس ذات یا نفس کا ہوگا۔ انسانی جسم۔ جمادات، نباتات اور حیوانات ہی سے مرکب ہے۔ اس لئے اس میں طبعی قوانین کے تحت ہر آن تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن انسانی ذات یا نفس۔ خدائی طاقت (روح) کا مظہر ہے اس لئے یہ خارجی تغیرات سے متاثر نہیں ہوتا۔ علم الابدان کے ماہرین کا کہنا ہے کہ جسمِ انسانی اس طرح مسلسل تغیرات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد سارے کا سارا جسم بالکل نیا بن جاتا ہے۔ یعنی آپ کا جو جسم دس سال پہلے تھا اس میں سے آج کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ آپ کا آج کا جسم ایک نیا جسم ہے لیکن جس چیز کو آپ "میں" کہتے ہیں وہ بدستور وہی ہے۔ آپ نے اگر کسی سے دس سال پہلے کوئی معاہدہ کیا تھا، تو آپ ہر وقت تسلیم کرتے ہیں کہ یہ معاہدہ "میں" نے ہی کیا تھا۔ اور "میں" ہی اس کا پابند ہوں۔ یہی وہ "میں" ہے جو جسم کے ساتھ بدلتا نہیں رہتا۔ بلکہ ہمیشہ غیر متبدل (مستقل) رہتا ہے۔ لہٰذا، یہ "میں" جسم کا حصہ نہیں، اس سے الگ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان تغیر (CHANGE) اور ثبات (PERMANENCE) سے مرکب ہے۔ باردیو (BERDYEAU) کے الفاظ میں:-

دنیا میں جس قدر تغیرات رونما ہوتے ہیں ان کے متعلق انسان کا اندازۂ نگاہ دہرا ہونا چاہیئے۔ زندگی تغیر کا نام ہے۔ جدت کے بغیر زندگی کچھ نہیں۔ لیکن صرف تغیر کا تصور فریب انگیز ہے۔ انسان میں ایک ایسی شے بھی ہے جو تغیر سے ناآشنا ہے۔ اس کے بغیر تشخصِ ذات کا تصور ناممکن ہے۔ لہٰذا اپنی ذات کے نشوونما میں انسان کو خود اپنی ذات سے فریب دہی نہیں کرنی چاہیئے۔ یعنی اسے اس مستقل شے کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے جو اسے ابدی طور پر ملی ہے

عام اشیاء کی صورت میں تغیر (CHANGE) کے معنی یہ ہیں کہ اس شے کی (جس میں تغیر واقع ہوتا ہے) پہلی حالت یکسر معدوم ہوجاتی ہے اور اس کے بعد وہ شے از سرِنو ایک نئی حالت میں پیدا ہوتی ہے۔ اسکے برعکس برگسان کے الفاظ میں انسانی ذات کی خصوصیت یہ ہے کہ "ہم میں تغیر تو آتا ہے لیکن معدوم ہوئے بغیر۔" (۳)

یہی انسانی انا یا ذات کی خصوصیت ہے۔ پھر جیسا کہ (باب دوم میں برگسان کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے) انسانی ذات مرکب نہیں، بسیط ہے۔ جوڈ اس باب میں لکھتا ہے کہ اگر انسانی ذات کو ان اثرات کا مجموعہ ہی تسلیم کر لیا جائے جن سے وہ متاثر ہوتی ہے تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ انسانی ذات کو اس کے اجزاء میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے

جو کچھ ہم کرتے ہیں اس میں ہماری ذات تمام کی تمام موجود ہوتی ہے۔ (۴)

دورِ حاضر کا علمِ تجزیۂ نفس کا ماہر (ERICH FROMM) انسانی ذات کے متعلق لکھتا ہے۔

ہم اپنے اندر اپنی ذات کے وجود کا احساس رکھتے ہیں۔ یہ ذات غیر متبدل ہے اور حالات کے تغیر اور خیالات اور احساسات تک میں تبدیلی کے باوجود، ساری زندگی غیر متغیر رہتی ہے۔ یہ وہ ذات ہے جو لفظ "میں" کے پیچھے ایک حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی پر ہمارے تشخصِ خویش پر یقینِ محکم کی بنیاد ہے۔ اگر ہمیں اپنی ذات کے غیر متغیر ہونے پر یقین نہ ہو تو ہمارا تشخص متزلزل ہوجاتا ہے۔ اور ہم دوسروں کے محتاج ہوجاتے ہیں۔ پھر انہی کی اصابت رائے ہمارے احساسِ ذات کی بنیاد بن جاتی ہے۔ وہی شخص دوسروں کا وفاشعار ہو سکتا ہے جسے اپنی ذات پر ایمان ہو اس لئے کہ صرف ایسے شخص کو یقین ہو سکتا ہے کہ جو کچھ وہ آج ہے وہی کچھ وہ مستقبل میں ہوگا اور اسی لئے وہ اس وقت بھی ویسا محسوس کریگا اور اسی کے مطابق عمل کریگا جیسا وہ اس وقت محسوس کرتا ہے۔ اپنی ذات پر ایمان ہی ہمیں اس قابل بنا سکتا ہے کہ ہم دوسروں سے وعدہ کریں۔ یہ وجہ ہے کہ نیٹشے نے کہا ہے کہ انسان کی تعریف (DEFINITION) یہ ہے کہ وہ وعدہ کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی ذات پر یقین اپنی ہستی کی شرائط میں سے لازمی شرط ہے۔ (۵)

اس حد تک یہ تصور "روحانیین" کے نظریہ کے مطابق ہے کیونکہ وہ بھی نفس انسانی (یا انسانی ذات یا روح) کے قائل ہیں۔ لیکن اس سے آگے بڑھ کر یہ تصور ان کے تصور سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک انسانی نفس کا منتہائے کمال یہ ہے کہ وہ اپنے جداگانہ تشخص کو فنا کر کے اپنی اصل (خدا کی ذات) میں جذب ہو جائے۔ اس تصور کی رُو سے انسانی ذات کے نشوونما پانے اور استحکام حاصل کرنے کا تصور بے معنی قرار پاتا ہے۔ قرآنی تصور کی رو سے انسانی ذات اپنا مستقل تشخص رکھتی ہے اور انسانی جدوجہد کا مقصود یہ ہے کہ اس کی ذات اس قدر پختگی حاصل کرے کہ اس کا جداگانہ تشخص فنا نہ ہونے پائے۔ پھر "روحانیین" کے نزدیک' انسانی ذات کے تزکیہ کے لئے ضروری ہے کہ انسانی دنیا اور اس کے تمام متعلقات کو قابلِ نفرت سمجھے۔ ان سے دور بھاگے۔ ان سے قطع تعلق کر لے۔ یہ تصور، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، قرآنی نظریہ حیات کے یکسر خلاف ہے۔ اسی لئے اُس نظامِ ربوبیت میں جسے قرآن' اس دنیا میں انسانی زندگی کا منتہیٰ و مقصود قرار دیتا ہے، اِن حضرات کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ یہ اُس سے دور بھاگتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنی نظریہ حیات، میکانکی اور روحانیین کے نظریات سے بالکل الگ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآنی نظریہ کی رو سے نظامِ ربوبیت کس طرح قائم ہوتا ہے۔

P.84-(1) P.D.Ouspensky -in- ANew Model of The Universe pp.118 - 119
(2) Thus Spake Zarathustra
P.85 (3) Nicolas Berdyaev -in-"The Divine And The Human" p.50
(4) C.E.M.Joad, in- Decadence. p.208
(5) The Art Of Loving. p. 102

پانچواں باب

قرآنی نظامِ ربوبیت

گذشتہ باب میں بحث کا زیادہ حصہ نفسِ انسان سے متعلق تھا۔ اس لئے گفتگو بیشتر تجریدی (ABSTRACT) ہوگئی تھی۔ چونکہ تجریدی گفتگو میں عام طور پر کچھ الجھاؤ سا ہوتا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے اصل موضوع کو ذرا کھلے کھلے الفاظ میں سامنے لے آیا جائے تاکہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے۔

بات یہ ہے کہ انسان نام ہے جسم اور نفسِ انسانی کا (جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے) مقصدِ زندگی یہ ہے کہ انسان کے جسم کی پرورش بھی نہایت عمدگی سے ہو اور اس کے ساتھ ساتھ نفسِ انسانی کی ربوبیت (پرورش و تربیت) بھی ہوتی جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جسم کی پرورش کا اصول اور انسانی ذات کی پرورش کا اصول ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جسم کی پرورش کا اصول یہ ہے کہ جسم کو کچھ ملے۔ میرا جسم اسی صورت میں پرورش پا سکے گا جب میں خود کچھ کھاؤں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ میں دوسروں کو کچھ کھلاؤں (خواہ یہ دوسرے، میرے اپنے بیٹے ہی کیوں نہ ہوں) اور میرا جسم توانا ہوتا جائے۔ اپنے جسم کی پرورش اور توانائی کے لئے مجھے خود کھانا ہوگا۔ اس لئے جسم کی پرورش کا نظام یکسر انفرادی ہے۔ میرا جزوِ بدن وہی کچھ بنے گا جسے میں کھاؤں گا۔ جس چیز کو میں کسی دوسرے کو دیدوں گا اس سے میرے جسم کی پرورش نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا جسم کی پرورش کا اصول یہ ہے کہ تمہارا جسم کس قدر "لیتا" ہے۔ یہ وہ قانون ہے

جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

لیکن انسانی ذات کی پرورش کا قانون اس کے برعکس ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ تم "دیتے" کس قدر ہو۔ تم کائنات کے حُسن میں کس قدر اضافہ کرتے ہو۔ تم دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کیا دیتے ہو۔ تم نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے کس قدر (CONTRIBUTE) کرتے ہو۔ تم جتنا زیادہ دیتے جاؤ گے اتنی ہی زیادہ تمہاری ذات کی کشادہوتی جائے گی۔ اسی کا نام نفسِ انسانی کی پرورش و تربیت ہے۔

اب بات یوں ہوئی کہ :-

(i) انسان نام ہے جسم اور انسانی ذات کا۔

(ii) پرورش و تربیت دونوں کی ضروری ہے۔

(iii) لیکن جسم کی پرورش "لینے" سے ہوتی ہے اور انسانی ذات کی پرورش "دینے" سے۔

(iv) یہ دونوں تقاضے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہم "لیتے" ہیں تو ہماری ذات کی ربوبیت نہیں ہوتی۔ اور "دیتے" ہیں تو جسم کی پرورش میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

یہ ہے اصلی کشمکش۔ یہ ہے وہ ٹیڑھا مسئلہ جس کا حل نہیں ملتا۔ انسانیت اسی مسئلہ کے حل میں سرگرداں چلی آرہی اور افراط و تفریط کے جھولے جھول رہی ہے۔ ایک گروہ نے کہا کہ تم "دیتے جاؤ" جسم کے تقاضوں کی پرواہ نہ کرو۔ جسم کو فنا ہونے دو کہ اس کی فنا میں تمہاری بقا کا راز ہے۔

یہ بھی غلط تھا۔ انسان نام ہے جسم اور ذات دونوں کا۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ تم "لئے جاؤ" سب کچھ اپنے لئے سمیٹتے جاؤ۔ اس سے تمہارے اپنے جسم کی پرورش ہوگی۔ توانائی بڑھے گی۔ اور مقصودِ زندگی جسم کی پرورش و توانائی ہے اور بس۔

یہ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ انسان جسم اور ذات دونوں پر مشتمل ہے۔ اس میں کسی ایک کو بھی نظرانداز کر دینا مقصدِ حیات میں ناکام رہنا ہے۔

ذہنِ انسانی اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ وہ اس "کج دار و مریز" کی گتھی کو سلجھا نہیں سکا۔ اس سے اسکی اپنی ذات میں تضادات (CONTRADICTIONS) پیدا ہو گئے اور ان تضادات کا لازمی نتیجہ تھا کہ معاشرہ میں تضادات پیدا ہو جائیں۔ معاشرہ کے یہی تضادات ہیں جنہیں قرآن نے فساد (یا ناہمواریاں) کہہ کر پکارا ہے۔

قرآنِ کریم نے آکر بتایا کہ ان تضادات میں توافق پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ (CONTRADICTIONS) آسانی سے (RESOLVE) ہو سکتے ہیں۔ ایسا نظام قائم کیا جا سکتا ہے جس میں جسم اور ذات دونوں کے (متضاد) تقاضے بیک وقت پورے ہوتے جائیں اور اس طرح یہ دونوں پرورش پاکر توانا ہوتے جائیں۔ اس نظام کا نام ہے نظامِ ربوبیت۔

اب آئیے یہ دیکھیں کہ قرآنِ کریم اس نظام کی کیا تفاصیل بیان کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے آپ انسانی زندگی کے ان دو بنیادی نظریوں کو سامنے رکھئے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (جیسا کہ پچھلے باب میں بتایا جا چکا ہے)، قرآن کریم نے اس نظریئے کے لئے جس میں انسان کی نگاہ صرف جسم کی پرورش تک محدود رہتی ہے، حیوٰۃ الدنیا کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ جس سے مراد ہے فقط انسان کی طبیعی زندگی، اور اس زندگی کے حفظ و بقا کے لئے مفادِ خویش، قریبی مفاد، پیش پا افتادہ مفاد، عاجلہ مفاد، ہی کو پیشِ نظر رکھنا۔ آئندہ صفحات میں اس نظریئے کے لئے یہی اصطلاح استعمال کی جائے گی۔ اس کے برعکس دوسرا نظریہ ہے جس سے مقصود اس دنیا کی طبیعی زندگی اور اس کے بعد انسانی ذات کے تسلسل کی زندگی دونوں ہیں۔ یہ اسلامی زندگی یا نظامِ ربوبیت ہے یعنی وہ نظام جس میں انسانی جسم اور ذات دونوں کی نشوونما ہو جاتی ہے۔ اس سے حال اور مستقبل — دنیا اور آخرت — دونوں کی خوشگواریاں میسر آجاتی ہیں۔

مفادِ خویش کی نظر سے انسان کی حالت

قرآن کریم کہتا ہے کہ جب انسان کے سامنے "مفادِ خویش" کا نظریہ رہے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ جمع کئے جاتا ہے لیکن اس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ (جَمَعَ فَاَوْعٰی۔ ۷۰/۱۸) سب کچھ سمیٹتا جاتا ہے اور پھر اسے تھیلی میں ڈال کر اوپر سے اس کا منہ بند کر دیتا ہے (اَوْعٰی) تاکہ جمع شدہ سرمایہ کم نہ ہونے پائے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا۔ (۷۰/۱۹)

یقیناً انسان بہت ہی بے صبرا ہے۔

هَلُوْعًا۔ جو ہر وقت بھوکا رہے۔ جس کی بھوک کم نہ ہو۔ وہ دولت کی ہوس میں کھنچے چلا جاتا ہے۔ وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ۔ (۱۰۰/۸) روپیہ جمع کرتا رہتا ہے اور اسے گنتا رہتا ہے اور اس طرح ننانوے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے۔ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ۔ (۱۰۴/۲)۔ سمجھتا یہ ہے کہ یہی مال و دولت اسے حیاتِ جاودانی عطا کر دے گا۔ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ (۱۰۴/۳) اس کی نگاہ ہمیشہ مفادِ عاجلہ (IMMEDIATE GIAN)

پر رہتی ہے۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ - (۷۵/۲۰)۔ اور مستقبل کی خوشگواریوں کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ - (۷۵/۲۱) مستقبل کی خوشگواریوں پر مفاد عاجلہ کو ترجیح دیتا ہے۔ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا - (۸۷/۱۶)۔ چاہتا یہ ہے کہ اپنا بھی سب کچھ پاس رہے اور اس کے علاوہ جو کچھ دوسروں نے جمع کر رکھا ہے، ان کے مرنے کے بعد وہ بھی اسی کے پاس آجائے۔ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا - (۸۹/۱۹)۔ لَمًّا کے معنی سمیٹنے کے ہیں) اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ ادھر اُدھر کا مال اس کے پاس اس طرح چلا آئے جیسے گرد و نواح کا تمام پانی، نشیب کی طرف آکر کسی گڑھے میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹/۲۰) یہ لوگ صرف ضرورت کے لئے مال جمع نہیں کرتے بلکہ محض ہوسِ زر کی خاطر دولت سمیٹتے جاتے ہیں۔ اس ہوس کارانہ زندگی سے ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ان میں سے ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ مال و دولت میں دوسروں سے بڑھ جائے اور اس خواہش کی تسکین پوری ہی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ وہ قبر میں جا پہنچتا ہے

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ - (۱۰۲/۱-۲)

ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی خواہش، جس کا سلسلہ قبر تک جاری رہتا ہے، تمہیں زندگی کے صحیح مقصد کی طرف سے غافل کر دیتی ہے۔

اس معاشرہ میں ایک انسان دوسرے انسان سے اس طرح الگ ہو جاتا ہے جیسے ان میں کسی نے (WEDGES) ٹھونک دی ہوں۔ (بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ - ۲/۳۶)۔ اس کے بعد ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ بھائی بھائی سے الگ ہو جاتا ہے۔ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ - (۸۰/۳۴) اولاد، ماں باپ سے جدا ہو جاتی ہے۔ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ (۸۰/۳۵) حتیٰ کہ میاں بیوی اور باپ بیٹے کے مفاد تک بھی ایک دوسرے سے متصادم ہو جاتے ہیں۔ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ - (۸۰/۳۶)۔ ہر شخص اپنے اپنے مفاد کے حصول اور تحفظ میں ایسا جذب ہوتا ہے کہ اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں رہتی۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ - (۸۰/۳۷)۔ ان میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ مشترکہ مفادِ انسانیت کی بجائے اپنے اپنے مفاد کے حصول کے لئے الگ الگ پروگرام بنائے۔ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً - (۷۴/۵۲)۔ اس نظریہ کے ماتحت جو کچھ افراد میں ہوتا ہے وہی کچھ اقوام میں ہوتا ہے۔ اس کی رُو سے ہر قوم کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسری قوموں کو زندگی کی خوشگواریوں سے محروم کر دے۔

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا - (۷/۳۸)

اس جہنمی زندگی میں ہر قوم دوسری قوم کو محروم کرنے کی فکر میں ہوتی ہے۔ (لَعَنَ کے معنی ہیں دور رکھنا، محروم کرنا۔)

اور اس طرح دوسری قوموں سے آگے بڑھ جائے۔ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ۔ (۱۶/۹۲)۔ اس کے بعد جس طرح ہر دولتمند یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھے اب دوسرے افرادِ انسانیہ کی کیا پرواہ ہے۔ میرا مال و دولت میرے لئے کافی ہے۔ اسی طرح ہر قوم اپنے آپ کو خود مکتفی سمجھ کر خیال کر لیتی ہے کہ مجھے اب دوسروں کی کوئی احتیاج نہیں۔ اور اس طرح احترام و تکریمِ انسانیت کے تمام اقدار و ضوابط سے سرکشی اختیار کر لیتی ہے۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى۔ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى۔ (۹۶/۶-۵)

جب انسان اپنے آپ کو مستغنی تصور کر لیتا ہے تو پھر آئین و ضوابط سے سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔

غور کیجئے۔ کتنی بڑی ہے یہ حقیقت جسے قرآن نے دو جملوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ ایسا انسان سمجھتا ہے کہ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ۔ (۹۰/۵)۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ انسان معاشرہ کے عام قوانینِ داد و ستد کی بھی پرواہ نہیں کرتا اور ہمیشہ کوشش کرتا رہتا ہے کہ لوگوں سے زیادہ سے زیادہ لے اور انہیں کم سے کم دے۔ آپ اپنے معاشرے (کے کاروباری حلقہ) میں دیکھئے۔ ہر جگہ یہی ذہنیت کارفرما نظر آئے گی۔ ہر شخص اسی گھات میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح دوسرے کی جیب کا روپیہ اس کی جیب میں آجائے۔ اور اگر اسے دوسروں کی محنت کا معاوضہ (یا جنس کی قیمت) دینی پڑے تو کم از کم دے۔ یہی وہ ذہنیت ہے جس سے سارے معاشرے میں ناہمواریاں (فساد) برپا ہو جاتی ہیں اور اسی سے وہ تباہیاں آتی ہیں جن میں آج دنیا اس طرح چاروں طرف سے گھری ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم اپنے دعاوی کی شہادت میں تاریخی نوشتوں کو پیش کرتا ہے۔ جس ذہنیت کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، وہ بالخصوص قومِ شعیب کو اس کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی اس ذہنیت کی اصلاح کے لئے حضرت شعیبؑ نے پوری کوشش فرمائی۔ انہوں نے اس قوم سے کہا کہ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۷/۸۵)۔ تمہارے پاس خدا کا قانونِ ربوبیت واضح انداز میں آچکا ہے۔ اسے اپنی زندگی کا نصب العین بناؤ اور اپنی موجودہ روش کو چھوڑ دو۔

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ۔ (۷/۸۵)

تم اپنے ماپ اور تول کے پیمانوں کو ٹھیک رکھو۔ اور ایسا نہ کرو کہ لوگوں کو ان کی چیزیں کم دو۔

اس طرح معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا۔ (۷/۸۵)۔ اسکے برعکس اگر تم نے خدا کے قانونِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تو یہ تمہاری خوشگواریوں اور زندگی کے ہر شعبے میں فراوانیوں کا ضامن بن جائے گا۔ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔ (۷/۸۵)۔ تم تجارت کی شاہراہوں پر قابض ہوکر بیٹھ جاتے ہو اور پھر (عام قوانینِ عدل و انصاف کی رُو سے نہیں بلکہ) لوگوں کو طرح طرح سے مرعوب کرکے معاملات کی سیدھی سیدھی اور صحیح راہیں ان پر مسدود کردیتے اور انہیں ٹیڑھی راہوں پر چلنے کے لئے مجبور کردیتے ہو (۷/۸۶) اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہے۔ (۱۱/۸۴)

سورۂ شعراء میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ اپنے ماپ تول میں ڈنڈی مت مارا کرو۔ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ۔ (۲۶/۱۸۱)۔ سورۂ عنکبوت میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اُن سے کہا کہ تم مفادِ عاجلہ سے صرفِ نظر کرکے مستقبل کے مفاد پر نگاہ رکھو وَارْجُوا الْيَوْمَ الْآخِرَ۔ (۲۹/۳۶)۔ اور معاشرے میں ایسا نظام نہ پیدا کرو جس کا نتیجہ ناہمواریاں ہوں۔ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ۔ (۲۹/۳۶)۔

قرآنِ کریم نے قومِ شعیبؑ کو اس ذہنیت کے ترجمان کی حیثیت سے بطور تاریخی شہادت پیش کیا ہے۔ ورنہ وہ کہتا ہے کہ "قریبی مفاد" کے نظریہ کے ماتحت تمام انسانوں کی حالت یہی ہوجاتی ہے کہ وہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر میں پریشان رہتے ہیں اور دوسروں کے مفاد کی قطعاً کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ وہ سامانِ نشوونما کو اپنے لئے روک رکھتے ہیں۔ (مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ۔ (۵۰/۲۵) خدا کے "جاری پانی" کے آگے بند لگا دیتے ہیں تاکہ کسی اور کی کھیتی سیراب نہ ہونے پائے (وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ - (۱۰۷/۷) وہ انسانیت کے مفادِ کلّی کے لئے اوّل تو کچھ دینے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے، اور اگر انہیں مجبوراً کچھ دینا پڑ ہی جائے تو بہت تھوڑا دیتے ہیں اور پھر اس طرح اپنے ہاتھ کو سخت کر لیتے ہیں جس طرح پتھریلی زمین کسی روئیدگی کو ابھرنے نہیں دیتی۔ (وَأَعْطَىٰ قَلِيلًا وَأَكْدَىٰ۔ (۵۳/۳۴) اسی ذہنیت کو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ۔ (۸۳/۱) تباہی اور بربادی ہے اس نظامِ معاشرہ کے لئے جس میں لوگوں کی کیفیت یہ ہو کہ ہر شخص یہ چاہے کہ تمام مفاد اسی کے لئے ہوجائیں اور دوسروں کو جتنا ہوسکے کم ملے۔ یہ وہ لوگ ہیں

الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ۔ (۸۳/۲)

لہ قوم کی طرف سے اس کا کیا جواب ملا تھا؟ اس کا جواب آگے چل کر آئے گا۔

کہ جب دوسروں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں۔

لیکن

وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ - (۸۳/۳)

جب انہیں ماپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو ہمیشہ ڈنڈی مار لیتے ہیں۔

یہ تو پھر بھی وہ طبقہ ہے جو لیتا زیادہ ہے اور دیتا کم ہے۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو دوسروں سے لیتا ہی لیتا ہے۔ انہیں دیتا کچھ نہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتا ہے۔ انہیں قرآن کی اصطلاح میں مترفین کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی کمائی کھاتے رہتے ہیں اور خود کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے معاشرہ میں تعمیری نتائج مرتب ہوں۔ یہ طبقہ بالخصوص مذہبی پیشواؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ:-

مترفین کا طبقہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ...... (۹/۳۴)

اے وہ جماعت جو خدا کے قانونِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے ہوئے ہو' اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ اربابِ طریقت و شریعت (علماء و مشائخ) کا گروہ کثیر وہ ہے جو لوگوں کی کمائی کھاتا ہے اور ہمیشہ تخریبی نتائج کا موجب بنتا ہے اور اس طرح لوگوں کو خدا کی طرف لے جانے والی راہ میں روک بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

یہ وہ گروہ ہے جو ہمیشہ اس انقلاب کی مخالفت کرتا ہے جس میں خدا کی ربوبیت عام ہو۔ اس لئے کہ اس انقلاب میں انہیں اپنی موت نظر آتی ہے۔ انہیں خود محنت کر کے کھانے کی عادت نہیں ہوتی اور نظامِ ربوبیت میں ہر اس شخص کو کام کرنا پڑتا ہے جو کام کے قابل ہو۔ اس میں کام چوروں اور مفت خوروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی لہٰذا' جہاں اور جب بھی نظامِ ربوبیت کے قیام کی آواز بلند ہوتی ہے اس طبقہ کی طرف سے ہمیشہ اس آواز کی مخالفت ہوتی ہے۔ وہ عوام کو یہ کہہ کر مشتعل کرتے ہیں کہ دیکھو! یہ نئی دعوت دینے والے تمہیں تمہارے آباء و اجداد کے مسلک سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ انقلاب اور اس کی مخالفت کے ضمن میں یہی شروع سے ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ ۔ (۴۳/۲۳)

اسی طرح اس سے پہلے بھی جس قوم میں کوئی دعوتِ انقلاب خداوندی لے کر آیا تو وہاں کے مترفین نے یہ کہہ کر اس آواز کی مخالفت کی کہ ہم نے جس مسلک پر اپنے آباء واجداد کو دیکھا ہے ہم اس کی پیروی کرتے جائیں گے۔

یہ مخالفت بدیہی ہے۔ دوسروں کی کمائی پر آرام طلبی کی زندگی بسر کرنے والے کب چاہتے ہیں کہ انہیں نہ صرف خود کما کر کھانا پڑے بلکہ ان کی کمائی سے دوسروں کے لئے بھی سامانِ زیست بہم پہنچایا جائے۔

اس مقام پر قرآنِ کریم نے مذہبی پیشوائیت کو جو بطورِ مثال پیش کیا ہے تو اس میں ایک بڑا لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ سرمایہ دار جو دوسروں کی کمائی کا استحصال کرتے ہیں تو انہیں بہرحال کچھ نہ کچھ سرمایہ لگانا پڑتا ہے اور بعض اوقات (RISK) بھی لینا پڑتا ہے۔ لیکن مذہبی پیشواؤں کا طبقہ ایسا ہے کہ انہیں ایک پائی بھی بطور سرمایہ لگانی نہیں پڑتی اور دوسروں کی کمائی کا بہترین حصہ ان کی طرف کھنچے چلا آتا ہے۔ نہ ہی انہیں اپنے اس "کاروبار" میں کسی قسم کا (RISK) اٹھانا پڑتا ہے۔ اس لئے غور سے دیکھئے تو مذہبی پیشوائیت، نظامِ سرمایہ داری کی شدید ترین شکل ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے دولتمند سرمایہ داروں سے بھی پہلے مترفین کے اس گروہ کا ذکر کیا ہے۔ (۹/۳۴)۔

(۷)

بہرحال، یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے "مفادِ خویش" (حیات الدنیا) کو..... زندگی کا نصب العین بنانے والوں کی کیفیت۔ ان کے سامنے ہمیشہ مفادِ عاجلہ رہتے ہیں اور مستقبل کی زندگی ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ ان کی زندگی کی تمام تگ و تاز، ان کی ساری کوششیں "مفادِ خویش" کے حصول میں ضائع ہو جاتی ہیں اور وہ بزعمِ خویش سمجھتے رہتے ہیں کہ وہ بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ قیامِ انسانیت کی میزان میں ان کی کوششوں کا وزن پرِکاہ کے برابر بھی نہیں ہوتا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۔ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۔ (۱۸/۱۰۳-۱۰۵)

ان سے کہو کہ ہم تمہیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جن کی تمام سعی و عمل کا نتیجہ نقصان کے سوا کچھ نہیں ہوگا؟

یہ وہ لوگ ہیں جن کے تمام پروگرام قریبی مفادِ خویش کے حصول میں ضائع ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے دل

میں سمجھتے ہیں کہ ہم بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے قانونِ ربوبیت سے انکار کرنے اور حقائق کا سامنا کرنے سے جی چراتے ہیں۔ سو ان کے پروگرام بظاہر بڑے خوش آئند نظر آتے ہیں لیکن ان کے ٹھوس نتائج کبھی بھی مرتب نہیں ہو سکتے۔ قیامِ انسانیت کے پروگرام میں ان کے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ انہیں تولنے کے لئے میزان تک کھڑی کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اس قسم کے معاشرے کی تباہی کے اسباب وعلل تلاش کرنے کے لئے کسی خاص کاوش کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل ظاہر ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہر فرد کی عقلِ بے باک کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس فرد کے مفاد کا تحفظ کرے۔ چونکہ انسان کو اپنی موت کے متعلق معلوم نہیں کہ وہ کب آئے گی، اس لئے وہ اپنی مفاد پرستی کی دوڑ میں کوئی آخری حد مقرر نہیں کر سکتا۔ اس کی عقل اسے ہر وقت عدمِ تحفظ (INSECURITY) کے خوف سے ڈراتی رہتی ہے۔ اس لئے وہ قبر تک سمیٹنے کی فکر کرتا رہتا ہے۔ لہذا اس کے مفاد غیر محدود ہوتے ہیں لیکن اشیائے ضروریات ہمیشہ محدود ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اشیائے ضروریات اس کے قبضے میں آجائیں۔ اس کے لئے افراد میں کشمکش ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب دو آدمیوں نے ایک گھوڑے پر بیٹھنا ہو تو ان میں سے ایک کو بہر حال پیچھے بیٹھنا ہوگا۔ لیکن اگر ان میں سے ہر ایک کی خواہش اور کوشش یہ ہو کہ وہ آگے بیٹھے تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ لہذا اس قسم کے معاشرے میں افراد کی باہمی کشمکش لازمی ہے۔ افراد سے آگے بڑھ کر یہی حال اقوام کا ہے۔ جس طرح ہر فرد کی عقل اس کے مفاد کا تحفظ چاہتی اور زیادہ سے زیادہ سمیٹ لینے کی فکر کرتی ہے، اسی طرح ہر قوم کی مجموعی عقل بھی یہی چاہتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وسائل پیداوار پر قابض ہو جائے۔ اس سے بین الاقوامی کشمکش شروع ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کا وہ جہنم ہے جس میں آج ساری دنیا مبتلا ہے۔ جوڈ لکھتا ہے۔

جس معاشرے میں افراد کا منتہائے نگاہ قریبی مفاد کا حصول ہو، اس میں کبھی توازن اور استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جب انسان کا مقصودِ حیات وہ چیزیں قرار پا جائیں جو دنیا میں اتنی افراط سے موجود نہیں تو اس کا نتیجہ لامحالہ یہ ہوگا کہ چند آدمیوں کے پاس بہت کچھ آجائے گا۔ اور باقی اس سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ محروم رہنے والے لوگ ہمیشہ غیر مطمئن اور مضطرب رہیں گے۔ اس قسم کے غیر مطمئن افراد معاشرے کی تباہی کا موجب بنتے ہیں۔ (۱)

باقی رہے مترفین۔ سو ان کے متعلق برفا لکھتا ہے۔

(۲)

کوئی معاشرہ صحت مند نہیں کہلا سکتا جس میں ایک فرد دوسرے کے خون سے فربہ ہو۔

"قریبی مفادِ خویش" کے نظریئے کے حامل معاشرہ کی یہی حالت ہوتی ہے۔ اس معاشرے کے اہلِ فکر حضرات اس جہنم کی شعلہ سامانیوں سے گھبرا کر سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں کہ معلوم کریں کہ اس الم انگیز تباہی کے اسباب کیا ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ اسباب اس قدر بدیہی اور نمایاں ہیں کہ ان کی دریافت کے لئے کسی تحقیقاتی کمیشن کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں کہتا ہے کہ جب ان کی یہ حالت ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ "خدا کی مرضی ہے" اس نے ایسا کر دیا۔ وہ جسے چاہے عزت دے دے جسے چاہے ذلیل کر دے۔ (فَيَقُولُ رَبِّيٓ اَهَانَنِ ۔ (۸۹/۱۶)۔ قرآن کہتا ہے کہ (کَلَّا ۔ (۸۹/۱۷) بالکل غلط۔ یہ ان کا فریبِ نفس ہے جو حقیقت کو سامنے نہیں آنے دینا چاہتا۔ اور اپنی زندگی کی غلط روش کے نتائج کو خدا کی طرف منسوب کر کے اپنے آپ کو اطمینان دے لینا چاہتا ہے۔ ان کی یہ حالت اس لئے نہیں ہوئی کہ خدا نے خواہ مخواہ ایسا کر دیا۔ یہ اس لئے ہوئی کہ انہوں نے معاشرہ ایسا بنا رکھا تھا جس میں کسی ایسے شخص کی عزت و تکریم نہیں ہوتی تھی جس کے متعلق سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ اکیلا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی پارٹی نہیں۔ وہ بے یار و مددگار ہے۔ اس کا کوئی والی وارث نہیں۔ کَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۔ (۸۹/۱۷)۔ اور جس میں کوئی ایک دوسرے سے یہ نہیں کہتا تھا کہ جس شخص کی چلتی ہوئی گاڑی رُک جائے۔ جس کی حرکت مبدل بہ سکون ہو جائے اس کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا چاہیئے۔ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۔[1] (۸۹/۱۸) اس کے برعکس، ہر شخص چاہتا تھا کہ جو کچھ اُسے وراثت میں ہاتھ آئے سب کچھ سمیٹ کر رکھا جائے۔ (۸۹/۱۹) اور اِدھر اُدھر کا مال اکٹھا ہو کر اسی کے گھر پہنچ جائے (۸۹/۲۰)۔ اس معاشرہ کا انجام اگر جہنم کی تباہیاں نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ یہ آگ کہیں باہر سے نہیں آئی۔ وہی دولت جو انہوں نے جمع کر رکھی تھی، بند رہنے سے اس قدر گرم ہو گئی ہے کہ اس سے ان کے جسم کو داغا جا رہا ہے (۱۰۴/۵) یہ وہ آگ ہے جو انہوں نے بڑے بڑے لمبے چوڑے سہاروں اور بھروسوں کے ستونوں میں بند کر رکھی تھی۔ اب وہی آگ ان کے دلوں پر چڑھ رہی ہے۔ (۱۰۴/۷) قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ درحقیقت انسانیت کی سطح تک پہنچے ہی نہیں تھے۔ اُن

---

[1] قرآن نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ مثلاً دیکھئے ۶۹/۳۴ ; ۷۴/۴۴ ; ۱۰۷/۳ ; ۹۰/۱۴ ; ۱۰۷/۲۔ ان مقامات کے علاوہ اس نے سورۃ والضحیٰ میں کہا ہے کہ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۔ (۹۳/۹) جو معاشرہ میں اکیلا رہ جائے اسے استبداد سے ایسا کچلنے کی کوشش نہ کرو کہ وہ مجبور ہو کر ایسا نرم ہو جائے کہ تم اُسے نگل جاؤ۔ اسکے بعد ہے۔ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۔ (۹۳/۱۰) اور ضرورتمند کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ اس کا مقام وہ جگہ ہے جہاں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

کی زندگی حیوانی سطح پر ہی تھی جو کھاتے پیتے ہیں اور اس کے بعد طبعی موت سے مر جاتے ہیں۔ اور اس زندگی کا نتیجہ یہ جہنم ہے۔ (۴۷/۱۲)

——— (۲) ———

دوسرا نظریہ اس کے برعکس دوسرا نظریۂ زندگی ہے جسے حیاتِ آخرت یا کلّی مفاد یا مستقبل کی خوشگواریوں کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر پہلا نظریہ بخل (ARRESTED INTERESTS) کا ہے تو یہ دوسرا نظریہ انفاق (OPEN INTERESTS) کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود لفظ انفاق جسے قرآن نے اس تکرار کے ساتھ اپنے ہاں استعمال کیا ہے، اس تصور کا صحیح صحیح مفہوم سامنے لے آتا ہے۔ نفق ایسی سرنگ کو کہتے ہیں جو دونوں طرف سے کھلی ہو۔ (برخلاف سرب کے جس میں صرف اندر داخل ہونے کا راستہ ہو آگے نکلنے کا راستہ نہ ہو)۔ منافق کو اسی لئے منافق کہتے ہیں کہ وہ دین میں ایک طرف سے داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل جاتا ہے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انفاق کے معنی "کھلا رکھنے" یا "عام کرنے" کے ہیں۔ "انفاق" کا ترجمہ عام طور پر "خرچ کرنا" کیا جاتا ہے۔ لیکن اس لفظ کے بنیادی معانی کی رو سے "خرچ کرنا" اس کے مفہوم کو صحیح طور پر ظاہر نہیں کرتا۔ "انفاق فی سبیل اللہ" کا صحیح ترجمہ ہونا چاہیئے "مفادِ عامہ کے لئے کھلا رکھنا"۔ قرآن میں انفاق درحقیقت بخل کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ بخل سے مراد ہے اپنی ذات تک محدود رکھنا۔ روک لینا۔ جمع کرنا۔ اس کے برعکس، انفاق سے مراد ہے، مفادِ عامہ کے لئے کھلا رکھنا۔ عام کر دینا۔ روک اور حدبندیاں اٹھا دینا۔ لہٰذا جس معاشرہ کی بنیاد "انفاق فی سبیل اللہ" کے اصول پر ہو گی۔ اس میں ہر فردِ معاشرہ اپنی محنت کے ماحصل کو مفادِ عامہ کے لئے کھلا رکھے گا۔ اس کی حدبندی نہیں کرے گا۔ اسے عام کرے گا۔ یہی وہ معاشرہ ہے جس میں ہر فردِ معاشرہ دوسروں کی ربوبیت کی فکر میں رہتا ہے اور دوسروں کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دیتا ہے۔

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (۵۹/۹)

اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ خود تنگی کی حالت میں ہوں۔

آپ نے کبھی ایسا منظر بھی دیکھا ہے کہ سخت گرمی کا دن ہو۔ پانی کی کمی ہو۔ کسی جگہ ایک ہی نل ہو جس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی ٹپک رہا ہو۔ پانی پینے اور لینے والوں کی کثرت ہو۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ ایسے وقت میں کس طرح ہر شخص دوسروں کو پیچھے ہٹانے اور خود آگے بڑھ کر پانی لینے کی کوشش کرتا ہے۔ عربی زبان میں اس ذہنیت

کا نام "شحّ نفس" ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس معاشرے میں جس میں ہر فرد دوسرے کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دیتا ہے، انسان "شحّ نفس" سے بچ جاتا ہے۔ اور جو شخص شحّ نفس سے بچ جاتے اس کی ذات کی تربیت اس طرح ہوتی ہے جس طرح کھیتی پروان چڑھ جاتی ہے۔

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (۵۹/۹)

اور جو شخص "شحّ نفس" سے بچ جائے تو سمجھئے کہ اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔

دوسرا مقام یہ ہے کہ انفاق (اپنی محنت کے ماحصل کو ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھنے میں) بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ ہم دوسروں کے لئے خرچ کر رہے ہیں۔ لیکن یہ درحقیقت اپنی ذات کے لئے خرچ کرنا ہوتا ہے۔ اسی سے نفسِ انسانی کی ربوبیت ہوتی ہے۔

انفاق اپنے ہی لئے ہے

(وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (۶۴/۱۶) قرآن نے اس حقیقت کو بڑی شدت اور تکرار سے دل نشین کرایا ہے کہ جو کچھ تم کھلا رکھتے ہو، اس کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ وہ دوسروں کے کام آیا، تمھیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ درحقیقت خود تمھاری اپنی ہی ذات کے کام آتا ہے۔ فَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۔ (۲/۲۷۲)۔ مال و دولت میں سے جو کچھ تم کھلا رکھتے ہو، وہ درحقیقت تمہاری اپنی ہی ذات کے لئے ہوتا ہے۔ اس سے تمہاری اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے (۱۸/۳۵) اس سے تم خوف اور حزن سے محفوظ رہتے ہو (۲/۲۷۴)۔ اس کا ذرّہ ذرّہ تمھیں واپس مل جاتا ہے۔ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (۲/۲۷۲)۔ اسی کو قرآن نے دیگر مقامات پر قرض سے تعبیر کیا ہے۔ ویسے تو قرض اس مال کو کہتے ہیں جو دیا ہی واپس لینے کے لئے جائے لیکن اس واپسی میں ایک خاص نکتہ بھی پنہاں ہے۔ آپ نے کسی جگالی کرنے والے جانور کو دیکھا ہے، خام چارہ کا گولہ معدہ سے ابھر کر منہ میں آجاتا ہے۔ اسے دانت آہستہ آہستہ چبا کر قابلِ ہضم بنا دیتے ہیں اور اس کے بعد اسے پھر معدے میں لوٹا دیتے ہیں۔ اسے قرّیض کہتے ہیں۔ انفاق سے متعلق آیت میں کہا گیا ہے کہ تم جو کچھ کسی پر خرچ کرتے ہو، بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اسے تم دوسروں کو دے رہے ہو لیکن اس کی مثال تو قرّیض کی سی ہے۔ تم جو کچھ خام شکل میں دیتے ہو، نظامِ ربوبیت اسے قابلِ ہضم صورت میں تمھیں لوٹا دیتا ہے۔ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ (۶۴/۱۷): اگر تم معاشرہ کا توازن قائم کرنے کے لئے کچھ دیتے ہو تو وہ تمھیں دگنی شکل میں واپس مل جاتا ہے۔ (وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۔ (۶۴/۱۷) اور تمہاری حفاظت کا سامان بن جاتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کا نظامِ ربوبیت خود کچھ نہیں رکھ لیتا بلکہ تمہاری محنتوں کو اس طرح

خوشگوار نتائج سے بھرپور کر دیتا ہے جیسے بکری کے تھن۔ جو اس طرح دودھ سے لبریز ہوں کہ ان میں سے دودھ کے قطرے ٹپک رہے ہوں۔ (وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ۔ (۶۴/۱۷) شکور کے یہی معنی ہیں۔ اور اس طرح تمہاری ذات کی ربوبیت سے تمہاری کیفیت اس اونٹ کی سی ہو جاتی ہے جو قوٰی کے اعتدال سے ایسا ثقہ اور بھاری بھرکم ہو جائے کہ یوں ہی ذرا ذرا سی بات پہ بدک نہ اُٹھے (حلیم کے یہ معنی ہیں) یہ اس لئے کہ تمہارے سامنے تو صرف محسوس و مشہود نتائج ہی آتے ہیں جیسے جسم کی پرورش۔ لیکن قانونِ خداوندی ان محسوس نتائج کے علاوہ ان نتائج کا حامل بھی ہوتا ہے جو تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں اور جو تمہاری مستقبل کی زندگی کو سنوارتے ہیں (عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ۔ ۶۴/۱۸) پھر اس کا بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ اس کا قانونِ ربوبیت بڑی قوتوں کا مالک ہے (عزیز) اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی کوئی اور قوت اس پر غالب آجائے اور اسے نتائج مرتب کرنے سے روک دے۔ لیکن اس کا یہ غلبہ دھاندلی کا غلبہ نہیں ہوتا، یکسر حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ (حکیم) اس لئے خدا کے اس غالب اور پُرحکمت قانونِ ربوبیت کے مطابق مستقبل کے اَن دیکھے نتائج پر یقین رکھتے ہوئے اپنی محنت کے ماحصل کو اس نظام کے سپرد کر دینا چاہیئے۔

سورۂ سبا میں ہے کہ رزق کی بست و کشاد خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق ہوتی ہے۔ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ (۳۴/۳۹) ۔اس قانونِ مشیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ تم جس قدر مفادِ کلّی کے لئے کھلا رکھو اسی قدر رزق میں کشائش ہوگی (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) مال و دولت کو نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھنے میں بظاہر نظر آتا ہے کہ مال ہاتھ سے چلا گیا۔ لیکن درحقیقت یہ جاتا نہیں۔ نہایت خوشگوار شکل میں واپس آجاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم نے خزاں کے موسم میں درختوں کو دیکھا ہوگا ان کے پتے کس طرح جھڑ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ تر و تازگی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد وہ درخت حسین شادابیوں کا سر و لب جوئبار بن جاتا ہے۔ ربوبیتِ عامہ کے لئے اپنی محنت کے ماحصل کو کھلا رکھنے والے کی یہی مثال سمجھو۔ (وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ۔ (۳۴/۳۹) خِلفَۃ ان پتوں کو کہتے ہیں جو پت جھڑ کے بعد پھر سے درخت پر نکلیں۔ یا اس کی مثال اس بیج کی سی ہے جس کے ایک پودے میں سات بالیں آئیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں۔ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ۔ (۲/۲۶۱)۔ اس لئے جو کچھ بھی نوعِ انسانی کی ربوبیت (ربّ العالمین کو مشہود کرنے) کے لئے کھلا رکھا جائے گا، وہ خود تمہارے ہی فائدے کے لئے ہے۔ (وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ

فَلِاَنْفُسِكُمْ۔ (۲/۲۷۲)۔ یہ تمھیں پورا پورا واپس مل جائے گا۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں ہو گی۔ (یُوَفَّ اِلَیْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۷۲)۔ اس لئے کہ اس سے تمھاری ذات میں پختگی پیدا ہو جائے گی۔ تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ۔ (۲/۲۶۵) اس سے تمھاری نگاہوں میں فراخی اور ظرف میں وسعت آجائے گی۔ اور اس طرح تمہاری ذات حدود فراموش ہوتی چلی جائے گی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ (۳/۹۱)

اور اگر تم وسعت و کشادگی چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی محنتوں کا عزیز ترین ماحصل ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دو۔

اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ وہ انفاق جس سے دل میں کبیدگی پیدا ہو اور طوعاً و کرہاً کیا جائے اس کا نتیجہ کچھ نہیں۔ (وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ - ۹/۵۴ نیز ۲/۲۶۴ نیز ۳/۱۱ نیز ۴/۳۸)۔ ربوبیتِ عامہ کے لئے انفاق کی صورت یہ ہوتی ہے کہ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی امید (لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۷۶/۹) اس لئے کہ جو انفاق قانونِ خداوندی کی ربوبیتِ اعلیٰ کے لئے ہوتا ہے (اِبْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۹۲/۲۰) اس کا صلہ انسان کی اپنی ذات کی نشو و نما ہوتا ہے۔ (الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى - ۹۲/۱۸) اس لئے اس کے بدلہ میں دوسروں سے صلہ اور ستائش کا کیا سوال؟ اسی لئے سورۂ مدثر میں ہے کہ (وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۷۴/۶) اس خیال سے دوسروں کو نہ دو کہ وہ تمھیں اس کے بدلے میں اس سے زیادہ دیں گے۔ دوسروں کی کمی کو پورا کرنے کا صلہ یہ ہے کہ اس سے خود تمھاری ذات کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ (هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ ۵۵/۶۰)۔

یہ ہے انفاق کا صحیح مفہوم۔ قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ اس قسم کے انفاق (اپنی محنتوں کے ماحصل کو ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دینے) کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں۔ وہ اس قسم کے مثالی معاشرہ (Ideal Society) کو جنت[1] کہہ کر پکارتا ہے۔ اس جنت کی

---

[1] جو معاشرہ خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق متشکل ہوتا ہے اس سے اس دنیا میں جنت کی زندگی مل جاتی ہے۔ اور جو معاشرہ غیر خدائی قوانین کے مطابق قائم ہوتا ہے اس میں انسان جہنم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ چونکہ قرآن کی رو سے زندگی کا سلسلہ غیر منقطع ہے جو موت کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔ اس لئے جنت اور جہنم بھی اسی طرح آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد کی زندگی میں

(باقی ملاحظہ ہو)

خصوصیت رزق کی فراوانی ہے۔ ہم قصہ آدم کے ضمن میں پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جنت کی زندگی میں کیفیت یہ تھی کہ

جنّت کی زندگی

انسان جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھا سکتا تھا۔ (رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔ ۲/۳۵) آدم سے کہا گیا تھا کہ اگر تم نے ابلیس (غیر خدائی قانون) کی بات مان لی تو وہ تمہیں اس جنّت سے نکال دے گا۔ جہاں تمہیں "نہ بھوک کی فکر ہے نہ لباس کی۔ نہ پیاس کی تکلیف ہے نہ مکان کی" (۲۰/۱۱۸) تمام ضروریاتِ زندگی نہایت اطمینان سے پوری ہو جاتی ہیں۔ اگر تم نے اس معاشرہ کو چھوڑ کر غیر خدائی قانون کے مطابق زندگی اختیار کر لی تو یاد رکھو: زندگی کے بلند مقاصد تو ایک طرف، تمہیں ان معاشی ضروریات کے حصول کے لئے بھی مشقت اٹھانی پڑے گی۔ (فَتَشْقٰى۔ ۲۰/۱۱۷) آدم نے اس تصورِ حیات کو چھوڑ دیا اور مشقت میں پڑ گیا۔ آدم اس جنّت سے کس طرح نکلا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا، اسے قرآن نے بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس جنت میں آدم کی حالت یہ تھی کہ جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھاتا پیتا تھا (وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا) اس سے کہا یہ گیا تھا کہ (وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ۔ ۲/۳۵) تم اس شجر کے قریب نہ جانا۔ یہ شجر کیا تھا؟ اس کے متعلق بہت کچھ کہا گیا تھا لیکن اس کے معنی خود اس لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں۔ شجر کے معنی ہیں انسانوں کا الگ الگ رہنا۔ باہمی اختلاف پیدا ہونا۔ ایک دوسرے کا دشمن ہو جانا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ "شجر" الگ الگ مفاد کی اختلافی زندگی تھی۔ آدم، ابلیس کے فریب میں آ گیا اور اس سے جنت کی زندگی چھن گئی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ (بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ ۲/۳۶) افرادِ آدم ایک، دوسرے سے الگ الگ ہو گئے۔ اجتماعی مفادِ کلی کی بجائے انفرادی مفاد کی زندگی شروع ہو گئی۔ دوسری جگہ ہے کہ ابلیس نے آدم سے کہا کہ آؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ حیاتِ جاوداں حاصل کرنے کا راز کیا ہے (قَالَ يٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (۲۰/۱۲۰) اس نے آدم سے کہا کہ تم اپنی اولاد کے ذریعے حیاتِ جاوید حاصل کر سکتے ہو۔ تم اپنی موت کے بعد اپنی اولاد کی شکل میں زندہ رہ سکتے ہو۔ اس لئے حیاتِ جاوداں کا راز اولاد پیدا کرنے میں ہے۔ (فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا ...... ۲۰/۱۲۱)۔ اُن کے شرم کے مقامات ظاہر ہو گئے۔ یعنی جنسی شعور بیدار ہو گیا۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۰۰) چونکہ زمان و مکان کا موجودہ تصور بدل جائے گا اس لئے وہاں کی جنت اور جہنم کی کیفیات ہم اپنے موجودہ شعور کی سطح پر سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن ان کے ایک حقیقت کی طرح واقع ہونے پر ہمارا ایمان ہے۔ حیاتِ اُخروی تو ایمان کی بنیادی شرائط میں سے ہے۔ اسے مانے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

اس سے آدم ایک آگے بڑھا یعنی پہلے تو خود اپنے آپ کے مفاد ہی سامنے آتے تھے۔ اب اس سے آگے بڑھ کر، اولاد کے مفاد کا تحفظ بھی مقصدِ زندگی بن گیا۔ اس سے انفرادی مفاد کی ایسی نفسا نفسی پڑی کہ آدم کی جنّت چھن گئی اور فرزندانِ آدم میں باہمی بُعد پیدا ہو گیا (بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ۔ ۲۰/۱۲۳) اب اس کے بعد پھر سے اسی جنّتی معاشرہ کی تشکیل، اسی فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی، مقصدِ زندگی ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ابنِ آدم اپنے معاشرہ کو خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق متشکل کرلے۔ (فَمَنۡ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ۔ ۲/۳۸)

سورۃ طٰہٰ کی ان آیات کے بعد جنہیں اوپر درج کیا گیا ہے فرمایا کہ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشۡقٰى۔ ۲۰/۱۲۳)۔ یعنی جنّت سے نکلنے کے بعد آدم کی حالت یہ ہو گئی کہ وہ سامانِ رزق (کھانے، پینے، لباس مکان) کی فکر میں مارا مارا پھرتا تھا (فَتَشۡقٰى۔ ۲۰/۱۱۷) اس سے کہا گیا کہ اگر تم اپنی زندگی کو وحیِ الٰہی کے تابع لے آؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ " تَشۡقٰى " کی حالت ختم ہو جائے گی۔

قرآن چھوڑ دینے سے رزق کی تنگی

اور پھر وہی رزق کی فراوانیاں حاصل ہو جائیں گی۔ لیکن اگر اس کے بعد پھر اس ضابطہ سے روگردانی کی تو پھر تمہاری معاش تنگ ہو جائے گی۔

وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِيۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا ..... (۲۰/۱۲۴)

اور جس نے میرے ضابطۂ قانون سے اعراض برتا تو اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔

دوسرے مقام پر ہے کہ جب انسان نے پھر سے اپنے معاشرہ کو انہی خطوط پر متشکل کرلیا تو پھر وہی جنّتی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اس جنت میں رزق کی فراوانی ہوگی۔ (وَلَهُمۡ رِزۡقُهُمۡ فِيۡهَا بُكۡرَةً وَّعَشِيًّا۔ ۱۹/۶۲) اس میں ان کے لئے سامانِ معیشت غیر منقطع ہوگا۔ وہاں رزق کے حصول کے لئے نہ کوئی پریشانی ہوگی نہ مصیبت۔ نہ مشقت ہوگی نہ تشویش۔ (لَا يَمَسُّنَا فِيۡهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيۡهَا لُغُوۡبٌ۔ ۳۵/۳۵) ۔وہاں فکرِ معاش کا خیال تک نہیں ستائے گا۔ (وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِيۡۤ اَذۡهَبَ عَنَّا الۡحَزَنَ۔ ۳۵/۳۴) اس معاشرہ کے افراد قانونِ خداوندی کی مدح و ستائش میں زمزمہ بار ہوں گے جس نے انہیں ان کی اور ان کی اولاد کی معیشت کی فکر سے آزاد کر دیا۔ چونکہ اس معاشرہ میں رزق کے لئے باہمی چھینا جھپٹی نہیں ہوگی، اس لئے دلوں میں عداوت اور کینہ، بغض اور حسد کے شعلہ بار جذبات بھی نہیں اٹھیں گے۔ (وَنَزَعۡنَا مَا فِيۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ۔ ۷/۴۳) ان کے سینے جذباتِ بغض و کدورت سے صاف ہوں گے۔ ہر طرف سے امن اور سلامتی کی ہوائیں چلیں گی ـــ

(اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ - ۱۵/۴۶)۔ وہ سب ایک ہی دسترخوان پر آمنے سامنے بیٹھ کر کھائیں گے۔ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ - (۱۵/۴۷)۔ اس معاشرہ میں فراوانیٔ رزق کی یہ کیفیت عارضی نہیں ہوگی بلکہ ہمیشہ ایسی ہی حالت رہے گی۔(وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ - ۱۵/۴۸ -) وہاں کے باغات میں ہر وقت نہریں جاری رہیں گی تاکہ ان کی سرسبزی اور شادابی میں کمی نہ آنے پائے۔ بڑے سے بڑا حادثہ بھی ان کی اس زندگی میں انتشار پیدا نہیں کر سکے گا۔ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ- (۲۱/۱۰۳)۔ اس معاشرہ میں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ خدا کی صفتِ ربّ العالمین (تمام کائنات کی پرورش و ربوبیت) کس طرح مشہود شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ (وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - (۱۰/۱۰) یہ ہے مختصر سا نقشہ اس معاشرہ کا جو خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ اس معاشرہ کے پورے خط و خال اور تفصیلی کوائف دیکھنے ہوں تو قرآن کریم کے ان مقامات کو سامنے لائیے جن میں جنت کی تفاصیل دی گئی ہیں[1]۔ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس معاشرہ میں انسان کس قسم کی شگفتہ اور شاداب زندگی بسر کرے گا۔ لیکن جب انسان ضابطۂ خداوندی کو چھوڑ دے گا تو پھر وہی پریشانیاں شروع ہو جائیں گی۔ یعنی جب انسان اپنے معاشرے کو اپنے بنائے ہوئے قانون کے مطابق متشکل کرے گا تو اس میں (انسانی ذات کی نشو و نما کا تو ذکر ہی کیا) روٹی کے مسئلہ کا حل بھی کہیں نظر نہیں آئے گا۔ لیکن اگر اس معاشرہ کو قانونِ ربوبیت کے مطابق متشکل کرے گا تو نہ صرف یہ کہ اس کے معاشی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے بلکہ اس کی ذات کی نشو و نما بھی ہوتی چلی جائے گی۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ نظامِ ربوبیت نہ محض "روحانی" مسئلہ ہے اور نہ ہی محض "معاشی"، اس میں معاشی اور روحانی دونوں مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

قریبی مفاد (حیات الدنیا) اور مستقبل کے مفاد (حیاتِ آخرت) کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دونوں نظریئے ہمارے سامنے آگئے۔ اور ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان دونوں نظریوں کے ماتحت جس قسم کے معاشرے متشکل ہوتے ہیں ان میں انسانی زندگی کس شکل سے بسر ہوتی ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کریم ان دونوں نظریوں اور معاشروں کو کس کس انداز سے مقابلہ کرتے ہوئے سامنے لاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ قرآن کی ساری تعلیم کا منتہیٰ و مقصود قانونِ ربوبیت کے مطابق معاشرے کا قیام ہے اس لئے پورا قرآن ان ہی تفاصیل سے بھرا پڑا

---

[1] یہ تفاصیل میری کتاب "جہانِ فردا" میں ملیں گی۔

ہے۔ کہیں ان نظریوں کے اصول و مبانی کا ذکر ہے۔ کہیں آفاقی کائنات کی مشینری کی مثالوں سے سمجھایا گیا ہے کہ وہاں یہی قانونِ ربوبیت، کس نظم و ضبط اور حسن و خوبی سے کارفرما ہے۔ کہیں اممِ سابقہ کی تاریخی یادداشتوں سے بتایا گیا ہے کہ دیکھو! انفرادی مفادِ زندگی پر مبنی معاشرہ کا انجام کیا ہوا۔

قرآن کے دعاوی علیٰ وجہ البصیرت

قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کسی دعوے کو اندھے عقیدے کے طور پر منوانا نہیں چاہتا۔ وہ ہر دعوی کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ تم میرے دعاوی کو علم و بصیرت کی میزان میں تولو۔ اور پھر دیکھو کہ ان کا وزن کیا نکلتا ہے اگر یہ اس میزان پر پورے اتریں تو انہیں مانو۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جب میں کسی دعوے کو بلا دلیل و برہان نہیں منواتا تو تمہارے لئے بھی یہ مناسب نہیں کہ تم ان کا انکار بلا دلیل و برہان یونہی سرسری کر دو۔ اگر تم ان دعاوی کو جھٹلاتے ہو تو (هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ - ۲۷/۶۴) تم اپنے دعوے کی تائید میں دلیل پیش کرو۔ اسے اپنے دعاوی کی صداقت پر اس قدر محکم یقین ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہی کہہ دیتا ہے کہ جاؤ! جتنی جی چاہے کوشش کر دیکھو، تمہیں ان دعاوی کے خلاف علم کی بارگاہ سے کوئی دلیل نہیں مل سکے گی۔ (لَا بُرْهَانَ لَهٗ - ۲۳/۱۱۷) کتنا بڑا ہے یہ دعویٰ اور کس قدر حتم و یقین کے ساتھ اسے پیش کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ (وہ کہتا ہے کہ) قرآنی دعاوی محض ظن و قیاس پر مبنی نہیں، علم و حکمت پر مبنی ہیں۔ اس لئے اسے علم کی شہادات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار ان لوگوں کی زجر و توبیخ کرتا ہے جو علم و برہان سے کام نہیں لیتے اور محض ظن و تخمین اور اسلاف کی تقلید کی بنا پر قرآنی دعاوی سے انکار کر دیتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ ان دونوں نظریوں کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ "انفرادی مفاد" کے نظریہ کی علت "لینا" ہے۔ اس کے برعکس نظامِ ربوبیت کا مدار "دینے" پر ہے۔ دیکھئے وہ اس

دونوں نظریوں کا تقابل

تفریق و تمیز کو کتنے واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اس جہانِ کارزار میں بڑی جد و جہد کرتے ہو لیکن تمہاری کوششوں کے رُخ مختلف سمتوں میں ہوتے ہیں۔ (اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى - ۹۲/۴) ان مختلف سمتوں کی چھوٹی چھوٹی شاخیں کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، آخر الامر یہ دو بڑی شاخوں میں بٹ جاتی ہیں۔ ایک شاخ ہے "دینے" کی، اور ایک شاخ ہے "لینے" کی۔ سو یاد رکھو! جس نے دینا سیکھا اور اس طرح اپنی محنت کے ماحصل کو خدا کے قانونِ ربوبیت کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا (فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى - ۹۲/۵) اور یوں معاشرہ کے توازن کو برقرار رکھ کر اپنے نظریۂ زندگی کو سچ کر دکھایا۔ (وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى - ۹۲/۶)

تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس پر فراوانی اور آسانی کی راہیں کھول دی جائیں گی۔ (فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى - ۹۲/۷) یہ ہے ایک نظریۂ زندگی اور اس کا نتیجہ۔ اس کے برعکس، جس نے دوسرا نظریۂ زندگی اختیار کیا اور سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھنے کی فکر میں لگ گیا اور سمجھ بیٹھا کہ میں اب ہر شے سے بے نیاز ہو چکا ہوں (وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى - ۹۲/۸)۔ اور اس طرح اس نے اپنے معاشرہ کے توازن کو بگاڑ دیا (وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى - ۹۲/۹) تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس پر مشقت اور عسرت کی راہیں آسان ہو جائیں گی (فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى - ۹۲/۱۰) لیکن اس قسم کا ناہموار معاشرہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گا۔ اس میں انقلاب آکر رہے گا۔ جب انقلاب آئے گا تو اس وقت جمع کردہ مال انسان کے کسی کام نہ آسکے گا۔ (وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى - ۹۲/۱۱) اس نے یہ نظریۂ زندگی اس لئے اختیار کیا تھا کہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ زندگی کا مقصد کھانا۔ پینا (جسم انسانی کی پرورش) ہے۔ جس کے لئے انسان کے اپنے رجحانات (خواہ وہ جبلت (INSTINCT) پر مبنی ہوں اور خواہ تنہا عقل پر) کافی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی نشو و ارتقا کے لئے انسان کے خود ساختہ قوانین کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے یہ فریضہ ہم نے (خدا نے) اپنے ذمہ لے رکھا ہے کہ انسانی زندگی کی ربوبیت کے لئے (جس میں جسم اور انسانی ذات دونوں کی نشو و نما شامل ہے) ضابطۂ ہدایت (راہ نمائی کے اصول) خود متعین کریں (اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى - ۹۲/۱۲) یہ اس لئے کہ انسان کے سامنے صرف اس کے انفرادی مفاد ہوتے ہیں۔ وہ پیش پا افتادہ قریبی مفاد ہی کو دیکھ سکتا ہے۔ اس کی نگاہ دور تک نہیں جاتی۔ وہ اس لئے نوعِ انسانی کے مفادِ کلّی کو نہیں دیکھتا اور نہ ہی اپنی مستقبل کی زندگی کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے (خدا کے) سامنے قریب اور بعید، حال اور مستقبل، فرد اور نوعِ انسانی، سب کے مفاد ہوتے ہیں۔ (اِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى - ۹۲/۱۳) لہٰذا تم ان لوگوں کو ان کے انفرادی نظریۂ زندگی کے مآل و عواقب سے آگاہ کر دو اور انہیں بتا دو کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری زندگی کی کھیتی جھلس کر رہ جائے گی (فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى - ۹۲/۱۴) یہ جہنم اس معاشرے کا نتیجہ ہے جس میں ہر فرد، دوسرے فرد سے الگ رہتا ہے اور اس طرح خدا کے قانونِ ربوبیت کے علی الرغم گریز کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ (لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى - ۹۲/۱۵-۱۶)

اس کے برعکس وہ معاشرہ ان ہلاکتوں سے محفوظ رہے گا جس میں ہمواریاں پیدا ہوں گی اور اس طرح تمام افراد کامل ہم آہنگی سے مفادِ کلّی کے حصول میں منہمک رہیں گے۔ (وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى - ۹۲/۱۷) اس معاشرہ میں ہر فرد کی کوشش یہ ہوگی کہ وہ اپنی محنت کا ماحصل دوسروں کو دے اور اس طرح ان کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچائے اور بالواسطہ

لے صفحہ ــــ پر ملاحظہ فرمادیں

خود اپنی ذات کی نشو و نما کرے۔ (اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی۔ ۹۲/۱۸) اس معاشرہ میں کوئی شخص خدا کی بخشائش (نعماء خداوندی) کا معاوضہ نہیں چاہے گا۔ بلکہ انہیں نوعِ انسانی کی ربوبیتِ اعلیٰ کے مقصد کے حصول میں صرف کرتا جائے گا۔ (وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَۃٍ تُجْزٰٓی اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی ۹۲/۱۹-۲۰) اس معاشرہ کے حسین و درخشندہ نتائج فوراً سامنے آجائیں گے۔ (وَلَسَوْفَ یَرْضٰی۔ ۹۲/۲۱)۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک نکتہ پر مزید غور کرنا ضروری ہے جو مندرجہ بالا آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ تمہاری عقل تمہاری راہنمائی کے لئے کافی نہیں۔ راہنمائی ہمیں دے سکتے ہیں۔ وَ اِنَّ عَلَیْنَا لَلْھُدٰی۔ ۹۲/۱۲) یہ نکتہ قرآنی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ ہے اور یہیں سے وحی کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ ہم دیکھ

وحی کی ضرورت

چکے ہیں کہ ہر فرد کی عقل کا تقاضا اس کے اپنے مفاد کا تحفظ ہے۔ اور اسی طرح ہر قوم (گروپ) کا تقاضا، اس قوم (گروپ) کے مفاد کا تحفظ ہے۔ [حقیقت یہ ہے کہ فرد، اپنے آپ کو گروپ کے ساتھ منسلک ہی اس لئے کرتا ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ گروپ کے ساتھ رہنے میں وہ زیادہ محفوظ ہو جاتا ہے]۔ نہ فرد کی عقل کسی دوسرے فرد کا مفاد سوچ سکتی ہے اور نہ قوم (گروپ) کی عقل کسی دوسری قوم (گروپ) کے مفاد کا خیال رکھ سکتی ہے۔ مفادِ غیر کا تحفظ عقل کے بس کی چیز نہیں۔ جس طرح میری آنکھ صرف مجھے دکھا سکتی ہے میرے کان صرف مجھے سنا سکتے ہیں۔ میری زبان صرف مجھے ذائقہ کا علم دے سکتی ہے، اسی طرح میری عقل صرف میرے مفاد کا تحفظ کر سکتی

---

[۱] (فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ) تقویٰ کے معنی عام طور پر پرہیزگاری کئے جاتے ہیں لیکن اس سے قرآن کی اس عظیم اصطلاح کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ تقویٰ کا مادہ وقی ہے جس کے معنی نگہداشت اور حفاظت کے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی کے ہر شعبے میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت رکھے اور ان سے کامل ہم آہنگی کی زندگی بسر کرے۔ اس سے وہ زندگی کے راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہے گا۔

[۱] (صفحہ ہذا) یاد رکھئے جب عقل کائناتی امور میں تجسس کرتی ہے تو وہاں صرف انکشافِ حقیقت (DISCOVERIES) کا سوال پیش ہوتا ہے اسلئے وہاں عقل صحیح کام کرتی ہے لیکن انسانوں کی دنیا میں چونکہ ایک انسان کے مفاد کا تصادم دوسرے انسان کے مفاد سے ہوتا ہے اسلئے اس میں ہر فرد کی عقل اس فرد کے مفاد کا سوچتی ہے۔ اس سے الگ ہو ہی نہیں سکتی۔ انسانوں کی دنیا میں اگر عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس سے خالص ابلیسی معاشرہ وجود میں آجاتا ہے جس میں ہر انسان دوسرے انسان کا دشمن ہو جاتا ہے (بعضکم لبعض عدو)۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ:۔

گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ — آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

لیکن اگر اسی عقل کو وحی کے تابع رکھا جائے تو اس سے جنتی معاشرہ وجود میں آجاتا ہے۔

ہے۔ لہٰذا، کسی فرد یا افراد کے مجموعہ (قوم) کی عقل کے بس کی بات نہیں کہ وہ نوعِ انسانی (یعنی اپنے سے باہر دیگر افراد یا اقوام) کے مفاد کے لئے کوئی نظام وضع کر سکے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان کو کسی ایسے مقام سے راہنمائی ملے جو انسانی جذبات سے بلند ہو۔ یعنی وہ سرچشمۂ ہدایت یکسر خارجی (OBJECTIVE) ہونا چاہیئے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں وحی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ اس قسم کا نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لئے تمہاری عقل کافی نہیں ...... کیونکہ اس میں تمہارے جذبات کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہ راہنمائی ہماری طرف ہی سے مل سکتی ہے۔ (اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى۔ ۹۲/۱۲) اور یہ اس لئے کہ تم صرف اپنا اپنا مفاد دیکھ سکتے ہو۔ اور ہم مفادِ کلّی کو سامنے رکھ سکتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　　سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اب آپ پھر اسی موضوع کو سامنے لایئے جو پیچھے سے چلا آ رہا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے سورۂ روم میں دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قریبی مفادِ خویش، اس قدر بیش پا افتادہ اور اُبھرے ہوئے ہوتے ہیں کہ لوگ ان کی طرف کشاں کشاں چلے جاتے ہیں اور مستقبل کے مفاد کا تصور ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ (يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔ ۳۰/۷)۔ لیکن اگر یہ ذرا بھی غور و فکر سے کام لیں اور اپنے میلانات و قیاسات سے کام لینے کی بجائے علم و تحقیق کی بارگاہ سے پوچھیں تو انہیں وہاں سے یہی جواب ملیگا کہ زندگی کا راز، مستقبل کے مفادِ کلّی کے نظریہ میں ہے نہ کہ انفرادی مفاد کے پروگرام میں۔ دنیا میں یوں تو علوم و فنون کے سینکڑوں شعبے ہیں۔ لیکن اگر آپ انہیں سمٹا لیں تو یہ تین اصولی شاخوں میں بٹ جاتے ہیں۔ علمِ خویش (یعنی انسان کا اپنے آپ سے متعلق علم۔ اس میں میڈیسن۔ فلسفہ اور سائیکالوجی وغیرہ آ جاتے ہیں)۔ علمِ کائنات (جس میں سائنس کے تمام شعبے آ جاتے ہیں)۔ اور نوعِ انسانی کی تاریخ۔ قرآن کہتا ہے کہ علم کے ان تینوں شعبوں میں تحقیق کرو۔ اور پھر دیکھو کہ یہ کارگہِ عالم "لینے" کے انفرادی نظریہ کے ماتحت چل رہا ہے یا "دینے" کے عالمگیر اجتماعی نظریہ کے مطابق۔

سب سے پہلے خود انسان کو لیجئے۔ (اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ۔ ۳۰/۸) ذرا دیکھو کہ جسمِ انسانی میں کس طرح ہر عضو اور اس کا ہر حصہ اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس آئے وہ اسے دوسروں تک پہنچا دے، معدہ، جگر، پھیپھڑے، دل۔ دماغ۔ شریان، وریدیں، حتیٰ کہ ذرا ذرا سے خلیئے (CELLS) سب کے سب دن اور رات اسی کوشش میں سرگرداں ہیں کہ جو کچھ ان کے پاس آئے، اس میں اپنی محنت کو شامل کر کے جلد سے جلد دوسروں

تک پہنچا دیں۔ یہ نظام اسی نظریئے کے ماتحت قائم ہے۔ اگر کبھی (مثلاً) معدہ، اس قانونِ انفاق کی بجائے نظریۂ بخل کو اپنا مسلک بنا لے اور جو کچھ اس میں داخل ہوا ہے وہیں روک لے، تو دیکھئے یہ ساری مشینری کس طرح جامد ہو جاتی ہے۔ اگر دل ایک ثانیے کے لئے بھی "دینے" (اعطیٰ) کے اصول کو چھوڑ کر خون کو تھام کر بیٹھ جائے تو دیکھئے! کس طرح ایک ثانیہ میں موت واقع ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی ورید یا شریان، ایک ذرہ خون کو آگے پاس (PASS) نہ کرے تو دیکھئے! کس طرح پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ جسم کی پرورش اور زندگی کا دار و مدار کس طرح "دینے" کے نظام پر ہے۔

انسانی جسم سے آگے بڑھو اور خارجی کائنات پر غور کرو۔ دیکھو وہاں بھی کس طرح یہی نظامِ انفاق وایتاء کارفرما ہے۔ زندگی کا دار و مدار حرارت اور روشنی پر ہے۔ دیکھو سورج کس طرح روشنی اور حرارت مسلسل و متواتر دیئے چلا جاتا ہے۔ وہ اس معاملے میں ذرا بھی بخل نہیں برتتا۔ یہی کیفیت دیگر عناصرِ کائنات کی ہے۔ ہر ایک "دینے" اور دوسرے کی ربوبیت کے سامان بہم پہنچانے کی فکر میں سرگرداں ہے۔ اسی نظام کا نتیجہ ہے کہ کائنات میں تعمیری نتائج مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ورنہ اگر عناصرِ کائنات میں سے کوئی ایک عنصر ایک لمحہ کے لئے بھی، بخل سے کام لے تو یہاں تخریب ہی تخریب رونما ہو جائے۔ (وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ - ۳۰/۸)۔

اس سے آگے بڑھو تو انسانیت کی تاریخ پر غور کرو۔ جن قوموں نے صرف معاشی زندگی کے انفرادی نظریہ کو سامنے رکھا۔ وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔ جب تک کسی قوم میں مفادِ عامہ کا تصوّر و نظام غالب رہا، وہ قوم زندگی اور اس کی عیش سامانیوں سے متمتع ہوتی چلی گئی۔ جب یہ تصور بدلا، معاشرے میں ناہمواریاں اور مفاد پرستیاں شروع ہو گئیں۔ اور وہ قوم تباہ و برباد ہو گئی۔

تاریخی شہادت

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ - (۳۰/۹)

کیا یہ لوگ دنیا میں چل پھر کر نہیں دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے گذر چکی ہیں ان کا انجام کیا ہوا؟

انہوں نے ان سے بھی زیادہ قوت و شوکت کا سامان اکٹھا کر رکھا تھا۔ (كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً - ۳۰/۹) اور معاشی وسائل سے بھی خوب نفع اندوز ہوتے تھے۔ (وَاَثَارُوا الْاَرْضَ - ۳۰/۹) اس لئے ان کی بستیاں بڑی آباد اور بارونق تھیں۔ (وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا - ۳۰/۹) لیکن ان کا نظریۂ زندگی باطل تھا۔ ان کی طرف خدا

کے فرستادگان صحیح نظریۂ حیات لے کر آئے لیکن انہوں نے اپنی روش میں تبدیلی پیدا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا معاشرہ تباہ و برباد ہو گیا۔ (وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۔ ۳۰/۹)۔ اس لئے کہ خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ جو قوم اپنے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتی ہے، خود ان کی زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کا توازن بگڑ جاتا ہے اور چونکہ زندگی کا دارو مدار توازن اور اعتدال پر ہے۔ اس لئے اس عدمِ توازن سے ان کی زندگی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۔ (۳۰/۱۰)۔ جب تک اس قسم کا ہلاکت انگیز انقلاب نہیں آتا، ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مفاد پرست گروہ کے افراد کم از کم آپس میں، ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ لیکن جب اس قسم کا جھٹکا آئے جس سے ان کے مفاد کی عمارت متزلزل ہوتی دکھائی دے تو اس وقت یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ در اصل خود آپس میں بھی ایک دوسرے کے بہی خواہ نہیں تھے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۔ (۳۰/۱۳)۔

اس وقت سب شریکِ کار (PARTNERS) الگ الگ ہو جاتے ہیں اور کوئی کسی کے ساتھ کھڑا نہیں ہوتا۔ سب اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کی راہوں پر الگ الگ چل نکلتے ہیں۔ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ ۔ (۳۰/۱۴)

یہ تو تھا ایک نظریۂ زندگی۔ اس کے برعکس، جو لوگ خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں اور پھر اس نظام کے قیام و استحکام کے لئے عملی پروگرام پر گامزن ہوں تو ان کے معاشرہ کی کیفیت یوں سمجھئے جیسے کسی پانی کے خوشگوار چشمے کے گرد سدا بہار پھول مہک رہے اور کھیتیاں لہرا رہی ہوں اور وہ ان میں نغمہ بار ہوں۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ۔ (۳۰/۱۵)

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن دنیاوی زندگی اور اس کی آسائشوں کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ ان کی یہ اہمیت اسی صورت میں ہے جبکہ نظریۂ حیات، ربوبیتِ عالمینی (تمام نوعِ انسان کی ربوبیت) اور مستقبل کی زندگی (انسانی ذات) کی نشو و ارتقاء ہو۔ اگر اس کے خلاف نظریۂ زندگی صرف طبیعی زندگی کے مفاد کا حصول ہو جائے تو پھر ان معاشی آسائشوں کی کوئی قیمت نہیں رہتی بلکہ یہ الٹا تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت

دنیاوی زندگی لہو ولعب

دنیاوی زندگی کی قیمت لہو ولعب سے زیادہ کچھ نہیں رہتی، لہو ہر اس جاذبیت کو کہتے ہیں جو انسان کو اس کے مقصد سے غافل کر دے۔ اور لعب اس پروگرام کو کہتے ہیں جس میں حرکت (MOVEMENT) تو ہو لیکن اس سے انسان منزل کے قریب نہ پہنچ سکے۔ جیسے بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی، کہ وہ ہر وقت حرکت میں تو رہتی ہے لیکن ساحل کے قریب نہیں پہنچتی۔ لہٰذا طبیعی نظریۂ حیات میں زندگی کی جدوجہد انسان کو اس کی منزلِ مقصود (ربوبیتِ ذات اور حصولِ حیاتِ جاوداں) کی طرف نہیں لے جاتی۔ سورۂ حدید میں ہے۔ (اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ۔ 57/20)۔ یعنی مفادِ خویش کے نظریہ کے ماتحت زندگی کی معاشی جدوجہد، بے مقصد حرکت اور منزل سے غافل کر دینے والی جاذبیتوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ اس سے آگے بڑھیے تو اس جدوجہد کا مقصد یہ رہ جاتا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے مقابلہ میں بڑا دکھائی دے اور مال ودولت اور جتھہ بندی میں ایک دوسرے سے آگے نکل جائے۔ وَتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ (57/20) (فخر کہتے ہیں ایسے بالھ (UDDER) کو جو دکھائی تو دے بہت بڑا لیکن اس میں دودھ بالکل نہ ہو، اور اگر دودھ بہت کم ہو تو اسے غرور کہتے ہیں)۔ لیکن اس نہج زندگی کے معاشی فوائد پر خوش ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسان ایسی روئیدگی پر خوش ہو جائے جو بارش کے ہلکے سے چھینٹے سے یوں ہی اُگ آئے اور اس کی جڑیں اوپر ہی اوپر ہوں۔ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ۔ (57/20)۔ اس قسم کی کھیتی کی زندگی کے دن کی ہوتی ہے؟ ذرا دھوپ پڑی اور مرجھا گئی۔ اور خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا (57/20)۔ ایسی کھیتی پر آس لگا کر بیٹھنے والے کا انجام معلوم ہے۔ اس کا مستقبل دردناک اور عبرت انگیز عذاب کے سوا اور کیا ہوگا۔ (وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ۔ 57/20)۔ اس قسم کی مایوسیوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان اپنی محنت کو خدا کے قانون کے ساتھ ہم آہنگ کر دے۔ (وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ۔ 57/20) اگر ایسا نہ کیا جائے اور زندگی کا مقصد محض طبیعی مفادِ خویش رکھا جائے تو جیسا کہ کہا جا چکا ہے اس روش کا ماحصل ایسی متاع ہے جو صرف دیکھنے میں بڑی نظر آتی ہے، حقیقت میں کچھ نہیں۔ (وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ)۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں جاگزین ہے۔ ہم اس جذبہ کو کچلنا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ اس میں استحکامِ خودی کا راز پوشیدہ ہے۔ لیکن ہم اس کے لئے میدان دوسرا تجویز کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتے ہو تو اس نظام کے قیام کی کوشش میں آگے بڑھو جو ربوبیتِ عامہ کی بنا پر تمام انسانیت کی حفاظت کا سامان بہم پہنچا دے۔ (سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ 57/21)۔ اور

(لہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

اس طرح، وہ جنت تمہارے سامنے مشہود ہو جاتے جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ (وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ۔ ۵۷/۲۱)۔ اور جو اس نظام کا عملی نتیجہ ہوتی ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے قانون کے ذریعے متشکل ہوتا ہے۔ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ۔ ۵۷/۲۱)۔ اس قسم کی معاشی خوش حالیاں کسی خاص گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر اس قوم کو مل سکتی ہیں جو خدا کے قانون کے مطابق اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ (ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ۔ ۵۷/۲۱) اس لئے کہ اللہ کا قانون وہ اصل و بنیاد ہے جس پر حقیقی معاشی خوش حالیوں کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ (وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔ ۵۷/۲۱)

دنیاوی زندگی کے "کھیل تماشا" اور اخروی زندگی کے فی الحقیقت زندگی ہونے کے متعلق ایک اور زاویہ نگاہ سے بھی غور کیجیے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان کی طبیعی زندگی کا دارومدار، طبیعی سامانِ زیست پر ہے۔ لیکن انسان کی ذات کی نشوونما ان مستقل اقدار کے تحفظ سے ہوتی ہے جو وحی کی رو سے ملتی ہیں جب تک طبیعی سامانِ زیست کے حصول اور مستقل اقدار میں تصادم (CLASH) نہیں ہوتا، اس باب میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب ان دونوں میں ٹکراؤ ہو تو اس وقت کیا کرنا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس وقت، مستقل اقدار کے تحفظ کے لئے طبیعی مفاد کو قربان کر دینا چاہیے اس لئے کہ طبیعی مفاد کے مقابلہ میں مستقل اقدار کی قیمت بہت زیادہ ہے اور مستقل اقدار کے مقابلہ میں طبیعی مفاد ہیچ ہیں خواہ دنیاوی نقطۂ نگاہ سے ان کی قیمت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ قرآن کریم نے جہاں جہاں دنیاوی زندگی اور اس کے ساز و سامان کو ہیچ قرار دیا ہے، اس سے مطلب یہی ہے۔ یہ نہیں کہ دنیاوی زندگی اور اس کا ساز و سامان بہرحال ہیچ اور قابلِ نفرت ہے۔ اس نکتہ کو سمجھ لینے سے ان تمام مقامات کا صحیح مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

(٥)

اس وضاحت کے بعد آگے بڑھیے۔

قرآن کہتا ہے کہ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ وہ معاشرہ جو طبیعی زندگی کے انفرادی مفادِ خویش کے نظریہ پر قائم ہو گا، تباہ و

لہ (فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ) قرآن میں دوسری جگہ ہے کہ باہمی منافست چاہتے ہو تو "جنت کی زندگی" اور اس کی خوشحالیوں اور شادکامیوں کے حصول میں منافست کی کوشش کرو۔ (وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ۔ ۸۳/۲۶)۔ سورۂ بقرہ میں (نیز کئی ایک دوسرے مقامات میں) ہے کہ آگے بڑھنا چاہتے ہو تو نوعِ انسانی کی بہبود کے کاموں میں آگے بڑھو (فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ ۲/۱۴۸) "دینے میں ایک دوسرے سے سبقت لیجاؤ نہ کہ لینے" میں۔ (۲۳/۶۱-۶۰)

برباد ہوجائے گا اور جس نظام کی بنیادیں نوعِ انسانی کے مفادِ کلّی پر ہوں گی جس سے انسانی ذات کی نشو ونما ہوتی ہے وہی انسانیت کی ربوبیت کا ضامن اور انسانی ذات کی نشو وارتقاء کا کفیل ہوگا، تو یہ دعویٰ ایک عظیم الشان حقیقت پر مبنی ہے۔ اور وہ حقیقت

کائنات میں ایک ہی قانون

یہ ہے کہ تمام کائنات میں ایک ہی قانون کارفرما ہے۔ اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ تم اپنے معاشی کاروبار کو کائناتی قانون سے الگ کرکے، کامیاب ہوجاؤ۔ جو معاشرہ اپنے معاشی معاملات کے لئے الگ قاعدے مقرر کرے اور انہیں اخلاقی دنیا کے (کائناتی) قوانین کے ساتھ ہم آہنگ نہ رکھے تو اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ قرآن کریم اس بنیادی دعوے کو بڑے شد ومد سے پیش کرتا اور مختلف انداز سے اسے اجاگر کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس خدا کا قانونِ ربوبیت، کائنات میں جاری وساری ہے، اسی خدا کا قانونِ ربوبیت، انسانوں کی معاشی دنیا میں بھی کارفرما ہونا چاہیئے۔ جو شخص انسانوں کی معاشی دنیا میں کسی اور قانون اور ضابطہ کا اتباع چاہتا ہے، وہ درحقیقت شرک کا مجرم ہے (اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ یُنْشِرُوْنَ [21/21]) "کیا ان لوگوں نے اپنی معاشی زندگی (ارض) کے لئے الگ الٰہ (قوانین) تجویز کر رکھے ہیں جن کی یہ اطاعت کرتے ہیں اور ان کے سہارے اپنے معاشی پروگرام کو عام کرنا چاہتے ہیں؟" اگر ان کی یہی روشِ زندگی ہے تو انہیں سن رکھنا چاہیئے کہ اگر انسان کی معاشی زندگی میں کوئی اور قوانین نافذ ہوں اور کائناتی زندگی میں اور، تو اس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ (لَوْ کَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ [21/22]) تمام کائنات اور انسانوں کی دنیا کی مرکزی ربوبیت کا مالک وقادر ایک خدا ہے جس کا عالمگیر قانون ہر جگہ نافذ العمل ہے۔ وہ خدا ان لوگوں کے اس قسم کے "مشرکانہ" تصورات سے بہت بلند ہے۔ (فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ [21/22])

یہ دعویٰ کہ کائنات میں ایک ہی قانون کارفرما ہے، دورِ حاضرہ کے مفکرین کے نزدیک حقیقت ثابتہ بن چکا ہے۔ اس باب میں (HANS DREISCH) لکھتا ہے:-

وحدتِ قانون

> یہ نظریہ کہ تمام کائنات ایک منظم وحدت ہے، وحدتِ نظم (MONISM OF ORDER) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحدتِ نظم کا یہ تصور کائنات کے متعلق دیگر تمام تصورات کو منسوخ کر دیتا ہے۔ اس کی رو سے کائنات کے مختلف شعبوں میں الگ الگ نظام باقی نہیں رہتے تمام کی تمام کائنات وحدتِ نظم کی مظہر بن جاتی ہے۔
>
> اس وحدتِ نظم کے پیشِ نظر قوانینِ فطرت کے تصور میں بھی تبدیلی ضروری ہوجاتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں

فطرت میں متعدد قوانین نہیں بلکہ ایک ہی قانون کارفرما نظر آئے گا۔ (۳)

ایک اور ممتاز سائنس دان اس باب میں لکھتا ہے :-

جوں جوں ہم عناصر اور ان کے مرکبات کے متعلق قوانین کا مطالعہ کرتے ہیں، یہ حقیقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ساری کائنات میں ایک ہی قانون نافذ العمل ہے۔ (۴)

صرف منکر ہی نہیں

لہٰذا یہ تصور کہ کائناتی زندگی میں اور قانون کارفرما ہے اور انسان کی معاشی زندگی کسی اور قانون کے تابع ہونی چاہیئے یکسر باطل ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس قسم کا تصور رکھنے والے لوگ صرف وہی نہیں جو خدا کی ہستی کے منکر .... (ATHEISTS) ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو یہ تو مانتے ہیں کہ کائنات میں خدا کا قانون نافذ ہے لیکن اپنی معاشی زندگی کو اپنے (خود ساختہ) قوانین کے تابع رکھتے ہیں۔ سورۂ عنکبوت میں ہے کہ اگر ان لوگوں سے پوچھو کہ کائنات کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کس کے قانون کے تابع مصروفِ خرام ہیں۔ تو یہ کہہ دیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے (۲۹/۶۱)۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جب یہ لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں تو ان سے پوچھو کہ تم انسان کی معاشی زندگی کے لئے قوانین کی تلاش میں کسی دوسری طرف کیوں جاتے ہو؟ وہاں بھی اسی کا قانون کیوں نہیں تسلیم کرتے؟ (۲۹/۶۱)۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ بارش کس کے قانون کے مطابق برستی ہے اور زمین سے کھیتی کس کے نظام کے ماتحت اُگتی ہے تو یہ کہہ دیں گے کہ اللہ کے (۲۹/۶۳)۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جب یہ لوگ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں تو ان سے پوچھو کہ تم انسان کی معاشی دنیا میں انسان کا خود ساختہ نظریۂ حیات (جس میں ہر فرد اپنے ہی مفاد کو پیشِ نظر رکھتا ہے) کیوں جاری کرنا چاہتے ہو؟ اور اس نظریہ پر کیوں عمل پیرا نہیں ہوتے جس کی رو سے انسانیت کا مفادِ کلی اور انسان کے مستقبل کی زندگی کی کامرانیاں، مقصود و منطوق بنتی ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ خدا کو ماننا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ جن مستقل اقدار (PARMANENT VALUES) کی مظہر اس کی صفات (اسماء) ہیں، ان سب اقدار کو بنیادی اور اٹل تسلیم کیا جائے۔ اسی سے تمہاری ذات اور معاشرہ کے اندر حسن و نظم قائم رہ سکتا ہے۔ یہ انداز غلط ہے کہ اس کی بعض صفات کو آگے بڑھا دیا جائے اور دوسری صفات کو پیچھے ہٹا دیا جائے۔ یہ الحاد ہے۔ الحاد کے معنی ہیں ایک طرف ہٹ جانا (جس طرح لحد ایک طرف ہٹا کر بنائی جاتی ہے) چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے کہ :-

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ۔ (۷/۱۸۰)

صفاتِ خداوندی میں حسنِ کارانہ توازن ہے۔ اس لئے اسے ان تمام صفات کے ساتھ پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو ان میں ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔

یعنی وہ عالمِ آفاق میں خدا کے قانون کو تسلیم کرتے ہیں لیکن عالمِ انسانیت میں دوسرے قوانین کی طرف جھک جاتے ہیں۔ یا انسان کی دنیا میں بعض شعبوں میں خدا کے قانون کو آگے رکھتے ہیں اور دوسرے شعبوں میں اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ معاشی دنیا میں خدا کے قانون کی جگہ اپنے قوانین کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ مفادِ خویش کے نظریہ کے ماتحت دنیاوی زیست کا ساز و سامان لہو و لعب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ حقیقی زندگی اسی نظریہ سے حاصل ہوتی ہے جس میں نگاہ مستقبل اور پوری انسانیت پر رہے۔ وَهٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ (۲۹/۶۴)۔ لہٰذا صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ جس خدا کا قانون کائنات میں کارفرما ہے، اسی خدا کا قانون انسان کی معاشی اور عمرانی زندگی میں کارفرما رہے۔ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ۔ (۴۳/۸۴)۔ یہ انسان کی کوتاہ نگہی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ کائنات ایک بےجان مشینری ہے اس لئے اسے تو کسی اور (یعنی خدا) کے قوانین کے تابع رہنا چاہیئے لیکن میں صاحبِ اختیار و ارادہ ہوں اس لئے میری معاشی زندگی پر کائناتی قوانین کیوں نافذ ہوں؟ یہ اس کی غلط بینی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کے

فطرت اللہ

جس قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کے مطابق باقی کائنات وجود میں آئی ہے، اسی قانون کے مطابق انسان کو بھی پیدا کیا گیا ہے۔ (۳۰/۳۰) اوسپنسکی کے الفاظ میں:

> یہ ناممکن ہے کہ ہم انسان کا مطالعہ کئے بغیر کائنات کا مطالعہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم انسان کا مطالعہ کائنات کا مطالعہ کئے بغیر کر سکیں۔ انسان تو کائنات کا عکس ہے۔ اس کی تخلیق انہی قوانین کی رو سے عمل میں آئی ہے جن قوانین کی رو سے کائنات کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ لہٰذا یہ اپنی ذات کے مطالعہ سے کائنات کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ یعنی ان تمام قوانین کا مطالعہ جن کے تحت سلسلۂ کائنات چل رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ کائنات اور اس کے قوانین کا مطالعہ کرلے گا جن کے تابع اس کی اپنی زندگی بسر ہونی چاہیئے۔ (۵)

یعنی انسان کی تخلیق ان ہی قوانین کے مطابق عمل میں آئی ہے جن کے مطابق کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔ اللہ کے قانونِ تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ ایک محکم، بنیادی اور توازن بدوش نظام ہے۔ لیکن اس کی کنہ (حقیقت) صرف علم کی رو سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۳۰/۳۰) اگر تم غور کرو تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائیگی

کہ کائنات کے نظام کو قائم رکھنا، انسانی تخلیق کے مقابلے میں بہت بڑا کام ہے۔ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۰/۵۷)۔ اس لئے یہ سمجھنا غلطی ہے کہ اس قدر عظیم اور محیر العقول کارگہ کائنات تو خدا کے قانون کی گرفت میں ہے لیکن انسان اپنی دنیا میں اپنے خود ساختہ قانون کو نافذ کرلے اور اس کے بعد توقع یہ رکھے کہ اس سے وہی نتائج مرتب ہوجائیں جو کائنات میں مرتب ہورہے ہیں! یہ خیالِ خام ہے۔ قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جو لوگ نظامِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں اور اس کے بعد ایسا پروگرام مرتب کریں جو انسانوں میں ہمواریاں پیدا کرنے کا موجب ہو۔ اور ان کے برعکس وہ لوگ جو معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کریں، تو ان دونوں کی زندگی کبھی ایک جیسی نہیں ہوسکتی۔ جس طرح ایک اندھے اور دیکھنے والے کی زندگی ایک جیسی نہیں ہوسکتی۔ (وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ (۴۰/۵۸)۔ اگر تم (اور نہیں تو کم از کم) انسانی تاریخ ہی کو سامنے رکھو تو یہ حقیقت تم پر واشگاف ہوجائے گی۔ لیکن تم تو اتنا بھی نہیں کرتے (قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ۔ ۴۰/۵۸) اگر تم انسانی تاریخ کا مطالعہ کرو تو تم دیکھو گے کہ جن قوموں نے قانونِ خداوندی سے سرکشی برتی اور ایسے پروگرام بناتے جن سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوگئیں تو ان کی ان تدبیروں کا وبال خود ان کے اوپر آپڑا۔ (اِسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۔ (۳۵/۴۳)۔ یہ خدا کا کائناتی قانون ہے۔ یہ سنت اللہ ہے۔ اور سنت اللہ (خدا کے قانون) میں نہ کبھی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کبھی اپنی سمت بدلا کرتا ہے۔ (وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۔ ۳۵/۴۳)۔

لہٰذا انسان اپنے خود ساختہ معاشی نظام کی رو سے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کامیابی کا راز خدا کے اس قانون کے اتباع میں ہے جس میں حال اور مستقبل، فرد اور نوعِ انسان سب کی خوشگواریوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ۔ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ۔ (۵۳/۲۴-۲۵)۔ لہٰذا جو لوگ پیش پا افتادہ مفادِ عاجلہ ہی کو سامنے رکھتے ہیں اور مستقبل کا خیال چھوڑ دیتے ہیں وہ کس طرح کامیاب ہوسکتے ہیں؟ (كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۔ ۷۵/۲۰-۲۱؛ ۷۶/۲۸؛ ۸۷/۱۶؛ ۹۲/۱۳؛ ۹۳/۴)۔ جو لوگ صرف طبعی مفاد کے لئے جد و جہد کرتے ہیں، قانونِ فطرت کے مطابق، انہیں ان کی کوششوں کا پورا پورا بدلہ مل جاتا ہے (۱۱/۱۵)، لیکن یہ شعلۂ مستعجل ہوتا ہے، اس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ان معاشی فراوانیوں میں پائیداری نہیں ہوتی۔ (۲/۴۴)۔ پائیداری خدا کی ربوبیتِ عالمینی کے نظام ہی کے لئے ہے (۵/۴۴)، قریبی مفاد ہی کو پیش نظر رکھنے والوں کے لئے

مستقبل کی خوشگواریوں میں کوئی حصہ نہیں ہوسکتا۔ فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا وَمَا لَهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ۔ (۲/۲۰۰) لیکن جو لوگ اس نظریہ زندگی کو اپنا نصب العین بناتے ہیں، جس کی رو سے حال اور مستقبل دونوں توازن بدوش خوشگواریوں کے حامل ہو جاتے ہیں تو یہ وہ معاشرہ ہے جو تباہیوں سے بچ سکتا ہے اور اس میں ہر ایک کی محنت صحیح صحیح نتیجہ مرتب کر سکتی ہے۔ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَّ فِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ نَصِیۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا وَ اللّٰهُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ۔ (۲/۲۰۱-۲۰۲) خدا کے نظامِ ربوبیت میں حال اور مستقبل دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے:

> جو صرف مفادِ عاجلہ کو چاہتا ہے تو ہم اپنے کائناتی قانون کے مطابق اسے مفادِ عاجلہ دے دیتے ہیں۔ لیکن (مستقبل کی خوشگواریوں میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوتا) اس کا انجام جہنم ہوتا ہے جس میں وہ خاسر و ناکام اور محروم و نامراد جلتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو مستقبل کے مفاد پر نگاہ رکھتا ہے اور اس کے لئے پوری جدوجہد کرتا ہے اور اسے اپنی جدوجہد کے نتائج پر یقین کامل ہوتا ہے تو ایسے لوگوں کی مساعی بھرپور نتائج کی حامل ہو جاتی ہیں۔ (۱۷/۱۸-۱۹)

سورۃ کہف میں ان دونوں نظریوں کے حاملین کا تقابل "باغ والوں کی مثال" سے کیا گیا ہے جس میں ایک شخص اپنی محنت کے نتائج اپنے خود ساختہ قوانین کے تابع رکھنا چاہتا ہے اور دوسرے کی نگاہ قانونِ خداوندی پر رہتی ہے۔ اول الذکر کو قریبی مفاد تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن آخر الامر اس کے حصے میں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں آتا۔ (۱۸/۳۲-۴۴)۔ اسی طرح سورۃ یونس میں کھیتی کی مثال سے بتایا کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ کھیتی پیدا تو خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے لیکن اس کے مصرف کے لئے ان کے اپنے فیصلوں سے بلند و بالا کوئی قانون نہیں تو ان کھیتوں کا ایسا حشر ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص انہیں دیکھ کر نہیں کہہ سکتا کہ ابھی کل تک ان میں کھیتی لہلہاتی تھی (۱۰/۲۴)۔ اس تقابل کے بعد وہ کہتا ہے کہ انجام کار کی سلامتی صرف خدا کے قانونِ ربوبیت عامہ کے مطابق ہی مل سکتی ہے۔ (وَ اللّٰهُ یَدۡعُوۡۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ۔ ۱۰/۲۵) اسی لئے وہ بار بار کہتا ہے کہ صحیح نشو و نما کا سامان حال اور مستقبل دونوں کی ہم آہنگی ہی سے مل سکتا ہے۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمُ اتَّقُوۡا مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡكُمۡ وَ مَا خَلۡفَكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ۔ (۳۶/۴۵)۔

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ تمہارے سامنے ہے (حال کے قریبی مفاد) اور جو کچھ بعد میں آنے والا ہے (مستقبل) ان دونوں میں ہم آہنگی رکھو۔ تاکہ تمہیں وہ قالب (PATTERN) مل جائے جس میں تمہاری نشو و نما ہو سکے۔

(رَحِم وہ قالب جس میں جنین کی نشو و نما ہوتی ہے)

سورۂ بقرہ میں ہے کہ (یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ ۲/۲۱۹) "یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ نظامِ ربوبیت میں کس قدر حصّہ مفادِ عامہ کے لئے کھلا رکھنا ہوگا؛ اس کے جواب میں کہا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے۔ جو کچھ تمہاری اپنی ضرورت (پرورش) سے زیادہ ہے وہ سب کا سب مفادِ عامہ کے لئے کھلا رہے گا۔ (قُلِ الْعَفْوَ۔ ۲/۲۱۹)۔ اس کے بعد کہا کہ "ہم ان باتوں کو اس لئے واضح طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ تم اپنے حال اور مستقبل دونوں کو نگاہ میں رکھ سکو۔ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ ۲/۲۱۹)۔ یہی وہ معاشرہ ہے جس میں انسانی زندگی اس شجرِ طیب کی طرح ہوتی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ۔ ۱۴/۲۴) اور جو خدا کے قانونِ ربوبیت کے مطابق ہمیشہ پھلوں سے لدا رہے۔ (تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا۔ ۱۴/۲۵) اس طرح اللہ کا قانون' ان لوگوں کو حال اور مستقبل دونوں میں ثبات عطا کر دیتا ہے۔ (يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ..... ۱۴/۲۷)۔ اس لئے صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ انسان اپنی نگاہ مستقبل پر رکھے۔ (وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۵۹/۱۸) اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کا حال اور مستقبل دونوں روشن ہو جائیں گے۔ (۲/۱۳۴) جو لوگ محض قریبی مفاد پر نظر رکھتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہی نظریۂ زندگی خوشحالیوں کا ضامن اور باقی رہنے والا ہو سکتا ہے جس میں نگاہ مستقبل پر رہے۔ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى۔ ۸۷/۱۶-۱۷ ؛ ۹۲/۱۳ ؛ ۹۳/۴) یہ صرف خدا کا نظامِ ربوبیت ہے جس میں حال اور مستقبل (آغاز اور انجام) دونوں محمود ہو جاتے ہیں۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ لَهُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ وَ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ (۲۸/۶۹-۷۰)

قانون صرف ایک خدا کا قانون ہے۔ اس کے سوا کسی اور کا قانون نہیں۔ اسی قانون کے مطابق زندگی کا نظام' ابتداء اور انتہا دونوں میں محمود ہوتا ہے۔ کائنات میں ہر مقام پر اسی کا اقتدار ہے۔ اس لئے تمہاری زندگی کی ہر حرکت کو بھی اس کے گرد گھومنا ہوگا۔

یعنی تم کسی طرح بھی اس کے قانون کی گرفت سے نکل نہیں سکتے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ اگر یوں زندگی بسر کروگے تو اس کے نتائج یہ ہوں گے۔ اور اگر دوسری طرح زندگی بسر کروگے تو اس کے نتائج وہ ہوں گے۔ یہ تو تمہارے اختیار میں ہے کہ تم کس قسم کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ تم زندگی ایک نہج کی بسر کرو اور اس کے نتائج دوسری قسم کے برآمد ہو جائیں۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔

یہ ہے قرآن کا نظامِ ربوبیت۔
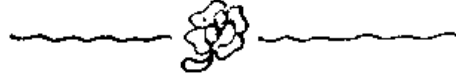
P.95 -(1) C.E.M.Joad, in - Decadence. pp. 328-29

P.96 -(2) Robert Briffault - The Making Of Humanity- p.101

P.113 (3) Driesch, in, The Problem of Individuality. p.63

(4) Thomas Dwight. in, Thoughts Of A Catholic Anatomist; quoted by F.W.Jones, in Design and Purpose. p.59

P.114- (5) P.D.Ouspemsky, in - In Search of the Miraculous. p.75

چھٹا باب

ایک بنیادی اعتراض ــــ حقِ ملکیت

گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک نظریۂ زندگی وہ ہے جس کی رو سے ہر انسان اپنے اپنے مفاد کا تحفظ چاہتا ہے۔ اسے دوسرے کے مفاد سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ دوسرا نظریۂ زندگی وہ ہے جس کے مطابق ہر شخص نوعِ انسانی کی ربوبیت کی فکر کرتا ہے اور رزق کے سرچشموں کو عام کرنے کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہتا ہے۔ چونکہ تحفظِ خویش کا جذبہ حیوانات کی جبلت میں داخل ہے اس لئے ایسا دکھائی دیتا ہے گویا پہلا نظریۂ زندگی انسان کی "فطرت" میں داخل ہے۔ ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کی طرف لپکتا ہے۔ اس کی عقل اسے ہر وقت اسی پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں عقلِ بے باک کا نام ابلیس یا شیطان ہے (یعنی وہ عقل جو خدا کے قوانین کی روشنی میں نہیں چلتی بلکہ خود اپنے انفرادی مفاد کے تقاضوں کی رُو سے فیصلے کرتی ہے)۔ اس عقل کا مسلسل وعظ یہ ہوتا ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ سمیٹ کر اپنے پاس جمع رکھو۔ اگر تم نے اپنی محنت کی کمائی دوسروں کو دیدی تو تم تنگدست ہو جاؤ گے اور وقت پڑنے پر پچھتاؤ گے۔ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ[1] (۲/۲۶۸)۔ شیطان تمہیں

عقل کا تقاضا

---

[1] فَحْشَآء کے معنی بخل (یعنی سمیٹ کر اپنے لئے جمع رکھنے) کے ہیں۔ چونکہ اس نظریۂ زندگی کے ماتحت انسان کے اندر ایسی کمینہ خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو عربوں جیسی کشادہ ظرف ذہنیت کے نزدیک شرافت کے یکسر منافی تھیں، اسلئے انہوں نے بےحیائیوں کے لئے بھی اس لفظ فحش کا استعمال کیا۔

محتاجی کے خوف سے ڈراتا رہتا ہے اور اس طرح بخل کا تقاضا کرتا رہتا ہے۔ یہ عقلِ خود بین (شیطان) انسان کے اموال و اولاد میں دخیل کار ہو جاتی ہے (وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ۔ ۱۷/۶۴) اور اس طرح نسلِ انسانی کی نکیل پکڑ کر اسے جس طرف چاہتی ہے، لیے لیے پھرتی ہے۔ (لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا ۔ ۱۷/۶۲)

حَنَكَ کا لفظ غور طلب ہے۔ جب کسی جانور، گدھے یا گھوڑے کو لگام نہ دی جائے بلکہ اس کے منہ کو رسی سے کس کر باندھ دیا جائے اور پھر اس رسی کو آگے سے پکڑ کر اسے کھینچا جائے تو اسے احتناک کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ عقلِ خود بین انسان کو مفادِ خویش کی رسی سے باندھ کر جہاں جی چاہے کشاں کشاں لئے پھرتی ہے۔

اندریں حالات انسان کے دل سے یہ خیال نکال کر، اسے اس پر آمادہ کرنا کہ وہ مفادِ خویش کی بجائے "مفادِ ہمہ" کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے، یعنی اپنی عقل کو خود بینی کی بجائے جہاں بینی سکھائے بڑا ہمت طلب مرحلہ ہے۔ ایسا ہمت طلب کہ قرآن نے اسے "نہایت بلند، دشوار گذار پہاڑ" پر چڑھنے سے تعبیر کیا ہے (فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۔ ۹۰/۱۱)

انسان کی عقل اپنے اس مسلک کے جواز میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتی ہے کہ مختلف انسانوں میں کمانے کی استعداد (EARNING CAPACITY) مختلف ہوتی ہے۔ جو شخص زیادہ کماتا ہے اسے اپنی کمائی پر پورا پورا حقِ ملکیت حاصل ہونا چاہیئے۔ اس سے اس کی کمائی چھین کر دوسروں کو دے دینا، ظلم اور غصب ہے۔ جو شخص دن میں بیس[1] روپے کماتا ہے اس سے یہ کہنا کہ تم چار روپے رکھو اور سولہ روپے دوسروں کو دے دو، اگر جبر و استبداد نہیں تو اور کیا ہے؟ حق و انصاف کا کون سا قانون ہے جس کی رو سے آپ اس کی محنت کا ماحصل چھین سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنی کمائی میں سے کچھ رقم خیرات کرنا چاہے تو یہ اور بات ہے۔ آپ اس کے حقِ ملکیت میں تصرف نہیں کر سکتے! آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ مفاد پرستی اور سرمایہ داری کے پورے نظام کی عمارت اسی "دلیل" پر قائم ہوتی ہے۔

سرمایہ پرستی کی دلیل

قرآن نے (بنی اسرائیل کے) قارون کو نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے کہ جب اس پر اعتراض کیا جاتا کہ اس کے پاس اس کی اس روش کا کیا جواز ہے کہ اس نے اس قدر دولت کے خزانے بھر رکھے ہیں اور غریب بھوکے مر رہے ہیں۔ تو وہ اس کے جواب میں کہتا:-

إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي ۔ (۲۸/۷۸)

---

[1] عقلِ خود بین دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است ۔ (اقبالؔ)

میں نے جو کچھ کمایا ہے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے۔

اس لئے کسی کو کیا حق ہے کہ میری ملکیت میں دست اندازی کرے! قرآن کہتا ہے کہ یہی دلیل ہر مفاد پرست اور سرمایہ دار گروہ پیش کرتا چلا آرہا ہے اور یہی دلیل اس تمام فتنہ اور فساد کی جڑ ہے (بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ ۚ قَدْ قَالَهَا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۳۹/۴۹ نیز ۲۸/۷۸)۔ قرآن نہایت حسن و خوبی سے اس دلیل کا تجزیہ کرتا ہے اور حقائق کو سامنے لاکر اس کی کمزوری کو بے نقاب کرتا ہے۔ سنیئے اس باب میں وہ کہتا کیا ہے۔

ذرا غور کرو۔ تم بھی صبح سے شام تک کام کرتے ہو اور ایک مزدور بھی صبح سے شام تک کام کرتا ہے۔ تمھارا دن بھر کا کام اتنا پیدا کرتا ہے جس کی قیمت (مثلاً) بیس روپے ہے اور مزدور اتنا پیدا کرتا ہے جس کی قیمت (مثلاً) دو روپے ہے[1]۔ تم دونوں کی کمائی میں دو عنصر شامل ہیں۔ (i) محنت۔ اور (ii) کمائی کی استعداد کا فرق۔ شق i۔ دونوں میں مشترک ہے۔ فرق شق ii میں ہے۔ اور اسی فرق کی بنا پر تمھاری پیداوار کی قیمت (مزدور کی پیداوار سے) اٹھارہ روپے زیادہ ہے۔ تم کہتے ہو کہ تمہاری استعداد کی زیادتی، تمہاری اپنی ہے۔ اس لئے اس سے پیدا شدہ کمائی بھی تمہاری اپنی ہونی چاہیئے۔ اس دلیل کی بنا پر تم اس زائد کمائی کو اپنی ملکیت میں رکھتے ہو۔ اس سے سرمایہ جمع ہو جاتا ہے۔ اس سرمایہ سے تم بہت سی چیزیں خرید کر اپنی ملکیت میں لے آتے ہو (مثلاً زمین۔ وسائل آب پاشی۔ مکانات، صنعت وغیرہ) اس سے تمہاری آمدنی اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ [پھر یہی جمع شدہ سرمایہ تمھاری اولاد کو وراثتاً مل جاتا ہے۔ انہیں نہ محنت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی کمانے کی استعداد کی حاجت۔ وہ بغیر کام کئے اس سرمایہ پر عیش کرتے ہیں۔ لہٰذا اس دلیل کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے کہ جس شخص میں کمانے کی استعداد زیادہ ہے اسے اپنی زیادہ کمائی پر حقِ ملکیت حاصل ہے]

قرآن کہتا ہے کہ ذرا ان دونوں چیزوں کا تجزیہ کرو۔ یعنی (i) تمھاری ذہنی استعداد اور (ii) سرمایہ کے ذریعے خرید کردہ وسائل پیداوار۔ اور پھر دیکھو کہ ان میں تمھارا حصہ کس قدر ہے!

ایک انسان کی ذہنی استعداد کی تخلیق و تعمیر میں حسب ذیل عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔

(i) دماغی خلیات (BRAIN - CELLS) کی ساخت جس کا تعلق پیدائش سے ہے۔

(ii) ابتدائی ماحول۔

---

[1] اس وقت ہمیں اس مسئلہ سے بحث نہیں کہ یہ قیمتیں بھی خود معاشرہ ہی کی متعین کردہ ہوتی ہیں۔

(iii) تعلیم و تربیت
(iv) ذہنی استعداد کے استعمال کے موزوں مواقع
(OPPORTUNITIES)

} ان سب کا تعلق اس معاشرے سے ہے جن میں بچہ پیدا ہوتا ہے۔

آپ غور کیجئے کہ ان تمام عناصر میں سے وہ کون سا عنصر ہے جو آپ کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ یا جس میں آپ کے کسب و ہنر کا دخل ہے؟ اگر آپ کا دماغ اچھا ہے تو یہ چیز آپ کی اپنی پیدا کردہ نہیں بلکہ وہبی (یا یوں کہیئے کہ پیدائشی[1]) ہے اگر آپ کی تربیت اچھے ماحول میں ہوتی ہے تو اس میں بھی آپ کی ذاتی کاریگری (تو ایک طرف اختیار و ارادہ) کو بھی کوئی دخل نہیں۔ اگر اتفاق سے آپ کا ماحول خراب ہوتا تو آپ کیا کر لیتے؟ اسی طرح، اگر آپ کی تعلیم کے لئے اچھی درسگاہیں موجود تھیں تو اس میں بھی آپ کی اپنی کاریگری کا کوئی دخل نہیں۔ اگر اس علاقے میں، جہاں آپ پیدا ہوئے تھے کوئی اسکول ہی نہ ہوتا۔ یا اسکول میں تعلیم کا اچھا انتظام نہ ہوتا تو آپ کی تعلیم ناقص رہ جاتی۔

اب لیجئے وہ وسائل پیداوار جنہیں آپ اپنے سرمایہ سے خرید کر ان کے اجارہ دار بن جاتے ہیں۔ ان میں سب سے بنیادی وسیلہ ارض (زمین) ہے۔ [یہی وجہ ہے کہ قرآن نے معاشی زندگی کے لئے بھی ارض کی اصطلاح استعمال کی ہے کیونکہ تمام معاشی وسائل کی اُم (ماں) ارض ہی ہے]۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ ارض کی تخلیق اور اس کے ذریعہ رزق ہونے میں تمہاری ہنرمندی کو کیا دخل ہے؟ یہی صورت پانی، حرارت، روشنی، ہوا، معدنیات وغیرہ کی ہے۔ قرآن نے اس بنیادی حقیقت کو اپنے مخصوص دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا اس کھیتی پر غور کرو جس کے ماحصل کے تم واحد مالک بننا چاہتے ہو۔ (اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ - ۵۶/۶۳) تم اتنا ہی کرتے ہو نا! کہ ہل چلا کر بیج ڈال دیتے ہو۔ اس کے بعد، کیا یہ قوت بھی تمہیں حاصل ہے کہ اس بیج کو زمین سے اُگا کر پودا بنا دو؟ کیا یہ کچھ تم کرتے ہو یا ہمارا قانون کرتا ہے جس پر تمہیں کوئی قدرت حاصل نہیں۔ (ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ - ۵۶/۶۴)۔ اگر ہم اس کھیتی کو پروان نہ چڑھائیں اور اسے پکنے سے پہلے

---

[1] اس لئے خدا کا ارشاد ہے کہ انسان کو اس قابل ہمیں نے بنایا ہے کہ وہ علم حاصل کر سکے (۹۶/۵) لیکن انسان اسکے بعد خود ہمارے قانون ہی سے سرکشی اختیار کر لیتا ہے (۹۶/۶) اور اپنے علم و ہنرمندی کی بنا پر اپنے آپ کو مستغنی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ (۹۶/۷)

ہی چورا چورا کر دیں تو فصل کا گھر لے جانا تو ایک طرف، تمہاری محنت اور بیج کی قیمت کی بھی تم پر چیٹی پڑ جائے۔

اس میں تمہارا حصہ کتنا ہے؟

(لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ - اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۵۶/۶۵) اس سے آگے بڑھو اور اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری فصلوں اور خود تمہاری اپنی زندگی کا دار و مدار ہے۔ (اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ - ۵۶/۶۸) کیا اس پانی کو تم بادلوں سے برساتے ہو یا ہمارا قانون برساتا ہے (ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۵۶/۶۹) فرض کرو ہم ایسا انتظام نہ کرتے کہ سورج کی شعاعیں عملِ کشید سے صاف اور مقطر پانی اوپر لے جائیں اور سمندر کے تمام نمک (جس سے اس کا پانی نہ پینے کے قابل ہوتا ہے اور نہ ہی زراعت کے کام آسکتا ہے) سمندر میں باقی رہ جائیں تو بتاؤ اس میں تم کیا کر لیتے۔ (لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ - ۵۶/۷۰) اور آگے بڑھیئے اور اس آگ پر غور کیجئے جس پر کھانے پینے کی اشیاء اور زندگی کا دار و مدار ہے۔ کیا اس میں حرارت تمہاری پیدا کردہ ہے یا ہماری؟ (اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ - ۵۶/۷۱) کیا یہ درخت تمہاری ہنر مندی سے پیدا ہوئے ہیں جن سے آگ روشن کی جاتی ہے؟ (ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ - ۵۶/۷۲) ذرا سوچو کہ اس سارے کاروبار میں تمہاری ہنر مندی اور کاریگری کا کتنا دخل ہے اور ہمارے کائناتی قانونِ ربوبیت کا کس قدر حصہ ہے؟ سوچو کہ۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

یہ سب کچھ ہمارے قانون کا کیا ہوا ہے۔ اس میں تمہاری صرف محنت تھی۔ باقی سب کچھ ہمارا تھا۔ اب بات یوں ہوئی کہ ایک مشترکہ کاروبار تھا جس میں تمہاری محنت تھی اور ہمارا سرمایہ (CAPITAL) اس کاروبار کے منافع (پیداوار) کو اسی نسبت سے بانٹ لینا چاہیئے۔ تم اپنی محنت کا معاوضہ لے لو اور ہمیں ہمارے سرمایہ کا حصہ دے دو۔ ہم نے اپنا حصہ انسانیت کی ربوبیتِ عامہ کے لئے وقف کر رکھا ہے اس لئے اسے ان تک پہنچا دو۔ (نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ۔ ۵۶/۷۳)۔ ہم نے اسے بھوکوں کے لئے وقف کر رکھا ہے اور اس طرح خدا کی ربوبیتِ عامہ (عظیم ربوبیت) کے قیام و استحکام میں سرگرم عمل رہو۔ (فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۵۶/۷۴)

اسی طرح سورۂ عبس میں ہے کہ انسان ذرا اپنی خوراک پر غور کرے جس پر اس کی زندگی کا دار و مدار ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور سوچے کہ اس میں کس قدر حصّہ اس کی کاریگری کا ہے اور کتنا حصہ ہمارا ہے۔ (فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ ۔ ۸۰/۲۴)۔ ہمارا قانونِ ربوبیت بارش برساتا ہے۔ پھر اسی قانون کے مطابق زمین پھٹتی ہے اور اس میں سے کونپل پھوٹتی ہے۔ پھر اس سے بالیں ملتی ہیں اور ان میں دانے پڑتے ہیں۔ پھر اس طرح انگور اور ترکاریاں، زیتون اور کھجور اور طرح طرح کے پھلوں کے گھنے باغات اور چارہ پیدا ہوتا ہے (۸۰/۲۵-۳۱) یہ پھل اور چارہ کس مقصد کے لئے ہے تمہاری اور تمہارے مویشیوں کی پرورش کے لئے (مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۔ ۸۰/۳۲) (نیز دیکھئے ۳۶/۳۵ ؛ ۲۳/۱۸-۲۱ ؛ ۱۴/۳۵)

سورۂ قٓ میں ہے کہ ہم نے زمین کو اس طرح پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ پیدا کر دیئے۔ اور اس نظامِ زراعت و آب رسانی کے ذریعے طرح طرح کی خوشنما چیزیں اگا دیں۔ اس نظام میں ہر شخص کے لئے جو اپنی توجہات کو اس طرف منعطف کرے گا سامانِ بصیرت و تذکیر ہے (۵۰/۷-۸)۔ پھر ہم نے بادلوں سے مینہ برسایا جس سے بڑے بڑے باغات اگائے اور کھیتی بھی۔ نیز کھجوروں کے تہ بہ تہ خوشے۔ یہ سب کچھ انسانوں کی پرورش کے لئے ہے۔ (رِزْقًا لِّلْعِبَادِ ۔ ۵۰/۱۱)

ان حقائق کو سامنے لانے کے بعد قرآن ایک سوال کرتا ہے اور وہ یہ کہ بتاؤ کہ یہ تمام وسائلِ معیشت کس کے پیدا کردہ ہیں؟ (اَمَّنْ هٰذَا الَّذِىْ يَرْزُقُكُمْ ۔ ۶۷/۲۱) اور اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ بتاؤ کہ اگر وہ اس رزق کو روک لے تو تمہاری ہنرمندی کیا کرے؟ (اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۔ ۶۷/۲۱) اگر وہ (مثلاً) پانی کو نیچے لے جائے اور سطحِ زمین سے اوپر نہ آنے دے تو تم کیا کرلو (۶۷/۳۰)۔ وہ کہتا ہے کہ سوچو کہ یہ بات کس قدر صاف اور واضح ہے۔

---

[1] (فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ)۔ قرآن میں رَبِّكَ الْعَظِيْمِ اور رَبِّكَ الْاَعْلٰى کی اصطلاحات غور طلب ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم میں سے ہر شخص اپنی اپنی پرورش کی فکر کرتا ہے یا اپنے بال بچوں کی پرورش کی فکر۔ یہ بھی ربوبیت ہے۔ لیکن اس ربوبیت میں انسان اور حیوان سب برابر ہیں۔ حیوان بھی اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ لہٰذا اس ربوبیت کی سطح بہت نیچی ہے۔ اس کا دائرہ بہت محدود ہے۔ یہ ربوبیتِ صغریٰ یا ربوبیتِ ادنیٰ ہے۔ اس کے برعکس خدا کی ربوبیت میں تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت شامل ہے۔ (وہ ربّ العٰلمین ہے) اس لئے اس کی ربوبیت عظیم اور اعلیٰ ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ تمہیں اس کی صفتِ ربوبیتِ عظمیٰ یا ربوبیتِ اعلیٰ کا مظہر بننا چاہیئے۔ (سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى ۔ یا سَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ) یعنی نظامِ ربوبیت کے قیام میں سرگرمِ عمل رہنا چاہیئے۔

ہم نے زمین کو پھیلایا۔ ہم نے بادلوں کو بلند کیا اور ان سے پانی برسایا۔ ہم نے اس میں سے پھل اور غذا کی دوسری چیزیں پیدا کیں (۲۲/۲)۔ یہ سب کچھ تو ہم نے کیا لیکن تم ہو کہ بجائے اس کے کہ اس متاع (سامانِ معیشت) کو ہمارے قانونِ ربوبیت کے مطابق استعمال میں لاؤ، اس قانون کی بجائے اپنے ہی قاعدے اور قانون بنا لیتے ہو اور رزق کی تقسیم ان کے مطابق کرنے لگ جاتے ہو، فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲۲/۲)

اپنا حصہ لے لو

اس تمام کاروبار میں تمہارا حصہ محنت کا ہے۔ وہ تم لے لو، اور باقی حصہ ہمارے سرمایہ کا ہے وہ ہمیں دے دو۔ (وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۔ ۱۴۲/۶) سورۂ حجر میں ہے کہ اس پیداوار میں صرف تمہارے لئے ہی سامانِ معیشت نہیں بلکہ ان کے لئے بھی ہے جن کے متعلق تم (بزعمِ خویش) اپنے معاشی نظام کے ماتحت، سمجھتے ہو کہ ان کا اس میں کچھ حق نہیں؟ (وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ۔ ۲۰/۱۵) ہم نے اس سامانِ معیشت کو تمام نوعِ انسانی (بلکہ انسان کے علاوہ دوسری مخلوق) کے لئے وجہِ ربوبیت بنایا ہے۔ (وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۔ ۱۰/۵۵) اور اس کے ساتھ ہی میزان (خدا کا وہ ضابطہ قوانین جس کی رو سے رزق کی صحیح صحیح تقسیم ہوتی ہے اور معاشرہ کا توازن قائم رہتا ہے) بھی بھیجا ہے۔ اس لئے میزان کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور کسی کے حصے میں کمی بیشی نہ کرو۔ (وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۔ ۹/۵۵)

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی کہ وسائلِ پیداوار خدا کی بخشائش ہیں جن کا مقصد تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت ہے۔ اس لئے کسی کو حق نہیں کہ ان کی حدبندی کر کے انہیں اپنی ملکیت میں لے لے۔

وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۔ (۲۰/۱۷)

اور جو کچھ تیرے رب کی طرف سے بطور بخشش عطا ہوا ہے اس کی حدبندی نہیں کی جا سکتی۔ اس کے گرد حصار نہیں کھینچا جا سکتا۔

زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں

یہ ظاہر ہے کہ ان معاشی وسائل میں جو خدا کی طرف سے بطور بخشش (تمام نوعِ انسانی کو مفت) عطا ہوتے ہیں، زمین کی حیثیت بنیادی ہے اس لئے زمین کے متعلق اور بھی واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اسے عام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ سورۂ حٰم السجدہ میں ہے:

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا۔ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (۴۱/۹)

اُن سے کہہ دو کہ کیا تم اس خدا کے قانونِ ربوبیت سے انکار کرنا چاہتے ہو جس نے زمین کو دو مدارج (PERIODS) میں (پیداوار کے قابل) بنایا۔ اس لئے کہ وہ تمام کائنات کا ربوبیت کرنے والا ہے۔ لیکن تم اوروں کو بھی خدا کا ہمسر بنا دیتے ہو؟

اس کے بعد ہے:

وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَآ اَقْوَاتَهَا فِیْٓ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ۔ (۴۱/۱۰)۔ [نیز ۱۵/۱۹-۲۰؛ ۷۶/۳۱-۳۲]

اور اس نے اس کے اوپر پہاڑ کھڑے کر دیئے۔ (تاکہ آب رسانی کا سلسلہ ٹھیک ٹھیک کام کرے) اور زمین میں فراوانیٔ رزق کی استعداد پیدا کر دی۔ اور چار موسموں میں اس کی پیداوار کے اندازے مقرر کر دیئے۔ اسے تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔

یہ بنیادی ذریعہ پیداوار (زمین) خدا کی طرف سے بلاقیمت عطا ہوا ہے تاکہ اس سے تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہو سکے۔ زمین پر لکیریں کھینچ کھینچ کر اسے ذاتی ملکیت قرار دے لینا، خدا کے خلاف سرکشی اور اس کے قانونِ ربوبیت سے بغاوت ہے۔ جو کچھ خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ تمام انسانوں کو یکساں طور پر ملا ہے، قرآن کی رُو سے ان پر انفرادی ملکیت کا تصور ہی باطل ہے۔ ہوا۔ پانی۔ روشنی۔ حرارت۔ زمین۔ سب انسانی زندگی اور اس کی پرورش کے اسباب و ذرائع ہیں جو خدا کی صفتِ ربوبیت کی وجہ سے مفت عطا ہوتے ہیں۔ انہیں انسانوں کی پرورش کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔

اس حقیقت کو پھر دُہرا لیجئے کہ انسان کی کمائی میں تین عناصر شامل ہوتے ہیں۔[1]

(i) وسائلِ پیداوار

(ii) ذہنی استعداد

(iii) محنت

---

[1] چونکہ سرمایہ، کمائی کی جمع شدہ شکل کا نام ہوتا ہے اس لئے اسے ان عناصر میں شامل نہیں کیا گیا۔

انہیں نمبر دار، نیچے سے اوپر لیجئے۔

محنت کا صلہ محنت کے معنی ہیں اپنی وسعت کے مطابق پوری پوری کوشش کرنا۔ اس میں تین قسم کے افراد آجائیں گے۔

(i) وہ افرادِ معاشرہ جو اس کام کی سرانجام دہی میں جو ان کے سپرد کر دیا جائے' اپنی وسعت کے مطابق پوری پوری کوشش کریں۔

(ii) وہ لوگ جو وسعت کے باوجود محنت نہ کریں۔

(iii) وہ لوگ جو کسی حادثہ یا پیدائشی نقص کی وجہ سے محنت سے معذور ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ شق نمبر (i) کے تمام افراد، محنت کے معاوضے میں یکساں ہوں گے۔ (فرق اکتسابی استعداد کا ہوگا، جس کا ذکر بعد میں آتے گا) ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں ہوگی۔ اگر ایک مزدور اپنی استعداد کے مطابق باہر میدان میں چھ گھنٹے کام کرتا ہے اور ایک انجینئر میز پر بیٹھا، اپنی استعداد کے مطابق چھ گھنٹے کام کرتا ہے، تو جہاں تک ان کی محنت کا تعلق ہے، دونوں برابر ہیں۔ اس لئے دونوں (اپنی محنت کے لئے) یکساں معاوضے کے مستحق ہیں۔

شق نمبر (ii) کے لوگ کسی معاوضے کے مستحق نہیں۔ (اگر وہ وسعت کے باوجود کم محنت کرتے ہیں تو وہ کم معاوضے کے مستحق ہوں گے۔) اس لئے کہ (لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ - ۵۳/۳۹) (معاوضہ بمقدار محنت) اٹل قانون ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص محنت نہ کرے اور اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ دوسرے لوگ اٹھائیں۔ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ - ۵۳/۳۸)۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ یہی عدل کا تقاضا ہے۔ قرآنی نظامِ ربوبیت میں ان مترفین کے لئے کوئی جگہ نہیں جو استطاعت کے باوجود محنت نہ کریں اور دوسروں کی محنت پر گزارہ کرنا چاہیں۔

اب رہے تیسری شق کے لوگ۔ سو ٹھیٹھ عدل کی رو سے یہ کسی معاوضے کے مستحق نہیں لیکن قرآن کے نظامِ ربوبیت میں عدل کے ساتھ احسان بھی ہے۔ احسان کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں جہاں کہیں (جس شخص میں) کوئی کمی (DEFFICIENCY) آجائے اس کی کو پورا کرکے، معاشرے کے توازن (حُسن) کو قائم رکھا جائے۔ لہٰذا' انہیں عدل نہیں بلکہ احسان کے اصول کے مطابق دیا جائے گا۔

یہ تو صورت ہوئی محنت کے اعتبار سے۔ اب اکتسابی استعداد (EARNING CAPACITY) ۔ اور

اکتسابی استعداد

ضروریاتِ زندگی کو لیجئے۔ اس کی رُو سے بھی افرادِ معاشرہ کی تین شقیں ہو جائیں گی۔
(i) وہ لوگ جو اپنی استعداد کی زیادتی کی وجہ سے، اپنی ضروریات سے زیادہ پیدا کرلیں۔
(ii) وہ لوگ جو استعداد کی کمی کی بنا پر اپنی ضروریات سے کم پیدا کرسکیں۔
(iii) وہ لوگ جو فقدانِ استعداد کی بنا پر کچھ بھی پیدا نہ کرسکیں۔ (یاد رہے کہ وہ طبقہ جو استعداد کے باوجود محنت نہ کرے، خارج از بحث ہے۔)

قرآن کہتا ہے کہ استعداد کی زیادتی، تمہاری اپنی پیدا کردہ نہیں۔ اس کے اسباب و علل تمہاری ذاتی حدودِ امکان سے باہر تھے۔ (وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ ۱۶/۵۳) اس لئے اس پیداوار کے تم بطور استحقاق مالک نہیں ہو سکتے۔ (وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ۔ ۱۶/۷۱) تمہیں حصولِ رزق کی استعداد میں ایک دوسرے پر جو فضیلت حاصل ہے وہ ہماری طرف سے ہے، اس لئے اس استعداد کے ماحصل کے بھی "ہم" مالک ہیں۔ یہ فاضلہ پیداوار، ہمارے قانونِ ربوبیت کے مطابق صرف ہوگی۔ اس کا مصرف شق (ii) کے لوگ ہیں جنہیں قرآن کی اصطلاح میں سائل کہا جاتا ہے۔ یعنی ضرورت مند) اور شق (iii) کے لوگ (جنہیں قرآن محروم کہہ کر پکارتا ہے)

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (۵۱/۱۹)
اُن کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے۔

"ان کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے"۔ حق کے لفظ پر غور کیجئے۔ یعنی یہ لوگ اس مال کو بطور حق (AS OF RIGHT) طلب کر سکتے ہیں۔ بطور خیرات نہیں بلکہ بطور استحقاق۔ اس لئے کہ یہ مال جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے "خدا" کی ملکیت ہے۔ اور خدا نے اسے "سائل و محروم" کے لئے مختص کر رکھا ہے۔

وسائلِ پیداوار

اب رہا تیسرا عنصر۔ یعنی وسائلِ پیداوار۔ سو ان کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ سب "نِعْمَةٌ مِّنَ اللّٰهِ" ہیں۔ اس لئے ان پر کسی کے حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ تم اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا کیوں نہیں رکھتے (وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ ۵۷/۱۰) کیونکہ ارض و سماء کی ملکیت خدا ہی کی ہے تمہاری نہیں۔

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۷/۱۰)

اب اس بنیادی اعتراض کو پھر سامنے لایئے جس سے آغازِ سخن ہوا تھا۔ یعنی جن لوگوں میں کمانے کی استعداد زیادہ ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ سب ہماری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ (اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ) اس لئے ہم اس کے واحد مالک ہیں۔ اور چونکہ ہم اسی سرمایہ سے زمینیں اور جائیدادیں خرید (اور بنا) لیتے ہیں، اس لئے ہم اُن کے بھی "جائز" مالک ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، سرمایہ داری کے نظام کی بنیاد اسی "دلیل" پر قائم ہے۔ اس "دلیل" کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد اس جواب کو جو قرآن نے دیا ہے۔ بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

استعداد میں تفاوت کیوں ہے؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ذہنی استعداد کے ماحصل کا مالک فرد متعلقہ نہیں ہوتا تو انسانوں میں اس قدر ذہنی تفاوت رکھا کیوں گیا ہے؟ اللہ نے تمام انسانوں کو ایک جیسی ذہنی استعداد کیوں نہیں دیدی تاکہ معاشی ناہمواریوں کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ قرآن اس سوال کا جواب بھی دیتا ہے۔

آپ حیوانات کو دیکھئے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے۔ ان کی کسی ایک نوع میں استعداد کا فرق نہیں ہوتا۔ مثلاً تمام ہرن ایک جیسی استعداد رکھتے ہیں۔ اس لئے ان میں معاشی ناہمواریوں کا تصور نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ ان کی زندگی کا مقصد سوائے جینے اور مرجانے کے کیا ہوتا ہے؟ (زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ افزائشِ نسل کرکے مرجاتے ہیں) وہ جس حالت میں دنیا میں آتے ہیں، دنیا کو اسی حالت میں چھوڑ کر مرجاتے ہیں۔ وہ دنیا کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوتِ تخلیق (CREATIVE FACULTIES) بھی دی ہیں۔ وہ دنیا میں آتا ہے اور اپنی قوتِ تخلیق سے دنیا کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ یہ انسان کی قوتِ تخلیق ہی کے کرشمے ہیں کہ یہ مٹی کا گھروندا اس قدر متنوع جاذبیتوں اور حسین وجمیل مرصع کاریوں کا مجموعہ بن رہا ہے۔ انسان فطرت کی خام پیداوار کو لیتا ہے اور اپنی ندرت کاریوں سے اسے ایک نئی دنیا میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لیکن آپ غور کیجئے کہ ان تخلیقی مراحل (CREATIVE PROCESS) میں کس قدر مختلف نوعیتوں کے کام درپیش ہوتے ہیں۔ کوئی کام لیجئے۔ اس میں پہلا مرحلہ تدبیر (PLANNING) کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے قوتِ فکر کی ضرورت ہوگی۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ اس تدبیر (PLAN) کو بروئے کار لانے (EXCUTE کرنے) کا ہوگا۔ اس کے لئے جسمانی قوتوں (PHYSICAL LABOUR) کی زیادہ ضرورت ہوگی۔ اگر تمام انسانوں کی استعداد ایک جیسی ہو تو دنیا میں تقسیمِ عمل (DIVISION OF LABOUR) ناممکن ہو جائے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے مختلف افراد کی استعداد میں فرق ہے۔

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا۔ (۳۲/۴۳)

اور ہم نے مدارج کا یہ اختلاف اس لئے رکھا ہے تاکہ معاشرے کے مختلف کام مختلف لوگوں سے لئے جا سکیں۔

قرآن کا یہ دعویٰ کہ ذہنی استعداد کا اختلاف، تقسیم کار کا موجب اور انسانی دنیا میں تخلیقی ندرت کاریوں کا ضامن ہے۔ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر جگہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ممفورڈ لکھتا ہے۔

> ارسطاطالیس نے کہا ہے کہ نوعِ انسانی ایسے افراد کا مجموعہ ہے جنہیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس طرح فرد اپنے آپ کو معاشرے کا جزو محسوس کر کے، اپنی محدودیت کو بے کرانی میں بدل دیتا ہے۔ یہ اس ضرورت کا روحانی پہلو ہے۔ دوسرے اس لئے کہ اس طرح افراد کی استعداد کے اختلاف سے مختلف افراد ایک دوسرے سے متمتع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ اس کا عملی پہلو ہے۔ (۱)

اسی طرح (MASON) لکھتا ہے کہ:

> انسانوں میں استعداد کا اختلاف دنیائے انسانیت میں تنوع کا موجب ہے۔ اسی سے حریتِ فکر اپنے سامنے وسیع میدان دیکھتی ہے۔ (۲)

لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ 'قرآن'، افلاطون کے تصور کے مطابق، مختلف طبقات (CLASSES) کی مستقل تقسیم کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ یا ہندوؤں کے درنوں (ذاتوں) کے نظریہ کے مطابق پیدائشی تفریق کا قائل ہے۔ اس کی تعلیم اس کے یکسر خلاف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے لحاظ سے ایک ہی حیثیت رکھتا ہے۔ ان سب کا ایک ہی طبقہ (CLASS) ہوتا ہے۔ اس لئے ان سب کی پرورش، تعلیم و تربیت، یکساں طور پر ہونی چاہیئے (اسی کو ربوبیت کہتے ہیں) اس کے بعد، وہ اپنی اپنی استعداد اور رجحان کے اعتبار سے جس جس کام کے لئے زیادہ موزوں ہوتے جائیں ان کے سپرد وہی کام کر دیئے جائیں۔ یہ طبقات [اگر انہیں طبقات کہنا مناسب ہے تو] محض تقسیم کار کی رُو سے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی حیثیت کچھ نہیں۔ اس پر پیدائش کا اثر کچھ نہیں ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ مزدور کا بیٹا محض اس لئے کہ وہ مزدور کے ہاں پیدا ہوا تھا، مزدور رہے اور انجنیئر کا بیٹا، انجنیئر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے انجنیئر بنے۔ یہ دونوں بچے ابنِ آدم ہیں۔ انہیں تربیت و تعلیم کے یکساں مواقع بہم پہنچائے جائیں گے۔ اگر مزدور کا بیٹا ذہنی صلاحیتوں میں بلند ہوگا تو وہ انجنیئر بن جائے گا۔ اور انجنیئر کا بیٹا فکری طور پر پیچھے اور جسمانی قوت میں آگے ہوگا تو اس کے سپرد جسمانی قوت کا کام کیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی معاشرہ میں جو چیز تباہی کا باعث ہے وہ مختلف گھرانوں میں پیدا ہونے والے بچوں کو یکساں مواقع بہم نہ پہنچانا ہے، ان کی ذہنی استعداد کا تفاوت نہیں۔ بقول مِلیَن:-

> استعداد کا اختلاف نہیں بلکہ مواقع کا یکساں طور پر نہ ملنا تباہی کا باعث ہے۔ (۳)

قرآن پیدائشی تفریق کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ ہر فرزندِ آدم کو فرزندِ آدم تصور کر کے سب کے لئے یکساں مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ تاکہ ہر ایک کی مضمر صلاحیتیں پورے طور پر نشوونما پاسکیں۔ لیکن یہ صرف اسی معاشرے میں ممکن ہے جس میں نظامِ ربوبیت رائج ہو۔

(۰)

اس میں شبہ نہیں کہ جب کسی معاشرہ میں تمام بچوں کی تعلیم و تربیت (ربوبیت) بہتر اور یکساں انداز سے ہو گی تو اس سے ان کی ذہنی صلاحیتیں بھی زیادہ بلند ہوتی جائیں گی۔ لیکن اس کے باوجود ذہنی استعداد قلبی رجحان اور افتادِ طبیعت کا فرق باقی رہے گا۔ یعنی اس سے معاشرہ کی ذہنی سطح ضرور بلند ہوتی جائے گی۔ لیکن انفرادی استعداد و خصائص کی تفریق نہیں مٹ سکے گی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے متعلق کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

ذہنی اختلاف کیوں ہوتا ہے؟

مختلف افراد میں ذہنی استعداد کا فرق کیوں ہوتا ہے اور اس کے اسباب و علل کیا ہیں۔ اس مسئلہ پر ہمارے دور کی علمی دنیا میں بہت سی تحقیق ہو چکی ہے (اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے) علم الحیات (BIOLOGY) کے محققین کہتے ہیں کہ مختلف انسانوں میں عقلی تفاوت، ان کی دماغی ساخت کی بنا پر ہوتا ہے۔ وہ مختلف دماغوں (BRAIN CELLS) کا حیاتیاتی تجزیہ (BIOLOGICAL ANALYSIS) کر کے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ فلاں دماغ کی ساخت میں کیا نقص تھا اور فلاں میں کیا کمی۔ لیکن یہ تحقیقات ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہیں۔ اور کسی یقینی نتیجہ تک نہیں پہنچا سکیں۔ حتیٰ کہ "اوسپنسکی" تو یہاں تک کہتا ہے کہ دماغ کے خلیات (BRAIN CELLS) مادے کے پیدا کردہ ہوتے ہی نہیں۔ بہرحال دماغی ساخت کے متعلق ہمارے دور کی علمی تحقیقات کا درجہ جو بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ مختلف افراد میں ذہنی تفاوت کا مسئلہ، ہمارے دور کی علمی تحقیقات کی رُو سے حل نہیں ہو سکا۔ ہم کسی معاشرہ کی ذہنی سطح کو کتنا ہی بلند کیوں نہ کر دیں انفرادی استعداد کا فرق باقی رہے گا۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس نے ذہنی استعداد کے اس تفاوت کو معاشی تقسیم کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

انسان کی غلط نگہی

حالانکہ اس کا مقصد فقط تقسیم کار تھا جو عملِ تخلیق (CREATIVE PROCESS) کے لئے ضروری ہے، انسانی ذہن کی اس غلطی نے وہ تمام مفاسد پیدا کر دیئے جن سے یہ دنیا جہنم بن کر رہ گئی۔ انسان کی حماقت یہ ہے کہ وہ اپنی اس غلطی کو اس جہنمی معاشرہ کے وجود کے لئے بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر زیادہ استعداد کے مالک، اپنی کمائی ان لوگوں کی طرف منتقل کر دیں جنکی استعداد کم ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "گدھا گھوڑا سب برابر ہو جائیں گے"۔ یہ ان کی نگاہ کی بھول ہے۔ ذہنی استعداد

کی زیادتی کسی کی ذاتی پیدا کردہ نہیں۔ یہ خدا کی طرف سے مفت عطا ہوتی ہے۔ اس لئے اس استعداد کی کمائی بھی ان افراد کی ذاتی ملکیت نہیں، "خدا کی ملکیت" ہے۔ اور خدا نے اسے ان انسانوں کی ربوبیت کے لئے مختص کر دیا ہے جن میں ذہنی استعداد کم ہے یا جو ذہنی اور جسمانی استعداد سے کسی نہ کسی طرح محروم ہو گئے ہیں۔ اس فاضلہ کمائی کو اپنی ملکیت تصور کر لینا اور جن کا یہ حصہ ہے انہیں نہ دینا، اس امر کا اعلان ہے کہ ذہنی استعداد خدا کی نعمت نہیں۔ تمہاری اپنی پیدا کردہ ہے۔ دیکھئے قرآن نے اس اہم مسئلہ کو کس طرح چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِھِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَھُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ۔ اَفَبِنِعْمَۃِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ۔ (۱۶/۷۱)

مختلف افراد میں اکتسابی استعداد کا تفاوت خدا کی طرف سے ہے (تمہارا اپنا پیدا کردہ نہیں) جس کی وجہ سے مختلف کے ماحصل (فضل) میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اس طرح معاشی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ اس زائد پیداوار (یا سرمایہ) کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو ان کی زیرِ نگرانی کام کرتے ہیں۔ وہ ایسا اس لئے نہیں کرتے کہ ان کا ذہن اس تصور کو قبول نہیں کرتا کہ اس طرح معاشرہ میں سب برابر ہو جائیں۔ یہ ذہنیت درحقیقت خدا کی طرف سے دی ہوئی نعمتوں کے خلاف محاذ پیدا کرنے کے مرادف ہے (جس کا نتیجہ تباہی ہے)

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے اس اہم مسئلہ کو کس خوبصورتی سے حل کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو لوگ اکتسابِ رزق کی استعداد کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں وہ ہمارے قانونِ ربوبیت کی تکذیب کرتے ہیں۔

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ۔ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ۔ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۱۰۷/۱-۳)

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جو ہمارے قانونِ مکافات کو جھٹلاتا ہے (جس سے اس کا کردار یہ بن جاتا ہے کہ) وہ یتیموں (وہ افراد جو تنہا رہ گئے ہوں) کو دھکے دیتا ہے اور دوسروں کو مسکین کی پرورش کی ترغیب نہیں دیتا۔

وہ کہتا ہے کہ ابھی تو یہ غنیمت ہے کہ زمین سے رزق ایک اندازے کے مطابق نکلتا ہے اور یہ انسان کے اختیار کی بات نہیں کہ زمین میں چھپے ہوئے رزق کے سارے کے سارے خزانے بیک وقت باہر نکال لے۔ ورنہ اگر کہیں اس پر بھی اسے اختیار ہوتا تو زیادہ ذہنی استعداد کے مالک نہ معلوم کیا کر گزرتے؟ (۱۷/۱۰۰)

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ گئی کہ قرآن کی رو سے، انسان اپنی کمائی میں سے صرف اپنی محنت (LABOUR) کی نسبت سے حصہ لے سکتا ہے۔ ذہنی استعداد کی فراوانی، یا وسائلِ پیداوار کی (بزعمِ خویش ملکیت) کی بنا پر کچھ نہیں لے سکتا۔ یہ سب "خدا کا حصہ" ہے اور نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے وقف۔ لہٰذا نظامِ سرمایہ داری کی

یہ دلیل کہ جو شخص اپنی استعداد کی زیادتی کی بناء پر زیادہ کما سکتا ہے وہ اپنی کمائی کا مالک ہے، نگاہ کا فریب ہے۔ مبنی علی الحقیقت نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی اس دلیل کا جواب وہ نظام کبھی نہیں دے سکتا جو نہ خدا کو مانے اور نہ ہی مستقل اقدار کو تسلیم کرتے۔ جو نہ نفس انسانی کی ہستی کا اقرار کرے اور نہ ہی حیاتِ جاوداں پر ایمان رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس اس اعتراض کا جواب نہیں دے سکا کہ زائد استعداد کا مالک اپنی استعداد کا ماحصل اُس شخص کو کیوں دیدے جس کی استعداد کم ہے[1]۔ اس کا جواب صرف وہ شخص دے سکتا ہے جو نفسِ انسانی کی حقیقت اور اس کی ربوبیت کا قائل ہو۔ اس کے لئے خدا اور آخرت پر ایمان لاینفک ہے۔ نظامِ سرمایہ داری اپنی ہنرمندی کی دلیل کو اپنی ہی طرف سے پیش نہیں کرتا بلکہ اُسے مذہب کے علمبرداروں کی طرف سے بھی پیش کراتا ہے جو خود نظامِ سرمایہ داری کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ (یعنی خدا کی طرف سے نازل شدہ دین نہیں بلکہ انسانوں کا خودساختہ مذہب[2])۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنی کمائی اور اس کمائی سے پیدا کردہ (یا خریدکردہ) جائیداد پر پورا پورا حقِ ملکیت ہوتا ہے اور اس کی یہی ملکیت، اس کو وراثتاً ملتی ہے۔ اسے اس ملکیت سے محروم کرنا شرعاً جائز نہیں۔ "شرعاً" سے مراد ہوتی ہے وہ شریعت جو دورِ ملوکیت و مفادپرستی کی پیدا کردہ ہوتی ہے (نہ کہ منزل من اللہ کتاب) اس کے ساتھ ہی وہ یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ اگر تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی جائیں تو غریبوں اور محتاجوں کا وجود ختم ہو جائے گا اور اس طرح خیرات اور صدقات کے لئے گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ لیعنی ان کے نزدیک

یہودی ذہنیت

غریبوں اور محتاجوں کا باقی رہنا اس لئے ضروری ہے کہ اس سے دولت مند لوگ خیرات وصدقات سے ثواب حاصل کر سکیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ملکیت نہ رہے تو وراثت کے احکام کی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ تو ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا کہ صدقہ وخیرات اور وراثت کے احکام سے مقصود کیا ہے، اس وقت اس دلیل کے بودے پن کو ملاحظہ کیجئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی صحت کا خیال قطعاً نہیں رکھنا چاہیئے۔ ایسی کوشش بالکل نہیں کرنی چاہیئے جس سے لوگ تندرست وتوانا رہیں۔ اس لئے کہ لوگ اگر تندرست وتوانا رہے اور بیمار نہ پڑے تو ہسپتال بند کرنے پڑیں گے۔ دوائیوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ڈاکٹر بےکار ہو جائیں گے۔ مذہب پرست گروہ کے اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے قرآن نے یہودیوں کی ایک ذہنیت کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی حالت یہ تھی کہ یہ پہلے اپنے کمزور اور نادار لوگوں کو گھروں سے نکال

---

[1] تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر سامنے آئے گی۔

[2] دین اور مذہب کے فرق کے لئے میری کتاب "اسبابِ زوالِ امت" ملاحظہ کیجئے۔

دیتے۔ جب وہ فریقِ مخالف کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے تو پھر انہیں فدیہ دے کر چھڑا لیتے (کیونکہ ان کے ہاں قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا ثواب کا کام تھا)۔ یعنی وہ "حصولِ ثواب" کی خاطر خود اپنے میں سے ایک ایسی جماعت (CLASS) پیدا (CREATE) کر لیتے جو قیدی بن جائیں۔ اور پھر چندے جمع کر کے ان قیدیوں کو قید سے آزاد کراتے۔ یہی ذہنیت اس مفاد پرست گروہ کی ہے جو ایک طبقہ مستقل محتاجوں اور غریبوں کا رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ انہیں خیرات دے کر ثواب حاصل کریں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس ذہنیت کا نتیجہ، حال کی رسوائیوں اور مستقبل کی تباہیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)۔

آج مسلمانوں کی بھی یہی حالت ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ ان اعتراضات کا جواب ذرا آگے چل کر دیا جائے گا۔

———— (۰) ————

لیکن اس تمام بحث کے باوجود ایک بنیادی نکتہ کو بھی سامنے رکھئے۔ مومن وہ ہے جو بطیبِ خاطر اپنے دل کی کامل رضامندی سے، اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی استعداد کے مطابق پوری پوری محنت کرے اور اسکے ماحصل (اپنی کمائی) میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لیکر، باقی نوعِ انسان کی نشوونما کیلئے عام کر دے۔ حتیٰ کہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے۔ اس "ایمان" کے بعد اگر (بالفرضِ محال) اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جو کچھ ایک شخص کماتا ہے وہ سب کا سب اس کی ذاتی ملکیت قرار پائیگا، تو جہاں تک ایک مومن کا تعلق ہے اس سے اصل مسئلہ پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ سب کچھ اسکی ذاتی ملکیت ہوتا ہے لیکن وہ اپنی ذاتی ملکیت کو، اپنے دل کی پوری رضامندی سے، نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے اپنے معاشرہ (نظامِ مملکت) کے حوالے کر دیتا ہے۔ اسلام کا معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہوتا جو اس قسم کا ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا جماعتِ مومنین کے ضمن میں یہ سوال کچھ اہمیت نہیں رکھتا کہ ایک فرد کی محنت کا ماحصل اسکی ذاتی ملکیت ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ ذاتی ملکیت ہو یا نہ ہو، انکے نزدیک وہ ان لوگوں کا حق ہوتا ہے جن کی ضروریات انکی محنت کے ماحصل سے پوری نہیں ہوتا۔ یہ اس مشکل ترین مسئلہ کا آسان ترین حل ہے۔

———— (۰) ————

P.130 -(1) Lewis Mumford, in, The Conduct Of Life. p.27
(2) J.W.T. Mason, in, Creative Freedom. p.169
(3) -do- p.170

ساتواں باب

بنیادی اصول

زندگی کے دونوں نظریوں کے متعلق جو کچھ قرآن کریم نے کہا ہے وہ گذشتہ اوراق میں آپ کے سامنے آچکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مقصودِ حیات یہ ہے کہ انسان کا حال بھی خوشگوار ہو اور مستقبل بھی تابناک۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر انسان، دوسرے انسانوں کی ربوبیت (پرورش) کی فکر کرے۔ اس نظریہ زندگی کے ماتحت، سرمایہ داری اور مفاد پرستی کی وہ تمام لعنتیں ختم ہو جاتی ہیں جنہوں نے دنیا کو اس طرح جہنم بنا رکھا ہے۔ مارکس[1] نے بھی چاہا تھا کہ دنیا سے سرمایہ داری کا نظام ختم ہو جائے۔ لیکن اسے اس کے لئے کوئی محکم بنیاد نہیں مل سکی۔ اس لئے کہ وہ خود زندگی کی محکم بنیادوں کا منکر تھا۔ وہ نہ تو خدا کے قانونِ ربوبیت کا قائل تھا نہ مستقل اقدار کا۔ نہ وہ حیات بعد الممات کو تسلیم کرتا تھا نہ قانونِ مکافاتِ عمل کو۔ دنیا سے نظامِ سرمایہ داری کے ختم کر دینے کی آرزو بڑی مقدس ہے لیکن مقدس آرزوئیں صرف حقائق کی محکم بنیادوں کے سہارے پروان چڑھ سکتی ہیں۔ مارکس کے پاس کوئی محکم سہارا تھا نہیں اس لئے اسے تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY)

[1] میں نے اس کتاب میں مارکسزم یا کمیونزم کی تفصیلات سے بحث نہیں کی کیونکہ یہ اس کتاب کا موضوع نہیں۔ بایں ہمہ اس کی اہم جزئیات کتاب کے آخری حصہ میں سامنے لائی جائیں گی۔

کا خود ساختہ سہارا تراشنا پڑا۔ چنانچہ (L. L AURAT) لکھتا ہے کہ :-

مارکس اور اینجلز نے اشتراکی آرزوؤں کی بنیاد تمدنی ترقی کے معاشی قانون پر رکھی۔ ایسا کرنے میں انہوں نے اپنی اشتراکی آرزوؤں کا جواز اخلاقی بنیادوں پر نہیں رکھا۔ بلکہ یہ کہا کہ اشتراکیت، تاریخی وجوب کا تقاضا ہے۔ (1)

لیکن یہ سہارا ایسا نہ تھا جس پر اتنی بڑی عمارت قائم ہو سکتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سہارا چار قدم تک بھی ساتھ نہ دے سکا اور مارکس کے جانشین لینن ہی نے اسے چھوڑ دیا اور اپنے پروگرام کے لئے دوسری راہ اختیار کر لی۔ لینن کے بعد سٹالن آیا اور اس نے اشتراکیت کے بنیادی تصورات تک بدل دیئے۔ لینن اور اسٹالن نے اپنی تحریک کی بنیاد جذباتِ نفرت و انتقام پر رکھی چنانچہ یہی وہ "دلیل" ہے جس کے زور پر کمیونسٹ اپنا پروپیگنڈا کرتے ہیں "سرمایہ داری لعنت ہے" "سرمایہ دار غریبوں اور مزدوروں کا خون چوستے ہیں" "مزدورو! اٹھو اور ان سے انتقام لو" وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تو محض جذبات انگیزی ہے۔ حقائق پروری نہیں۔ قرآن اپنی دعوت کی بنیاد حقائق پر رکھتا ہے، نہ کہ جذبات پر۔

تاریخی وجوب کا فلسفہ

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، مارکس کا تاریخی وجوب کا فلسفہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی نظام علیٰ حالہٖ قائم نہیں رہ سکتا۔ ہر نظام کچھ وقت کے لئے قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد اس کے اندر سے، اُس کی ضد ایک دوسرا نظام اُگنا شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ نظام چھا جاتا ہے اور سابقہ نظام ختم ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ شروع سے چلا آ رہا ہے اور اسی طرح چلا جائے گا۔ یہ سب کچھ تاریخ کی اندھی قوت میکانکی طور پر کرتی رہتی ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ کوئی نظام اچھا ہے یا بُرا۔ اچھا ہو یا بُرا، وہ ہر موجودہ نظام کو بدل کر اس کی جگہ، اس کی ضد دوسرا نظام لے آتی ہے۔ آج کل سرمایہ داری کا نظام ہے۔ تاریخی وجوب اسے مٹا کر اس کی جگہ مزدوروں اور کسانوں کا نظام لے آئے گا۔ اس کے بعد، یہی تاریخی وجوب اس نظام کو مٹا دے گا اور اس کی جگہ، اس کی ضد دوسرا نظام لے آئے گا۔

قرآنی تصوّر

قرآنِ کریم کی رُو سے یہ تصور محض جذباتی اور حقائق کُش ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کائنات اندھی قوتوں کے تحت نہیں چل رہی، ایک خدائے علیم و حکیم کے پروگرام کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ اس کی ہر گردش قانون کے مطابق اور ہر حرکت ضابطہ کے ماتحت ظہور میں آتی ہے؛ اور ان تمام گردشوں اور حرکتوں کا رُخ تعمیر اور ارتقاء کی طرف ہے۔ تخریب اور انحطاط کی طرف نہیں۔ کائنات میں تعمیری اور تخریبی دونوں قوتیں (حق اور باطل) مصروفِ عمل ہیں (اس لئے کہ ارتقاء ہمیشہ کشمکش سے ظہور میں آتا ہے) ان کی کشمکش جاری ہے، لیکن اس کشمکش میں تعمیری قوت غالب رہتی ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ۔

(۲۱/۱۸ نیز ۱۷/۸۱ (۳۴/۴۹))

ہم تعمیری قوتوں سے تخریبی قوتوں پر نشانہ مارتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعمیری قوتیں، تخریبی قوتوں کا مغز توڑ دیتی ہیں اور ثانی الذکر نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ (یہ ہے حقیقت، اس کے سوا تم جس قسم کا بھی کوئی اور قانون مانو، اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔

یہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل یونہی اتفاقی طور پر عمل میں نہیں آجاتا، بلکہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ سب کچھ خدا کے اٹل قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ (وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۴۲/۲۴)

کائنات کے اس بنیادی قانون کو بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ اب انسانوں کی دنیا کی طرف آؤ۔ اس میں تم دو قسم کے نظریے دیکھو گے۔ ایک یہ کہ ہر فرد صرف اپنے ذاتی مفاد کے تحفظ میں سرگرداں و پریشان ہے۔ یہ تخریبی نظریہ ہے۔ اس لئے اس کے لئے بقا نہیں ہے۔ اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ انسان تمام نوعِ انسانی کی بہبود منفعت کے لئے کوشاں ہے۔ یہ نظریہ کائنات کے قانونِ ربوبیت کے مطابق ہے اس لئے حق ہے۔ اس نظریہ کے لئے بقا ہے۔ دیکھئے! قرآن کریم نے اس حقیقتِ ثابتہ کو کیسے نکھرے اور ابھرے ہوئے انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے آؤ تمہیں یہ حقیقتِ مجردہ ایک محسوس مثال کے ذریعے سمجھائیں۔ تم دیکھتے ہو کہ جب مینہ برستا ہے تو ادھر اُدھر کا خس و خاشاک پانی کی سطح پہ آجاتا ہے۔ حیات بخش پانی تو زمین میں جذب ہو جاتا ہے اور خس و خاشاک سیلاب کے ساتھ بہہ جاتے ہیں۔ (أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۔ ۱۳/۱۷)۔ یہی حق و باطل کی مثال سمجھو۔ میل کچیل کی جھاگ جو کسی کام کی نہیں ہوتی رائیگاں چلی جاتی ہے۔ (وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۔ ۱۳/۱۷) اسی طرح یہ لوگ جو دھات آگ میں گلاتے ہیں تاکہ اس سے زیور یا دیگر اشیاءِ ضروریہ بنائیں تو اس میں بھی جھاگ اوپر آجاتی ہے۔

بنیادی اصولِ بقاء

(كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۔ ۱۳/۱۷)۔ اللہ اس طرح حق کو باطل سے ٹکراتا رہتا ہے۔ سو (جیسا کہ ان مثالوں میں بتایا گیا ہے) کھوٹی جھاگ ضائع ہو جاتی ہے۔ وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۔ ۱۳/۱۷) اور جس چیز (نظام یا نظریہ یا تصور) میں نوعِ انسانی کی منفعت ہوتی ہے وہ دنیا میں باقی رہ جاتی ہے۔

یہ ہے انسان کی معاشی اور معاشرتی دنیا میں فنا اور بقا کا اصول۔ یعنی

(۱) جو چیز (نظام یا نظریہ) انفرادی یا گروہ بندانہ مفاد پر مبنی ہوتی ہے مٹ جاتی ہے۔ اور

(۲) جس نظام کا مطمحِ نگاہ نوعِ انسانی کی منفعت ہوتا ہے، باقی رہ جاتا ہے۔

یہ ہے وہ اصولِ کلی جس کے ماتحت یہاں کا کاروبار چلتا ہے۔ باقی وہ رہ سکتا ہے جو انفرادی مفادِ خویش کے بجائے، کلی مفادِ انسانیت کا حامل ہو۔ یہاں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ بجز اس قانونِ ربوبیت کے جو زندگی کی فراوانیوں اور خوشحالیوں کا ضامن ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔ (۵۵ / ۲۶-۲۷ نیز ۲۸ / ۸۸)

دنیائے فکر کا سب سے اہم مسئلہ خیر و شر (GOOD AND EVIL) کا مسئلہ ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جسے انسانی فکر آج تک حل نہیں کر سکا۔ "خیر کسے کہتے ہیں اور شر کیا ہے؟" جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا ہے اس سوال نے اسے

مسئلہ خیر و شر

طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔ قرآن کا اسلوب یہ نہیں کہ وہ اس قسم کے فلسفیانہ مسائل سے نظری طور پر بحث کرے۔ وہ زندگی کے حقائق سے بحث کرتا ہے اور ان مسائل میں اسی حد تک دلچسپی لیتا ہے جس حد تک ان کا تعلق انسانی زندگی اور ان کے متعلقات سے ہے۔ چنانچہ وہ اس مسئلہ کے نظری پہلو سے تو بحث نہیں کرتا لیکن اس کے عملی پہلو کو نہایت آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو جو کچھ بطور عطیۂ خداوندی ملتا ہے (یعنی اس کی استعداد اور تمام وسائل پیداوار) اسے نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے عام کر دینا خیر ہے اور اس کے برعکس اسے ذاتی مفاد کے لئے روک لینا شر۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ..... (۳ / ۱۸۰)

جو لوگ عطایائے خداوندی کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے روک رکھتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ روش ان کے لئے خیر کی روش ہے نہیں! یہ شر کی روش ہے۔

یہ ہے مسئلہ خیر و شر کا حل اور یہ ہے انسانی سعی و کاوش کو پرکھنے کا معیار۔ آج نکلسلے بھی خیر و شر کی یہی تعریف کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ

خیر وہ ہے جس سے وحدت (انسانیت) پیدا ہوتی ہے اور شر وہ ہے جس سے افراد الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ (۲)

آج ہر طرف سے یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ اسلام کی تعلیم کیا ہے؟ اس تعلیم کا ماحصل کیا ہے؟ اس پر عمل کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ سوال ہر طرف سے اٹھتا ہے لیکن جو کچھ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ

قرآنی تعلیم کا ماحصل ایک لفظ میں

کثرتِ تعبیر سے خواب، اور بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ یہ سوال نیا نہیں۔ یہ اس وقت بھی اٹھا تھا جب قرآن پہلے پہل دنیا کے سامنے آیا۔ جو لوگ قرآن

کی دعوت پیش کرتے تھے، ان سے پوچھا جاتا تھا کہ اس کی تعلیم کیا ہے؟ اور اس تعلیم کا نتیجہ کیا ہوگا؟ قرآن نے اس سوال اور اس کے جواب کو اپنے آغوش میں محفوظ کرلیا ہے۔ سورۃ النحل میں ہے۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۔ (۱۶/۳۰)

جن لوگوں نے قرآن سے رشتہ جوڑ لیا ہے ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے ربّ نے کیا نازل کیا ہے؟

یہ تھا سوال اور اس کا جواب؛ صرف ایک لفظ میں

قَالُوا خَيْرًا ۔ (۱۶/۳۰)

وہ کہتے ہیں کہ ہمارے رب نے خیر نازل کیا ہے۔

جواب ہے کہ خدا نے خیر نازل کیا ہے۔ اور خیر کے معنی ہر قسم کی خوشگواریاں ہیں۔ اس طبعی زندگی میں بھی اور اسکے بعد آنے والی زندگی میں بھی۔ جس آیت کا پہلا حصہ اوپر درج کیا گیا ہے وہ پوری آیت یوں ہے۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ۔ (۱۶/۳۰)

جن لوگوں نے قرآن سے رشتہ جوڑ لیا ہے ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے ربّ نے کیا نازل کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ربّ نے خیر نازل کیا ہے یعنی جو لوگ اس کے متوازن پروگرام پر عمل کریں گے ان کا حال بھی خوشگوار رہے گا اور مستقبل بھی بہتر۔ اس پروگرام پر عمل کرنے والوں کی زندگی کس قدر عمدہ ہوگی۔

اس تمام تفصیل کو اگلی آیت کے ان چار لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا جہاں فرمایا کہ (لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ ۔ ۱۶/۳۱) وہ جو چاہیں گے انہیں ملے گا "ان کی ہر آرزو پوری ہوگی۔ یہ ہے خیر کا مفہوم جس کی طرف دعوت دینے کے لئے امتِ مسلمہ کو پیدا کیا گیا تھا۔ (وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ .... ۳/۱۰۳) اور جس سے روکنے والوں کو جہنمی بتایا گیا ہے۔ (مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ ۔ ۵۰/۲۵)

یہ ہے قرآنی تعلیم کا ماحصل۔ فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۔ حال بھی خوشگوار اور مستقبل بھی خوشگوار۔ اس پروگرام پر عمل کرنے والے حقیقی مومن ہیں۔ (أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۔ ۸/۴) اور ان ہی کے لئے بلند درجات، تباہی اور بربادی سے حفاظت اور "عزت کی روزی" ہے (لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۔ ۸/۴) یہی قرآن کی تعلیم ہے اور یہی تعلیم ہر رسول کے ذریعے بھیجی گئی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں حضرت نوحؑ کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم میرے پروگرام پر عمل کروگے تو اللہ تمہارے لئے

سامانِ پرورش کی فراوانی کر دے گا۔ تمہاری کھیتیاں سیراب ہوں گی (یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا - ۷۱/۱۱) تمہارے مال اور اولاد میں کشائش ہوگی (وَیُمْدِدْکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ ۷۱/۱۲) اور تمہیں پھلوں سے لدے ہوئے باغات اور انہیں سدا بہار رکھنے کے انہار عطا کرے گا۔ (وَیَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّکُمْ اَنْهٰرًا - ۷۱/۱۲) یہی کچھ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے کہا گیا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَکَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ...... (۵/۶۶)

اور اگر یہ لوگ اس پروگرام پر عمل پیرا رہتے جو تورات اور انجیل اور دیگر کتبِ سماوی کی رو سے دیا گیا تھا تو ان پر اوپر اور نیچے سے رزق کے دروازے کھل جاتے۔

اور اس رزق سے تمام نوعِ انسانی کی پرورش ہوتی۔ لیکن ان کے مذہبی پیشواؤں (احبار و رہبان) نے انہیں کچھ اور ہی پٹی پڑھا دی اور خدا کے دین کو ایک اور ہی "دین" سے بدل دیا۔ اور اس کے بعد خود بھی دولت کے انبار اپنے مفاد کے لئے جمع کرنے لگ گئے۔ اور ان کی دیکھا دیکھی قوم نے بھی ویسی ہی سرمایہ پرستانہ روش اختیار کر لی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ سارا معاشرہ جنت کی بجائے جہنم میں بدل گیا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۔ وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۔ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ۔ (۹/۳۴-۳۵)

اے ایمان والو! اس حقیقت سے آگاہ رہو کہ پیر اور مولوی (علماء اور مشائخ) لوگوں کا مال محض تخریبی نتائج کے لئے (مفت میں) کھا جاتے ہیں اور لوگوں کو خدا کی طرف لے جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھو! جو لوگ سونے اور چاندی (کے ڈھیر) جمع کرتے رہتے ہیں اور انہیں نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے صرف نہیں کرتے، تو انہیں الم انگیز سزا سے آگاہ کر دو۔ جب اس مال کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور پھر اس کے ساتھ ان کی پیشانی، پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا۔ اور (ان سے کہا جائے گا) کہ یہ ہے وہ مال جو تم نے (نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھنے کی بجائے) اپنے ذاتی مفاد کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو آج اس کا مزہ چکھو جو تم نے جمع کر رکھا تھا۔

خلاصہ مبحث | تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن ایک محکم اور بنیادی اصول بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ

مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ - (۱۳/۱۷)

یہ ہے وہ محور جس کے گرد قرآن کی ساری تعلیم گردش کرتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمام نوعِ انسانی 'ایک اُمت' ایک قوم، ایک جماعت ہے۔ لیکن انفرادی مفاد پرستیوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ہیں۔ قرآنی تعلیم کا منشاء یہ ہے کہ ان تفرقوں کو مٹا کر نوعِ انسانی کو پھر سے ایک امت بنا دیا جائے جس میں تمام انسان ایک گھرانے کے افراد سمجھے جائیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہمارا یہ پروگرام یہ نہ ہوتا (کہ تمام نوعِ انسانی کو پھر سے ایک امت بنا دیا جائے جس میں تمام انسان ایک گھرانے کے افراد بن جائیں) تو نظامِ سرمایہ داری ہی انسانی معاشرہ کا مستقل اصول قرار پا جاتا اور دولت جمع کرنے والے (سرمایہ داروں کے گروہ) کی دولت دن بدن بڑھتی چلی جاتی۔ (وَلَوْلَا أَن يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً...... (۴۳/۳۳-۳۵)۔ لیکن یہ نظریہ صرف قریبی مفاد کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس لئے اس سے نوعِ انسانی کی ربوبیت نہیں ہو سکتی اور اس لئے نوعِ انسانی امتِ واحدہ بھی نہیں بن سکتی۔ (ذَٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِندَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ۔ (۴۳/۳۵)۔ لہٰذا ہمارا قانون یہی ہے کہ بقا اسی نظام کو ہوگی جس میں تمام نوعِ انسانی کی منفعت مقصود ہو۔ یہی اصولِ محکم ہے۔

P.136 (1) Marxist And Democracy
P.138 (2) Alduous Huxley, in, Ends And Means.P.303

لہ اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی۔

آٹھواں باب

عملی پروگرام

گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر انسان کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے اور اس کی راہ نمائی کسی خاص راستے کی طرف نہ کی جائے تو ہر انسان اپنے لئے وہی راہ تجویز کرے گا جس سے سب کچھ سمٹ کر اس کے پاس آجائے۔ وہ اسے اپنے لئے جمع رکھے گا اور اس کی قطعاً پرواہ نہیں کریگا کہ کسی دوسرے انسان پر کیا گذرتی ہے۔ اس کی عقل اسے بار بار سمجھائے گی کہ اسی متاع پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے جو اپنے پاس موجود ہو۔ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں بنتا۔ سب کھانے کے یار ہیں۔ اگر کل کو تم پر کوئی بُرا وقت آپڑا تو کوئی تمہاری مدد نہیں کریگا۔ تم بھی تباہ ہو جاؤ گے اور تمہاری اولاد بھی روٹی تک کی محتاج ہو جائے گی۔ عقل کے دلائل محض قیاسی اور فرضی نہیں ہوتے۔ وہ اپنے بیان کی تائید میں بیسیوں مثالیں پیش کر دیتی ہے۔ بات ہے بھی ٹھیک۔ جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں (یعنی سرمایہ دارانہ معاشرہ) اس کا یہی چلن ہے۔ دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ جس پر مصیبت پڑتی ہے اس کا کوئی ساتھی نہیں بنتا۔ اس وقت وہی پیسہ کام دیتا ہے جو انسان کی اپنی جیب میں ہو۔

ظاہر ہے کہ اس معاشرے میں رہنے والے انسان کو یہ سمجھانا بڑا مشکل ہے کہ زندگی کا صحیح چلن وہ نہیں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ صحیح روشِ انسانیت یہ ہے کہ ایک شخص جو کچھ کماتا ہے اس میں اس کا حصہ صرف اس قدر ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہوں۔ باقی سب دوسرے انسانوں کی پرورش کے لئے ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب

موجودہ معاشرہ کے انسان کو اس جدید نظریۂ زندگی کا سمجھانا اس قدر مشکل ہے تو اسے عملاً اس مقام تک لانا کس قدر مشکل ہوگا۔ قرآن اس حقیقت سے بے خبر نہیں۔ اس کی تعلیم کا خاصا یہ ہے کہ وہ حقائق کا سامنا کرتا ہے، ان سے پہلوتہی نہیں کرتا

دشوار گذار راستہ

چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ انسان کے سامنے یہ دونوں راستے کھلے طور پر آ جانے کے بعد بھی، انسان اس دوسرے راستے (مفادِ کلی) کو اختیار کرنے کی ہمت نہیں کریگا۔ اسے یہ راستہ بڑا دشوار گذار اور پہاڑ کی سی چڑھائی کا مشقت آمیز اور حوصلہ شکن راستہ دکھائی دے گا۔ سورہ البلد میں ہے کہ ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیتے ہیں (وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ - ۹۰/۱۰) ان دونوں راہوں میں سے ایک راستہ اسے بظاہر بڑا آسان نظر آتا ہے۔ وہ اسے اختیار کر لیتا ہے۔ دوسرا راستہ پہاڑ کا سا دشوار گذار دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا (فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ - ۹۰/۱۱) تمہیں معلوم ہے کہ یہ پہاڑ کا سا دشوار گذار راستہ کون سا ہے؟ (وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ - ۹۰/۱۲) یہ راستہ وہ ہے جس میں انسانوں کو غلامی اور محکومی کی زنجیروں سے رہا کرایا جاتا ہے (فَكُّ رَقَبَةٍ - ۹۰/۱۳)۔ یا معاشی بدحالی کے دور میں جب بھوک اور مشقت عام ہو جاتے، ان ناداروں اور بے کسوں کی روزی کا فکر کرنا جو معاشرے کے دیگر افراد کے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کریں (اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ - ۹۰/۱۵) یا ان مزدوروں کی بہبود کا انتظام کرنا جنہیں ہمیشہ مٹی میں لت پت رکھا جاتا ہے تاکہ ان کی صلاحیتوں کی نشوونما رکی رہے (اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ - ۹۰/۱۶) ظاہر ہے کہ اس کی شکل یہی ہے کہ اس معاشرہ کی جگہ وہ معاشرہ قائم کیا جائے جس کی تاکید قرآن نے کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس "پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے" کے مرادف دشوار گذار راستہ کو اختیار کرنے کے لئے انسانوں کو کس طرح تیار کیا جائے! انہیں کس طرح موجودہ معاشرہ سے اس معاشرہ تک لے جایا جائے جس میں ہر فرد، دوسرے فرد کی ربوبیت کا ذمہ دار بن جائے۔ یہ ہے اصل سوال۔ قرآن اس کا جواب نہایت شرح و بسط سے دیتا ہے۔ وہ اس کے لئے ایک مفصل پروگرام مرتب کر کے دے دیتا ہے۔

ایمان یعنی بنیادی تصورات

اس پروگرام کی سب سے پہلی کڑی یہ ہے کہ انسان کے دل میں چند بنیادی تصورات کو بطور اصولی حقائق نقش کرا دیا جائے۔ اسے ایمان کہتے ہیں[1] (یعنی زندگی کا نصب العین)۔ ان میں

---

[1] بنیادی حقائق وہ ہیں جنہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) یا ابدی صداقتیں (ETERNAL TRUTHS) کہا جاتا ہے اور جو ناقابلِ تغیر و تبدل ہوتے ہیں۔ انہیں عقل و فکر اور دلائل و براہین کی بنا پر بطور مسلمہ حقیقت کے ماننا ایمان کہلاتا ہے۔ ایمان (FAITH) نہیں (CONVICTION) کا نام ہے۔

سب سے پہلا تصور یہ ہے کہ انسان کے پاس عقل کے علاوہ ایک، اور ذریعۂ علم بھی ہے جسے وحی کہتے ہیں جس کے پیامبر حضرات انبیاء کرام تھے۔ برگساں اس باب میں کہتا ہے :-

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ عقل، انسان کا امتیازی نشان ہے۔ یہ بھی ہر ایک کو تسلیم ہے کہ عقل متاعِ گراں بہا ہے۔ ایسے ہی جیسے فنِ لطیفہ کا کوئی شاہکار گراں بہا ہوتا ہے لیکن یہ چیز محتاجِ وضاحت ہے کہ عقل کے فیصلے کس صورت میں مطلق اور واجب التعمیل قرار پاتے ہیں۔ عقل تو صرف دلائل فراہم کرتی ہے جن کی تردید دوسرے دلائل سے ہوسکتی ہے۔ اسی لئے اس پر اصرار کرنا غلطی ہے کہ ہماری اور آپ کی عقل ایسی گراں بہا ہے کہ وہ طوعاً وکرہاً ہم سے اپنی عظمت کا اعتراف کرائے اور اپنے فیصلوں کو منوالے۔ ہمیں اس کے ساتھ یہ بھی کہنا ہوگا کہ عقل و بصیرت کے پیچھے وہ انسان ہیں جنہوں نے نوعِ انسانی کو خدائی رنگ میں رنگ دیا اور اس طرح عقل کو لاہوتی سند عطا کر دی۔ یہ وہ گراں قدر ہستیاں ہیں جو ہمیں ایک مثالی معاشرہ کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہیں۔ (۱)

اس کے بعد دوسرا مسلّمہ یہ ہے کہ اس کائنات میں ایک ہی قانون ہے جو انفس اور آفاق کی دنیا میں کارفرما ہے۔ یعنی وہی قانونِ ربوبیت جو خارجی کائنات میں از خود نافذ العمل ہے، اسے انسانی دنیا میں بھی نافذ العمل ہونا چاہیئے۔ انسان کسی دوسرے قانون کے ذریعے کامیاب زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ اس وحدتِ قانون (UNITY OF LAW) کے معنی ہیں وحدتِ خالق۔

وحدتِ خالق کا لازمی نتیجہ، وحدتِ مخلوق ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری۔ قرآن نے اس حقیقت پر بڑا زور دیا ہے۔ کیونکہ انسانی دنیا میں قانونِ ربوبیت کی عمارت اسی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی تخلیق ایک نفسِ واحد (SINGLE CELL) سے ہوئی ہے (هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۷/۱۸۹) تمام انسان ایک ہی درخت کی شاخیں، ایک ہی برادری کے افراد، اور ایک ہی جسم کے مختلف حصے ہیں۔ اس لئے ان سب کی تخلیق اور زندگی کی اٹھان، نفسِ واحد کی طرح ہونی چاہیئے۔ (مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ۳۱/۲۸) انسان کی ہوس ناکیوں نے اس عالمگیر برادری کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا ہے۔ لیکن وحی کا مقصود یہ ہے کہ ان امتیازات کو مٹا کر پھر سے نوعِ انسانی کو امتِ واحدہ بنا دیا جائے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ ...... ۲/۲۱۳)۔ اس وحدتِ انسانیت کا عملی طریقہ یہ ہے کہ خدا کی ربوبیتِ عامہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا جائے۔ انبیاء کرامؑ کا مشن اسی طریق پر امتِ واحدہ متشکل کرنا تھا۔ اس کے لئے وہ خود سب سے پہلے ایک امت (امتِ واحدہ) بنتے تھے۔ (وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً

وَاَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ ۔ (۲۳/۵۲)۔

وحدتِ انسانیہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے اب رفتہ رفتہ تمام دنیا تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ اس باب میں مفکرینِ مغرب کے سینکڑوں اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں وہ آخری شہادت سب کو اپنے اندر جمع کر لیتی ہے جس کا چند سال اُدھر (U.N.O) کی طرف سے اعلان ہوا تھا (UNESCO) نے بڑے بڑے ائمۂ علوم و فنون کی ایک کمیٹی بٹھائی تھی کہ وہ بتائیں کہ نوعِ انسانی کے متعلق ان کی تحقیقات کا ماحصل کیا ہے۔ انہوں نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ ہماری تحقیق یہ ہے کہ "نوعِ انسانی ایک ہے اور تمام انسان ایک ہی نوع کے افراد ہیں۔" (۲)

قرآن اس حقیقت کو بطور بنیادی مسلّمہ منوانا چاہتا ہے۔

چوتھا مسلّمہ جسے بطور بنیادی حقیقت ماننا ضروری ہے یہ ہے کہ انسان کی زندگی اسی جسم اور اسی دنیا کے ساتھ وابستہ نہیں۔ اس کی زندگی کا سلسلہ موت کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔ اس لئے جسم کی پرورش کے ساتھ ساتھ انسانی ذات کی تربیت بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ حیاتِ جاوید صرف متوازن شخصیت (BALACED PERSONALITY) کے حصے میں آسکتی ہے۔ اس مسلمہ کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ انسان کا کوئی کام بے نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اور یہ نتیجہ زود یا بدیر ظہور میں آکر رہتا ہے۔ عملِ خیر اسے کہتے ہیں جس سے انسانی ذات میں نشوونما پیدا ہو اور عملِ شر وہ جس سے انسانی ذات میں ضعف و انتشار (DISINTEGRATION) پیدا ہو۔

انسانی ذات کی تربیت کا راز اس میں ہے کہ انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے ماحصل کو نوعِ انسانی کی تربیت و پرورش کے لئے عام کر دے۔ اور اس طرح خدا کی صفتِ رب العالمینی (ربوبیتِ عامہ) کا مظہر بن جائے۔ یعنی جس قدر کوئی شخص دوسروں کی نشوونما کے لئے دے گا اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے گی اور چونکہ مقصودِ حیات انسانی ذات کی نشوونما ہے اس لئے اس کی پوری پوری کوشش یہ ہو گی کہ وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

یہ ہیں وہ مسلّمات جنہیں قرآن بطورِ حقیقت انسان کے دل میں جاگزین کراتا ہے۔ اسے ایمان کہا جاتا ہے۔ لہٰذا نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے جسے قرآن نے "پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے" سے تعبیر کیا ہے۔ سب سے پہلی کڑی یہ ہے کہ انسان کے دل میں اس قسم کا ایمان پیدا ہو۔

———— (۰) ————

دُوسری کڑی تعلیم و تدریس اس نظام کی دوسری کڑی یہ ہے کہ جو لوگ ان مسلّمات کو بطورِ حقیقت مان لیں (اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ـــــ یعنی جو لوگ ایمان لے آئیں) اُن کے سامنے اس ایمان کو، اس نظام کے ضابطہ (یعنی قرآن) کی تعلیم و تدریس کے ذریعے، پختہ سے پختہ تر کیا جائے اور اس طرح ان کے اندر ربّانی (ربوبیت کی ذمہ دار جماعت) بننے کی امنگ پیدا کی جائے۔ ان پر اس حقیقت کو بے نقاب کیا جائے کہ اس نظام میں حاکم اور محکوم کا کوئی تصور نہیں تمہیں **اپنے دل کی مرضی سے** ایک ایسی جماعت بننا ہے جس کا مقصودِ زندگی نوعِ انسانی کی ربوبیت ہے۔ نوعِ انسانی کی ربوبیت سے خود تمہاری ذات کی نشو و نما ہوتی جائے گی اور وہ رفتہ رفتہ صفاتِ خداوندی کی مظہر بن جائے گی۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلٰكِنۡ كُوۡنُوۡا رَبَّانِيّٖنَ بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ۔ (۳/۷۸)

کسی انسان کے لئے یہ روا نہیں کہ خدا اسے کتاب اور حکومت اور نبوت تک بھی کیوں نہ عطا کر دے' اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم قانونِ خداوندی کی بجائے میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کا کہنا صرف یہ ہوگا کہ تم قانونِ خداوندی کی تعلیم سے اور اس تعلیم کے دل پر نقش کر لینے سے ایسی جماعت بن جاؤ جو ربوبیتِ انسانیہ کی ذمہ دار ہو۔

اس کے بعد ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ تم نے خود سمجھا ہے اسے دوسروں تک بھی پہنچاؤ اور انہیں بھی یہی کچھ سمجھاؤ۔ اس طرح اس نظام کے فکر کو عام کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سعید روحیں جو اس نظام کی اہمیت کو سمجھ جاتی ہیں اور اس کے قیام کی تڑپ اپنے اندر پاتی ہیں، اس فکر سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور قلب و نظر کی اس تبدیلی سے رفتہ رفتہ بتدریج اس معاشرہ سے الگ ہوتی جاتی ہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کے اندر' ایک اور معاشرہ کی تشکیل ہو جاتی ہے۔ اس سے اگلا قدم یہ ہوتا ہے کہ اس جدید معاشرہ کے افراد میں اس قسم کا باہمی ربط پیدا کیا جائے جس سے اس جدید نظام کے اصول و مبادیات ہر وقت ان کے سامنے رہیں۔ وہ اپنے روزمرّہ کے کاروبار میں ان ہی اصولوں کو سامنے رکھیں اور ان مقاصد کو اُجاگر کرنے کے لئے ان کے وقتی اجتماعات منعقد کئے جائیں تاکہ اس طرح ایک فضا (ATMOSPHERE) پیدا ہو جائے جس میں یہ فکر اس طرح غیر محسوس طور پر پھیل جائے جیسے ہماری طبعی فضا میں ہوا کا وجود ہے۔ اس جدید فضا کی تخلیق کے لئے قرآن نے قیامِ صلوٰۃ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ آج جبکہ ہم میں صلوٰۃ کا مفہوم صرف نماز، پرستش

قیامِ صلوٰۃ یا ہندی زبان میں پوجا پاٹ ہو کر رہ گیا ہے، یہ سمجھنا ذرا دشوار ہے کہ قیامِ صلوٰۃ کا صحیح مفہوم

کیا ہے۔ ہمارے ہاں قیامِ صلوٰۃ کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ "نماز قائم کرو" اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ نماز کو پابندی کے ساتھ پڑھو۔ اور اس سے مقصود ہوتا ہے خدا کی پرستش۔ اس لئے آج یہ بات بمشکل سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس "پرستش" کو "معاشی امور" سے کیا واسطہ؟ یہ شبہ کوئی نیا نہیں۔ وحی کی طرف سے ہمیشہ دین (زندگی کا نظام) ملتا تھا لیکن اسے انسان رفتہ رفتہ مذہب (دھرم) میں بدل دیتے تھے۔ اس طرح دین کے وہ تمام عناصر جو نظامِ زندگی کے ستون تھے، رفتہ رفتہ پوجا پاٹ میں بدل جاتے تھے اور ان کا انسان کی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہتا تھا۔ یہی کچھ سابقہ اقوام نے کیا اور یہی کچھ ہم (مسلمانوں) سے ہوا۔ چنانچہ قرآن نے سورۃ ہود میں انسان کی اس عام ذہنیت اور اقوامِ سابقہ میں اس ذہنیت کے مظاہرے کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اہلِ مدین کی طرف، حضرت شعیبؑ خدا کا پیغام لے کر آئے۔ قوم نے مذہب کے اس تصور کے مطابق جو عام طور پر رائج ہوتا ہے، یہ سمجھا کہ یہ خدا کی عبادت (یعنی پرستش) کی دعوت دیتا ہے اس لئے اسے یہ دعوت دینے دو۔ یہ قیامِ صلوٰۃ (نماز پڑھنا) چاہتا ہے۔ اسے ایسا کر لینے دو۔ اس کی نماز سے ہم پر کیا اثر پڑے گا؟ لیکن انہوں نے دیکھا کہ حضرت شعیبؑ جس "صلوٰۃ" کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کا دائرہ مسجد کی چار دیواری تک محدود نہیں بلکہ اس سے آگے بھی بڑھتا ہے۔ اس سے انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے حضرت شعیبؑ سے کہا:-

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ (۱۱/۸۷)

اے شعیبؑ! کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ ہم ان قوانین کی اطاعت چھوڑ دیں جن کی اطاعت ہمارے آباء و اجداد کرتے چلے آرہے ہیں؟

اور کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنا مال و دولت بھی اپنی مرضی سے خرچ نہ کریں؟

قومِ شعیبؑ کے اس اعتراض پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ قرآن کی رُو سے صلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔ قومِ شعیبؑ نے کہا کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ صلوٰۃ سے مراد خدا کی پرستش ہے۔ لیکن یہ تمہاری صلوٰۃ عجیب ہے جو ہم سے کہتی ہے کہ ہم اپنی دولت کو بھی جس طرح جی چاہے خرچ نہیں کر سکتے؟ بھلا نماز کو معاشیات سے کیا واسطہ؟ غور کیجئے! کیا آج بھی صلوٰۃ سے وہی مفہوم نہیں لیا جا رہا، جو مفہوم قومِ شعیب کے ذہن میں تھا اور کیا آج کا مسلمان بھی وہی اعتراض نہیں پیش کرتا جو مدین کی قوم کی طرف سے عاید کیا گیا تھا؟

بہرحال، مقصود یہ بتانا تھا کہ خدا کے نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے ایمان کے بعد دوسری کڑی یہ ہوتی ہے کہ اس

معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کی جائے جس سے اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے یہی تصور آنکھوں کے سامنے رہے۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں قیامِ صلوٰۃ ہے۔ (صلوٰۃ کے معنی ہیں خدا کے قوانین کے پیچھے پیچھے چلنا۔ مصلّی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو ریس میں اوّل نمبر کے گھوڑے کے پیچھے لیکن اس سے متصل چلا آئے۔ لہٰذا اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں ایسا معاشرہ

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ

قائم کرنا جس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتے جائیں۔ یہ سب نظامِ ربوبیت کا اتباع کریں۔ واضح رہے کہ "نماز کے اجتماعات" بھی "اقامتِ صلوٰۃ" کا ایک حصہ ہیں۔ لیکن "نظامِ صلوٰۃ" صرف نماز کے اجتماعات نہیں۔ یہ نظام ایک مومن کی ساری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔

اس سے آگے بڑھیے۔

صلوٰۃ اور ربوبیت کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ قرآن میں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے ساتھ ہی اِیْتَاءِ الزَّکٰوۃَ کا حکم آیا ہے۔ (اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ) قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے) لیکن مشکل یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا مفہوم صرف نماز پڑھنا رہ گیا ہے۔ اسی طرح 'اٰتُوا الزَّکٰوۃَ' کا مفہوم یہ قرار پا گیا ہے کہ ایک سرمایہ دار دولت کے انبار کے انبار جمع کرتا رہے اور سال کے بعد اس میں سے اڑھائی فیصد خیرات دیدے۔ یہ ہے فریضۂ زکوٰۃ۔ حالانکہ زکوٰۃ کے معنی نشوونما (GROWTH) ہیں۔ لہٰذا "اٰتُوا الزَّکٰوۃَ" کے معنی ہوئے "سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا"۔ اب اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کا صحیح مفہوم سامنے آسکتا ہے۔ یعنی معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کر دی جائے جس سے ہر فردِ معاشرہ ان مستقل اقدار کو، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اپنے اندر سموئے ہوئے اور قوانینِ خداوندی کا کامل اتباع کرتے ہوئے، اپنے دل کی مرضی اور خوشنودی سے دوسروں کے لئے سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کی فکر میں لگ جائے۔ قرآن نے اقامتِ الصَّلٰوۃَ کا لازمی نتیجہ یہی بتایا ہے جب فرمایا کہ

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ (۲۹/۴۵)

یہ یقینی بات ہے کہ صلوٰۃ بخل سے روک دیتی ہے اور عقل کی ان فریب کاریوں سے بچا دیتی ہے (جن کی بنا پر انسان سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر کرتا رہتا ہے۔

غور کیجئے! صلوٰۃ کا مقصد یہ بتایا کہ اس سے افرادِ معاشرہ بخل (سب کچھ سمیٹ لینے کی ذہنیت) سے بچ جاتے ہیں۔ اور عقلِ فسوں ساز کی فریب کاریوں (منکر) سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور اس طرح ایتاء زکوٰۃ (افرادِ معاشرہ کے لئے

سامانِ نشو ونما بہم پہنچاتے) کی تگ و تاز میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یعنی قیام الصلوٰۃ سے انسان کی ذہنیت بدل جاتی ہے۔ اس کے قلب ونگاہ میں انقلاب واقع ہو جاتا ہے۔ اس انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے جذبات کو عقل وشعور کے تابع رکھتا ہے۔ انہیں بے لگام نہیں ہونے دیتا اور اپنی عقل وشعور سے وحی (مستقل اقدار) کی روشنی میں کام لیتا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ (قرآن نے بتایا ہے کہ) انسان کو علیٰ حالہ چھوڑ دیا جاتے تو یہ سب کچھ اپنے سلئے سمیٹتا چلا جاتا ہے اور اس کی ہوس کی آگ کبھی بجھتی ہی نہیں۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جمع کرتا رہتا ہے اور پھر اپنی تھیلی کا منہ اوپر سے بند کر لیتا ہے (جَمَعَ فَاَوْعٰى ۔ ۷۰/۱۸)۔ یہ اس لئے کہ اس کی بھوک مٹتی ہی نہیں (اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۔ ۷۰/۱۹)۔ جب اس سے کچھ چھنتا ہے تو واویلا مچانا شروع کر دیتا ہے (اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۔ ۷۰/۲۰) اور جب مال و دولت کی فراوانی ہو جاتی ہے تو اسے دبا کر بیٹھ جاتا ہے (وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۔ ۷۰/۲۱) اب اس کے بعد دیکھئے کہ اس ذہنیت کی تبدیلی کے لئے قرآن کیا علاج بتاتا ہے؟ وہی اقامتِ صلوٰۃ کا علاج۔ وہ کہتا ہے کہ مذکورہ صدر ذہنیت عام انسانوں کی ہوتی ہے لیکن وہ لوگ اس سے بچ جاتے ہیں جو نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں۔ (اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۔ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۷۰/۲۲-۲۳) اس تبدیلیٔ نگاہ سے ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ ہم اپنی استعداد کے ماحصل کے واحد مالک نہیں ہیں اس میں ہر ضرورت مند اور محروم کا حق ہے (وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۷۰/۲۴-۲۵) آپ نے دیکھا کہ وہ کیا تبدیلی ہے جو انسان کی نگاہ میں صلوٰۃ سے پیدا ہوتی ہے؟ اور قرآن کی رو سے مصلّی (نمازی) کون ہے؟

مصلّین کون ہیں؟

دوسرے مقام پر ہے کہ "جہنم والوں" سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے تمہاری یہ حالت ہو گئی، وہ کہیں گے کہ ہم مصلّی نہیں بنے تھے (قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۔ ۷۴/۴۳) یعنی ہماری کیفیت یہی کہ ہم ان لوگوں کے لئے جو حرکت سے محروم ہو گئے تھے سامانِ پرورش نہیں فراہم کرتے تھے۔ (وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۔ ۷۴/۴۴) [نیز دیکھو ۱۰۷/۵]

سورۃ الدھر میں اس حقیقت کو نہایت حسین و دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ انسان کو ذرائع علم (سمع و بصر) دینے کے بعد زندگی کا راستہ دکھا دیا اور اسے یہ اختیار دیدیا کہ چاہے اس راستے کو اختیار کرلے اور چاہے اس سے انکار کردے (اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۔ ۷۶/۳) اسے یہ بھی بتا دیا کہ اس راستے سے روگردانی کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی ذات کی صحیح آزادیاں سلب ہو جائیں گی۔

زندگی گھٹ کر جوئے کم آب رہ جائے گی۔ اس کی کشادگیاں سمٹ جائیں گی۔ اس کی نشو ونما رُک جائے گی۔ اسکی کھیتیاں جُھلس جائیں گی (اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِیْرًا۔ ۷۶/۴) اس راہ سے انکار کرنے والوں اور اس طرح زندگی کی برومندیوں کو دبا دینے والوں کے لئے زنجیریں اور طوق اور جھلسا دینے والی آگ کے شعلے بنا دیئے گئے ہیں۔ ان کے برعکس، جو لوگ اس راستے کو اختیار کرلیں گے، ان کے سینے میں کشادہ اور نگاہوں میں وسعت پیدا ہو جائیگی اور زندگی پھیل کر بحرِ بے کراں بن جائے گی۔ (ان لوگوں کو ابرار کہہ کر پکارا گیا ہے جس کے معنی "کشادہ اور وسعت" ہیں)[1]

یہ نظام دل کی گہرائیوں سے اُبھرے گا

یہ اس پیالے سے آبِ حیات پئیں گے جس میں سکون اور ٹھنڈک کی آمیزش ہوگی (اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا۔ ۷۶/۵) یہ مشروب آئیگا کہاں سے؟ اس چشمے سے جسے یہ لوگ اپنے دل کی گہرائیوں سے پھاڑ کر نکالیں گے۔ (عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا۔ ۷۶/۶) اس چشمے کا منبع کہیں باہر نہیں ہوگا۔ اُسے یہ لوگ خود اپنے عمقِ قلب سے نکال کر باہر لائیں گے۔ یہ نظام ایسا نہیں جسے ان پر جبراً ٹھونس دیا جائے۔ یہ دل کی گہرائیوں سے اُبھر کر باہر آئے گا۔ یہ ہوگا کیسے؟ اس طرح کہ یہ لوگ ان تمام واجبات کو جنھیں یہ از خود اپنے اوپر عاید کریں گے، نہایت عمدگی سے ادا کرتے جائیں گے۔ (یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ۔ ۷۶/۷) انہیں اس کا احساس ہوگا کہ اگر ہم نے اس قسم کا معاشرہ قائم نہ کیا تو اس کی جگہ ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا جس میں شر اس طرح عام ہو جائے گا کہ جو لوگ اس سے بچنا چاہیں، وہ بھی نہ بچ سکیں گے۔ وہ اُڑ اُڑ کر ان تک از خود جا پہنچے گا (وَ یَخَافُوْنَ یَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا۔ ۷۶/۷) اس سے بچنے کے لئے وہ کریں گے کیا؟ ان تمام لوگوں کی "روٹی" کا انتظام کریں گے جن کی حرکت رُک جائے (مسکین) یا جو معاشرے کے اندر رہتے ہوئے اپنے آپ کو تنہا پائیں (یَتِیْمًا) یا جن میں حرکت تو ہو لیکن وہ خارجی موانعات سے اس طرح گھر جائیں کہ ہل نہ سکیں (اَسِیْرًا) وہ، یہ سب کچھ مفادِ خویش کی کشش و جاذبیت کے علی الرغم کریں گے (وَ یُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّ یَتِیْمًا وَّ اَسِیْرًا۔ ۷۶/۸) اور اس کے لئے نہ کسی صلہ کی امید رکھیں گے نہ ستائش کی تمنا۔ (اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا۔ ۷۶/۹)

یہ ہیں نظامِ ربوبیت کی بنیادیں یعنی دل کی گہرائیوں سے وہ چشمے اُبلیں جو مزرعِ انسانیت کی برومندی اور

---

[1] قرآن نے کہہ دیا کہ یہ کشادہ اور وسعت اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ تم اپنے عزیز ترین متاع کو ربوبیتِ انسانیہ کے لئے کھلا رکھو۔ (لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ ۳/۹۱)

سرسبزی و شادابی کا موجب بنیں۔ قلب و نگاہ کی اس تبدیلی کا نام ہے مصلّی بننا۔

اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ قرآن کریم واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ الدین سے مفہوم نظامِ ربوبیت کا قیام ہے۔ اور اس کا ذریعہ صلوٰۃ۔ لہٰذا جو شخص نظامِ ربوبیت قائم نہیں کرتا وہ الدین کو جھٹلاتا ہے اور جو شخص صلوٰۃ سے فقط "نماز کی رسم ادا کرنا" مراد لیتا ہے۔ اور افرادِ معاشرہ کی ربوبیت کا سامان فراہم نہیں کرتا اس کی یہ صلوٰۃ اسکی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔

تکذیبِ دین

وہ کہتا ہے کہ (اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ۱۰۷/۱) تم نے اس شخص کی حالت پر کبھی غور کیا جو الدین کو جھٹلاتا ہے؟ یہ وہ ہے جو انہیں دھکے دیتا ہے جو معاشرے میں تنہا رہ گئے ہیں (فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ ۱۰۷/۲) اور دوسروں کو بھی ان لوگوں کے سامانِ پرورش فراہم کرنے کی ترغیب نہیں دیتا جن کی صلاحیتیں نشوونما سے رک گئی ہوں (وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ۔ ۱۰۷/۳) جس صلوٰۃ کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا، سمجھ لو کہ وہ صلوٰۃ بے نتیجہ ہی نہیں بلکہ تباہی کا باعث ہے۔ (فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ الَّذِیۡنَ ھُمۡ عَنۡ صَلَاتِھِمۡ سَاھُوۡنَ ۔ ۱۰۷/۵) تباہی کا باعث اس لئے کہ اگر وہ صلوٰۃ کو بالکل ترک کر دیں گے تو اس کا احساس تو ہوگا کہ ہمارے معاشرے کی تباہی فقدانِ قیامِ صلوٰۃ کی وجہ سے ہے لیکن جب صلوٰۃ کو "رسمِ نماز" میں بدل لیا جائے تو اس سے جھوٹا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ ہم صلوٰۃ کے پابند ہیں اور معاشرہ کی خرابی کا باعث کچھ اور ہے۔ یہ ہیں وہ مصلّین جن کی صلوٰۃ دیکھنے میں صلوٰۃ نظر آتی ہے لیکن درحقیقت صلوٰۃ ہوتی نہیں۔ کیونکہ جو صلوٰۃ ربوبیتِ عامہ کی سائع ہو جائے وہ صلوٰۃ کیا ہے؟ (اَلَّذِیۡنَ ھُمۡ یُرَآءُوۡنَ وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ۔ ۱۰۷/۶-۷) یہ لوگ رزق کے ان سرچشموں پر بند لگا کر بیٹھ جاتے ہیں جنہیں بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہنا چاہیئے۔ قرآن کی رو سے مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نوعِ انسان کی نشوونما کا انتظام کرتے ہیں۔ (وَالَّذِیۡنَ ھُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوۡنَ۔ ۲۳/۴) دیکھئے! یہاں للزکوٰۃ فاعلون نے کس طرح بات واضح کر دی ہے کہ زکوٰۃ سے مراد ایک پروگرام ہے جس کی سرانجامدہی مومنین کے ذمے ہے۔ یہی وہ مقصدِ عظیم ہے۔ جس کے لئے ان کی حکومت وجود میں آتی ہے:-

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ .... (۲۲/۴۱)

یہی لوگ ہیں کہ جب انہیں دنیا میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ صلوٰۃ کا نظام قائم کریں اور نوعِ انسانی کی پرورش کا سامان بہم پہنچائیں گے۔

اس آیت میں ایک دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ "ایتاءِ زکوٰۃ" (زکوٰۃ دینے) کا فریضہ اس وقت ادا ہو سکے گا

جب ان کی اپنی مملکت قائم ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اگر "زکوٰۃ دینے" سے مراد خیرات دینا ہو تو اس کے لئے اپنی حکومت کی ضرورت نہیں۔ خیرات تو ہر حکومت کے تابع دی جا سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ "ایتاء زکوٰۃ" سے مراد خیرات دینا نہیں۔ اس سے مراد ایسا نظامِ حکومت قائم کرنا ہے جس کا مقصد نوعِ انسان کے لئے سامانِ نشو ونما مہیا کرنا ہو۔

اور دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی مملکت، زکوٰۃ دے گی (اس حکومت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ ہوگا) لہٰذا یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ لوگوں سے زکوٰۃ کا روپیہ وصول کرے، یہ تصوّر قرآن کے تصورِ زکوٰۃ کے خلاف ہے۔ قرآن کریم تو یہ کہتا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ زکوٰۃ دینا (ایتاءِ زکوٰۃ) ہے، نہ کہ لوگوں سے زکوٰۃ لینا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری الجھنیں زکوٰۃ کے مروّجہ مفہوم کی پیدا کردہ ہیں۔ اس میں زکوٰۃ کا مفہوم انفرادی خیرات ہے۔ لیکن دین کے نظام میں ایتاء زکوٰۃ سے مراد، افرادِ انسانیہ کے لئے سامانِ نشوونما بہم پہنچانا ہے جو اسلامی حکومت کا فریضہ، بلکہ اس کے قیام کی وجہ جواز ہے۔

(۱۰)

اب آگے بڑھیئے :-

ہم دیکھ چکے ہیں کہ نظامِ ربوبیت کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ ہماری نگاہ قریبی مفاد کی بجائے مستقبل کے مفاد (آخرت) پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص مستقبل پر نگاہ رکھے گا وہ نظامِ ربوبیت (نوعِ انسانی کی نشوونما ـــ زکوٰۃ) کے لئے کوشاں ہوگا۔ لیکن جو شخص مستقبل پر نگاہ نہیں رکھے گا وہ اس کے لئے کوشاں ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ (اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ ۴۱/۷) جو لوگ انسانوں کو سامانِ نشوونما بہم نہیں پہنچاتے وہ درحقیقت آخرت کے منکر ہیں۔ اس کے برعکس، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے حاملین آخرت پر ایمان رکھتے ہیں (اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ ۳۱/۴) یہی دینِ قیم ہے (وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔ ۹۸/۵) صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا باہمی رشتہ ایسا استوار ہے کہ جو لوگ دولت کو ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہوئے دل میں کبیدگی محسوس کرتے ہیں ان کی نمازیں بھی بانجھ ہوتی ہیں۔ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ۔ (۹/۵۴)

آپ نے دیکھ لیا کہ قیامِ صلوٰۃ سے مفہوم کیا ہے؟ معاشرہ میں ایسی فضا پیدا کر دینا جس سے انسان خود بھی ربوبیت کی ذہنیت پیدا کرے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرے اور ترغیب دے۔ لہٰذا، نظامِ ربوبیت کے قیام کے

لئے ضروری ہے کہ

(۱) انسان پہلے ان مسلمات کو بطور نصب العینِ حیات اپنے دل میں جانشین کرے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اور اس کے بعد

(۲) اس معاشرہ کا جزو بن جائے جس میں تمام افراد ایک دوسرے کو اس نظام کے قیام کی تلقین کریں۔

اس طرح انسان اس راستے کو اختیار کر سکتا ہے جسے قرآن نے "پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کا دشوار گزار راستہ بتایا ہے۔ چنانچہ ان آیات کے بعد (جن میں اس راستہ کو پہاڑ پر چڑھنے کا راستہ بتایا گیا ہے) قرآن نے کہا ہے کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ:-

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (۹۰/۱۷)

انسان ان لوگوں میں سے ہو جائے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایسا معاشرہ قائم کر لیا جس میں ہر فرد دوسرے کو گرنے سے بچانے اور سامانِ نشو و نما بہم پہنچانے کی تلقین کرتا ہے۔

محرکات کی نگہداشت

انسانی معاشرہ کی بنیاد اُن محرکات پر ہوتی ہے جو افرادِ معاشرہ کو آمادہ بہ عمل کرتے ہیں۔ اگر آپ ان محرکات کی نگہداشت کرتے رہیں اور ایسا انتظام کر دیں کہ وہ محرکات افسردہ نہ ہونے پائیں اور نہ ہی ان میں اور قسم کے محرکات کی آمیزش ہو، تو اس معاشرہ کے افراد کی سیرت اور کردار میں استقامت اور توازن پیدا ہو جائے گا اور یہی چیز ایک صحیح معاشرہ کی جان ہے۔ چنانچہ اس باب میں علم تجزیہ نفس کا امام فرائڈ (FREUD) لکھتا ہے کہ

> وہ مہذب سوسائٹی جو افراد سے تو اچھے کردار کا مطالبہ کرتی ہے۔ لیکن جن محرکات پر اس کردار کی بنیاد ہوتی ہے، ان کا کچھ خیال نہیں کرتی، وہ ایسے افراد سے اطاعتِ احکام کراتی ہے، جو اس اطاعت میں اپنی فطرت کے تقاضوں کی اطاعت نہیں کر رہے ہوتے۔ جس شخص سے ایسے احکام کی اطاعت کرائی جائے جنہیں وہ اپنے فطری تقاضوں کا مظاہرہ نہ سمجھے، علم النفس کی زبان میں یوں سمجھئے کہ ایسا شخص اپنے ذرائع اور وسائل کے حدود سے باہر زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسی کو منافق کہتے ہیں خواہ اسے اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ہماری دورِ حاضرہ کی تہذیب کی فضا ایسے منافقین کی تخلیق کے لئے غیر معمولی طور پر سازگار ہے۔ (۳)

تفصیل کا یہ موقعہ نہیں (نہ ہی زیرِ نظر کتاب کا یہ موضوع ہے) ورنہ بتایا جاتا کہ قرآن نے "منافقین" کی جو خصوصیات بتائی ہیں فرائڈ اور عصرِ حاضر کے دیگر علمائے علم النفس کی تحقیقات کس طرح ان کے لئے شہادت بہم پہنچاتی ہیں۔ اس

وقت صرف اتنا دیکھنا ہوگا کہ قرآن ان محرکات کی کس قدر نگہداشت کرتا ہے جن پر اس کے نظامِ ربوبیت کی عمارت اٹھتی ہے۔ اس سارے پروگرام کا نام قیامِ صلوٰۃ ہے۔ پروفیسر (HAWTREY) نے لکھا ہے کہ

جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ (۴)

آپ دیکھئے کہ قرآن جن جذباتِ محرکہ پر اپنے نظام کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ کس قدر محکم، پائیدار، مبنی برعلم و بصیرت اور عقلی تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں۔

ان محرکات کی بیداری اور پختگی (یعنی قیامِ صلوٰۃ) کے ساتھ ساتھ ان افراد کو انفاق (اپنی کمائی کو کھلا رکھنے) کی عملی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ یعنی ایسے مواقع سامنے لائے جاتے ہیں جن میں یہ افراد، اپنی کمائی کا بیشتر حصہ اجتماعی بہبود کے لئے صرف کر دیں۔ قرآن کریم میں اس کے لئے "فی سبیل اللہ" کی اصطلاح آتی ہے۔ قرآن میں صدقہ و خیرات وغیرہ

عبوری دَور کے احکام

کے لئے جس قدر ترغیبات و تحریصات یا احکام و ضوابط آتے ہیں وہ سب اسی عبوری دور (TRANSITIONAL PERIOD) سے متعلق ہیں (اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی) یعنی وہ دور جس میں نظامِ ربوبیت اپنی مکمل شکل میں ہنوز قائم نہ ہوچکا ہو لیکن اس کے قائم کرنے کے لئے کوشش کی جارہی ہو۔ بالفاظِ دیگر نظامِ ربوبیت کے قیام کے ابتدائی مراحل۔ اس عبوری دور میں افرادِ معاشرہ کی تربیت اس انداز سے کی جاتی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اس معاشرہ کی آخری شکل تک پہنچ جائیں۔ چنانچہ انہیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ اپنے لئے بھی رکھو، لیکن اس کے ساتھ ہی اجتماعی بہبود کے لئے بھی دو۔ اس لئے کہ معاشرہ سب کچھ لے لینے کا مطالبہ صرف اس وقت کرسکتا ہے جب وہ اس پوزیشن میں ہو کہ افرادِ معاشرہ کی تمام ضروریاتِ زندگی بہم پہنچا سکے۔ یہی ہے وہ آخری مقام جس تک یہ جماعت آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ یُسۡرِفُوۡا وَلَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَ کَانَ بَیۡنَ ذٰلِکَ قَوَامًا۔ (۲۵/۶۷)

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں تو اس میں اسراف نہیں کرتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی (موقعہ پر) تنگی بھی نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی روش ان دونوں حالتوں کے بین بین، اعتدال پر ہوتی ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ

وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰی حَقَّهٗ وَالۡمِسۡکِیۡنَ وَابۡنَ السَّبِیۡلِ وَلَا تُبَذِّرۡ تَبۡذِیۡرًا۔ (۱۷/۲۶)

اور قریبی کو اس کا حق دو اور مسکین کو بھی اور ایسے مسافر کو بھی جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو اور مال کو بے جا صرف

کر کے ضائع مت کرو۔

کہیں انہیں محتاجوں اور غریبوں کو خفیہ اور علانیہ خیرات دینے کی تلقین کی جاتی ہے (۲/۲۷۴) اور کہیں حکم دیا جاتا ہے کہ دولت کو گردش دیتے رہو لیکن اس انداز سے کہ وہ اوپر ہی اوپر کے طبقہ میں نہ پھرتی رہے۔ (کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ۔ ۵۹/۷) کہیں انہیں دولت جمع کرنے کے ہلاکت انگیز عواقب سے ڈرایا جاتا ہے (۹/۳۴) اور کہیں سود خواری کے نتائج سے متنبہ کیا جاتا ہے (۲/۲۷۵) حقیقت یہ ہے کہ اگر بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو ان ہی تدریجی احکامات سے اس جماعت میں ایسی کیفیت پیدا کر دی جاتی ہے کہ اس میں ذاتی املاک اور جائیداد کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ مثلاً دیکھئے۔

جائیداد بنانے کی گنجائش ہی نہیں رہتی

(۱) زمین کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کے لئے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ (سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ) یعنی تمام ضرورتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی رہے گی۔ لہٰذا زمین خرید کر زمینداریاں اور جاگیرداریاں پیدا کرنے کا تصور ہی باقی نہیں رہتا۔

(۲) جب زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی تو ظاہر ہے کہ کرائے پر دینے کے لئے مکانات بنانے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ جب زمین ہی نہ ہوگی تو مکان کہاں بنایا جائے گا۔ مکان اپنی رہائش کے لئے درکار ہوگا سو اس کی ذمہ داری خود معاشرہ نے لے رکھی ہے۔ نہ ہی زمین کو بٹائی پر دینے کا سوال پیدا ہوگا۔

(۳) روپیہ جمع نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کی سخت ممانعت آئی ہے۔ نہ ہی اسے کسی خاص حلقے میں گردش دیا جاسکتا ہے۔

(۴) اپنی ضروریات کے لئے نہ ہی اسراف کیا جاسکتا ہے نہ تبذیر۔ یعنی نہ زائد از ضرورت خرچ کیا جاسکتا ہے نہ بلاضرورت۔

(۵) کسی کو روپیہ قرض دے کر اس پر سود نہیں لیا جاسکتا۔

اب فرمائیے کہ اگر کسی کے پاس زائد از ضرورت روپیہ ہو تو، ان احکام کی موجودگی میں وہ اس روپے کو کریگا کیا؟ یہ روپیہ تو اس کے لئے وبالِ جان بن جائے گا۔ کیونکہ (قرآنی احکام کی رُو سے) اس روپے کے رکھنے (یا خرچ کرنے) کی کوئی جگہ ہی نہیں ہوگی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس روپے سے کارخانے لگائے جائیں۔ تجارت کی جائے۔ بہت اچھا! لیکن اس تجارت اور ان کارخانوں سے جو روپیہ آئے اسے کیا کیا جائے؟ بات پھر وہیں آجائے گی۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کس طرح، ان احکام کی رو سے زائد از ضرورت روپیہ کے لئے افراد کے پاس کوئی جگہ ہی باقی نہیں چھوڑی۔ جہاں تک افراد کی ضروریات کا تعلق ہے، انہیں معاشرہ نے اپنے ذمہ لے لیا (تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر آتی ہے)

اس طرح عملی تعلیم سے ان افرادِ معاشرہ کی زندگی میں ایسی تبدیلی پیدا کر دی جاتی ہے جس سے وہ آہستہ آہستہ کلّی مفاد کے خوگر ہو جائیں اور حال کی کشش و جاذبیت کے باوجود اسے اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے صرف کرتے رہیں۔ (وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ..... (۲/۱۷۷) نیز (۷۶/۸))۔ اسی سے رفتہ رفتہ ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ:-

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ..... (۵۹/۹)

وہ خود تنگی کی حالت میں گذر کر لیتے ہیں لیکن دوسروں کی ضروریات کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔

جماعت کی تشکیل

جب قلب و نگاہ میں اس قدر تبدیلی ہو جائے تو وہ مقام آجاتا ہے جہاں یہ جماعت اس مثالی معاشرہ (IDEAL SOCIETY) کی تشکیل کے لئے جو اس تعلیم و عمل کا منتہی ہے، نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے۔ دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اب ایک متمیز (DISTINCT) پارٹی کی حیثیت سے مشہود ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ کسی معاشرہ میں انقلاب پیدا نہیں کیا جا سکتا جب تک اس کے لئے ایک جماعت (پارٹی) موجود نہ ہو۔ اس باب میں اوسپنسکی اپنے استاد گرجیف کا قول نقل کرتا ہے کہ:-

انسانیت کا ارتقاء ہمیشہ ایک گروپ کے ذریعے ہی عمل میں آسکتا ہے۔ یہ گروپ باقی نوعِ انسانی پر اثر انداز ہوگا اور اس کی راہنمائی کرے گا۔ (۵)

لیکن اس گروپ کی تشکیل، استبدادی ڈنڈے کے زور سے یا جاہ و منصب کے لالچ سے نہیں ہوگی۔ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں، یہ پارٹی ان افراد پر مشتمل ہوگی جو برضاء و رغبت، بطیبِ خاطر، نظامِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے چکے ہیں۔ جو اس پر ایمان لا چکے ہیں کہ یہی نظام ان کے حال اور مستقبل کی خوشگواریوں کا ضامن ہے۔ بالفاظِ دیگر یہ وہ افراد ہیں جن میں قلب و نگاہ کی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے اور یہی تبدیلی ان میں وجہِ جامعیت اور موجبِ اشتراک ہے۔ اس یک نگہی سے ان کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی وہ محکم بنیاد ہے جس پر ایک صالح معاشرہ کی عمارت اٹھتی ہے۔ اوسپنسکی لکھتا ہے کہ:-

انسانوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلط فہمیاں اس لئے پیدا ہو جاتی ہیں کہ وہ مختلف جذبات کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر ان کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو وہ ایک دوسرے کو بالکل صحیح طور پر سمجھنے لگ جائیں گے (۶)

اس قسم کے افراد کا ایک جا ہو کر اس مقصدِ عظیم اور واحد نصب العین کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے کا نام جماعتی زندگی ہے۔ اس قسم کی جماعت کی تشکیل کس طرح سے ہوتی ہے اس کے لئے اوسپنکی اپنے استاد گرجیف کے الفاظ میں لکھتا ہے کہ:-

> اس جماعت کی شرطِ اولین کیا ہے؟ بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں ہر فرد، دوسرے فرد کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے۔ ایک کی غلطی سب کی غلطی سمجھی جاتی ہے۔ یہی ان کا قانون ہوتا ہے۔ اور اس قانون کی بنیاد بڑی محکم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس جماعت میں جو کچھ ایک فرد کا ہوتا ہے، وہ سب کا ہوتا ہے۔ (۷)

یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے رسول اللہ سے کہا گیا کہ (فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (۱۵/۹۴) قانونِ خداوندی کے مطابق دوسروں سے الگ ہٹ کر اپنی جماعت کی جداگانہ تشکیل کر لیجئے۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ ۲۶/۲۱۵) اور جو لوگ اس جدید پروگرام پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں انہیں اپنے بازوؤں کے نیچے سمٹا لیجئے۔ تمہارے اس ٹکراؤ میں، جو مفاد پرست جماعتوں سے ہونے والا ہے، اللہ کا قانون اور اس جماعت کی رفاقت کافی ہے۔ (حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ ۸/۶۴)

اس طرح ایک جدید معاشرہ کی تشکیل ہو جاتی ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ اپنے اندر صفاتِ خداوندی کو منعکس کر کے ربوبیتِ عامہ کو اپنا نصب العین زندگی قرار دیتے ہیں۔ اب معاشرہ اور ان افراد کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ افرادِ معاشرہ، اپنی جان اور مال سب کچھ اس مرکز کے سپرد کر دیتے ہیں جو قرآنی نظامِ ربوبیت کو عمل میں لانے کا ضامن ہوتا ہے اور اس کے بدلے یہ مرکز انہیں "الجنۃ" کی ضمانت دیتا ہے۔

معاہدہ

> اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱)
>
> اللہ نے خرید لیا ہے مومنین سے ان کا جان اور مال بعوض جنت کے۔

"الجنۃ" کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس میں زندگی کی تمام بنیادی ضروریات (خوراک، لباس، مکان اور حفاظت) شامل ہیں۔ لہٰذا، اس معاہدے کی رو سے، نظامِ معاشرہ اس امر کی ذمہ داری لیتا ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کی تمام بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کرے گا اور افرادِ معاشرہ اپنی وہبی اور اکتسابی قوتوں کے ماحصل کو معاشرہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ یہ وہ تجارت ہے جس سے افرادِ معاشرہ ان تباہیوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں جو اُس نظام کا لازمی نتیجہ ہیں جس میں اجتماعی مفادِ کلّی کی بجائے، انفرادی مفادِ خویش سامنے رہتا ہے (۲/۱۷)۔ اس معاہدہ کی رو سے ہر وہ شخص جو کمانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اپنی کمائی میں سے صرف اتنا لیتا ہے جو اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے کافی ہو، باقی سب معاشرہ کی تحویل میں

دے دیا جاتا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ـ قُلِ الْعَفْوَ ـ (۲۱۹/۲)

پوچھتے ہیں کہ اپنی کمائی کا کتنا حصہ دوسروں کے لئے کھلا رکھنا ہوگا۔ ان سے کہو کہ جتنا تمہاری ضروریات سے زیادہ ہو۔
اس لئے کہ تم نے زائد از ضرورت اپنے پاس رکھ کر کرنا کیا ہے؟ تمہاری تمام ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری تو معاشرہ نے لے رکھی ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا .... (۶/۱۱) نیز [۵۸/۵۱ ؛ ۶۰/۲۹]

زمین پر (یعنی اس حصۂ ارض میں جس میں یہ معاشرہ قائم ہے) کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔

ہم اس مقام پر ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں جسے آگے بڑھنے سے پہلے سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہم نے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ .... کی آیت میں بھی اور پھر مذکورہ صدر آیت میں بھی "اللہ" سے مراد لیا ہے وہ معاشرہ جو قانونِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے متشکل ہو۔ سوال یہ ہے کہ اللہ سے یہ مفہوم کیسے لیا

اللہ سے عملی مراد

گیا ہے؟ یہ سوال ایسا ہے جس کے متعلق میں اپنی مختلف تحریروں میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس لئے اس مقام پر زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بایں ہمہ، ان حضرات کی خاطر جن کی نظروں سے میری (مذکورہ صدر) تحریریں نہیں گزریں، اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ انسانوں کی دنیا میں اللہ کے کام انسانوں کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً خدا کا یہ اعلان ہے کہ ہم اپنے کلمہ کو بلند کریں گے، حق کی فتح و کامیابی ہوگی، خدا کا دین تمام ادیان پر غالب آئے گا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کلمۃ اللہ کی بلندی، حق کی فتح و نصرت اور دینِ خداوندی کا غلبہ، بدر و حنین کے میدانوں میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین) کے ہاتھوں سے ہوا تھا، از خود نہیں ہوا۔ جب تک یہ جماعت پیدا نہیں ہوئی، حق کا کلمہ بلند نہیں ہوا۔ خود جس مقام پر قرآن نے کہا ہے کہ "دین الحق" اس لئے بھیجا گیا ہے کہ وہ تمام ادیان پر غالب رہے۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۴۸/۲۸) اس کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ.... (۴۸/۲۹) یہ اس جماعت کی "کفار پر شدت" کا نتیجہ تھا کہ دین الحق تمام ادیان پر غالب آگیا۔ جب (حدیبیہ کے مقام پر) مجاہدین کی یہ جماعت، نبی اکرمؐ کے ہاتھ پر جان دینے کی بیعت کر رہی تھی تو قرآن نے کہا تھا کہ جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ درحقیقت خدا سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ کے اوپر (تمہارا ہاتھ نہیں) دراصل خدا کا ہاتھ تھا (۴۸/۱۰) یعنی خدا براہِ راست بیعت نہیں لیا کرتا، نظامِ خداوندی کا مرکز خدا کی جگہ بیعت لیتا ہے۔ اسی طرح جب بدر کے میدان میں مجاہدین، حق کے غلبہ کے لئے مخالفین پر تیر اندازی کر رہے تھے تو اس کے متعلق بھی فرمایا کہ (وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى - ۸/۱۷) یہ تیر اندازی تم نہیں کر رہے تھے اللہ کر رہا تھا۔ لہٰذا انسانوں کی معاشرتی

زندگی میں جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں وہ اس معاشرہ کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ سورۃ یٰسین میں اسی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اسے محتاجوں کی پرورش کے لئے کھلا رکھو (وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۔ ۳۶/۴۷) تو اس کے جواب میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر اللہ ایسا ہی چاہتا ہے تو وہ انہیں خود کھلائے۔ ہم کیوں کھلائیں؟ (قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۔ ۳۶/۴۷) قرآن کہتا ہے کہ اُن سے کہہ دو کہ تم لوگ کس قدر احمقانہ باتیں کر رہے ہو (اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ ۳۶/۴۷) خدا خود براہِ راست نہیں کھلایا کرتا۔ یہ تمام انتظام خود انسانوں کے ہاتھوں سے ہوا کرتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ ان لوگوں کا یہ خیال کس قدر گمراہی اور جہالت پر مبنی تھا، ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تمام اقوامِ عالم کا پرورش کرنے والا ہے (ربّ العالمین)۔ "زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو" (۱۱/۶) یا یہ کہ تم لوگ اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کر دیا کرو۔ (نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۔ ۱۷/۳۱) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے بھی۔ اب ظاہر ہے کہ جب ان سب کے رزق کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے تو ان میں سے کسی کو بھی بھوکا نہیں رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دنیا میں کروڑوں انسان بھوکے مرتے ہیں۔ ایک ایک قحط میں لاکھوں جانیں روٹی نہ ملنے کی وجہ سے تلف ہو جاتی ہیں۔ کتنے بچے ہیں جو محض غذا نہ ملنے (یا کم ملنے) کی وجہ سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس سے انسان (معاذ اللہ) اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ خدا کی ذمہ داری اچھی ہے جو اس قدر مخلوق بھوکوں مر جاتی ہے۔ لیکن ان آیات کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ ان ذمہ داریوں کو براہِ راست پورا کرتا ہے۔ یہ پوری ہوتی ہیں معاشرہ کے ہاتھوں۔ اگر معاشرہ، ضابطۂ خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے تو اللہ کی یہ تمام ذمہ داریاں پوری ہوتی جاتی ہیں اور اس طرح انسان دیکھ لیتا ہے کہ وہ کس طرح رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (۶/۱۶۵) "ہر شے کی ربوبیت کا ذمہ دار" ہے۔ لیکن اگر معاشرہ غیر خداوندی خطوط پر متشکل ہو تو اس کا نتیجہ ربوبیتِ عامہ نہیں ہوتا۔

خارجی کائنات میں خدا کی ربوبیت خدا کے قانونِ کائنات کی رُو سے از خود کارفرما ہوتی جاتی ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں یہ ربوبیت انسانوں کے ہاتھوں سے پوری ہو سکتی ہے۔ جو نظام (حکومت) خدا کے نام سے قائم ہوتا ہے وہ ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر پر لیتا ہے جو خدا کی طرف منسوب ہیں اور اس کے بدلے میں افرادِ معاشرہ وہ تمام فرائض و واجبات پورے کرتے رہتے ہیں جن کا عہد انہوں نے اپنے خدا سے کر رکھا ہوتا ہے۔ افرادِ معاشرہ اس نظام کی اطاعت کے اس وقت تک مکلف ہوتے ہیں جب تک یہ نظام ان ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا

عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶) زمین میں کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں۔ یہ ذمہ داری اس معاشرہ کے سر ہوگی جو خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہوگا۔ قرآن کہتا ہے کہ جب تمھاری پرورش کا سامان اس طرح کر دیا جائے تو پھر تم رزق سمیٹ کر جمع کیوں کرو؟ تم اسی لئے جمع رکھنا چاہتے تھے کہ کل کو وقت پڑنے پر وہ تمھارے اور تمھاری اولاد کے کام آئے۔

جمع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

لیکن جب تمھاری اور تمھاری اولاد کی پرورش کی تمام ذمہ داریاں معاشرہ اپنے سر لے لے تو تمھیں جمع کرنے کی کیا ضرورت رہے گی؟ (نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ۔ ۱۷/۳۱) "ہم تمھارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمھاری اولاد کے بھی"؛ تم اس لئے جمع کرنا چاہتے تھے کہ جب تم بوڑھے ہو جاؤ اور تم میں کمانے کی استطاعت نہ رہے اور تمھارے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں تو اس وقت تمھاری اور ان کی پرورش کا کیا انتظام ہوگا (۲/۲۶۶)، لیکن اس نظامِ ربوبیت میں اس قسم کا خیال بھی دل میں نہیں آنا چاہیئے۔ اس میں ہر ایک کی پرورش کا انتظام موجود ہونا ہے۔ یا تم اس لئے جمع کرنا چاہتے تھے کہ کل کو کوئی حادثہ پیش آجائے جس سے تمھارے کمانے کی استعداد کم ہو جائے یا بالکل سلب ہو جائے تو اس وقت کیا ہوگا؟ لیکن اس نظام میں اس قسم کے حوادث کے لئے بھی پہلے ہی گنجائش (PROVISION) رکھ دی گئی ہے۔ (مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا۔ ۵۷/۲۲)۔ اس نظام میں اس قسم کے خارجی یا داخلی حوادث کے لئے (PROVISION) کر لینا کچھ دشوار نہیں۔ (اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۔ ۵۷/۲۲) یہ وہ نظام ہے جس میں کسی استعداد کے کم یا سلب ہو جانے سے انسان سامانِ نشو ونما سے محروم نہیں رہ جاتا (لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ ۵۷/۲۳) اس لئے کہ جن کی استعداد زیادہ ہوتی ہے، وہ اس استعداد کے ماحصل کو اپنی ملکیت نہیں سمجھ لیتے۔ (وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ۔ ۵۷/۲۳) یہ دشواری اس معاشرے میں پیش آتی ہے جہاں ہر شخص خود بڑا بننے کی فکر کرے اور اس کے لئے دوسرے انسانوں کی کمائی پر اس طرح چپکے چپکے ہاتھ مارے جس طرح شکاری دبے پاؤں شکار کو جا دبوچتا ہے (وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔ ۵۷/۲۳)۔ لہٰذا جس معاشرہ میں انسان کا رزق اس طرح محفوظ (SECURED) ہو، اس میں جمع کرنے کی ضرورت کہاں رہتی ہے؟ یہ تو مستقبل کے عدمِ تحفظ (INSECURITY) کا احساس ہے جو انسان کو ہر وقت جمع کرنے پر اُکساتا رہتا ہے۔ وَالشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (۲/۲۶۸) ابلیسی معاشرہ تمہیں ہر وقت احتیاج سے ڈراتا

عقل کا پورا اطمینان

رہتا ہے اور اسی ڈر کی بنا پر بخل پر اُکساتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس، نظامِ ربوبیت تمھیں پوری پوری حفاظت کا یقین دلاتا ہے اور رزق کی فراوانیوں کی ضمانت دیتا ہے (وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ ۲/۲۶۸)

غور کیجئے. قرآن نے کس طرح چار لفظوں میں دونوں معاشروں کا فرق نمایاں طور پر بیان کر دیا ہے. ایک وہ معاشرہ ہے جس میں ہر شخص اپنی ضروریاتِ زندگی کا خود ذمہ دار ہے. کسی اور کو اس سے غرض نہیں کہ اس کی ضروریات پوری ہوتی ہیں یا نہیں. ظاہر ہے کہ اس معاشرہ میں، ہر فرد ہر وقت مستقبل کے متعلق خائف رہے گا. اس کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ کل کو مجھ پر کوئی وقت آ پڑا تو میرا اور میری اولاد کا کیا بنے گا. مستقبل کے متعلق اس قسم کا عدمِ اطمینان (INSECURITY) ہے جو انسان کے لئے دنیا کو جہنم بنا دیتا ہے. وہ ہر وقت زیادہ سے زیادہ سمیٹنے اور جمع رکھنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے. یہاں تک کہ وہ قبر میں جا پہنچتا ہے (حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۱۰۲/۲). اس کے لئے وہ ہر قسم کی بے ایمانی اور بد دیانتی کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے. فریب دیتا ہے. طرح طرح کی حیلہ جوئیاں کرتا ہے.

اس کے برعکس دوسرا معاشرہ ہے جس میں ہر فردِ معاشرہ کی اپنی اور اس کی اولاد کی پرورش کی ذمہ داری معاشرہ اپنے ذمے لے لیتا ہے. اس میں کسی شخص کو اپنے مستقبل کے متعلق کوئی عدمِ اطمینان نہیں ہوتا. وہ دل کے پورے اطمینان کے ساتھ کام کرتا ہے اور چین کی نیند سوتا ہے. اسے نہ جھوٹ بولنے کی ضرورت ہے نہ چوری کرنے کی حاجت، نہ فریب دینے کی ضرورت ہے نہ بد دیانتی کرنے کی مجبوری. یہ ہے وہ معاشرہ جو اس نئی جماعت کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے. اس میں نہ تو کسی کو مستقبل کی فکر ستاتی ہے اور نہ ہی یہ خدشہ ہوتا ہے کہ میری محنت کا ماحصل، اس طبقہ کی عیش پرستیوں کی نذر ہو جائے گا جس کے ہاتھ میں معاشرہ کا نظم و نسق ہے. نظامِ ربوبیت میں اس قسم کا کوئی طبقہ ہی نہیں ہوتا. اربابِ نظم و نسق بھی اسی قانون اور فیصلے کے پابند ہوتے ہیں جس پر دوسرے افرادِ معاشرہ گامزن ہوتے ہیں. اس میں اربابِ حل و عقد کو عملاً بتانا ہوتا ہے کہ (مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۵۱/۵۷) ہم افرادِ معاشرہ سے رزق نہیں چاہتے. ہمیں ان کی محنت سے اپنی پرورش مطلوب نہیں. جس طرح دیگر افرادِ معاشرہ کے ذمے کچھ کام ہیں، اسی طرح ہمارے ذمے بھی کچھ کام ہیں. اور جس طرح دیگر افرادِ معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہے اسی طرح ہماری ضروریات کا پورا کرنا بھی معاشرہ کے ذمے ہے. ہم میں اور دیگر افرادِ معاشرہ میں کوئی فرق نہیں. ہم اپنے لئے کوئی خاص معاوضہ نہیں چاہتے. ہمارا معاوضہ بھی اسی طرح خدا کے ذمے ہے جس طرح دوسرے افراد کا (فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۱۰/۷۲). ہم بھی دیگر افرادِ معاشرہ کے ساتھ اس نظامِ ربوبیت کے اجزا ہیں. (وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۱۰/۷۲).

دوسرا جذبہ جس کے لئے انسان دوسروں سے زیادہ دولت مند بننے کی کوشش کرتا ہے سوسائٹی میں ممتاز حیثیت حاصل کرنے (SOCIAL STATUS) کا جذبہ ہے. اسے قرآن تفاخر اور تکاثر سے تعبیر کرتا ہے. لیکن اس معاشرہ میں جو

نظامِ ربوبیت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے عزت وعظمت کے معیار اور سوسائٹی کی اقدار (VALUES) بدل جاتی ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ

قیمتِ ہر شے باندازِ نگاہ

ہمارے موجودہ (غلط) معاشرہ میں، عزت وتکریم کا معیار دولت ہے۔ جس کے پاس جتنی زیادہ دولت ہے وہ اتنا ہی زیادہ معزز اور ممتاز ہے۔ لیکن قرآنی معاشرہ میں عزت کا معیار تقویٰ ہوگا۔ یعنی جو اپنے فرائض مفوضہ کو سب سے بہتر طریق پر سرانجام دے گا، (اور اس طرح قانونِ خداوندی سے سب سے زیادہ ہم آہنگ ہوگا) وہی سب سے زیادہ واجب التکریم ہوگا۔ (اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ)۔ لہٰذا، اس معاشرہ میں دولت جمع کرنے کا یہ جذبہ بھی باقی نہیں رہیگا۔

(٥)

تجارت میں نفع کی ضرورت نہیں ہوگی

یہیں سے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ جب نظامِ ربوبیت میں تمام ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہوگی، اور اس طرح نہ کسی کو روپیہ اپنے پاس رکھنے کی ضرورت ہوگی نہ جائیداد کی ذاتی ملکیت کی حاجت، تو اس وقت تجارت میں نفع لینے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ نفع تو ایک طرف اس وقت تجارت کا موجودہ نظریہ ہی بدل جائے گا۔ اس وقت چیزیں تیار کرنے والے انہیں تیار کرتے جائیں گے اور جنہیں ان کے استعمال کی ضرورت ہے وہ ان تک پہنچا دی جائیں گی۔ چیزیں بنانے والوں اور استعمال کرنے والوں دونوں کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہوگی۔ ہمارا موجودہ معاشرہ اپنی پیدا کردہ مصیبتوں سے تنگ آکر زیادہ سے زیادہ یہ سوچتا ہے کہ نقدی کے مبادلے کی بجائے، اجناس کا مبادلہ (BARTER SYSTEM) بہتر ہو سکتا ہے۔ اس باب میں کہا یہ جاتا ہے کہ

مبادلے کے عدل کے یہ معنی ہیں کہ جن چیزوں کا تبادلہ کیا جائے ان کی قیمتیں برابر ہوں۔ (۸)

لیکن اس کے بعد دقت یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ چیزوں کی قیمتوں کو کیسے متعین کیا جائے۔ مثلاً موچی نے جوتا تیار کیا۔ وہ اسے گیہوں کے عوض فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ کیسے متعین کیا جائے کہ کس قدر گیہوں کی قیمت جوتے کی قیمت کے برابر ہے؟ لیکن جس معاشرہ میں موچی اور کسان دونوں کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ پر ہو، اس میں "قیمت" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ وہاں سوال ہوگا ضرورت کا۔ اس لئے قرآنی نظامِ ربوبیت میں "تجارت" کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ اس میں تجارت سے دراصل مراد ہوگا اشیائے ضروریہ کی مناسب تقسیم کا انتظام۔ اس نظام کے کارندوں کی ضروریاتِ زندگی معاشرہ (نظامِ مملکت) کی طرف سے مہیا ہوتی رہیں گی۔ اسی کو ان کا منافع کہہ لیجئے۔

اسی طرح اس نظام میں کام کرنے والوں (موجودہ اصطلاح میں محنت کشوں، مزدوروں) کی اجرتیں مقرر کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ وہ اپنی استعداد کے مطابق وہ کام کریں گے جو انہیں تفویض کیا جائے گا اور معاشرہ انکی ضروریات پوری کرتا جائے گا۔ یہی ان کی محنت کا معاوضہ ہوگا۔

(۰)

آپ غور کیجئے۔ نظامِ ربوبیتِ عامہ کی تشکیل میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ انسان کی عقل اسے ڈراتی رہتی تھی کہ اگر تم نے اپنی کمائی دوسروں کو دے دی تو کل کو تمہارا کیا ہوگا؟ اس جدید معاشرہ نے عقل کا اطمینان کر دیا کہ اس شخص اور اس کے تمام متعلقین کے رزق کی ذمہ داری معاشرہ کے سر ہے۔ اس لئے

بے پناہ قوتیں

اب تمہیں (عقل کو) تشویش (WORRY) کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں جو مشکل پیش آئے اسے معاشرے کے سپرد کر دو، معاشرہ خود اس کا حل تلاش کرتا پھرے گا۔ غور کیجئے کہ اس انتظام سے عقل کتنے بکھیڑوں سے چھوٹ گئی۔

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ جب انسان، فکرِ معاش کی طرف سے آزاد ہو جائے اور اسے اپنے اور اپنی اولاد کے مستقبل کی طرف سے پوری بے فکری ہو جائے تو وہ دنیا میں کس قدر محیر العقول کام کر سکتا ہے؟ یہ تو معاشی پریشانیاں اور مستقبل کے متعلق عدمِ اطمینان ہے جو اس کی توانائیوں کو سلب کئے جاتا ہے، ورنہ انسان اتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے کہ کوئی اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔ اب آپ سوچئے کہ اگر کوئی ایسا معاشرہ ہو جس کے افراد کو نہ معاشی پریشانیاں ستائیں اور نہ ہی مستقبل کی طرف سے عدمِ اطمینان چھلاوے کی طرح ڈراتا رہے، تو وہ معاشرہ دنیا میں کیا کچھ نہیں کر سکے گا؟ وہ طوفانِ بلا کی طرح اٹھے گا اور فطرت کی تمام مخفی قوتوں کو مسخر کرتا اور بروئے کار لاتا چلا جائے گا۔ اس کے ہر فرد کا سینہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح شعلہ خیز ہوگا۔ اس کا ہر "مولا شہباز سے لڑ جائے گا"۔ اس کے راستے میں کائنات کی کوئی قوت سنگِ گراں بن کر حائل نہیں ہو سکے گی۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ نظامِ ربوبیت، افرادِ معاشرہ کو صرف فکرِ معاش ہی سے آزاد نہیں کرتا بلکہ ان میں سے ہر فرد اس پر ایمان رکھتا ہے کہ میں جو کچھ "دیتا ہوں" اس سے خود میری ذات کی ربوبیت ہوتی ہے۔ اس لئے میں جس قدر زیادہ دوں گا اتنی ہی زیادہ میری ذات کی نشوونما ہوگی اور اس طرح میں حیاتِ جاوید حاصل کر لوں گا اور خدا کی صفات کا مظہر بنتا جاؤں گا۔ وہ اس ایمان کی بنا پر زیادہ سے زیادہ "دینے" کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر دے گا حتیٰ کہ اگر

ضرورت پڑے تو) وہ اپنی جان جیسی متاعِ عزیز بھی بلاتامل دے دیگا کیونکہ اسے یقین ہوگا کہ (i) میرے مرجانے سے میرے بچے لاوارث نہیں رہ جائیں گے۔ اور (ii) جان دیدینے سے مجھے وہ استحکام خودی (ذات کی پختگی) حاصل ہوجائے گی جس سے میں حیاتِ جاوداں کا مستحق ہوجاؤں گا لہٰذا اس کے لئے جان دے دینا بھی ایک جشن کامرانی ہوگا۔

اب سوچئے کہ ایسا معاشرہ دنیا میں کیا کچھ نہیں کرسکتا۔ آج دنیا حیران ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہٗ کی قلیل سی جماعت نے، اتنے مختصر سے عرصے میں، ایسی محیر العقول ترقی کس طرح کرلی تھی؟ دنیا حیران ہے اور اس کے لئے تحقیقاتی ادارے قائم کرتی ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ رسول اللہؐ نے وہ معاشرہ متشکل کرلیا تھا جو قرآنی نظامِ ربوبیت کا حامل تھا اور یہ تمام محیر العقول ترقیاں اسی کے ثمرات تھیں۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جس معاشرے کے افراد کے دلوں میں نہ مرنے کا خوف ہو اور نہ پسماندگان کے مستقبل کا حزن (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ) تو اُن کی قوتوں کا کیا ٹھکانا ہے؟ رسول اللہؐ نے انہیں قرآن کی تعلیم دی۔ اس کے نتائج و ثمرات سے انہیں آگاہ کیا اور نظامِ ربوبیت کی رو سے ان کی نشوونما کا انتظام کردیا۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ...... (۲/۱۲۹) اور یہ معاشرہ مشرق و مغرب پر چھا گیا۔ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ) انہوں نے قانونِ خداوندی سے موافقت پیدا کرلی اور وہ قانون ان کا رفیق و یاور بن گیا۔)

(۰)

فرد اور جماعت کا تعلق

دورِ حاضرہ کا سب سے اہم مسئلہ "فرد اور جماعت" کا باہمی تعلق ہے۔ جس طرح مغرب کا میکانکی نظریۂ حیات، عیسائیت کے اس باطل تصور کا ردِعمل ہے جس کی رو سے اس نے مادی دنیا کو سخت قابلِ نفرت شے بنا کر رکھ دیا تھا۔ اسی طرح فرد اور جماعت کے تعلق کے متعلق یورپ کا موجودہ تصور بھی عیسائیت کے مسلکِ خانقاہیت کا ردِعمل ہے۔ مسلکِ خانقاہیت سے مفہوم یہ تھا کہ معاشرہ یا جماعت کا وجود کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ مقصدِ زندگی ہر فرد کی اپنی نجات ہے اور اس نجات کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ انسان معاشرہ سے کٹ کر انفرادی زندگی بسر کرے۔ جس طرح عیسائیت کے تصورِ "روحانیت" کا ردِعمل یہ ہوا کہ مغربی مفکرین اور سائنسدانوں نے یکسر "روح"[1] ہی سے انکار کردیا اور دنیا کو خالص مادیت کی تعبیر بنا دیا۔ اسی طرح مسلکِ خانقاہیت کا ردِعمل یہ ہوا

[1] روح سے ہماری مراد انسانی ذات ہے جس میں، انسان کی طبیعی موت کے بعد زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے

کہ انہوں نے فرد کی ذات ہی سے انکار کر دیا اور اعلان کر دیا کہ اصل وجود اور ہستی سوسائٹی (معاشرہ) کی ہے۔ اسی "معاشرہ" نے کہیں "نیشن" کا پیکر اختیار کر لیا اور کہیں "اسٹیٹ" کا۔ چنانچہ انیسویں صدی سے یورپ میں یہ نظریہ عام ہونے لگا کہ فرد سوسائٹی یا نیشن یا اسٹیٹ کی خاطر جیتا ہے اور اسی کی خاطر مرتا ہے۔ اس اجتماعی زندگی کے باہر اس کی انفرادی زندگی کا تصور ہی غلط ہے۔ افراد کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو سوسائٹی میں مدغم کر دیں اور خود باقی نہ رہیں۔ اسی طرح جیسے مشین کے پرزوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کو باقی نہ رکھیں۔ ہستی صرف مشین کی باقی رہے۔ پرزوں کا کام یہ ہے کہ وہ مشین کے مقصدِ کلی کے حصول کی خاطر سرگرداں رہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ اس طرح گردش کیوں کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرد اور سوسائٹی کے اس تصور کے ماتحت افراد کی حیثیت محض میکانکی پرزوں (AUTOMATONS) کی رہ جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسلک نے یورپ میں ایک جدید مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے جس میں اسٹیٹ کو ایک معبود کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ اور افراد کو پرستار کی۔ جس طرح کالی دیوی کے مندر میں اس کے پرستاروں (بھگتوں) کی قربانی چڑھتی تھی۔ جس طرح "جگن ناتھ جی" کے رتھ کے نیچے زندہ انسانوں کو کچل دیا جاتا تھا تاکہ وہ مکتی (نجات) حاصل کر لیں۔ اسی طرح اسٹیٹ کے دیوتا کے حضور افراد کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔ چنانچہ ٹکیلے "نیشنلزم" کے متعلق لکھتا ہے کہ:

> یہ ایک بت پرستانہ مسلک اور مشرکانہ مذہب ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفریقِ انسانیت کے لئے ایسا طاقت ور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب، فلاح و وحدتِ انسانیت کے لئے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ (۹)

اور (MURRAY) لکھتا ہے کہ:-

> چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے اس لئے اس خالی مکان پر اس جدید مذہب شیطان نے قبضہ کر لیا ہے۔ (۱۰)

اصل یہ ہے کہ حکمران طبقے نے اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے یہ ایک نیا حربہ تراشا ہے۔ پہلے جو کچھ مستبد، مطلق العنان بادشاہ کے نام سے ہوتا تھا وہی کچھ اب "اسٹیٹ" کے مبہم نام سے ہوتا ہے۔ اسٹیٹ ایک مجرّد تصور (ABSTRACT CONCEPT) ہے اور آج تک کوئی مدبّر یا مفکر نہیں بتا سکا کہ اسٹیٹ کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے لیکن جب اس تصور کو ذرا کرید کر دیکھا جائے تو اس کے نیچے وہی دکھائی دے گا جو اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسٹیٹ کو مضبوط رکھو اور اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ برسرِ اقتدار طبقے کے ہاتھ مضبوط کر دو۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسٹیٹ کے خلاف بغاوت نہ کرو، اور اس سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ کرو جس سے حکمران طبقہ، اقتدار کی کرسیوں سے نیچے گر جائے۔ کمیونسٹوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے ہاں سلطانیٔ جمہور (PEOPLE'S GOVERNMENT

ہے۔ لیکن وہاں بھی جمہور (PEOPLE) سے درحقیقت مراد حکمران طبقہ ہے۔ (JACK BELDEN) انقلاب چین کے ضمن میں لکھتا ہے کہ

> کمیونسٹوں کے ہاں جمہور کا لفظ کچھ عجیب باطنی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے خاقانِ چین اپنے آپ کو آسمان کا بیٹا کہا کرتا تھا۔ اب چین کے کمیونسٹ اپنے آپ کو جمہور کا بیٹا کہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اب خدا کی جگہ جمہور نے لے لی ہے اور خاقان کی جگہ کمیونسٹوں نے۔ خاقان اس لئے حکومت کرتا تھا کہ اس کے پاس آسمانی سند تھی۔ اب کمیونسٹ اس لئے حکومت کرتے ہیں کہ ان کے پاس جمہور کی سند ہے۔۔۔ کمیونسٹ کہتے ہیں کہ جمہور کبھی غلطی نہیں کرسکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "ہم جو جمہور کے نمائندے ہیں، کبھی غلطی نہیں کرسکتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (۱۱)

بہرحال یورپ میں یہ نظریہ عام ہوچکا ہے کہ "وجودِ حقیقی" اسٹیٹ (سوسائٹی، نیشن) کا ہے اور فرد کی ہستی، اسٹیٹ (سوسائٹی) کے قیام کا ذریعہ ہے، مقصود بالذات نہیں۔ اگر اسٹیٹ کا استحکام افراد کے زندہ رہنے سے ہوتا ہے تو انہیں زندہ رکھا جائے گا۔ اور اگر اس کے لئے ان کی جان کی ضرورت ہے تو انہیں جان دینی ہوگی۔ یہ اصول ہر جگہ کارفرما ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض مملکتوں میں حکومت کو اس سے واسطہ نہیں ہوتا کہ افراد پر کیا گزر رہی ہے اور وہ اپنے دن کیسے کاٹ رہے ہیں اور بعض مملکتوں میں جنہیں (WELFARE STATES) کہا جاتا ہے، حکومت کا فریضہ قرار دیا جاتا ہے کہ وہ افراد کی طبیعی ضروریاتِ زندگی کی دیکھ بھال کرے۔ لیکن یہ دیکھ بھال بھی اسی انداز کی ہوتی ہے جس انداز کی دیکھ بھال "قربانی کے بکرے" کی کی جاتی ہے۔ ان افراد کی صحت، توانائی وغیرہ کی فکر اس لئے کی جاتی ہے کہ اس سے اسٹیٹ مضبوط ہوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے ان کی پیداوار کی "استعداد" بڑھتی ہے[1] یعنی وہ اچھی مشینیں بن جاتے ہیں۔

قرآنی نظریہ

قرآن، فرد کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس کا ارشاد ہے کہ جس نے ایک فرد کو ضائع کر دیا تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسانی کو تلف کر دیا! اور جس نے ایک فرد کی زندگی کا سامان

---

[1] میں نے مشہور روسی کمیونسٹ (M.D. KAMMARI) کی کتاب (SOCIALISM AND INDIVIDUAL) کا بڑے شوق سے مطالعہ کیا اس لئے کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ سوشلزم کے نظام میں ایک فرد کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے اور فرد کی پرورش سے ان کے ہاں مقصود کیا ہے۔ لیکن مجھے اس سے بڑی مایوسی ہوئی۔ اگرچہ اس میں ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "اشتراکی سوسائٹی کا مطمحِ نگاہ فرد کی جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کی تکمیل ہے"۔ لیکن اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ افراد کی کام کرنے کی استعداد کو زیادہ سے زیادہ بڑھا دینا مقصود ہے تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو۔ "روحانی" کی تفصیل کچھ نہیں بتائی۔ (P – 48)

ہم پہنچا دیا تو یوں سمجھو فَکَاَنَّمَآ اَحۡیَا النَّاسَ جَمِیۡعًا ۔ (۵/۳۲) جیسے اس نے تمام نوعِ انسانی کو زندگی بخش دی۔ اس کی ساری تعلیم فرد کی ذات (PERSONALITY) کی نشو ونما اور استحکام کے لئے ہے۔ اس کی یہ تعلیم کہ ہر فرد اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اس کے اعمال کا نتیجہ اس کی اپنی ذات کے لئے، استحکامِ انفرادیت (INDIVIDUALITY) کی زندہ دلیل ہے (فَمَنۡ اَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِہٖ وَمَنۡ عَمِیَ فَعَلَیۡهَا ۔ ۶/۱۰۴) فرد کی تکمیل ذات ہی اس کی تعلیم کا منتہیٰ ہے۔ اس لئے کوئی ایسا نظریہ ایسا تصور، ایسا مسلک، ایسا مذہب، جس میں فرد کی انفرادیت میں کمی واقعہ ہو جائے اور اس کی ذات میں اضمحلال پیدا ہو جائے۔ اس کے نزدیک مردود و مطرود ہے۔ بقول اقبالؒ

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگیزِ وجودِ من
باین قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانے را

لیکن وہ کہتا ہے کہ فرد کی ذات کی تکمیل، جماعت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ جماعت کے ساتھ رہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ ۔ (۹/۱۱۹)

اے ایمان والو! قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رہو۔ (اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ) جو لوگ اس صداقت پر ایمان رکھتے ہیں ان کے ساتھ رہو۔

وہ کہتا ہے کہ انسان کی ذات تباہی اور بربادی سے اسی صورت میں محفوظ رہ سکتی ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کا جزو ہو جس کے افراد ایک دوسرے کو تعمیری نتائج مرتب کرنے کی تلقین کریں۔ اور ایک دوسرے کی ثابت قدمی کا موجب بنیں۔ (وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ۱۰۳/۳) سارا قرآن اسی تعلیم کا حامل ہے۔ لہٰذا قرآن کی رو سے جماعت ذریعہ ہے فرد کی تکمیلِ ذات کا۔ یعنی یورپ میں فرد ذریعہ ہے اور سوسائٹی مقصود۔ اس کے برعکس قرآنی تعلیم کی رُو سے سوسائٹی ذریعہ ہے اور فرد مقصود۔" اقبالؒ کے الفاظ میں" فرد اور جماعت کا تعلق 'مسافر اور قافلہ کا ہے'۔

زندگی انجمن آرا و نگہدارِ خود است
ایکہ در قافلہ باہمہ رو بے ہمہ شو

اسی لئے قرآنی نظامِ ربوبیت میں افراد کو ایک قافلہ کی شکل میں ترتیب دیا جاتا ہے جس کا مقصود ہر مسافر کو اس کی

---

[1] اسی لئے حضورِ نبی اکرم کو مزمّل کہہ کر پکارا گیا ہے جس کے معنی بہترین سالارِ کارواں کے ہیں۔

منزل تک پہنچانا ہوتا ہے جو قافلہ افرادِ کارواں کو ان کی منازل تک نہیں پہنچاتا، وہ قافلہ نہیں۔ رہزن اور قزاق ہے۔ قرآن نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (۳/۲۰۰)

اے ایمان والو! خود بھی مستقل مزاج اور ثابت قدم، اور دوسروں کے ثابت قدم رہنے کا ذریعہ بنو۔ اس طرح سفرِ زندگی میں ایک دوسرے کے محافظ ہو اور سب مل کر قانونِ خداوندی سے ہم آہنگی اختیار کرو تاکہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں۔

یعنی اس تمام اجتماعی عمل کا مقصد یہ ہے کہ (لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔) تمہاری ذات کا ننھا سا بیج نشوونما پا کر کھیتی بن جائے۔ جس معاشرے میں افراد کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پا کر تکمیل تک نہیں پہنچتیں وہ معاشرہ باطل کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اور اس کا افراد سے اپنی اطاعت کا مطالبہ یکسر استبداد۔ جو معاشرہ حق کی بنیادوں پر قائم ہوگا، وہ افراد کی ذات کی نشوونما کا ذریعہ بنے گا۔ اُن سے اپنے لئے کچھ نہیں چاہے گا۔

اس نظریے کے ماتحت کہ فرد کی ہستی کچھ نہیں، ہستی صرف سوسائٹی کی ہے۔ پارٹی بنانا بہت آسان ہے۔ اس کے لئے قوت کی ضرورت ہے جو پارٹی کے "ڈسپلن" کو برقرار رکھ سکے۔ یہ پارٹی نہیں ہوتی درحقیقت فوجی نظام ہوتا ہے۔ جس میں افراد کی حیثیت سپاہیوں کی اور اربابِ اقتدار کی حیثیت ان کے کمانڈر کی ہوتی ہے۔ سپاہی کا کام حکم کی تعمیل کرنا ہوتا ہے اور بس۔ نہ اس کی کوئی رائے ہوتی ہے نہ فکر۔ نہ اس سے مشورہ لیا جاتا ہے نہ اس کی منشا دریافت کی جاتی ہے۔ بہترین سپاہی وہ ہے جس میں "میں" کا احساس یکسر ختم ہو چکا ہو۔ جس میں یہ احساس ذرا بھی باقی ہو اسے کچل دیا جاتا ہے۔ اور تو اور، چین ممالک میں دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ وہاں سلطانی جمہور (PEOPLE'S GOVERNMENT) ہے، وہاں بھی یہ عالم ہے کہ کوئی فرد اپنی انفرادیت کا احساس تک نہیں رکھ سکتا۔ (مثلاً) چین میں اس اندازِ حکومت کا آغاز ہمارے دور میں ہوا ہے (JACK BELDEN) جو انقلابِ چین سے بے حد متاثر ہے اور اسے قدرت کا معجزہ قرار دیتا ہے، اس باب میں رقمطراز ہے کہ:-

> وہاں کمیونسٹوں کی کوشش یہ ہے کہ سوسائٹی کے حقوق کو افراد کے حقوق پر غالب قرار دے کر ملک کی وحدت قائم رکھی جائے اگر تم نے کبھی اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کر دیا تو یہ جرم عظیم ہوگا۔ تمہیں محاسبۂ نفس کرنا ہوگا۔ تمہیں سوسائٹی کے جلسہ میں جا کر اپنے آپ کو تنقید کے لئے پیش کرنا ہوگا۔ تمہیں اپنی غلطی کا اعتراف کرنا ہوگا۔ (۱۲)

یعنی کمیونزم کے نظام میں معاشرہ افراد کی پرورش تو کرتا ہے لیکن اُن کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) کو ذبح کر ڈالتا ہے۔ قرآن نے بھی اس قسم کے "نظامِ پرورش" کا ذکر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ فرعون کا دعویٰ یہ تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹/۲۴)

"میں سب سے بڑھ کر تمہاری پرورش کرنے کا انتظام کرنے والا ہوں"۔ اس نے مصر کی تمام زمین اور اس کے دریاؤں کو قبضے میں لے رکھا تھا۔ (۴۳/۵۱)۔ یہی وہ "پرورش کے احسانات" تھے جنہیں اس نے (حضرت) موسیٰؑ کو جتایا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کے ایک جواب نے فرعونی ربوبیت اور خدائی ربوبیت کے بنیادی فرق کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶/۲۲) یہ تمام سامانِ نشوونما جن کا تو احسان جتاتا ہے، محض اس لئے ہے کہ تو بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنائے رکھے۔ ان کی تمام قوتوں کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرے۔ انہیں اپنے مقاصد میں جتے رہنے کے لئے تیار کرے۔ ان کی مردانگی کے تمام جوہر ختم کر دے (یذبحون ابناء ھم) اور ان کی نسائیت کے خصائص کو زندہ رہنے دے (و یستحیون نساء ھم) ان کی تعلیم بھی اپنی مرضی کے مطابق کرے اور ان کی تربیت بھی اپنے مفاد کے حصول کی خاطر اور اس طرح ان کی انفرادیت کو ذبح کر ڈالے۔

یہ ہے "ربوبیت" (پرورش) کا فرعونی نظام جس میں حکومت، یا نظامِ پیداوار کے ذرائع کو اپنی ملکیت میں لے لیتا ہے تاکہ افراد کو مطلب براری کے لئے بطور راست یا استعمال کرے۔ اس نظامِ پرورش میں، جس کا نام کچھ ہی رکھ لیا جائے (سوسائٹی، نیشن، اسٹیٹ، جمہور) فرد اپنی حیثیت کچھ نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس نظامِ ربوبیت میں، جماعت کی تشکیل ہی اس لئے کی جاتی ہے کہ فرد کی انفرادیت کامل طور پر نشوونما پاسکے۔ غور کیجئے کہ یہ مرحلہ کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ نظام کے استحکام کا تقاضا ہوتا ہے کہ پورا پورا نظم و ضبط قائم رکھا جائے اور دوسری طرف افراد کی ذات کی نشوونما اور انفرادیت کی پرورش کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کی حریتِ فکر اور آزادئ رائے کو زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جائے۔ ان دو متضاد تقاضوں میں امتزاج پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ یہی وہ اہم مرحلہ تھا جس کے متعلق نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ (اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۔ ۷۳/۵) تم پر ایک بہت بڑی ذمہ داری، ایک گراں بار فریضہ عائد کیا جا رہا ہے۔ وہ ذمہ داری جس سے "آپؐ کی کمر ٹوٹ رہی تھی"! (وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۔ ۹۴/۳) (اس کتاب کا یہ موضوع نہیں اور نہ ہی اس کی یہاں گنجائش ہے۔ ورنہ آپ کو تفصیل سے بتایا جاتا کہ حضورؐ نے اس کمر شکن ذمہ داری کو کس حسن و خوبی سے نباہا اور اس طرح، جس معاشرہ کی تشکیل کی[1]، اس میں یہ دونوں متضاد عناصر کس طرح شیر و شکر ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ نظام کا نظم و ضبط (ڈسپلن) ایسا کہ اس کی مثال شاید ہی کہیں اور ملے اور اس کے ساتھ افرادِ معاشرہ کی حریتِ فکر و آراء کا یہ عالم کہ فرزندانِ آدم میں سے شاید ہی کسی کو ایسی آزادی نصیب ہوئی ہو۔ اس کا امکان صرف قرآنی نظامِ ربوبیت ہی میں ہے۔ اس کے سوا اس کی کوئی دوسری شکل نہیں۔ یہی وہ نظام ہے جس میں "حاکم و محکوم" کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور تمام افرادِ معاشرہ کا

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "معراج انسانیت"

باہمی تعلق رفقائے کار کا رہ جاتا ہے جن میں باہمی نظم وضبط کا ذریعہ وہ قانون ہوتا ہے جو ان میں سے کسی کا خودساختہ نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس کے مطابق معاشرہ کا نظم وضبط بھی قائم رہتا ہے اور افراد کی ذات کی تکمیل بھی ہوتی جاتی ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، اب دنیا آہستہ آہستہ زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، ازخود، ان اصولوں کی طرف آرہی ہے جنہیں قرآن نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں بھی اب دنیا کا قدم اسی طرف اٹھ رہا ہے۔ اسی یورپ سے جہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ سب کچھ معاشرہ ہی ہے، فرد کی حیثیت کچھ نہیں، اب یہ آوازیں بھی اٹھ رہی ہیں کہ اصل مقصود فرد ہے اور اور اس کی ذات کی تکمیل ہی مقصودِ معاشرہ ہے۔ ۱۹۴۱ء میں کولمبیا یونیورسٹی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی کہ وہ غور کرے کہ "اندازِ جمہوریت کے ساتھ سائنس، فلسفہ اور مذہب کا کیا تعلق ہے" وہ کانفرنس جس نتیجہ پر پہنچی وہ یہ تھا کہ:-

اصول بس ایک ہی ہے یعنی احترامِ آدمیت۔ انسانی ذات کی قدر۔ دنیا کی تعمیرِ نو صرف اسی ایک اصول پر ہو سکتی ہے۔ انسانی ذات جس احترام کی مستحق ہے اگر اس میں ذرا بھی کمی روا رکھی گئی اور بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے سیاسی اور اقتصادی مفاد کا آلۂ کار بنتے دیا گیا تو مہذب زندگی کی ساری عمارت نیچے آگرے گی۔ انسانی تہذیب و ثقافت کی عمارت صرف احترامِ ذات کے ستون پر قائم رہ سکتی ہے۔ (۱۲۸)

الیگزنڈر لوڈے (ALEXANDER LOVEDEY) جو "لیگ آف نیشنز" کے شعبۂ مالیات و اقتصادیات کا ڈائرکیٹر رہ چکا ہے، لکھتا ہے کہ:-

صداقت کا معیار "زندگی" ہونا چاہیئے۔ فرد کی زندگی، فرد جو مقصود بالذات ہو۔ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہ ہو۔ (۱۳)

(M. ARTIN BUBER) لکھتا ہے کہ:-

جب انسان اپنے آپ کو ایک مثبت حقیقت کے طور پر "میں" نہیں کہہ سکتا، وہ خدا کو "تو" بھی نہیں کہہ سکتا۔۔۔۔
۔۔۔۔ جو آواز کا جواب نہیں دے سکتا وہ آواز سننے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔۔۔۔۔ انسان ہی ہستی کے امکانات کی منجمد شکل ہے۔ یہی کائنات کی ہر حیرت کا مرکز ہے۔۔۔۔۔ اصل یہ ہے کہ ابھی تک یہ حقیقت پردے سے باہر ہی نہیں آئی کہ کائنات میں انسان کا صحیح مقام کیا ہے[۱]۔ (۱۴)

---

[۱] "پردے سے باہر" تو چودہ سو سال ہوتے آچکی تھی لیکن اس کے مجرم ہم (مسلمان) ہیں کہ ہم نے اس حقیقت کو دوسروں تک پہنچایا نہیں۔ دوسروں تک پہنچانا تو ایک طرف اسے خود ہم نے اپنے خود ساختہ مذہب کے دبیز پردوں میں اس طرح چھپا دیا کہ نظریں، مشیّت کو بھی، کہ یہ کوئی قابلِ ذکر شے ہی نہ تھی۔

(ERNST CASSIRER) لکھتا ہے کہ:-

انسان کی قیمت خارجی اور اضافی چیزوں سے نہیں متعین کی جاسکتی۔ اس کی اصل قیمت اس کی اپنی ذات ہے۔ (۱۵)

(LEWIS MUMFORD) ٹالسٹائی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:-

ہر فرد میں انسانیت کی تمام ممکنات کا بیج موجود ہے۔ (۱۶)

اس لئے معاشرہ کا کام یہ ہے کہ وہ ممکنات کے اس بیج کو حقیقت کا جیتا جاگتا شجرِ ثمردار بنا دے۔ معاشرے کا یہی مقصد ہے اور اسی لئے اس کی ضرورت ہے۔ ممفورڈ کے الفاظ میں:-

انسان کو اپنی پوری قامت تک پہنچنے کے لئے عالمگیر معاشرہ کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ (۱۷)

(NICOLES BERDYAEU) فرد اور معاشرہ کے تعلق کے ضمن میں لکھتا ہے

قدرِ اعلیٰ انسانی ذات ہے معاشرہ نہیں ...... ہر ذات اپنی دنیا آپ ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ذات دنیا کی تاریخ اور کائنات کی فکر کے امکانات کو اپنے اندر لئے ہوتے ہے۔ اگر معاشرہ کا یہ مطالبہ ہے کہ انسان میں جس قدر خوبیاں اور صلاحیتیں ہیں، وہ اس کی عطا کردہ ہیں اس لئے انسان کو چاہیئے کہ وہ ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کو معاشرے کے حضور پیش کر دے تو یہ غلامی کی بدترین شکل ہے ...... انسانی ذات معاشرہ کا جزو نہیں ہوتی۔ اسے معاشرہ کے اندر ضم نہیں ہونا چاہیئے .... یہ عجیب تماشا ہے کہ انسان خود ہی معاشرے کی تخلیق کرتا ہے اور خود ہی اس سے مسحور ہو کر اس کی محکومیت اختیار کر لیتا ہے .... یاد رکھیے کہ ایک انسان کی موت خواہ وہ کیسا ہی حقیر انسان کیوں نہ ہو، مملکتوں اور سلطنتوں کی موت سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے ..... ایک مکمل مملکت وہ ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر اپنا حکم نہ چلا سکے ..... کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسروں پر اپنا اقتدار قائم کرے۔ نہ فرد کو، نہ افراد کی کسی جماعت کو، نہ تمام کی تمام قوم کو۔ قوت کا استعمال انسان کی حفاظت کے لئے ہے۔ (۱۸)

فرد اور معاشرہ کے تعلق کی نسبت پروفیسر (CASSIRER) لکھتا ہے۔

(اس میں شبہ نہیں کہ ایک فرد اپنی ذات کا احساس صرف معاشرہ کے اندر ہی کر سکتا ہے اور اس طرح معاشرہ اس کے شعورِ ذات کا ذریعہ بنتا ہے لیکن یہ ذریعہ ایک خارجی قوت نہیں ہوتا۔ انسان بھی حیوانات کی طرح معاشرہ کے قوانین کا اتباع کرتا ہے۔ لیکن حیوانات کے برعکس، اس میں اس کی قوت بھی ہے کہ یہ معاشرہ کو بدل ڈالے۔ (۱۹)

ل؎ فرد اور مملکت کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں مزید تفصیل، میرے اس خطاب میں ملے گی جو اسی عنوان سے طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔

جس معاشرہ میں فرد کی ذات کا احترام نہیں ہوتا (جیسا کہ ہم "اسٹیٹ کے تصور میں پہلے دیکھ چکے ہیں) وہ فرد کی کام کی استعداد کو تو بڑھاتا ہے (کیونکہ اس نے فرد سے کام لینا ہوتا ہے) لیکن اس کی قوتِ ارادی کو کچلتا رہتا ہے (تاکہ وہ جانوروں یا مشین کی طرح بلا چون وچرا اطاعت کرتا چلا جائے) اس سے تکمیل ذات کبھی نہیں ہو سکتی۔ تکمیلِ ذات کے لئے استعداد اور قوتِ ارادی دونوں کی نشوونما ضروری ہے۔ چنانچہ اس باب میں علمِ تجزیۂ نفس کا ماہر (WILHELM STEKEL) کہتا ہے۔

جہاں قوتِ ارادی اور استعداد ہم آہنگ ہو جاتی ہیں وہاں شخصیت قوی نظر آتی ہے۔ (۲۰)

آپ نے غور کیا کہ اب خود مغرب کے مفکرین، کس طرح انسانی ذات کی قدر و قیمت اور احترامِ آدمیت کا اعتراف کرتے جا رہے ہیں؟

(•)

یہ ہیں وہ بنیادیں جن پر قرآن نظامِ ربوبیت کی عمارت استوار کرتا ہے۔ یہی بنیادیں اس کے لئے قوتِ محرکہ بن جاتی ہیں اور انہی کے زور دروں سے یہ عمارت بلند سے بلند تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ نہ یہ محض تجریدی تصورات ہیں جن کا انسان کو کوئی احساس نہ ہو سکے یا جو اس کی عملی زندگی سے غیر متعلق ہوں اور نہ ہی ان میں کسی فریب خوردگی کا امکان ہے۔ ان سے انسان کی عملی زندگی میں زندہ نتائج پیدا ہوتے ہیں اور یہی زندہ نتائج ان کے پرکھنے کا معیار ہیں۔ اس مقام پر اس حقیقت کو بھی دہرا لینا چاہیئے کہ قرآنی نظامِ ربوبیت کا مقصود و منتہیٰ صرف اتنا نہیں کہ معاشرہ کے تمام افراد کی طبیعی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی جائیں۔ جیسا کہ متعدد مقامات پر لکھا جا چکا ہے۔ یہ مقصد تو بڑا ابتدائی اور سطحی ہے بلکہ یوں کہیئے کہ یہ مقصد ہی نہیں، مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اصل مقصد انسانی ذات کا ارتقاء ہے جو ربوبیتِ عامہ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ پرنسپل کیئرڈ اس باب میں لکھتا ہے:۔

سب کچھ کہہ چکنے کے بعد، یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ معاشرہ کے لئے ایثار، محبت اور بہبودِ دیگراں کا جذبہ، خواہ وہ اس حد تک بھی کیوں نہ چلا جائے کہ انسان اس میں مفادِ خویشتن کو کھلا دے ـــــ بلکہ فنا کر دے، اتنا ہی کر سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک مسلسل ترقی کرنے والی حیات سے متعارف کرا دیتے ہیں۔ صرف اتنے سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنے آپ کو ایک لامتناہی کل سے ہم رنگ کر سکیں۔ ایک فرد ایثارِ نفس سے اپنے آپ کو خاندان، مملکت یا تمام نوعِ انسانی کی طبیعی زندگی میں جذب کر سکتا ہے، لیکن یہ زندگی خود غیر مکمل ہوتی ہے۔ (اس کی ذات کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس حقیقت پر ایمان رکھے کہ) اس طبیعی زندگی سے ماوراء ایک اور زندگی ہے اور یہ خاندان، مملکت اور بستری سب اس زندگی کے مظاہر ہیں۔ یہ زندگی اصل مقصود ہے۔ (۲۱)

یہ ہے حیاتِ جاوداں اور مستقل اقدار کے سرچشمۂ حقیقی پر وہ ایمان جس کی بنیادوں پر قرآن کے نظامِ ربوبیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ لہٰذا، یہ نظام محض معاشرہ کے افراد میں تقسیمِ رزق کا طریق کار نہیں، ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ قرآنی نظامِ ربوبیت میں تقسیمِ رزق سے مراد مادی ضروریاتِ زندگی کی یکسانیت (SAMENESS) نہیں۔ یعنی اس سے یہ مراد نہیں کہ انسانوں کو مشین سمجھ کر سب کے لئے ایک جیسی خوراک، ایک جیسا لباس، ایک جیسے مکان اور ایک جیسا سامان تجویز کر دیا جائے۔ اس قسم کی زندگی جیل خانے کی زندگی ہوگی۔ اس قسم کی یکسانیت سے تو عملِ تخلیق رُک جاتا ہے اور انسانی زندگی کی لوح ختم ہو جاتی ہے۔ رسل کے الفاظ میں:-

> صرف مساوات کسی معاشرہ کو بہتر نہیں بنا سکتی۔ جس معاشرہ میں تمام غلام ہوں وہاں بھی مساوات ہوتی ہے اور جس میں تمام آزاد ہوں وہاں بھی مساوات ہوتی ہے۔ (۲۲)

قرآن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرہ میں زیادہ سے زیادہ آزادی قائم رکھی جائے۔ اور چونکہ آزادی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ انسان ضروریاتِ زندگی کے لئے پریشان نہ ہو، اس لئے تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کی ضمانت وصیانت معاشرہ اپنے ذمے لے لے۔ اس اصول کے ماتحت، مختلف افراد کے ذوق کے تنوع اور اشیائے ضرورت کے انتخاب اور استعمال پر کوئی پابندی نہیں ہوگی (بجز اس پابندی کے جسے قرآن نے حرام سے تعبیر کیا ہے) یعنی تمام حلال وطیب اشیاء سے متمتع ہونا اور اس میں انسانی ذوقِ تحسین کا لحاظ رکھنا، مقصودِ نظامِ ربوبیت ہے۔ قرآن نے حلال کے ساتھ طیب (خوشگوار) کا اضافہ کر کے اس عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اس میں انفرادی ذوق کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا۔ نیز اس نے "جنت" کے متعلق کہا ہے کہ وَهُمْ فِي مَا اشْتَهَتْ أَنْفُسُهُمْ۔ (۲۱/۱۰۲) "انہیں وہ کچھ ملیگا جسے ان کا دل چاہے گا"، تو اس میں اس انفرادی ذوق و انتخاب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس جنت میں انفرادی ذوق کی تسکین کا سامان نہ ہو وہ جنت نہیں، جہنم ہے۔

کمیونزم اور اسلام

آگے بڑھنے سے پہلے، اس حقیقت کا دہرا دینا ضروری ہے کہ کمیونزم صرف ایک معاشی نظام نہیں۔ وہ ایک فلسفۂ زندگی ہے جس پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام بھی ایک فلسفۂ زندگی

رکھتا ہے جس پہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی عمارت اٹھتی ہے۔ ان میں اس کا معاشی نظام بھی شامل ہے۔ کمیونزم کا فلسفۂ زندگی، اسلام کے فلسفۂ زندگی کی یکسر نقیض ہے۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ کوئی کمیونسٹ (یعنی کمیونزم کے فلسفۂ حیات کو ماننے والا) کبھی مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اور کوئی مسلمان، کمیونسٹ نہیں ہوسکتا۔ اگر کمیونزم کے معاشی نظام اور اسلام کے معاشی نظام میں کچھ مماثلت بھی نظر آئے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ کمیونزم اور اسلام ایک ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اسلام اپنا منفرد نظامِ حیات رکھتا ہے جس کا متبادل کوئی نظام نہیں۔ نہ ہی وہ دنیا کے کسی نظام سے مفاہمت کرسکتا ہے۔

P.144 (1) The Two Sources of Morality and Religion. p.60

P.145 (2) UNESCO Committee Report

P.153 (3) Sigmund Freud, in, Civilisation, War And Death. pp.10-11

P. 154 (4) Quoted by E.H.Carr, in, The New Society, p.60

P. 156 (5) P.D.Ouspensky, - in, In Search of The Miraculous, p.309

P. 156 (6) -do- in, Tertium Organum. p.198

P. 157 (7) -do- in, In Search of the Miraculous. p.231

P. 162 (8) Yvos R. Simons, in, Philosophy of Democratic Government,

P.165 (9) Alduous Huxley, in, Ends And Means. p.97

(10) J.M.Murray, in, Adam and Eve. p.67

P.166 (11) Jack Beldon, in, China Shakes The World. pp.504-505

P.168 (12) -do- p.489

P.170 (12A) Quoted by Howard Selson, in, Socialism And Ethics. p.203

(13) The Only Way. p.4

(14) Between Man And Man. pp.43;45;78

P.171 (15) An Essay On Man. p.7

(16) The Conduct Of Life. p.254

(17) Lewis Mumford, in, The Conduct Of Life. p.275

(18) Nicolas Berdyaev, in, Slavery And Freedom. pp.28;40;102;103;144;147;150

(19) An Essay On Man. p.223

P.172 (21) John Caird, in, An Introduction To The Philosophy Of Religion. p.279

(20) Peculiarities of Behaviour. p.325

P.173 (22) Bertrand Russell, in, Authority And The Individual. p.180

نواں باب

کشمکش

یہ تھا وہ اسلام جسے نبی اکرمؐ لے کر آئے اور یہ تھا وہ نظام جس کی تشکیل کے لئے حضورؐ نے اپنی دعوت پیش کی۔ یہ دعوت پیش کی اس معاشرے میں جس میں "انسانوں کے خودساختہ آئین وضوابط کی بنا پر ہر جگہ ناہمواریاں ہی ناہمواریاں تھیں" (۳/۴۱) ایسے معاشرہ میں اس قسم کی دعوت، فی الحقیقت ایک بہت بڑے انقلاب کی دعوت تھی۔ حضورؐ کے اولین مخاطب مکہ کے تاجر (قریش) تھے۔ اور ان کی تجارت کا یہ عالم تھا کہ سردی گرمی ان کے تجارتی قافلے مسلسل اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر سرگرمِ سفر رہتے تھے۔ (۱۰۶/۱-۲)۔ ان کی اس تجارت کے ڈانڈے مذہب سے مل گئے تھے، اس لئے کہ قریش ہی کعبے کے متولّی تھے اور اس کی وجہ سے معاشرے میں انہیں خاص مقام حاصل تھا۔ اس مقدس مقام کا اثر تھا کہ ان صحراؤں میں جہاں دوسرے لوگوں کی سوئی تک بھی محفوظ نہیں رہ سکتی تھی، قریش کے قافلوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ (۲۹/۶۷) پھر یہی لوگ اپنی قوم کے سردار بھی تھے۔ حکومت، دولت اور مذہبی پیشوائیت وہ قہرمانی قوتیں ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک بھی انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے کم نہیں ہوتی۔ لیکن جہاں یہ تینوں قوتیں ایک جگہ اکٹھی ہو جائیں وہاں نخوت و تکبّر اور فرعونیت و تمرّد جس شدّت کے ساتھ کارفرما ہو گی، اس کا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ یہ تھے وہ قریش جن کے سامنے حضورؐ نے یہ دعوت پیش کی کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے

رسول اللہؐ کی دعوتِ انقلاب

انسان پر فوقیت حاصل نہیں۔ پیدائش کے اعتبار سے ہر فرزندِ آدم یکساں واجب التکریم اور ایک ہی سطح پر ہوتا ہے۔ کسی انسان کو یہ حق

حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے اور اس سے اپنے فیصلے منوائے۔ تمام انسان ایک ہی قانون کے محکوم ہیں۔ اور وہ قانون انسانوں کا نہیں بلکہ خدا کا متعین فرمودہ ہے۔ کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ دولت کے انبار جمع کرتا ہے اور اس طرح رزق کے ان سرچشموں کو اپنی ملکیت بنالے جنھیں خدا نے نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ دنیا میں مذہبی پیشوائیت کا تصوّر بھی باطل ہے۔ خدا ہر انسان سے یکساں فاصلے پر ہے اور اس کے اور انسانوں کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں۔ نہ کوئی وسیلہ اور واسطہ۔ انسانوں سے اس کا تعلق اس وحی کی رو سے ہے جو اس نے اپنے رسول کی وساطت سے بھیجی ہے اور یہ وحی تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں ضابطۂ ہدایت ہے۔

آپ سوچیئے کہ قریش کے اس معاشرے میں اس دعوتِ انقلاب کا کیا اثر ہوا ہوگا اور اس کے خلاف قریش کا ردِّ عمل کیا ہوگا؟ اس ردِّ عمل کو اقبالؒ نے نوحۂ ابوجہل کی شکل میں بیان کیا ہے جو اس نے کعبے کا غلاف تھام کر لات و منات کے سامنے اس درد و کرب سے پیش کیا تھا۔

سینۂ ما از محمّد داغ داغ　　از دمِ او کعبہ را گُل شد چراغ

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب　　از قریش و منکر از فضلِ عرب

در نگاہِ او یکے بالا و پست　　با غلامِ خویش بر یک خواں نشست

قدرِ احرارِ عرب نشناختہ　　با کلفتانِ حبش در ساختہ

احمراں با اسوداں آمیختند　　آبروئے دودمانے ریختند

ایں مساوات، ایں مواخات اعجمی است　　خوب میدانم کہ سلماں مزدکی است

اس لئے۔

اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر　　خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر

اے منات اے لات ازیں منزل مرو　　گر ز منزل می روی از دل مرو

شروع شروع میں انہوں نے حضورؐ کی اس دعوت پر زیادہ سنجیدگی سے توجّہ نہ دی۔ کسی نے کہا کہ یہ (معاذ اللہ) پاگل ہوگیا ہے۔ کسی نے کہا کہ اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ کوئی بولا کہ اس قسم کے خیالات محض شاعری ہے، زمانہ کی گردش اسے خود ختم کر دے گی، اس لئے اس کا نوٹس ہی نہیں لینا چاہیئے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ آواز صدا بصحرا نہیں، بلکہ آہستہ آہستہ جڑ پکڑتی جارہی ہے تو انہیں اس کی طرف سے تردّد پیدا ہوا۔ اب انہوں نے اسکی مخالفت شروع کی اور جوں جوں یہ آواز زیادہ مؤثر ہوتی گئی ان کی مخالفت بھی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ یہ

مخالفت

مخالفت اس زمانہ میں اپنی انتہا تک پہنچ گئی جسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ اس وقت حالت کیا تھی۔ مخالفت کی تمام قوتیں چاروں طرف سے ہجوم کر کے آگئی تھیں۔ اُن کے پاس دولت تھی، طاقت تھی، جمعیت تھی، اثر ورسوخ تھا۔ کعبے کی تولیت تھی، اپنی سرداری تھی۔ ان کے مقابلے میں یہ ایک مختصر سی جماعت تھی جن میں اکثر و بیشتر غریب و نادار تھے۔ بیکس و بے بس تھے۔ کمزور ولاچار تھے اور یہ ماحصل تھا نبی اکرمؐ کی تیرہ برس کی مسلسل جدوجہد کا۔ اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قریش اور انکے متعلقین میں سے جس جس کے اندر اس دعوت کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی، وہ سب (ان میں سے چھٹ کر) ایک ایک کر کے ادھر آچکے تھے اور باقی وہی رہ گئے تھے جنھوں نے اس دعوت کی ہر ممکن مخالفت کرنی تھی۔ یہ مخالفت بھی اپنی انتہائی شدت تک پہنچ رہی تھی۔ ان کے ارادے یہ تھے کہ کسی نہ کسی طرح اس تحریک کو ختم ہی کر دیا جائے۔ لہٰذا، اب اس جماعت کی تجویز یہ تھی کہ اس علاقے کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے چلیں جہاں کی فضا اس نظامِ نو کی تشکیل کے لئے زیادہ سازگار ہو (اسی کو ہجرت کہا جاتا ہے)۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہاں کی زمین اب ان پر آسمان سے بھی زیادہ گراں ہو چکی تھی۔ لیکن بایں ہمہ اپنے آباء واجداد کے وطن کو چھوڑنا، گھربار کو چھوڑنا، اعزہ واقربا کو چھوڑنا، ہر قسم کی کشش وجاذبیت کو چھوڑنا، معاشی وسائل کو چھوڑنا اور ان سب کو چھوڑ کر ایک ایسی جگہ جانا جہاں مستقبل کی کوئی شے بھی متعین نہ تھی۔ بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا۔ مشکلات ومصائب کے اس تمام ہجوم کا مقابلہ کرنے کے لئے اُن کے پاس اگر کوئی ساز وسامان تھا تو فقط یہ یقین کہ ہم جس دعوت کو لے کر اٹھے ہیں، وہ حق وصداقت پر مبنی ہے۔ اس لئے ہماری کوششیں یقیناً نتیجہ خیز اور بارآور ہو کر رہیں گی۔ لیکن سوچئے کہ اس یقین کے لئے بھی کتنے بڑے قلبِ محکم کی ضرورت تھی۔ یہ جس دعوت کو لے کر اٹھے تھے۔ وہ ایک بالکل نئی تحریک تھی۔ دنیا جہان سے نرالی دعوت۔ ایسی دعوت جس میں معاشرہ کے تمام مسلمہ اقدار اور متوارث.... عقائد کو یکسر الٹ کر رکھ دینا تھا اور ان کی جگہ ایک جدید معاشرہ کی تشکیل ان اقدار کی رُو سے کرنی تھی جنھیں اس سے پیشتر انہوں نے کبھی آزمایا نہیں تھا۔ انہیں ان اقدار کے اَن دیکھے نتائج پر یقین تھا (ایمان بالغیب)، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی تحریک کے اَن دیکھے نتائج پر یقین محکم رکھنے کے لئے فی الواقعہ بڑے عزم وثبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تھا ہجرت سے پہلے کا وہ دور جس میں حالات کی نزاکت اس انتہائی نقطہ تک جا پہنچی تھی۔ اس وقت بڑی ضرورت تھی کہ کمزوروں اور ناتوانوں کی اس مختصر سی دکھی ہوئی جماعت کی ہمت بندھائی جائے۔ ان کے حوصلوں کو پست نہ ہونا دیا جاتے۔ آپ قرآن کے آخری پارہ کی آخری (چھوٹی چھوٹی) سورتوں کو دیکھئے۔ ان میں اس کشمکش کا پورا پورا نقشہ سامنے آجائے گا۔ کہیں قریش سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے ساز وسامان اور دولت وقوت کے نشے میں مست ہو کر سمجھ رہے ہو کہ کوئی تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہے، لیکن تم نے ابھی کل اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ یمن کے اس لشکرِ جرار کا کیا حشر ہوا تھا جو ہاتھی لے کر چڑھ آیا تھا۔ تم نے دیکھا کہ ان کی تمام خفیہ تدبیریں کس طرح

ناکام رہ گئیں اور وہ سب کے سب تباہ و برباد ہو گئے (کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ۔ ۱۰۵/۵) اور کہیں ان سے کہا جاتا کہ کیوں

تنذیر

گھبراتے ہو، تم استقامت رکھو اور اپنے خدا کی ربوبیت اعلیٰ کے قیام کے لئے مسلسل کوشش کرتے جاؤ (۱۰۳/۳) تم دیکھو گے کہ اس کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے ہم رکاب ہوتی ہے۔ (۱۱۱/۱) اور تمہیں رزق و نعمائے خداوندی کی کس قدر فراوانیاں حاصل ہوتی ہیں (۱۰۸/۱-۳) کبھی ان سے کہا جاتا کہ تمہارا یہ نظام جس میں تم غریبوں کی محنت کے سرمائے سے اپنے لئے دولت کے انبار اکٹھے کرتے رہتے ہو، تمہیں اور تمہارے معاشرے کو جلا کر راکھ کر دے گا (۱۰۴/۱-۹) اور تمہارے سرغنوں کا مال و دولت ان کے (اور تمہارے) کسی کام نہیں آئے گا۔ (۱۱۱/۱-۵) اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ تمہاری اس روش کا انجام کیا ہوتا ہے (۱۰۲/۱-۸) جس میں تم خدا کے جاری چشموں کو بند لگا کر روک لیتے ہو کہ ان سے کسی غریب و نادار کی زمین سیراب نہ ہونے پائے۔ (۱۰۷/۱-۷) اور کبھی ان سے کہا جاتا کہ گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ۝ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ یُسۡرًا ۔ ۹۴/۵-۶) مشکلات اور مصائب کے بعد یقیناً آسانیاں اور فراوانیاں آتی ہیں۔ تمہاری موجودہ حالت کے مقابلے میں تمہارا مستقبل یقیناً درخشندہ و تابناک ہوگا (۹۳/۴) کیا تم ہمارے کائناتی نظام پر غور نہیں کرتے کہ کس طرح رات کی ظلمت انگیز تاریکیوں کے بعد دن کا اجالا نمودار ہو جاتا ہے (۹۲/۱-۲) اور کس طرح نیر درخشاں اپنی تابانیوں سے تمام عالم کو بقعۂ نور بنا دیتا ہے (۹۱/۱-۲) اور اس کی روشنی کس طرح دور دراز تک پھیلتی چلی جاتی ہے۔ (۹۳/۱-۲) اس لئے اگر تمہیں مخالفتوں کا ہجوم ڈراتا ہے تو تم خدا کی ربوبیت کے اور قریب ہو جاؤ۔ تم دیکھو گے کہ وہ تمہاری اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح جانور اپنے نوزائیدہ (کمزور و ناتواں) بچوں کی حفاظت و پرورش کرتے ہیں۔ (۱۱۳/۱-۵، ۱۱۴/۱-۶) (تعوذ کے یہی معنی ہیں) پھر ان سے کہا جاتا کہ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ایک بالکل نیا پروگرام ہے جو تمہارے سامنے پہلے پہل آیا ہے۔ اس لئے تمہیں خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید اس کے وہ نتائج مرتب نہ ہوں جن کا وعدہ دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ پروگرام دنیا میں پہلی بار نہیں آیا۔ اس سے پہلے اس پر بارہا تجربہ ہو چکا ہے اس لئے تم تاریخی شواہد پر غور کرو اور دیکھو کہ جس روش پر تمہارے مخالفین کاربند ہیں، اس کا انجام کیا ہوتا رہا ہے اور جس نظام کی طرف تم دعوت دیتے ہو اس کا مآل کیا ہوتا تھا؛ دیکھو کہ زمانہ کی شہادت تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتی ہے (۱۰۳/۱-۳) یہ تحریک کوئی نئی تحریک نہیں۔ (حضرت) نوحؑ نے جبل تین پر اسی نظام کی دعوت دی تھی اور لوگوں کو اسی کی طرف کوہِ زیتون پر (حضرت) عیسیٰؑ نے بلایا تھا۔ یہی وہ تحریک تھی جسے طور کی وادیوں میں (حضرت) موسیٰؑ نے عام کیا تھا، اور اب وہی دعوت ہے جسے عام کرنے کے لئے تمہیں تیار کیا جا رہا ہے۔ جب اور جہاں، یہ آواز بلند ہوئی وہاں کے مترفین

نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ (نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ - ۳۴/۳۵) ہمارے پاس بڑی دولت ہے۔ ہماری جمعیت بھی بڑی ہے۔ کوئی ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ لیکن تم پوچھو تاریخ کے اوراق سے۔ تم دریافت کرو ان کھنڈرات اور ویرانوں سے جن کے پاس سے تم صبح و شام گزرتے ہو اور جن کی اینٹوں اور پتھروں پر ان کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ کہ ان کی مخالفت کا کیا نتیجہ نکلا؟ وہ تمہارے مخالفین سے بھی زیادہ صاحبِ قوت و شوکت تھے۔ کَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً - ۳۰/۹) ان کے ہاں رزق کی بھی فراوانی تھی۔ (وَاَثَارُوا الْاَرْضَ) ان کی آبادیاں بڑی تھیں۔ عَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا - ۳۰/۹) - لیکن چونکہ یہ معاشی ناہمواریاں پیدا کرتے تھے اس لئے ان کی زندگی کا ہر پہلو ناہموار ہو گیا۔ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ - ۳۰/۱۰) ان کا معاشرہ اپنی چھت کے بوجھ سے نیچے آگرا کیونکہ وہ کمزور بنیادوں پر استوار تھا۔ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ - ۱۶/۲۶) - انہوں نے اپنی عقل و تدابیر سے، بزعمِ خویش، وہ تمام راہیں بند کر لی تھیں جہاں سے ان کے معاشرے پر تباہی آسکتی تھی۔ لیکن یہ تباہی ان راہوں سے آگئی جو ان کے عقل و شعور میں بھی نہ تھیں۔ (وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ - ۱۶/۲۶) - انہوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بڑے بڑے مستحکم قلعے تعمیر کر رکھے تھے۔ جو ان کی صناعی کے مظہر تھے۔ (۲۶/۱۲۸-۱۲۹) ان کے ہاں سامانِ زیست کی بھی بہت فراوانی تھی (۲۶/۱۴۷-۱۴۸)۔ لیکن وہ بالآخر اپنے غلط نظام کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئے (فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ - ۲۶/۱۵۸) یہ وہ نظام تھا جس میں ان کے پیشِ نظر نفعِ قریبی مفادِ خویش تھے۔ مستقبل پر ان کی نگاہ نہ تھی۔ اس نظام کی تر و تازگی اور مرفہ الحالی اور فارغ البالی کی مدت چند روزہ ہوتی ہے، اس کھیتی کی طرح جس کی جڑیں زمین کے اوپر ہی اوپر ہوں (۱۴/۲۶) اس نظام کا انجام ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ
اِلَّا قَلِيْلًا ۗ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ‎(۲۸/۵۸)

اور کتنی بستیاں (قومیں)، ہم نے ہلاک کر دیں جو اپنے معاشی نظام پر اس طرح اتراتی تھیں۔ یہ ہیں ان کے مکانات جو ان کے بعد بہت کم آباد ہوئے اور ان کے ترکہ کا وارث ہمارے سوا کوئی نہ ہوا۔

بڑی قوتوں کے مالک (۹/۶۹) بڑے سرکش اور ظالم (۵۳/۵۲)۔ لیکن ان کی قوت اور سرکشی ان کے کسی کام نہ آئی اور وہ سب تباہ و برباد ہو گئے (۱۴/۱۵)، تم نے قومِ نوح کی داستانیں سنی ہوں گی کہ اس نے کس طرح اس دعوت کی مخالفت کی اور اس کا کیا حشر ہوا؟ (۱۱/۳۸-۳۴، ۲۳/۳۳، ۲۶/۱۲۰)

اقوامِ سابقہ کا حشر

۵۴/۹)۔ تم نے قومِ عاد کے متعلق بھی سنا ہوگا کہ ان کی مخالفت کا انجام کیا ہوا (۲۶/۱۲۸ ; ۴۱/۱۵ ; ۴۶/۲۴ ; ۸۹/۶-۱۰)۔ قومِ ثمود کے متعلق تو تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کیونکہ تم خود ان ہی کی اجڑی ہوئی بستیوں میں بس رہے ہو۔ (۲۶/۱۵۸ ; ۲۷/۵۱ ; ۴۱/۱۷ ; ۵۴/۲۴) تم نے قومِ لوط کے قصے بھی سنے ہوں گے (۲۶/۱۷۲ ; ۵۴/۳۴) اور قومِ سبا کی داستانیں بھی (۳۴/۱۶) قومِ شعیب کی سرکشی اور ان کا عبرتناک انجام بھی تم سے پوشیدہ نہیں (۲۶/۱۸۹ ; ۲۹/۳۶)۔ تم نے فرعون کی فرعونیت کی داستانیں بھی سن رکھی ہیں (۴۳/۵۱ ; ۵۴/۴۴) اور قارون کی قارونیت کی بھی (۲۸/۷۶ ; ۲۹/۳۹ ; ۴۰/۲۴ ; ۵۱/۴۳) یہ تمام اقوام اسی طرح اپنے غلط نظام کی پیدا کردہ قوتوں پہ اتراتی تھیں۔ (۲۰/۱۲-۱۰۰) لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے اس کا سخت محاسبہ کیا (۶۵/۸) اور جب ان کے غلط کردار کے نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو ان کی قوت و دولت ان کے کسی کام نہ آئی۔ وہ ہلاک اور برباد ہو گئے۔ (۵۹/۱۵ ; ۱۳/۴۲ ; ۳۶/۵۰)۔ اس انقلاب نے ان کا تختہ الٹ دیا (۴۸/۱۲ ; ۴۲/۱۵) وہ ایسے گرے کہ پھر اٹھنے کے قابل نہ رہے (۵۱/۴۵) وہ اپنے آپ کو عزتوں کے مالک سمجھتے تھے لیکن دنیا بھر کی رسوائیاں ان کے حصے میں آئیں (۳۹/۲۶)۔ ان کا نام و نشان تک مٹ گیا (۴۹/۲۹)۔ اب ان کی صرف داستانیں باقی ہیں (۲۳/۴۴) تاکہ وہ آنے والوں کے لئے نشانِ راہ کا کام دیں اور وہ سمجھ لیں کہ اس راستے پر چلنے کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔ (۵۱/۴۳)۔ تم زمین پر چلو پھرو (۳۰/۴۲ ; ۳۵/۴۴ ; ۴۷/۱۰) اور دیکھو کہ ان کے اجڑے ہوئے کاشانے اور برباد شدہ ویرانے کس طرح ابھر ابھر کر اُن کے مآل و انجام کی عبرت انگیز کہانیاں سنا رہے ہیں (۲۲/۴۵)

ان تاریخی شواہد کی طرف توجہ منعطف کرانے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا جاتا کہ ذرا سوچو کہ جب اقوامِ سابقہ کی غلط روشِ زندگی کا یہ انجام ہوا تو کیا تمہارے یہ مخالفین سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے قانون کی گرفت سے بچ نکلیں گے؟ کیا غلط ہے یہ فیصلہ جو یہ لوگ اپنی حماقت سے اپنے ذہنوں میں کئے بیٹھے ہیں۔ (اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ۔ (۲۹/۴)) جو لوگ معاشی ناہمواریوں کا نظام قائم کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے قانون سے آگے نکل جائیں گے؟ کس قدر ناعاقبت اندیشی پر مبنی ہے یہ فیصلہ جو یہ لوگ کئے بیٹھے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ جو معاشی نظام بخل (CLOSED INTEREST) پر مبنی ہو اس کا انجام یہی ہوا کرتا ہے (۴۷/۳۸)

یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا

یہ لوگ شکاریوں کی طرح، دبے پاؤں مخلوقِ خدا کی محنت کی کمائی کو دبوچ لیتے ہیں اور ایسے قوانین جاری کرتے رہتے ہیں جن سے اس قسم کی خون آشامی جائز قرار پا جائے۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا انجام ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ یَكْتُمُوْنَ

مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔ (۴/۳۶-۳۷) یہ ہمارے قانون کے خلاف ہے کہ اس قسم کا معاشرہ قائم رہ سکے۔ خواہ یہ لوگ اس کے قیام و استحکام کے لئے کتنی ہی تدبیریں کیوں نہ کریں۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

(BRIFFAULT) کے الفاظ میں :-

وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جائے، آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے، وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ظلم و استبداد کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے، ان ناہمواریوں کی وجہ سے انجام کار برباد ہو جاتی ہے۔ انتخابِ طبعی کے اٹل قانون کی بنا پر گناہ کی اجرت موت ہے۔ (1)

وہ کہتا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ تمہاری قوتیں اور سازشیں، خدا کے کائناتی قانون کو قطعاً روک نہیں سکتی کہ وہ اپنے نتائج مرتب نہ کرے۔ تمہاری قوتیں، خدا کو عاجز نہیں کر سکتیں۔ (۸/۵۹؛ ۲۴/۵۷؛ ۲۹/۲۲؛ ۳۴/۵؛ ۳۴/۳۸) تم اس سے آگے نہیں نکل سکتے (۲۹/۴) تم اس کی راہ میں روک نہیں پیدا کر سکتے (۴۲/۳۵)۔ یہ انقلاب آ کر رہے گا۔

(٠)

مفاد پرستانہ ذہنیت کی طرف سے اس انقلابی دعوت کی مخالفت صرف نظری دلائل طلبی تک ہی محدود نہیں رہتی۔ بلکہ وہ ذہنیت کی عام روش کے مطابق، عملی چھیڑ چھاڑ بھی شروع کر دیتے ہیں۔ کہیں اس جماعت کی تکذیب ہوتی ہے کہیں استہزاء، کہیں لوگوں کو بہکایا جاتا ہے کہ ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔ مقصد ان تمام حربوں سے یہ ہوتا ہے کہ اس جماعت کو دوسری باتوں میں الجھا کر انہیں ان کے پروگرام سے غافل کر دیا جائے۔ اس مقام پر اس جماعت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ مخالفین کے اس الجھاؤ میں نہ آ جائیں بلکہ ان سے دامن بچاتے ہوئے اپنے پروگرام میں آگے بڑھتے جائیں۔

ان سے اعراض برتنا ضروری ہے

یہی وہ مقام تھا جہاں نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ (اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ (۱۵/۸۵ نیز ۴۳/۸۹؛ ۴۵/۱۴؛ ۵۰/۳۹؛ ۷۳/۱۰)) جس انقلاب کے لئے تم جدوجہد کر رہے ہو وہ تو آ کر رہے گا۔ وہ ان کے روکنے سے رک نہیں جائے گا۔ یہ لوگ خواہ مخواہ تمہارا دامن الجھا رہے ہیں کہ تم آگے نہ بڑھ سکو۔ سو تم ان لوگوں سے حسنِ کارانہ انداز سے دامن بچا کر نکل جاؤ۔ ان سے الجھو نہیں (وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا۔ ۷۳/۱۰)۔ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر کبیدہ خاطر مت ہو۔ ان باتوں کا علاج یہ

ہے کہ انہیں اَن سنی کر کے ان سے نہایت خوبصورتی سے بچ کر نکل جائیے (وَذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ اُولِی النَّعْمَةِ وَ مَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا۔ ۷۳/۱۱ ; ۶۸/۴۴)۔ یہ اربابِ دولت، سرمایہ داروں کے نمایندے، جو اس طرح تمہاری مخالفت کر رہے ہیں انہیں میرے حوالے کر دو۔ ان سے میرا قانون خود نپٹ لے گا۔ انہیں تھوڑی سی مہلت مل رہی ہے۔ اس کے بعد انقلاب آئے گا اور اس وقت ان کی سمجھ میں خود بخود آ جائے گا کہ تم کیا کہتے تھے۔ (وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِیْنٍ ۔ ۳۸/۸۸)۔ کہیں کہا گیا کہ (فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۔ ۵۱/۵۴) ان سے اعراض برتو، اس سے تمہارے اوپر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ کہیں کہا کہ ان کی وجہ سے کبیدہ خاطر نہ ہو، خدا تمہارے ساتھ ہے (۱۶/۱۲۸ ; ۵۲/۴۹)۔ تم اپنی جماعت کی تنظیم میں لگے رہو۔ (۷۳/۱۰)۔ ان کی پرواہ مت کرو۔

قانونِ مکافاتِ عمل کا اصول یہ ہے کہ ہر کام اور اس کا نتیجہ برآمد ہونے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ جو بیج آج بویا جاتا ہے اس کا پھل اپنے وقت پر جا کر لگتا ہے۔ عمل اور ظہورِ نتائج کے درمیان وقفہ کو قانونِ امہال (مہلت کا قانون) کہا جاتا ہے۔ اسی قانون کے مطابق نظامِ ربوبیت کی تشکیل کی جدوجہد اور اس کے قیام کے وقت میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔

مہلت کا وقفہ

یہی وقفہ یا مہلت کا زمانہ ہے جس میں اس جماعت سے تاکید کی جاتی ہے کہ وہ مخالفین کی اِدھر اُدھر کی باتوں میں نہ الجھیں بلکہ اپنے پروگرام کی تدریجی تکمیل میں مسلسل کوشش کرتے جائیں۔ چونکہ اس مدت میں ان کی طرف سے کوشش جاری رہتی ہے لیکن اس کا مشہود نتیجہ سامنے نہیں آتا (کیونکہ اسے تو اپنے وقت پر سامنے آنا ہے) اس لئے انہیں قدم قدم پر سمجھایا جاتا ہے کہ اس تاخیر سے پریشان نہ ہوں۔ یہ انقلاب آ کر رہے گا لیکن بتدریج، آہستہ آہستہ۔ قدم بقدم، نامعلوم طریق سے، اس طرح غیر محسوس انداز سے جس طرح ایک پودا بڑھتا پھولتا اور پھلتا ہے[1]۔ اس لئے ان سے کہا جاتا ہے کہ جو شخص اس حقیقت سے انکار کرتا ہے اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ اسے میرے قانون کے سپرد کر دو۔ (فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ ۔ ۶۸/۴۴) میرا قانونِ مکافاتِ عمل، آہستہ آہستہ بتدریج اس طرح پکڑ لے گا کہ انہیں معلوم بھی نہیں ہوگا یہ گرفت کہاں سے آ گئی (سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۶۸/۴۴) موجودہ وقفہ صرف مہلت کا زمانہ ہے۔ یہ نہیں کہ ہمارا قانون کمزور ہے اس لئے یہ اس کی گرفت میں نہیں آ سکے۔ ہمارا قانون بڑی سخت گرفت کا مالک ہے (وَاُمْلِیْ لَهُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ ۔ ۶۸/۴۵) یہ کہتے ہیں کہ یہ "پاگل پن" کی باتیں ہیں کہ تم اپنا سب کچھ دوسروں کو دیدو۔ اس سے تمہیں دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی۔ ان سے کہو کہ تھوڑی

---

[1] اسے ایمان بالغیب کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے نظام کے اَن دیکھے نتائج پر یقینِ محکم۔

دیر انتظار کرو۔ (فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ ۔ بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ ۔ ۶۸/۵-۶) تم بھی دیکھ لوگے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ کون پاگل پن کی
باتیں کرتا ہے! تم اس وقفے سے گھبراؤ نہیں۔ ہمارا قانون انہیں چاروں طرف سے گھیرے جا رہا ہے (وَ اللّٰهُ مِنْ
وَّرَآئِهِمْ مُّحِيطٌ ۔ ۸۵/۲۰) اس لئے کہ وہ قانون ایسا نہیں جس پر ان کی تکذیبی کارروائیاں کچھ اثر کر سکیں یا اس کے نقوش
زمانے کے تغیرات سے مٹ جائیں۔ وہ قانون ایسے محفوظ مقام میں رکھا گیا ہے جہاں زمانے کے اثرات پہنچ نہیں
سکتے (بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۔ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ ۔ ۸۵/۲۱-۲۲) اس لئے یہ جو اپنی فراوانیٔ مال و دولت پر اتراتے ہیں انہیں میرے
قانون کے حوالے کردو۔ (۷۴/۱۱-۱۴)۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مال و دولت اسی طرح سے بڑھتا چلا جائے گا (ثُمَّ يَطْمَعُ
أَنْ أَزِيدَ ۔ ۷۴/۱۵) بالکل نہیں! جو لوگ ہمارے قانون کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا مال و دولت کس طرح زیادہ ہوتا
جائے گا؟ (كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ۔ ۷۴/۱۶)۔ انہیں سخت مشقت میں ماخوذ کیا جائے گا (سَأُرْهِقُهُ
صَعُودًا ۔ ۷۴/۱۷) جو کچھ ہم کر رہے ہیں یونہی مذاق نہیں۔ ایک قولِ فیصل ہے۔ (إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۔ ۸۶/۱۳-۱۴)
ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ بڑی بڑی گہری سازشیں کر رہے ہیں اور بڑی بڑی خفیہ تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ لیکن ہمارا قانون اس
سے بے خبر نہیں. وہ بھی اپنی جگہ کام کر رہا ہے (إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا وَّأَكِيدُ كَيْدًا ۔ ۸۶/۱۵-۱۶) بس تھوڑی سی مہلت
کی بات ہے۔ اس کے بعد یہ سامنے آجائے گا۔ (فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۔ ۸۶/۱۷) انہیں معلوم نہیں کہ
خدا کا قانون سب کچھ دیکھ رہا ہے (أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللّٰهَ يَرَىٰ ۔ ۹۶/۱۴) اگر یہ اپنی روش سے باز نہیں آئیں گے تو
ان کے لئے روسیاہی ہوگی۔ (۹۶/۱۵-۱۶) اس وقت انہیں مہلت دی جاتی ہے (۷۳/۱۱ ؛ ۱۴/۱۱ ؛ ۳۵/۴۵) کہ یہ اپنی روش
سے باز آجائیں۔ اس لئے کہ ہمارے قانون میں ظہورِ نتائج کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر کوئی
قوت اسے آگے پیچھے نہیں کر سکتی۔ (۷/۳۴) ابھی تم (اے رسول) ان کے اندر ہو۔ انہیں ان کی غلط روش کے انجام و عواقب
سے آگاہ کر رہے ہو۔ اس لئے ابھی ان کے پاداشِ عمل کا وقت نہیں آیا (۸/۳۳) جب تم انہیں چھوڑ کر نکل جاؤ گے تو اس
کے یہ معنی ہوں گے کہ ان میں تبدیلیٔ احوال کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اس کے بعد بساط الٹ جائے گی۔ پھر تم دیکھو گے
کہ ان بڑے بڑے سرمایہ داروں کا حشر کیا ہوتا ہے جو نوعِ انسانی کے سامانِ پرورش کو اس طرح روکے ہوتے ہیں (۶۸/۱۷-۱۹)
اس وقت ان کی جمع شدہ دولت کسی کام نہیں آسکے گی (۶۹/۲۸ ؛ ۹۲/۱۱ ؛ ۱۱۱/۲)۔ انقلاب کی گھڑی انہیں آواز دے دے کر
بلائے گی (۷۰/۱۷)۔ اس وقت یہ دیکھیں گے کہ جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں سامنے موت آتی دکھائی دیتی ہے۔ (وَ
يَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ ۔ ۱۴/۱۷) یہ چاہیں گے کہ اس ذلت اور تباہی کے عذاب سے پہلے پہلے ختم ہو جائیں لیکن (وَمَا
هُوَ بِمَيِّتٍ ۔ ۱۴/۱۷) انہیں موت بھی تو نہیں آئے گی۔ اس وقت ان کی حالت یہ ہوگی کہ نگاہیں پھٹ رہی ہیں۔ ڈھیلے

باہر کو آرہے ہیں۔ یہ میدانِ جنگ سے بدحواس، سر پر عورتوں کے دوپٹے اوڑھے بھاگے جارہے ہیں۔ اس وقت ان کے تمام اعزہ و اقربا اور دوست و رفیق ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے حتیٰ کہ ان کی نگاہ بھی کاشانۂ چشم میں واپس نہیں آسکے گی اور ان کے دل ڈوبتے چلے جائیں گے (۱۴/۴۳)۔ اس کے بعد یہ مجرمین ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے سامنے آئیں گے۔ ایک ایک زنجیر میں کئی کئی ہاتھ بندھے۔ ان کی زرہیں جن پر انہیں اس وقت اس قدر بھروسہ ہے، اس طرح نیچے گر رہی ہونگی جیسے پگھلی ہوئی دھات کے قطرے گر رہے ہوں۔ ان کے چہرے آگ سے جھلسے ہوئے ہوں گے (۱۴/۴۹-۵۰)۔ یہ خود اپنے وطن میں ذلیل و خوار ہوں گے اور ان پر یہ تباہیاں ایسے مقامات سے آئیں گی جو ان کے سان گمان میں بھی نہ ہوں گے۔ یہ اپنی اپنی جدوجہد میں مصروف ہوں گے اور انقلاب کا آہنی پنجہ انہیں آ دبوچے گا۔ (۱۶/۴۵-۴۶)

لیکن مخالفین اس قانون تدریج و امہال سے الٹا اثر لیتے۔ وہ مذاق کرتے اور کہتے کہ جس تباہی اور بربادی سے

غلط اثر

تم ہمیں اس طرح ڈراتے دھمکاتے ہو، وہ ہے کہاں؟ وہ کب آئے گی، (وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ - ۲۷/۷۱) اس کے جواب میں مخالفین سے تو کچھ کہنا بیکار تھا۔ البتہ خود اپنی جماعت سے کہا جاتا کہ ان کی ان باتوں سے کہیں دل گرفتہ نہ ہو جانا۔ (وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ - ۲۷/۷۰) خدا کا قانون برحق ہے۔ وہ نتیجہ خیز ہو کر رہے گا۔ ان لوگوں کی باتیں تمہارے دل میں جذبۂ مرعوبیت نہ پیدا کر دیں۔ (فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ - ۳۰/۶۰) ہمارا قانون اُن لوگوں کے نقشے الٹ کر رکھ دے گا جو دنیا میں تعمیری نتائج ربوبیت پیدا کئے بغیر قوت اور اقتدار چاہتے ہیں (سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ...... ۷/۱۴۶) یہ لوگ حصولِ اقتدار کے لئے ایسی تدابیر اختیار کرتے ہیں جس سے معاشرے میں ناہمواریاں پیدا ہوتی رہیں۔ لیکن ان کی ان تدابیر کا وبال خود انہی کے اوپر پڑے گا۔ یہ ہمارا اٹل قانون ہے جو نہ اس سے پہلے کسی کی خاطر بدلا ہے اور نہ اب بدلے گا۔ اگر کسی کو اس میں شک ہو تو اسے کہو کہ ذرا تاریخ عالم پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ اس قسم کا نظام کبھی کامیاب ہوا بھی ہے؟ (۳۵/۴۳-۴۴) لیکن بات وہی ہے جو پہلے کہی جا چکی ہے کہ ہر عمل کے ظہورِ نتائج کا ایک وقت متعین ہوتا ہے۔ وہ نتیجہ اس سے قبل سامنے آ نہیں سکتا (لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ - ۶/۶۷) اس وقت تم دیکھو گے کہ تمہارے مخالفین کی جڑیں کٹ جائیں گی (۷/۱۲)۔ چونکہ تمہارا نظام صحیح اصولوں پر استوار ہو رہا ہے اس لئے ہمارا قانون نے صاف کہلا بھیجا [illegible] (۳۵/۴۳)۔ یہ ہم نے طے کر دیا ہے (۲/۱۲۱)۔ اگر کہیں ایسا ہو کہ صحیح نظام کے پیروؤں اور غلط نظام کے متبعین کی زندگی اور انجام ایک جیسا ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کائنات میں ہمارا قانون کہیں کارفرما نہیں۔ قانون صرف یہی ہے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ یہ تصور بالکل غلط ہے۔ ان دونوں گروہوں کی زندگی اور اس کا مآل یکساں نہیں ہو سکتا۔

(۳۵/۴۳ ; ۱۰/۱۰۲) یہ لوگ اپنی غلط روش سے باز نہیں آتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ اس انجام کا انتظار کر رہے ہیں جو اس سے پہلے ان ہی جیسی روش پر چلنے والی اقوام کا ہوا۔ (۱۰/۱۰۲ ; ۶/۱۵۸)۔ اگر یہی بات ہے تو ان سے کہہ دو کہ بہت اچھا! تم بھی انتظار کر رہے ہو، میں بھی انتظار کرتا ہوں (۳۲/۳۰ ; ۳۹/۴۰)۔ میں تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم جس نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہو بسر کرتے جاؤ۔ ہم اس میں دخل اندازی نہیں کرتے اور جس پروگرام کے تحت ہم زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ہمیں بسر کرنے دو۔ ہمارے تجربے میں تم دخل انداز مت ہو۔ نتیجہ خود بتا دے گا کہ کس کا پروگرام کامیابی کا موجب بنتا ہے اور کس کا پروگرام تباہی لاتا ہے۔

آخری نتیجہ

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَکُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (۶/۱۳۶) نیز (۱۱/۹۳ ; ۱۱/۱۲۱ ; ۲۰/۱۳۵ ; ۳۹/۳۹ ; ۵۲/۳۱)

ان سے کہہ دو کہ اے قومِ مخالف! تم اپنے نقشوں کے مطابق کام کرتے جاؤ اور ہمیں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ انجام کار کامیابی کا ٹھکانہ کس کے لئے ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ خدا کا قانون کبھی ان لوگوں کی کھیتی پروان نہیں چڑھنے دے گا جو دوسروں کے حقوق میں کمی کرتے ہیں۔

تم دیکھ لوگے کہ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ۔ (۱۰/۱۷) مجرمین کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْکٰفِرُوْنَ۔ (۲۳/۱۱۸) اس کے قانون سے انکار کرنے ۔۔۔۔ والے کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکیں گے لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ۔ (۱۰/۸۱) ناہمواریاں پیدا کرنے والوں کے پروگرام میں کامیابی و شادکامی کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جو تمہارے سامنے آجائے گا۔ بس میں اتنا چاہتا ہوں کہ تم میرے پروگرام میں دخل انداز نہ ہو۔ تم میرے راستے میں روڑے مت اٹکاؤ۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہتا، تم مجھے کچھ نہیں کہو۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ نتائج سب کے سامنے آجائیں گے!

غور کیجئے! اپنے نظام (دین) کو مبنی علی الحق ثابت کرنے کا کس قدر سائنٹیفک طریق ہے! کوئی نظری بحث نہیں۔ کوئی لفظی گورکھ دھندا نہیں۔ یوں باتیں ہو رہی ہیں گویا لیبارٹری (معمل) میں کھڑے ہیں۔ ٹیسٹ کرنے کا عمل (PROCESS) جاری ہے۔ کہا صرف یہ جا رہا ہے کہ جلدی مت کرو۔ اس طریق امتحان کو ختم ہو لینے دو۔ امتحان کی نلی (TEST TUBE) خود بتا دے گی کہ نتیجہ کیا نکلا؟ کس قدر محکم یقین ہے اپنے پروگرام کے حق ہونے کا۔

ابھی دیکھ لو گے

اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس پروگرام کے نتائج اسی دنیا میں سامنے آجائیں گے۔ (فسوف تعلمون) یہ نہیں کہا گیا کہ قیامت میں جا کر دیکھ لینا کہ کون جنت میں جاتا ہے اور کون جہنم میں۔ کہا یہ گیا ہے کہ ذرا توقف کرو، ہمارا پروگرام پورا ہو لینے دو۔ تم ابھی دیکھ لوگے کہ جنّت کس کے حصے میں آتی ہے۔

مخالفین سے یہ سب کچھ کہہ دیا گیا۔ لیکن وہ اپنی قوت اور دولت کے نشے میں مخمور تھے۔ وہ ان دلائل و براہین پر کب کان دھرنے تھے؟ انہوں نے اپنی مخالفت میں اور بھی شدت اختیار کرلی اور ٹھان لی کہ اس نظام نو کے داعی کی زندگی ہی ختم کر دی جائے تاکہ یہ دعوت ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے۔ اب وہ وقت آگیا جب اس جماعت سے کہہ دیا گیا کہ تم ان سے قطع علائق کر کے الگ ہوجاؤ۔ تم ان سے کہہ دو کہ تمہارے اور ہمارے درمیان کوئی قدر مشترک باقی نہیں رہی ہم جارہے ہیں۔ اب تمھاری روشِ زندگی کے نتائج تمہارے لئے ہوں گے اور ہمارے نظام کے نتائج و ثمرات ہمارے

قطع علائق

لئے (لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ - ۱۰۹/۶)۔ یہ لو! ہم چلے۔ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ۔ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلَى اللّٰهِ۔

لیکن مفاد پرست گروہ اس طرح پیچھا کب چھوڑا کرتا ہے۔ مکہ کے متمول تاجر اور کعبے کے متولی کب برداشت کرسکتے تھے کہ (ان کے اپنے ہاں نہ سہی) دنیا کے کسی خطۂ زمین بھی ربوبیتِ عامہ کا نظام قائم ہوجائے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ اس نظام کے اثرات بہت دوررس ہوں گے۔ چنانچہ وہ آگے بڑھے اور اس نظام کے قیام کو بزورِ شمشیر روکنا چاہا۔

یہاں پہنچ کر وہ مقام آجاتا ہے جہاں اس نظامِ ربوبیت کے داعیوں کے لئے آخری فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ یا تو وہ ان سرکش قوتوں کے سامنے سپر ڈال کر، انسانیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کے آہنی پنجہ میں جکڑا رہنے دیں اور یا نوعِ انسان کی آزادی اور بہبود کے لئے سربکف میدان میں نکل آئیں۔ قرآن اس مقام پہ دوسرے مسلک کی تائید کرتا ہے (یعنی نوعِ انسان کی منفعت کی خاطر اپنی جان دے دینا)۔ اگر آپ غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے) اس مقام پر جان سپردگی، ربوبیت کے پروگرام ہی کی ایک (اور آخری) کڑی ہوتی ہے۔ نظامِ ربوبیت کی بنیاد کس اصول پر ہے؟ اس اصول پر کہ انسانی ذات کی نشوونما "دینے" (اعطیٰ) سے ہوتی ہے یعنی انسان کے پاس جو کچھ ہے اسے نوعِ انسان کی منفعت کے لئے وقف کر دے۔ انسان کے پاس (اپنی استعداد کی کمائی یعنی) مال ہوتا ہے اور (خدا کی دی ہوئی) جان۔ جب تک ربوبیتِ عامہ، مال دینے سے ہوتی رہتی ہے، یہ مال دیئے جاتا ہے

تسلیمِ جاں ہے زندگی

اور جب ایسا وقت آجائے کہ ربوبیتِ عامہ کے لئے اس کی جان کی ضرورت پڑجائے تو یہ جان بھی دے دیتا ہے۔ اس طرح اس کی ذات، حیاتِ جاوید حاصل کرلیتی ہے۔

لہٰذا، اس مقام پر جان بکف میدان میں آجانے کا قرآنی حکم اسی سلسلۂ تربیتِ ذات کی آخری کڑی ہے۔ دیکھئے قرآن نے "تلوار نازل کرنے" کا ذکر کس مقام پر کیا ہے! سورۂ حدید (کی ان آیات کو ایک دفعہ پھر سامنے لائیے جو پہلے گذر چکی ہیں اور جن) میں کہا گیا ہے کہ اللہ ان "نسکاریوں" کو پسند نہیں کرتا جو خود موٹا ہونے کی خاطر نوعِ انسان کا نسکار کرتے ہیں۔

(وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۔ ۵۷/۲۳) ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ اپنے فائدے کو سامنے رکھتے ہیں اور اس کے لئے سب کچھ سمیٹ کر جمع رکھنے کی فکر کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ یہ خود غرضانہ روش بڑی معیوب ہوتی ہے اور انہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح یہ لوگ سوسائٹی میں بدنام نہ ہو جائیں اس لئے یہ اس قسم کے قانون بنا دیتے ہیں جن کی رو سے اس طرح دولت جمع کرنا قانوناً جائز قرار پا جائے اور زر اندوزی اور مفاد پرستی معاشرہ کا معمول بن جائے (اِلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۔ ۵۷/۲۴) اس کے بعد قرآن نے بتایا ہے کہ اس (غلط) معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کرنے کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے لئے حسب ذیل پروگرام وضع کیا گیا ہے۔

(i) لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۔ (۵۷/۲۵)۔ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا۔ یہ پہلا مرحلہ افہام و تفہیم کا ہے یعنی دلائل و براہین سے ان میں ذہنی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔

(ii) وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۔ (۵۷/۲۵)

اور ان کے ساتھ ہم نے قانونِ عدل بھیجا تاکہ نوعِ انسانی میں توازن قائم رکھا جا سکے۔

یعنی ایسا معاشرہ متشکل کیا جائے جس میں نوعِ انسانی کی منفعت اور ربوبیت کے نظام کو قانون کی رُو سے قائم کیا جائے۔

نزولِ شمشیر

(iii) وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۔ (۵۷/۲۵)

"اور ہم نے فولاد (کی شمشیر) نازل کی جس میں بڑی قوت ہے اور نوعِ انسانی کی منفعت کا راز پوشیدہ ہے۔" یعنی اگر ایسا وقت آجائے کہ مفاد پرست گروہ اس نظام کے قیام میں عملاً مزاحمت کرے یا اس نظام کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کرے اور نہ تو دلائل و براہین سے بات سمجھنے کی کوشش کرے اور نہ ہی آئین و قانون کا احترام کرے، تو اس وقت اس کے سوا چارہ نہیں رہے گا کہ ان کی انسانیت سوز سرکشی کو تلوار کے زور سے روکا جائے۔ اسی سے یہ بھی دیکھا جا سکے گا کہ خود نظامِ ربوبیت قائم کرنے والی جماعت میں لوگوں کی تربیتِ ذات کس حد تک ہو چکی ہے اور کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنے پروگرام کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھتے ہوئے، اس نظام کے قیام میں جان تک دے دینے کے لئے تیار ہیں۔ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۔ (۵۷/۲۵)

قرآن کا بیشتر حصہ اس اہم نقطہ کی تشریح ہے کہ "تلوار" (قوت) کا استعمال کہاں کرنا چاہیئے اور کیسے کرنا چاہیئے۔ اس تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ (اس کے لئے میری کتاب "جہاد" کو دیکھنا چاہیئے[1])۔ اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی

---

[1] نیز معراجِ انسانیت اور شاہکارِ رسالت

ہے کہ قرآن کی رُو سے قوت :

"لادیں" ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

اور ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رُو سے "دین" کا مفہوم کیا ہے؟ نوعِ انسانی کی ربوبیت اور اس کے ذریعے اپنی ذات کی تربیت. یعنی ایسے معاشرے کا قیام جو خدا کی صفتِ ربّ العالمینی کا مظہر ہو اور جس میں انسان کی اپنی ذات کی تکمیل ہو جائے. قرآن اس معاشرے کا ضابطہ (CODE) ہے اور "تلوار" اس کی پاسبان. قرآن تلوار کی نگہداشت کرتا ہے کہ یہ بے محل نہ اٹھنے پائے اور تلوار، قرآن کی محافظت کرتی ہے کہ کوئی اسے غیر مؤثر (INEFFECTIVE) نہ بنا دے. یہ محض وعظ بن کر نہ رہ جائے.

ایں دو قوّت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

(٠)

ان مسلح مزاحمتوں کو روکنے کا سلسلہ برسوں تک جاری رہا تاآنکہ ایک ایک کر کے یہ تمام قوتیں ختم ہو گئیں. حقوقِ انسانیت میں کمی کرنے والوں کی جڑیں کٹ گئیں. (فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۔ ٦/٤٥) اور خدا کی ربوبیتِ عالمینی کا نظام دنیا بھر کی نگاہوں میں باعثِ حمد و ستائش بن گیا. (وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ ٦/٤٥).

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ۔ (٣٩/٦٩)

اور زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی.

ایک ضمنی گوشہ

میں نے جو کچھ گزشتہ صفحات میں لکھا ہے (اور جو کچھ اس کے بعد آئیگا) اس میں آپ نے ایک چیز کو نمایاں طور پر محسوس کیا ہوگا اور وہ یہ کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی سند میں صرف قرآن کی آیات پیش کی ہیں. تاریخ اور روایات سے کچھ نہیں لکھا (حتیٰ کہ میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ نبی اکرمؐ نے جس نظامِ ربوبیت کو متشکل فرمایا اس کے تفصیلی خط و خال کیا تھے اور وہ کب تک علیٰ حالہٖ قائم رہا.) اس کی یہ وجہ نہیں کہ تاریخ و روایات میں قرآنی نظامِ ربوبیت کی تائید میں کچھ نہیں ملتا. تفحص و تجسس سے ان میں، اس کی تائید میں، شہادات مل سکتی ہیں. لیکن ان تاریخی روایات کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں جہاں کسی مسئلہ کی تائید میں کچھ ملتا ہے وہاں اسکی تردید میں بھی بہت کچھ مل جاتا ہے. ان میں مخالف اور موافق دونوں قسم کی شہادات موجود ہوتی ہیں. یہی وجہ ہے کہ ان ذرائع

سے آج تک کسی جزئی سے جزئی مسئلہ کے متعلق بھی کوئی متفق علیہ فیصلہ نہیں مل سکا یعنی کہ آپ یہ بھی نہیں طے کر سکے کہ نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھنے چاہئیں یا ناف پر۔ آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیئے یا خاموشی سے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر ان کتابوں سے مسئلہ زیرِ نظر کی تائید میں کچھ پیش کیا جائے تو ان ہی کتابوں سے اس کے خلاف بھی بہت کچھ نکل آئے گا۔ اس کے بعد یہ بحث چھڑ جائے گی کہ ان میں سے کون سی چیز غلط اور کونسی صحیح ہے (اور اس بات کا فیصلہ آج تک نہیں ہو سکا کہ ان میں سے کون سی چیز غلط ہے اور کون سی صحیح) چنانچہ اگلے دنوں ایک بحث چھڑی کہ زمین کا بٹائی پر دینا جائز ہے یا نہیں اور رسول اللہ اور صحابہؓ کے زمانہ میں اس باب میں کیا عمل رہا تھا۔ ایک فریق کا دعویٰ تھا کہ یہ جائز نہیں۔ دوسرا کہتا تھا کہ جائز ہے۔ دونوں فریق اپنے دعویٰ کی تائید میں احادیث پیش کر رہے تھے اور اس کے مدعی تھے کہ ان کی پیش کردہ احادیث صحیح ہیں اور فریقِ مقابل کی غلط۔ یہی صورت ہر مسئلہ میں پیش آجاتی ہے۔ دین میں سند خدا کی کتاب ہے، جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے اور جس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ اس لئے دین میں جس چیز کو بطور سند پیش کیا جا سکتا ہے وہ صرف قرآن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے نظامِ ربوبیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے قرآن ہی سے لکھا ہے۔

ایک بات بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ کو یہ تسلیم ہے کہ جو کچھ ان صفحات میں لکھا گیا ہے وہ قرآن کی رُو سے صحیح ہے تو اس کے بعد آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ نبی اکرمؐ نے اسی کے مطابق معاشرہ کی تشکیل فرمائی ہوگی اس لئے کہ نبی اکرمؐ کا فریضۂ حیات ہی یہ تھا کہ آپ قرآن کے مطابق نظام قائم کریں۔ آپ کا کوئی ارشاد یا عمل قرآن کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس معیار کے مطابق ہمارے لئے آسان ہو جاتا ہے کہ ہم اس سارے تاریخی مواد کو (جو ہمارے ہاں چلا آرہا ہے) قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لیں۔ اس اصول کے ماتحت، جو کچھ قرآن کے مطابق ہوگا اس کے متعلق ہم کہہ سکیں گے کہ گمانِ غالب ہے کہ تاریخ کے یہ بیانات صحیح ہیں۔ اس اصول کی روشنی میں یہ باتیں اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہیں کہ رسول اللہ اپنے ہاں کیوں درہم و دینار نہیں رہنے دیا کرتے تھے اور آپ نے کیوں کوئی چیز بطور ترکہ کے نہیں چھوڑی۔ یا یہ کہ اس نظام کی تشکیل کے دوران میں آپ نے کیوں یہ فرمایا کہ:-

جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ سواری ہو وہ اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہیں ہے۔ جس کے

لہ یہ بحث مسلسل چلی جارہی ہے اور مخالف اور موافق اپنے اپنے موقف کی تائید میں روایات پیش کئے جاتے ہیں۔

پاس اپنی ضرورت سے زیادہ توشہ ہو وہ اس شخص کو دیدے جس کے ہاں توشہ نہ ہو۔ ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ آپ نے مال کی بہت سی قسمیں ..... بیان فرمائیں حتیٰ کہ ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ضرورت سے زیادہ کسی مال پر بھی ہمارا حق نہیں[1]۔

لیکن اگر ہم اس کے برعکس یہ مسلک اختیار کریں (جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے) کہ جو کچھ ہمارے پاس کتب روایات و سیر میں آیا ہے اسے صحیح تسلیم کرلیں اور پھر اس کے مطابق قرآن کا مفہوم متعین کریں تو یہ روش بداہتہً غلط ہوگی۔ اسلئے کہ تاریخ بہرحال ظنی ہے اور قرآن یقینی۔ ظنی چیز کو یقینی کی روشنی میں پرکھنا صحیح ہوگا نہ کہ یقینی کو ظنی کے تابع رکھنا۔ ہماری تاریخ اس دور میں مرتب ہوئی جب ہمارا معاشرہ قرآنی خطوط اور منہاج نبوت سے ہٹ کر مفاد پرستوں کے تابع آچکا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ... خلافت کی جگہ ملوکیت آچکی تھی اور زندگی کے ہر شعبے پر متغلبین اور متسلطین چھا چکے تھے۔ ملوکیت اور سرمایہ پرستی ایک ہی سکے کے دو رُخ ہوتے ہیں اب ظاہر ہے کہ جو تاریخ اس دور میں مرتب ہوگی اس میں عہدِ رسالتمآب کا صحیح صحیح نقشہ کس طرح مل سکے گا؟ اس لئے کہ اگر اُس وقت اُس عہد کا صحیح صحیح نقشہ پیش کر دیا جاتا تو اسے صاف نظر آجاتا کہ اُس دور کا معاشرہ کس طرح رسول اللہ ؐ کے زمانے کے معاشرے سے مختلف تھا۔ ملوکیت کا استبداد اسے کس طرح گوارا کرسکتا تھا کہ اسے کہا جائے کہ جو کچھ تم کرتے ہو وہ خدا کے حکم اور رسول اللہ ؐ کے عمل کے خلاف ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ہمارے پاس رسول اللہ ؐ کے دور کی صحیح تاریخ خالصتہً نہیں پہنچی (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) ہماری تاریخ اس دور میں مرتب ہوئی جب منبر و محراب سے بادشاہ کو ظل اللہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جس دور میں ملوکیت جیسی خلافِ قرآن چیز کو ظل اللہ بنا دیا گیا ہو اس میں سرمایہ داری اور مفاد پرستی کیوں حلال و طیب نہ قرار پاچکی ہوگی۔ اس دور کی مرتب شدہ تاریخ میں قرآنی نظامِ ربوبیت کی تو جھلک تک بھی دکھائی نہیں دے سکتی۔ بس اتنا ہی ہوسکتا ہے کہ یہاں وہاں کوئی بکھرے ہوئے ٹکڑے مل جائیں جن سے تصویر کے کچھ بے ربط سے نقوش نظر آجائیں۔ اندریں حالات، کسی کا یہ مطالبہ کہ جس نظامِ ربوبیت کا تصور قرآن پیش کرتا ہے، تاریخ سے ثابت کرو کہ رسول اللہ ؐ کے زمانے میں وہی نظام قائم تھا، اور اگر تم اسے ثابت نہیں کرسکتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نظام کا جو نقشہ از روئے قرآن پیش کیا گیا ہے وہ غلط ہے، ایک ایسا مطالبہ ہے جو علم و حقیقت کے خلاف اور مغالطہ آفرینی پر مبنی ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ جو نقشہ یہاں پیش کیا گیا ہے وہ اس مسلک کے خلاف ہے جو مسلمانوں میں متواتر چلا آرہا ہے اور جس کی رو سے "ہر شے پر انفرادی ملکیت بے حد و نہایت جائز ہے"؛ تو اس کے متعلق گذارش ہے کہ مسلمانوں میں تو بادشاہت (ملوکیت) بھی تیرہ سو سال سے متواتر چلی آرہی ہے۔ اگر اس تواتر کے باوجود ملوکیت خلافِ اسلام ہے تو

---

[1] میں نے اپنی کتاب شاہکارِ رسالت میں معاشی نظام کے تحت اس قسم کی بہت سی روایات اور آثارِ صحابہؓ درج کئے ہیں۔

مسلکِ سرمایہ پرستی محض تواتر کی دلیل سے کس طرح اسلام کے عین مطابق قرار پا سکتا ہے؟

یاد رکھیے کہ دین میں سند نہ تاریخ کے مشمولات ہیں اور نہ مسلمانوں کے متواتر و متوارث عقائد و مسالک۔ سند ہے خدا کی کتاب۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے قرآنی نظامِ ربوبیت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ یہ دیکھئے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ قرآن کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ و ذٰلِکَ الدِّینُ القَیِّمُ۔

(۰)

ایک اہم اعتراض

اس ضمن میں ایک سوال البتہ ایسا ہے جسے اگر صاف نہ کیا گیا تو وہ ذہنوں میں خلجان پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر قرآنی نظامِ ربوبیت میں انفرادی ملکیت باقی نہیں رہے گی، اگر اس میں کوئی شخص دولت جمع نہیں کر سکے گا، تو صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ، یتیموں کی پرورش، قرابتداروں سے حسنِ سلوک، مسکینوں کی امداد، غریبوں کی مدارات حتیٰ کہ ترکہ و میراث سے متعلق تمام احکام منسوخ ہو جائیں گے حالانکہ ان احکام سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی سخت تاکید آئی ہے۔ ان احکام کی موجودگی اس کی دلیل ہے کہ قرآن انفرادی ملکیت کو مٹانا نہیں چاہتا۔ وہ دولت جمع کرنے کی ممانعت نہیں کرتا۔

سوال واقعی اہم ہے اس لئے اسے اچھی طرح سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

سب سے پہلے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیے کہ قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو اس کی تعلیم میں باہمی اختلاف ہوتا (۴/۸۲) اس لئے قرآن کی کلی تعلیم کو سمجھنے کے لئے اس حقیقت کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے کہ کوئی ایسا نقشہ، ایسا نظام، ایسا تصورِ زندگی جس میں قرآن کے احکام باہمدگر متخالف و متضاد دکھائی دیں، قرآن کی صحیح تعبیر کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی وہی تعبیر صحیح ہوگی، جس میں اس کے تمام احکام و اصول ایک دوسرے سے موافق ہوں۔

آپ شروع سے آخر تک سارا قرآن دیکھئے اس میں دولت جمع کرنے کی سخت ممانعت آئی ہے۔ آپ پورے قرآن سے ایک آیت بھی ایسی نہیں پیش کر سکتے جس میں دولت جمع کرنے کا حکم یا اجازت ہو۔ اس کے بعد یہ سوچیئے کہ یہ کہنا کہ کوئی شخص جتنی جی چاہے دولت جمع کرلے، لیکن اگر اس میں سے کچھ روپیہ بطور زکوٰۃ دیدے تو باقی جمع کردہ دولت حلال و طیب ہو جاتی ہے، قرآن کی منشا کے مطابق قرار پا سکتا ہے؟ (جبکہ اس نے، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، دولت جمع کرنے کی سخت مخالفت کی ہے)۔ دولت کے متعلق قرآن کے اس بنیادی تصور کی رو سے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ مفہوم قرآنی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ مفہوم اس بنیادی تصور کے خلاف جاتا ہے اور قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف

اور تضاد نہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ اس قسم کے مفہوم کے لئے کس قسم کی روایات وضع کی گئیں۔ سورۃ توبہ میں ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ (۹/۳۴)۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی (دولت) اکٹھی کرتے رہتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے (اے رسولؐ! تو) انہیں ایک الم انگیز عذاب کی "بشارت" دیدے۔" اس سے اگلی آیت میں ہے کہ ان کی اس دولت (سکوں) کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے انہیں داغا جائیگا۔

اس آیت میں واضح طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ قرآن کی رو سے دولت جمع رکھنا عذابِ جہنم کا موجب ہے۔ یہ ایک آیت ہی "زکوٰۃ" کے مروجہ مفہوم کی تغلیط کے لئے کافی ہے ـــ یعنی اس مفہوم کی جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ جتنی دولت جی چاہے جمع کرو۔ اگر اس میں سے سال کے بعد اڑھائی فیصد زکوٰۃ (خیرات) دے دو تو باقی مال حلال و طیب ہو جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ:

> (حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کروں گا۔ پس عمرؓ، رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبی اللہؐ! یہ آیت آپؐ کے صحابہؓ پر گراں ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خدا نے زکوٰۃ کو اس لئے فرض قرار دیا ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سنکر عمرؓ نے جوش مسرت سے اللہ اکبر کہا ..... (مشکوٰۃ۔ باب الزکوٰۃ۔ اردو ترجمہ صفحہ ۳۰۹-۳۱۰)

روایت کا انداز کہہ رہا ہے کہ اسے سرمایہ پرستی کے دور میں وضع کیا گیا تھا۔ ہمارے ہاں نظامِ سرمایہ پرستی کا مدار اسی قسم کی وضعی روایات پر ہے جو قرآنِ مجید کی نصوصِ صریحہ کے خلاف ہیں لیکن جنہیں واجب التسلیم قرار دیا جاتا ہے۔

(۰)

اس کے بعد آگے بڑھیئے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآنِ کریم نے نظامِ ربوبیت کے قیام کو پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے سے تشبیہہ دی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پہاڑ پر دوڑ کر نہیں چڑھا جاتا۔ آہستہ آہستہ، قدم بقدم، ٹھہر ٹھہر اور رُک رُک کر بتدریج۔ چڑھا جاتا ہے۔ اس میں بھی بعض اوقات دم پھول جاتا ہے۔ معلوم نہیں انسان نے ذاتی ملکیت کا تصور کب سے پیدا کیا۔ لیکن جب سے بھی پیدا کیا ہو، آج ایسا دکھائی دیتا ہے گویا ذاتی ملکیت کا جذبہ "انسانی فطرت" میں داخل ہے۔ ہر شخص ایسا محسوس کرتا ہے کہ اگر اشیاء پر ذاتی ملکیت نہ رہنے دی جائے تو کوئی شخص برضا و رغبت کوئی کام نہیں کریگا۔

محنت اور جی لگا کر کام کرنے کے تمام محرکات ختم ہو جائیں گے۔ صدقہ وخیرات میں کوئی لذت نہیں رہے گی۔ اس لئے اس قسم کا نظام جس میں ذاتی املاک رہیں، نہ صرف ناکام رہے گا بلکہ ناقابل عمل بھی ہوگا۔ جب صورت یہ ہو تو کسی سے یہ کہنا کہ وہ کل صبح اپنی تمام املاک ختم کر دے (یا انہیں ختم کر دیا جائے گا) فی الواقعہ ایک ناقابل عمل طریق کار کو اختیار کرنا ہوگا۔ علاوہ بریں انسان نے جو معاشرہ (انفرادی مفاد کی بنیادوں پر) قائم کر رکھا ہے اس میں ہر فرد یہ جانتا ہے کہ اس کا اور اسکے بال بچوں کا زندہ رہنا اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے اپنے پاس کچھ ہو۔ وقت پڑنے پر کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ وہی دولت کام آتی ہے جو اس کی ملکیت میں ہو۔ اس لئے ان حالات میں کسی سے یہ کہنا کہ کل صبح اپنا سب کچھ ہمارے حوالے کر دو، ایک ناممکن مطالبہ ہے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن افراد کو اِس (موجودہ) معاشرے سے اُس معاشرے تک آہستہ آہستہ لے جاتا ہے۔ ایک طرف اُن کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرتا، اور دوسری طرف نئے نظام کے مطابق ایسے حالات پیدا کرتا جاتا ہے جن میں انسان کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ اگر میں نے یہ کچھ دے دیا تو اس سے بھوکا نہیں مروں گا۔ وہ اس طرح بتدریج' قدم بقدم' اس معاشرے کو اس نئے معاشرے میں تبدیل کرنے کی صورت پیدا کرتا ہے۔ صدقہ وخیرات، بیع و شریٰ، لین دین، ترکہ ومیراث وغیرہ کے تمام احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں۔ جوں جوں حالات بدلتے جاتے ہیں، عبوری دور کے یہ احکام پیچھے ہٹتے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ احکام، حالات سے مشروط ہوتے ہیں۔ مثلاً قرآن میں زنا کی سزا مقرر ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایسے معاشرتی حالات پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں زنا کے امکانات کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو جائیں اور ایک ایسا وقت آجائے کہ کوئی شخص زنا کا مرتکب ہی نہ ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اس وقت زنا کی سزا کی کوئی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ یہ حکم موجود تو رہے گا لیکن نافذ العمل نہیں ہوگا۔ یا مثلاً قرآن میں ہے کہ قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے (۵/۸۹) یہ واضح ہے کہ قرآن نے غلامی کو بند کر دیا تھا۔ لیکن جو غلام اس وقت معاشرے میں موجود تھے اُن کے متعلق مختلف احکامات دیئے گئے جن سے وہ رفتہ رفتہ معاشرہ میں جذب ہو جائیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس وقت وہ غلام معاشرے میں جذب ہو جائیں اور کوئی نیا غلام بنایا نہ جاسکے تو غلامی کا وجود ختم ہو جائیگا۔ اس وقت یہ حکم کہ "کفارہ میں غلام کو آزاد کرو" نافذ العمل نہیں رہے گا۔ اسی طرح اگر کوئی معاشرہ ایسا مرفہ الحال ہو جائے کہ اس میں بھوکوں اور مسکینوں کا وجود ہی باقی نہ رہے، سب کھاتے پیتے ہوں تو یہ حکم بھی ساقط العمل ہو جائے گا کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ اُس وقت اسلامی نظام فیصلہ کرے گا کہ اس کے بدلے میں کفارہ کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ یا مثلاً اگر کوئی حکومت ایسا انتظام کرے کہ ہر ضرورتمند کو حکومت کی طرف سے قرضہ مل جائے تو پرائیویٹ لین دین کے معاملات ختم ہو جائیں گے اور ان سے متعلقہ احکام بھی جاری نہ رہیں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو

اس پر وراثت سے متعلق احکام نافذ ہی نہیں ہوں گے۔ ان مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا کہ احکام ہمیشہ حالات سے مشروط ہوتے ہیں۔ اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں جن میں ضرورت، باقی نہ رہے تو یہ احکام نافذ العمل نہیں رہیں گے۔ یاد رکھیے۔ اُس وقت بھی یہ احکام منسوخ (ABROGATE) نہیں ہوں گے۔ صرف ساقط العمل (INOPERATIVE) ہو جائیں گے۔ اگر کسی وقت پھر وہی حالات پیدا ہو جائیں، تو پھر وہی حکم نافذ ہو جائے گا۔ (جس طرح، پانی نہ ملنے کی صورت میں وضو کا حکم ساقط العمل اور تیمم کا حکم نافذ العمل ہو جاتا ہے اور جب پانی مل جائے تو پھر وضو کا حکم نافذ ہو جاتا ہے اور اگر ایسا انتظام ہو جائے کہ ملک میں ہر جگہ پانی دستیاب ہو تو پھر تیمم سے متعلق حکم کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ لیکن یہ حکم منسوخ نہیں ہوگا، اپنی جگہ باقی رہے گا۔ اگر اس کے بعد پھر ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ پانی میسر نہ ہو تو یہ حکم پھر نافذ العمل ہو جائے گا۔

(۷)

ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کی رُو سے

(i) تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری نظام کے سر ہوتی ہے۔ (اس کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس کا فیصلہ وہ نظام کرے گا)

(ii) عفو، یعنی ضرورت سے زاید، فردِ متعلقہ کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔ اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ (یہ الگ بات ہے کہ اسلامی نظام ان زوائد کو فرد کی تحویل میں رہنے دے اور صرف عندالضرورت انہیں طلب کرے یا ساتھ کے ساتھ ہی اپنی تحویل میں لیتا جائے)

(iii) "ذاتی ملکیت" اگر ہو سکتی ہے تو روزمرہ کی عام مستعملہ اشیاء میں ہو سکتی ہے۔ لیکن کسی فرد کو اس کی ضرورت ہی نہ ہوگی کہ وہ ان اشیاء کو فروخت کرے۔ اس لئے "ملکیت" عملاً استعمال تک محدود رہ جائے گی۔ یہی اشیاء بطور ترکہ آگے منتقل ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ اس کی اولاد اس ترکہ کی بھی محتاج نہ ہوگی کیونکہ اس کی تمام ضروریات معاشرہ خود پوری کر رہا ہوگا۔

ان حالات میں آپ خود سوچ لیجئے کہ ایسے معاشرے میں صدقہ و خیرات، بیع و شریٰ، اور وصیت و وراثت[1] کے احکام کی

---

[1] وراثت کے متعلق تو قرآن نے بالتصریح فرمایا ہے کہ محنت و مشقت کئے بغیر محض باپ کے ترکہ سے دولت مند بن جانا، سرمایہ پرستی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ وہ سورۃ الفجر میں واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ مفاد پرستوں کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا۔ (۸۹/۱۹) وہ میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے میراث کے احکام اس عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں ہنوز اس کا نظامِ ربوبیت قائم نہ ہوا ہو۔ جس چیز کو وہ مفاد پرستوں کا مسلک قرار دے کر اس بری طرح لتاڑتا ہے۔ اسے وہ کس طرح ربانیوں کا مسلک قرار

(باقی صفحہ ۱۹۶ پر)

ضرورت کہاں پیش آئے گی۔ یہ سب احکام عبوری دور میں ساتھ چلیں گے اور جوں جوں معاشرہ، نظامِ ربوبیت سے قریب ہوتا جائے گا۔ یہ احکام پیچھے کھسکتے چلے جائیں گے، تا آنکہ یہ نظام اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ بار ہو جائے۔ اس وقت "یہ زمین بدل جائے گی، یہ آسمان بدل جائے گا" (یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ۔ ۱۴/۴۸) اور انسانی معاشرہ کی موجودہ اقدار کی جگہ اقدارِ خداوندی لے لیں گی۔ اس لئے کہ اس وقت تمام نوعِ انسانی (ذاتی مفاد کے پیچھے کھاگنے کی بجائے) خدا کی ربوبیتِ عامہ کے قیام کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (۸۳/۶)

(۰)

اس مقام پر ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے۔ آپ کسی قوم اور کسی ملک کی تاریخ کو دیکھئے۔ اس میں اُن حضرات کو شرفِ انسانیت کے بلند ترین مقام پر دکھایا گیا ہوگا جنھوں نے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے اپنا سب کچھ دے دیا تھا۔ ان کی

دے سکتا ہے؟ ویسے بھی آپ غور کیجئے۔ ہم ہمیشہ فخر سے بیان کرتے ہیں (اور یہ چیز ہے بھی قابلِ فخر) کہ اسلامی تعلیم کی بنیاد انسانی مساوات پر ہے۔ وہ پیدائشی تفوق کو قطعاً روا نہیں رکھتا۔ اس کے ہاں برہمن کے بیٹے اور شودر کے بچے میں کوئی فرق نہیں۔ اس کی بارگاہ میں محمودؔ اور ایازؔ ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے اس میں ذات پات کی کوئی تمیز نہیں۔ یہاں تک تو ہم بیان کرتے ہیں۔ لیکن پیدائش کا وہ فرق جس کی بنا پر زندگی کے ہر شعبے میں مستقل فرق اور امتیاز پیدا ہوتا ہے، ہمارے ہاں بالکل جائز اور درست (بلکہ ضروری) قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی ہم یہ تو کہتے ہیں کہ سید کے بیٹے کو یہ حق نہیں کہ وہ محض سید کے گھر میں پیدا ہو جانے سے سوسائٹی میں مستحقِ فضیلت سمجھا جائے۔ لیکن ہم کبھی نہیں سوچتے کہ ایک کروڑ پتی کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، محض اس کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے، پیدائشی کروڑ پتی ہو جاتا ہے۔ اور پھر دولت کی بنا پر (جس کے حصول میں اس کی محنت کو کوئی دخل نہیں ہوتا) سوسائٹی کے بڑے سے بڑے امتیازات خرید لیتا ہے۔ اگر اسلام کا اصول یہ ہے کہ پیدائش کا حادثہ (INCIDENT OF BIRTH) کسی امتیاز و تفوق کا موجب نہیں بن سکتا۔ تو وہ اسے کس طرح روا رکھ سکتا ہے کہ امیر کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ محض پیدائش کی رُو سے ایسے امتیازات کا مالک بن جائے جو دولت کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ احکام اس وقت تک کے لئے ہیں جب تک صحیح قرآنی نظام وجود میں نہیں آجاتا۔ جب یہ نظام قائم ہو جائے گا تو اس وقت وہی مسلک ہوگا جس کی طرف نبی اکرمؐ نے یہ کہہ کر اشارہ فرمادیا (نحن معشر الانبیاء لا نورث) انبیاء کا گروہ وراثت نہیں چھوڑا کرتا اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز انبیاء کے لئے جائز نہ ہوگی وہ مومنین کے لئے کس طرح جائز ہوگی۔ مومنین تو انبیاء ہی کے متبع ہوتے ہیں۔ جو احکام خصوصیت سے حضورؐ کی ذات تک محدود تھے ان کی وضاحت خود قرآن میں کر دی گئی تھی۔

نہ کوئی ذاتی ملکیت تھی نہ انہوں نے ترکہ میں کچھ چھوڑا۔ خود ہمارے ہاں پہلے حضورؐ نبی اکرم کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ حضورؐ نے نہ ساری عمر دولت جمع کی اور نہ ہی کوئی مال و دولت ترکہ میں چھوڑا۔ (ظاہر ہے کہ جب حضورؐ نے دولت جمع ہی نہیں کی تھی تو مروجہ مفہوم کی رُو سے آپؐ نے زکوٰۃ بھی نہیں دی ہوگی۔ کیونکہ زکوٰۃ تو اس مال میں دی جاتی ہے جس پر ایک سال گذر جائے) حضورؐ کی زندگی کو خدا نے امت کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ تو جب حضورؐ کی زندگی یہ تھی کہ آپؐ نے نہ دولت جمع کی نہ ترکہ چھوڑا تو یہی مسلک امت کے لئے بھی واجب التقلید ہونا چاہیئے۔ جو قرآنی تعلیم کے بھی مطابق ہے۔

حضورؐ کے بعد "اولیاء اللہ" کی بھی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ ان کے پاس جو کچھ آتا وہ سب محتاجوں بھوکوں اور ناداروں کو دیدیتے۔ یعنی ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ قابلِ تعریف اسی کی زندگی ہے جو اپنا سب کچھ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کی یہی تعلیم ہے تو اس پر اعتراض پر اعتراض وارد کئے جاتے ہیں۔ یا در کھئے۔ اسلام ایک ایسا نظامِ زندگی عطا کرتا ہے جس میں ہر فرد کے لئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدے۔ بالفاظِ دیگر وہ ہر مسلمان کو "اولیا اللہ" کے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے "اولیاء اللہ" کا کوئی الگ گروہ نہیں بتایا۔ مومنین ہی کو اولیاء اللہ کہا ہے۔

P.182(1) Robert Briffault, in, The Making Of Humanity p.262

دسواں باب[۱۰]

پس چہ باید کرد؟

جیسا کہ گذشتہ باب میں لکھا جا چکا ہے، نبی اکرمؐ نے اپنے جان نثار رفقائے کار کی معیت میں تئیس برس کی مسلسل تگ و تاز کے بعد، اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، قرآن کے اس نظام کو متشکل فرما دیا جسے آپ نے انسانی معاشرہ کا منتہیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن بعد کے مسلمانوں نے اس پروگرام کو پس پشت ڈال دیا اور انفرادی مفاد پرستی کے اسی نظامِ کہن کو پھر سے مسلط کر دیا جسے یہ خود ہی کچھ عرصہ پہلے (عہدِ رسالتمآبؐ میں) ختم کر چکے تھے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

بعد کے مسلمان

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

اس انفرادی مفاد پرستی کا وہی نتیجہ نکلا جس کی بابت قرآنِ کریم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ یعنی بھوک اور خوف کا عذاب، ذلت اور رسوائی کی لعنت، عقلِ بے باک کی فرماں روائی، مفاد کا باہمی تصادم اور اس تصادم سے حسد، بغض، منافرت، عداوت کے جذبات کی برانگیختگی۔ یہ ہے وہ جہنم جس میں مسلمان صدیوں سے خود بھی مبتلا چلا آ رہا ہے اور (اس کی وجہ سے) باقی دنیا بھی مبتلائے عذاب ہے۔" اس کی وجہ؟" اس لئے کہ اگر یہ اس پروگرام کو آگے بڑھاتا جو قرآن نے تجویز کیا تھا تو وہ پھیلتے پھیلتے پوری نوعِ انسانی کو محیط ہو جاتا اور اس طرح دنیا اس عذاب سے بچ جاتی جس میں وہ آج اس طرح

ماخوذ ہے۔

یہ تبدیلی کس طرح ہوئی اور وہ کون کون سی قوتیں تھیں جنہوں نے اس نظام کی جگہ پھر سے وہی پہلا نظام مسلط کر دیا، ایک تفصیل طلب تاریخی بحث ہے جس میں ہم جانا نہیں چاہتے (کیونکہ یہ ہمارے موضوع پیشِ نظر سے خارج ہے[1])۔ قرآن نے اس ساری سرگذشت کو سورۃ اعراف کی چند آیات میں سمو کر رکھ دیا ہے جہاں کہا کہ (وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا ۔ ۷/۱۷۵)۔ انہیں اس شخص کی سرگذشت سناؤ جسے ہم نے اپنا ضابطۂ قانون دیا۔ اس نے اس پر عمل کیا اور اس کے زندہ نتائج اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لئے۔ لیکن اس کے بعد (فَانْسَلَخَ مِنْهَا) وہ اس نظام سے اس طرح نکل کر الگ ہو گیا جس طرح کسی جانور کی کھال کھینچ لی جائے اور اس کے گوشت پر اس کا نشان تک باقی نہ رہے یا جس طرح سانپ کینچلی سے نکل جاتا ہے۔

مسلمانوں کی سرگذشت

اس قوم نے اس طرح قرآن کو چھوڑا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ ۷/۱۷۵) شیطان نے اسے جھٹ سے آن دبوچا۔ وہ تو اس تاک میں بیٹھا تھا کہ یہ کب نظامِ قرآنی کے محفوظ قلعے سے نکلے اور میں اسے دبوچ لوں۔ شیطان نے کیا دبوچنا تھا، یہ قرآن چھوڑنے کا فطری نتیجہ تھا!

مگر کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیّاد ہوتا ہے!

قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ مشیت کے قانون کے مطابق زندگی بسر کئے جاتے، تو ہم انہیں آسمان کی بلندیوں تک لے جاتے۔ (وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا ۔ ۷/۱۷۶) لیکن یہ معاشی مفاد پرستیوں کے ساتھ چپک گئے اور اپنے خود ساختہ نظام کا اتباع کرنے لگ گئے (وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۔ ۷/۱۷۶) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی مفاد کی لامتناہی ہوس نے ان میں جوع الکلب کی سی کیفیت پیدا کر دی کہ اسے کھلاؤ یا دھتکارو، ہر حال میں اس کی زبان باہر لٹکتی رہتی ہے (فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۔ ۷/۱۷۶) یہ کیفیت ہر اس قوم کی ہو جاتی ہے جو ہمارے ضابطۂ قانونِ ربوبیت کو جھٹلائے۔ لہٰذا تم اس قوم کی کہانی اپنے دور کے مخاطبین کو سناؤ تاکہ وہ غور و فکر کریں کہ انہیں کیا ہو گیا۔ (فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ ۷/۱۷۶) ان سے کہو کہ تم سوچو کہ کس قدر بُری حالت ہوتی ہے اس قوم کی جو خدا کے ضابطہ کی تکذیب کرے اور کس قدر کمی واقع ہو جاتی ہے اس کی ذات کی نشوونما

---

[1] اسے میری کتاب "شاہکارِ رسالت" کے آخری باب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

ہیں (سَآءَ مَثَلًا ۨ الْقَوْمُ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا یَظْلِمُوْنَ - (۷/۱۷۷)۔

قرآن کریم نے قوموں کے استخلاف و استبدال (SUCCESSION AND SUBSTITUTION) کے جو قوانین بیان کئے ہیں ان پر غور کیجئے۔ حقائق و بصر کی ایک عجیب دنیا آپ کے سامنے آ جائیگی۔ ان قوانین کی تفاصیل طول طویل ہیں لیکن اس نے ان قوانین کے اصل الاصول کو سورۃ محمد کی آخری آیت میں نہایت حسن و ایجاز سے سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ جہاں فرمایا ہے کہ ھٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ - (۴۷/۳۸) تم وہ ہو جنھیں یہ دعوت دی گئی تھی کہ تم نوعِ انسانی کے مفادِ کلی کے لیے سب کچھ کھلا رکھو لیکن تم نے اس کی جگہ "سمیٹنے اور جمع کرنے" کا شیوہ اختیار کر لیا (فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ) لیکن اس سے تم نے خود اپنا ہی نقصان کیا۔ تم نے مال و دولت کو روکا تو تمہاری اپنی ذات کی نشو و نما رک گئی (وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ) اللہ کو تمہاری دولت کی ضرورت نہ تھی تمھیں اس کے نظام کے محتاج تھے (وَ اللّٰهُ الْغَنِیُّ وَ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ) بہرحال اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم نے اس نظام سے روگردانی کی تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا۔ اور پھر وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی (۴۷/۳۸) اس نے کہہ دیا کہ تمھیں اقوامِ عالم پر جس قدر افضلیت نصیب ہوئی ہے وہ صرف اس نظام کی وجہ سے ہے جو تم نے ربوبیتِ عامہ کے لئے قائم کیا ہے۔ اگر تم اس کی جگہ پھر اسی مفاد پرستی کے نظامِ کہن کو لے آؤ گے تو یہ امتیازات تفوقات سب چھن جائیں گے چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ یہی ہوا۔ یاد رکھیئے کہ قوموں کی ہلاکت و بربادی کی یہی شکل نہیں ہوتی کہ وہ قوم طبعی طور پر فنا کر دی جائے اور صفحۂ ارض پر اس کا کوئی ایک فرد بھی باقی نہ رہے۔ تباہی کی بدترین شکل یہ ہے کہ وہ قوم طبعی طور پر تو زندہ رہے لیکن اس کا شمار زندہ قوموں میں نہ ہو۔ یہی وہ عذاب ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے۔ ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی - (۸۷/۱۳)۔ کہ جہنم میں نہ انہیں موت آئے گی اور نہ ہی زندگی نصیب ہوگی۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ مسلمان صدیوں سے اسی جہنم کے عذاب میں مبتلا چلا آ رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قعرِ مذلت میں گر گئی، یا اس کی باز آفرینی کی کوئی صورت بھی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اس کا امکان ہے لیکن اس کی صورت وہی ہے۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی　　(اقبالؒ)

سرگزشتِ آدم

اگر یہ پھر خدا کے ضابطہ کو اپنا راہنما بنا لیں تو پھر وہی فراوانیاں حاصل ہو جائیں گی اور اگر اس سے بدستور روگرداں رہے تو یہی حالت رہے گی۔ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِیْ وَ مَنْ

یُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ ۷:۱۷۸)۔ اس کے لئے قرآن میں بیان کردہ قصّہ آدم کو پھر سے سامنے لائیے۔ قرآن کہتا ہے کہ آدم جنت میں تھا جہاں اسے کھانے پینے، رہنے سہنے کے متعلق کسی قسم کی پریشانی نہ تھی۔ رزق کی کشائش اور سامانِ زیست کی فراوانی تھی۔ یہ اس لئے تھا کہ معاشی پریشانیاں اس مقصدِ عظیم کی راہ میں حائل نہ ہوں جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا۔

آدم ابلیس[1] کے چکمے میں آگیا۔ فرزندانِ آدم میں سے ہرایک اپنی اپنی فکر میں لگ گیا۔ وہ ایک دوسرے سے دور دور ہوتے گئے حتیٰ کہ یہ بُعد حسد اور کینے، بغض اور عداوت میں تبدیل ہوگیا۔ رزق کی کشائش، تنگی میں بدل گئی۔ آدم بھوک، برہنگی، بے سروسامانی، خوف و ہراس کے عذاب میں مبتلا ہوگیا۔ اس طرح آدم جنّت سے نکل گیا۔ اب اس کی ساری توانائیاں محض روٹی حاصل کرنے اور اولاد پالنے کی فکر میں ضائع ہوگئیں۔ زندگی کا وہ بلند مقصد جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

آدم مایوس ہوگیا۔ اس کی فضائے حیات میں امید کی کوئی کرن باقی نہ رہی۔ وہ بے حد غمگین اور اداس رہنے لگا۔ وہ اپنی زندگی تک سے بیزار ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔

لیکن اس سے خدا نے کہا کہ مایوس اور غمگین ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تمہارا جرم ایسا نہیں جس کی تلافی نہ ہوسکے۔ تم ہمارے بنائے ہوئے راستے پر چل نکلو۔ سیدھے جنّت میں پہنچ جاؤ گے۔ اس کے بعد تم جنت سے نکالے نہیں جاؤ گے۔ اس لئے کہ یہ جنت تمہارے خونِ جگر سے تعمیر ہوگی۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگی۔ (وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ۔ ۴۳:۷۲-۷۳)

یہ وہ جنت ہے جس کے تم اپنے اعمال کے عوض مالک بنائے گئے ہو۔ اس میں تمہارے لئے سامانِ زیست کی فراوانیاں ہیں۔

یہ ہے آدم کا تمثیلی قصّہ از روئے قرآن۔ اور یہی ہے امتِ مرحومہ کی سرگذشت! عہدِ رسالتمآبؐ میں جب قرآنی پروگرام سامنے تھا مسلمان اس جنت میں تھا جس میں "دودھ کی نہریں بہتی تھیں اور شہد کے حوض بھرے تھے"۔ اسے ہرقسم کی فراوانیاں حاصل تھیں (اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ) اس کے بعد یہ "ابن آدم" اس جنت سے نکل گیا اور اس پر چاروں طرف سے مایوسی چھاگئی۔ یہ مایوسی آج اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہے۔ اس عذاب سے بچنے کا ایک

---

[1] ابلیس۔ ابلاس سے ہے جس کے معنی ہی مایوسی اور ناامیدی ہے۔

ہی طریقہ ہے اور یہ طریقہ وہی ہے جو آدم کو بتایا گیا تھا۔ (فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔۲/۳۸)
جس نے قرآنی پروگرام کو اپنا ضابطۂ حیات بنا لیا اس کے لئے کوئی خوف و حزن نہیں ہوگا۔ قرآن کا پروگرام اس
کے سوا کیا ہے کہ :۔

با مسلمان گفت جان بر کف بنہ
ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ (اقبالؒ)

لیکن اصل سوال یہ سامنے آتا ہے کہ جس حالت سے ہم آج گزر رہے ہیں، اس میں آغازِ کار کیسے ہو؟ بات شروع کہاں سے کی
جائے؟ اس نظام کی خشتِ اوّلین کون رکھے؛ اس کی ابتدا کیسے ہو؟ یہ ہے وہ سوال جو ان قلوب کو وقفِ اضطراب
رکھتا ہے، جنھوں نے سمجھ لیا ہے کہ کرنے کا کام یہی ہے کہ اس نظام کو دوبارہ متشکل کیا جائے۔ ان کی گاڑی یہیں آکر رک
جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس سوال کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

ذرا تصور میں لایئے اس منظر کو کہ قحط سالی کا زمانہ ہے۔ غلہ کمیاب ہے۔ اوپر سے نئی فصل بونے کا زمانہ آگیا ہے۔
دو کسان ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک من گیہوں ہے۔ ایک کسان
اٹھتا ہے اور اپنا گیہوں پسوا کر لے آتا ہے۔ دو ہی گھنٹے بعد اس کے ہاں سفید گیہوں کی نہایت عمدہ روٹیاں پکنی شروع
ہو جاتی ہیں جنھیں وہ بھی خوش ہو کر کھاتا ہے اور اس کے بچے بھی۔

لیکن دوسرا کسان اپنا گیہوں سر پر اٹھا کر باہر لے جاتا ہے اور اس کھیت میں ڈال آتا ہے جو اس نے آئندہ فصل کے
لئے تیار کر رکھا ہے۔ اس کے گھر میں گیہوں کی روٹیاں نہیں پکتیں۔ اسے اور اس کے بچوں کو اکثر اوقات باجرہ اور مکئی پر
گزارہ کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات فاقے تک کی بھی نوبت آجاتی ہے لیکن وہ اس عسرت کو برداشت کرتا ہے۔ ہر صبح
اٹھ کر اپنے کھیت میں چلا جاتا ہے۔ دن بھر محنت کرتا ہے۔ چھ سات مہینے مسلسل کڑکڑاتے جاڑے اور چلچلاتی دھوپ
میں اپنا لہو پانی ایک کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کی کھیتی پکتی ہے اور اس کا سارا گھر غلّے سے بھر جاتا ہے۔ اب اسی غلہ
میں سے یہ اور اس کے بچے سال بھر تک مزے سے کھاتے ہیں اور آئندہ فصل کے لئے بیج بھی رکھ لیتے ہیں۔ اب اس
سلسلہ کا ایک دور (CYCLE) بندھ جاتا ہے۔

پہلے کسان نے اپنی نگاہ فوری مفاد (IMMEDIATE GAIN) پر رکھی۔ اس نے چار دن عیش کر
لئے۔ اس کا حال خوشگوار ہو گیا۔ لیکن مستقبل میں اس کا کوئی حصہ نہ رہا۔ (مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۔۲/۲۰۰)
دوسرے کسان نے اپنی نگاہ مستقبل پر رکھی۔ شروع شروع میں اسے تکلیف تو ضرور ہوئی لیکن اس کے بعد اس

کا حال بھی خوشگوار ہوگیا اور مستقبل بھی درخشندہ۔ (فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ)

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی بنا پر اس دوسرے کسان نے مفادِ عاجلہ سے صرفِ نظر کرکے اتنی جانکاہ مشقتوں کو مول لیا، فاقے جھیلے، مصیبتیں برداشت کیں، اس قدر محنت کی، حالانکہ دوسرے کسان کی مثال اس کے سامنے تھی کہ دو گھنٹے میں اس کے گھر عمدہ عمدہ روٹیاں پکنی شروع ہوگئی تھیں۔ اس سوال کا جواب ظاہر ہے۔ اس کسان کو یقین تھا کہ جو دانہ آج مٹی میں ملایا جارہا ہے، اس سے سات سات سو دانے نکلیں گے۔ مستقبل کا یہی یقین تھا جس کی بنا پر اس نے مفادِ عاجلہ کو چھوڑا اور اس قدر مصائب اور تکالیف برداشت کیں۔ اگر اسے اس امر کا یقین نہ ہوتا کہ اس پروگرام سے ایسے درخشندہ نتائج مرتب ہوں گے تو وہ کبھی اپنی متاعِ عزیز (گیہوں) کو اس طرح

ایمان بالغیب

مٹی میں نہ ملا دیتا۔ مستقبل کے ان دیکھے نتائج پر اس طرح کا محکم یقین "ایمان بالغیب" کہلاتا ہے۔ لہٰذا، یہ کسان کا ایمان بالغیب ہے جو اسے مفادِ عاجلہ کی جاذبیت میں کھو جانے سے باز رکھتا ہے اور اتنا عرصہ محنت اور مشقت کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

لیکن اس کسان کی مثال میں پھر بھی یہ شکل تھی کہ اس نے خود بھی اس سے پیشتر کئی بار اس قسم کا تجربہ کیا تھا، اور اسی طرح باربار دوسروں کی کھیتی کو اُگتے بھی دیکھا تھا اس لئے اس کا یہ ایمان، درحقیقت ایمان بالغیب (ان دیکھے نتائج پر ایمان) نہ تھا۔ اس کا ایمان سنتہ اللہ (خدا کے غیر متبدل قوانین) پر تھا۔ اس حقیقت پر ایمان کہ کائنات کا یہ قانون اٹل ہے کہ اگر زمین کو ایک خاص طریق پر تیار کیا جائے، پھر اس میں بیج ڈالا جائے اور اس کے بعد ایک خاص انداز سے اس کی دیکھ بھال کی جائے، تو یہی دانہ فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

لیکن ذرا سوچئے کہ اگر کسی شخص نے نہ تو پہلے ایسا تجربہ کیا ہو اور نہ ہی اس نے کسی اور کی کھیتی کو اُگتے دیکھا ہو۔ اور اس سے ایک شخص آکر کہے کہ اپنے غلے کو باہر لے جاکر مٹی میں ملا آؤ۔ اس سے کھلیان تیار ہو جائے گا، تو اس تجویز پر عمل پیرا ہونے کے لئے کسان کو بڑے محکم یقین کی ضرورت ہوگی۔ پہلے تو اس کا اپنا دل اس پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اگر وہ کسی نہ کسی طرح آمادہ ہو بھی جائے گا تو دوسرے لوگ اسے "پاگل" قرار دے کر اس کا مذاق اڑائیں گے۔ یہ چیز بھی اس کے دل میں تذبذب پیدا کرے گی۔ وہ اس سے کہیں گے کہ تیری مت ماری گئی تم نے اس سے پہلے کبھی دیکھا سنا کہ اچھے بھلے اناج کو مٹی میں ملا دیا جائے تو اس سے غلے کا ڈھیر برآمد ہو جائے۔ اگر وہ ان حوصلہ شکن اور شکوک انگیز باتوں کو بھی برداشت کرے گا تو تخم ریزی اور فصل کی تیاری کا درمیانی عرصہ بڑے بیم و رجا میں گزرے گا۔ کسی دن ذرا تیز ہوا چلی اور وہ گھبرایا۔ کہیں زور کا مینہ برسا اور وہ ڈرا۔ غرضیکہ اسے قدم قدم پر ڈرانے اور بہکانے والے چھلاوے دکھائی دیں گے۔ اگر وہ ان تمام

صبرآزما اور ہمت شکن مراحل سے بخیر و خوبی گذر گیا تب کہیں جا کر اسے یقین آئے گا کہ ایک دانہ واقعی کھلیان پیدا کر دیتا ہے۔

ابتدا کرنے والے

اس مثال سے آپ اس جماعت کا اندازہ لگائیے جو نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے سب سے پہلی بار اٹھتی ہے۔ جو تصور ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے وہ دنیا جہان سے نرالا ہوتا ہے۔ جو پروگرام ان کیلئے وضع کیا جاتا ہے، وہ عام زمانہ کی عام روش سے یکسر الگ ہوتا ہے۔ زمانے کا معمول یہ چلا آرہا ہے کہ ہر شخص "لینے" کی فکر کرے۔ اسی میں اس کی حفاظت ہے۔ یہی اس کی اپنی عقل کا تقاضا ہوتا ہے اور یہی سارے زمانے کی روش۔ اسی روش (اور معمول کا "زندہ نتیجہ" ہر شخص کے سامنے ہوتا ہے (اس کسان کی طرح جو اپنا غلہ پسوا کر روٹیاں پکانے لگ جاتا ہے) اس کے برعکس ان سے کہا جاتا ہے کہ زندگی کے تحفظ کا راز "لینے" میں نہیں، "دینے" میں ہے۔ "لینے" کا فائدہ (مفادِ عاجلہ) بالکل سامنے ہوتا ہے۔ لیکن "دینے" کا فائدہ نگاہوں سے یکسر اوجھل ہوتا ہے۔ اس جماعت کو اس نئے تجربے پر آمادہ کرنے کے لئے صرف ایک ہی قوت کارفرما ہو سکتی ہے یعنی اس امر پر یقین محکم کہ زندگی کا یہی نظریہ صحیح ہے اور یہ پروگرام زندہ اور پائندہ نتائج برآمد کر کے رہے گا۔ یہ کبھی ناکام نہیں رہے گا۔ اس کا نام ہے ایمان بالغیب۔ یعنی اس پروگرام کے اَن دیکھے نتائج پر محکم یقین۔ غیر متزلزل یقین۔ قرآن، السابقون الاوّلون (PIONEERS) کی اس جماعت کے لئے، اسی ایمان بالغیب کو سنگِ بنیاد قرار دیتا ہے۔ بعد میں آنے والے تو اس پروگرام کے حسین نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں لیکن السابقون الاوّلون (۹/۱۰۰) کی یہ جماعت صرف اس کے اَن دیکھے نتائج پر ایمان رکھنے سے اس پر عمل پیرا ہو سکتی ہے۔ برٹرنڈرسل کے نزدیک مہذب اور وحشی میں فرق یہ ہے کہ "مہذب انسان مستقبل کے حظائظ کے لئے امروز کے آلام برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ خواہ مستقبل دور ہی کیوں نہ ہو۔" (۱)

قرآن کا پہلا ورق

قرآن کا پہلا ورق الٹئے۔ اس کی ابتدا اسی نظامِ ربوبیت کے تعارف سے ہوتی ہے (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) زندگی کا وہی نقش قابلِ ستائش ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق، تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ضامن ہو) اس تعارف کے بعد اس جماعت کا ذکر سامنے آتا ہے جس نے پہلی بار اس پروگرام کو عمل میں لانا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ (ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ ۲/۲) اس پروگرام کے صحیح اور یقینی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس لئے اس سے دل میں کسی قسم کا اضطراب نہیں پیدا ہونا چاہیئے۔ (رَیْب کے معنی شک و شبہ اور اضطراب دونوں ہیں۔) لیکن یہ ضابطۂ حیات صرف ان لوگوں کی راہ نمائی کر سکتا ہے جو اس کے اَن دیکھے نتائج پر یقین محکم رکھیں۔ (ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ۔ ۲/۲)

اس کے بعد اس پروگرام کے وہ دونوں اصول بیان ہوتے ہیں جن پر اس کی ساری عمارت اٹھتی ہے۔ یعنی اقامت الصلوٰۃ اور سامانِ نشوونما کو کھلا رکھنا۔ (وَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ ۲/۳) پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اس یقین آفرینی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس پیش کردہ تصور اور اس کے عملی پروگرام پر غور کریں اور اس طرح اس کی صداقت پر ایمان لائیں۔ اس کے ساتھ تاریخی یادداشتوں سے اس حقیقت پر غور کریں کہ اس سے پہلے بھی یہی تصورِ حیات اور پروگرام دنیا کے سامنے آتا رہا ہے۔ اُس وقت اس نے کیا نتائج مرتب کئے تھے اور اس کے خلاف نظریاتِ زندگی کی حامل قوموں کا کیا انجام ہوا تھا۔ (وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۲/۴) اس طرح انہیں مستقبل کی زندگی اور اس کی پابندگی پر یقین آجائے گا (وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ ۲/۴) جو جماعت اس طرح یقین پیدا کرکے اس راستے پر چل پڑے گی، اس کی کھیتی پروان چڑھے گی اور اس کے بیج فصل بن جائیں گے۔ (اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ ۲/۵)

لہٰذا اس نئے تجربہ، نئے پروگرام، نئے اندازِ زندگی کے لئے السابقون الاولون کا یقینِ محکم (ان دیکھے نتائج پر ایمان) ہی وہ قوت ہے جس کے آسرے، وہ اس انقلابی نظریہ کو اختیار کرکے اس کے حصول کے لئے جادہ پیما ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ اس نظریۂ زندگی کی خوشگواریوں اور اس کے خلاف دوسرے تصورِ حیات کی ہلاکت انگیزیوں سے صرف ان ہی لوگوں کو آگاہ کیا جا سکتا ہے جو خدا کے قانونِ ربوبیت کے ان دیکھے نتائج کی عظمت کو اپنے دل میں لئے ہوں۔ (اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ۔ ۳۵/۱۸) اور اس کے لئے اقامت الصلوٰۃ اختیار کریں۔ (وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ۔) اور اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان رکھیں کہ دوسروں کی نشوونما سے درحقیقت ان کی اپنی نشوونما ہوتی ہے (وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ۔ ۳۵/۱۸) اس ایمان بالغیب کے سہارے یہ جماعت اس جدید پروگرام کو لے کر چلے گی۔ لیکن یہ راہ "خراماں خراماں ارم" کی راہ نہیں جس میں ہر طرف پھولوں کے فرش بچھے ہوں۔ یہ راہ کانٹوں کی راہ ہے۔ اس میں قدم قدم پر ایسے خطرناک تصادم ہوں گے اور اس قسم کے ہول انگیز واقعات و حوادث پیش آئیں گے کہ یہ گھبرا کر پکار اٹھیں گے کہ خدا کی وہ نصرت کہاں ہے جس کا ہم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس راستے پر چلنے والوں سے پہلے ہی کہہ دیا گیا کہ:-

صبر آزما مراحل

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ (۲/۲۱۴)

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اس جنتی زندگی میں یونہی پہنچ جاؤ گے۔ دراں حالیکہ تم پر ابھی ایسے حوادث گزرے ہی نہیں جو ان لوگوں کو پیش آتے تھے جو تم سے پہلے اس راہ پر چلے تھے۔ ان پر اس قدر سختیاں اور مصیبتیں آئیں کہ ان کے دل دہل گئے۔ یہانتک کہ اس پروگرام کا داعیٔ اول (رسول) اور اس کے ساتھی (مومنین کی جماعت) پکار اٹھے کہ " اے نصرتِ الٰہی! تو کب آئے گی؟

اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہ راستہ بڑا کٹھن اور یہ منزل بڑی دشوار گذار ہے۔ اس میں استقامت کی بڑی ضرورت ہے۔ (اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ۔ ۳۰/۴۱) جن لوگوں نے خدا کے قانونِ ربوبیت کو اپنا نصب العین بنا لیا اور اس راہ پر نہایت استقلال و استقامت سے گامزن ہو گئے تو) یہ ہیں وہ لوگ کہ قانونِ ربوبیت کے نتائج مرتب کرنے والی کائناتی قوتیں ان کی ممد و مددگار ہوں گی۔ (تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ ۔ ۳۰/۴۱) جو انہیں یقین دلائیں گی کہ ان کے لئے خوف و حزن کی کوئی وجہ نہیں۔ (اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا ۔ ۳۰/۴۱) اور وہ انہیں اس "جنت" کی بشارتیں دینگی جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا (وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۔ ۳۰/۴۱) اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ قوتیں ان کے قریبی مفاد کی زندگی (حَیٰوۃُ الدُّنْیَا) میں بھی ان کی رفیق و سازگار ہوں گی اور مستقبل کی زندگی میں بھی ان کی معین و مددگار (نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۔ ۳۱/۴۱) اور اس طرح قریب و مستقبل (دنیا و آخرت) دونوں میں، جو کچھ ان کا جی چاہے گا ملے گا اور جو کچھ وہ طلب کریں گے اُن کے سامنے آجائے گا۔ (وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ۔ ۳۱/۴۱)

اس دعوتِ انقلاب کی مخالفت ہوگی ہر اس مفاد پرست گروہ کی طرف سے جو دوسروں کی کمائی پر جینے اور عیش کرنے کا خوگر ہو چکا ہے۔ ذرا غور کرنے پر یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ یوں تو دنیا میں ہر شکار میں ایک لذت ہوتی ہے لیکن یہ لذت اپنی انتہا تک پہنچ جاتی ہے جب ایک انسان، کسی دوسرے انسان کا شکار کر رہا ہو۔ معلوم انسان کے خون میں کیا لذت ہے کہ (کہتے ہیں کہ) جب شیر کے منہ کو آدمی کا خون لگ جائے تو وہ پھر کسی جانور کے خون سے مطمئن نہیں ہوتا۔ شیر کا تو پتہ نہیں، لیکن انسانوں کی دنیا تو ہمارے سامنے ہے۔ اس میں یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں کہ ہر انسان دوسرے انسان کے شکار کی گھات میں لگا رہتا ہے۔ انسان کی ساری تاریخ درحقیقت اسی سلسلۂ صید و صیاد کی تاریخ ہے۔

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

جس چیز نے دنیا کو ایسا جہنم بنا رکھا ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹے ہوئے ہیں (نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی

اَلْاَفْئِدَۃِ ۔ ۱۰۴ـ۶) ۔ وہ اس کے سوا کیا ہے کہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح دوسرے کے خون کی رنگینی اس کے چہرے کی سرخی کا باعث بن جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب کوئی جماعت اس نظامِ ربوبیت کے قیام کی کوشش کرے گی جس میں کوئی ایسا شخص جس میں کمانے کی استطاعت ہے کسی دوسرے انسان کی محنت سے فیض ہی حاصل نہ کر سکے اور کوئی شخص رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت قرار دے کر دوسرے انسانوں کو خدا کی نعمت سے محروم نہ کر دے، تو ان لوگوں کی طرف سے اس جماعت کی مخالفت ضروری ہے جن کے منہ کو انسان کا خون لگ چکا ہے۔ اس مخالفت میں سرمایہ داروں اور مذہبی

مفاد پرستوں کی طرف سے مخالفت

پیشواؤں کی جماعت پیش پیش ہوگی کیونکہ یہی لوگ دوسروں کی کمائی پر موٹے ہوتے ہیں۔ وہ ایک طرف (بزعمِ خویش) "علمی دلائل" پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس قسم کا نظام "انسانی فطرت" کے خلاف ہے۔ ان کی دلیل یہ ہوگی کہ اگر تمام لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی جائیں گی، تو وہ کام ہی نہیں کریں گے۔ یا یہ کہ جب کسی شخص کو یہ معلوم ہوگا کہ اسے اس کی ضروریات سے زیادہ کچھ نہیں مل سکتا تو وہ اپنی جان کیوں مارے گا؟ وہ کہیں گے کہ انسان ضرورت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے کام لینے کا اور کوئی طریقہ نہیں (MANDEVILLE) کے الفاظ میں:-

> غریبوں سے کام لینے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انہیں محتاج رکھا جائے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ضروریات کو تھوڑا تھوڑا پورا کیا جائے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز کر دینا حماقت ہے۔ (۲)

یا (TOWNSEND) کے الفاظ میں:-

> بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تند سے تند جانور کو بھی رام کر لیتا ہے۔ اس سے سرکش سے سرکش انسان مطیع و فرماں بردار بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے یعنی بھوک۔ بھوک ہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔ (۳)

چنانچہ (DEFOE) نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "اگر غریبوں کی مدد کی گئی تو وہ سہل انگار ہو جائیں گے۔ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ وہ اپنا رزق آپ تلاش کریں اور کام نہ ملنے کی صورت میں فاقہ کشی کریں۔ (۴) وہ کہیں گے کہ یہی طریقہ ہے جس سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور ہر شخص دن رات محنت میں لگا رہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جن لوگوں کی آنکھیں صرف قریبی مفادِ خویش کو دیکھتی ہیں اور اس سے آگے نہیں جاتیں ان کے علم کی حد بھی ایسی ہی تنگ ہوتی ہے۔ (..... وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۔ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ..... ۵۳ ۔ ۲۹ ۔ ۳۰)

دوسری طرف مذہبی پیشواؤں کا گروہ آگے بڑھے گا اور شریعت کے نام پر فتویٰ صادر کرے گا کہ جو شخص اپنے سرمایہ میں سے زکوٰۃ نکال دیتا ہے اس کا سارا سرمایہ پاک اور طیب ہو جاتا ہے۔ جو شخص اپنی کمائی سے (یا بزرگوں کی وراثت سے) زمین، جائیداد وغیرہ خریدتا ہے، وہ اس کا شرعاً جائز مالک ہے۔ اس کی ملکیت پر نہ کوئی حد عاید کی جا سکتی ہے اور نہ ہی اس سے اسے محروم کیا جا سکتا ہے۔ غریب اور امیر کی تفریق خود خدا نے رکھی ہے اس لئے اس تفریق کو مٹانا منشائے خداوندی کے خلاف ہے۔ اگر دنیا میں غریبوں کا طبقہ نہ رہے تو صدقہ اور خیرات کے تمام احکام بے معنی ہو کر رہ جائیں..... اگر لوگ جائیدادیں چھوڑ کر نہ مریں، تو وراثت اور وصیت کے تمام قوانین بے مطلب ہو کر رہ جائیں۔ لہٰذا (ربوبیتِ عامہ کی) یہ نئی آواز، الحاد اور بے دینی ہے۔ یہ اس مسلک کے خلاف ہے جو اسلاف سے متواتر چلا آ رہا ہے۔ عوام ان "دلائل" سے مطمئن ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ وہ ہر موجودہ سسٹم کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ اس کی جگہ کسی دوسرے نظام کے متعلق سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ وہ اپنی جہنمی زندگی میں رہنا پسند کرتے ہیں لیکن اپنے دل و دماغ سے کام لے کر اپنے نظام میں تبدیلی کی جرأت نہیں کرتے۔ (وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۔ 7/179)۔ یہ جہنمی وہ ہیں کہ دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن راستہ دیکھ کر چلنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کرتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن سننے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ کہتے یہ ہیں کہ جس راہ پر ہم چلتے چلے آ رہے ہیں وہی راہ حق و صداقت کی راہ ہے۔ وہ انسان نہیں حیوان ہیں (أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ ۔ 7/179) بلکہ ان سے بھی گئے گزرے (بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۔ 7/179) حیوانات کی تو پھر بھی یہ حالت ہے کہ انہیں صرف ایک وقت میں پیٹ بھرنے کی فکر ہوتی ہے، جمع کرنے کی نہیں۔ اور انسان کا یہ عالم ہے کہ اس کا کبھی پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ ایسا انسان حقیقت سے کس قدر بے خبر ہے (أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ 7/179) قرآن کہتا ہے کہ یہ "دلائل" انسان کے خود ساختہ مفاد پرستانہ مسلک کے ہیں۔ خدائی نظام کے نہیں۔ خدائی نظام کی دعوت یہ ہے کہ ارض (معاشی پیداوار کا ذریعہ) تمام نوعِ انسانی کے لئے کھلا رہے۔ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی (الناس) نہایت خوشگواری سے (طیبا) کھائے پیئے (يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ۔ 2/168)۔ لیکن "شیطان" یہ چاہتا ہے کہ انسانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دے۔ لہٰذا اس کے مسلک کی پیروی نہ کرنا (وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۔ 2/168)۔ وہ اس مقصد کے لئے ایسے نظام کی تلقین کرتا ہے جس میں ناہمواریاں رہیں اور ہر شخص بخل کرے (إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ ۔ 2/169) دیکھنا! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ناسمجھی سے اس نظام کو خدا کا نظام سمجھنے لگ جاؤ۔ (وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ 2/169) ایسے نظام کو، نظامِ شریعت بتانے والوں سے کہو

کہ تم خدا کی کتاب سے اس کی سند لاؤ۔ وہ اس سے کبھی سند نہیں لاسکیں گے۔ لیکن اس کے جواب میں کہیں گے کہ ہمارے اسلاف یہی کچھ کہتے چلے آرہے ہیں جو ہم کہتے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ خدا کا نظام کیا ہے؟ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا (۲/۱۷۰) قرآن کہتا ہے کہ ذرا سوچو کہ یہ کیا دلیل ہے؟ یعنی "ہم اپنے آباو اجداد کے نقشِ قدم پر چلتے رہیں گے خواہ وہ راہ عقل و فکر کے بھی خلاف ہو اور ہدایتِ خداوندی کے بھی خلاف"؟ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ (۲/۱۷۰) قرآن کہتا ہے کہ اگر نظامِ خداوندی کی دعوت دینے والی پارٹی نے اس طرح استقامت برتی اور تمام مخالفتوں کا مقابلہ کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی تو اس کے بعد وہ وقت آجائے گا جب مشیّت کے اٹل قانون کے مطابق ان کا تعمیری پروگرام، مخالفین کے تخریبی پروگرام پر غالب آجائے گا۔ اسی کا نام

ظہورِ انقلاب

انقلاب ہے۔ اگرچہ اس (انقلاب) کی ترتیب ایک عرصہ سے شروع ہوچکی ہوتی ہے (یعنی اس وقت سے جب سے اس جماعت نے اس انقلابی فکر کو عام کرنا شروع کیا تھا) لیکن اس کا ظہور اس طرح دفعۃً، غیر متوقع طور پر ہوتا ہے کہ مخالف قوتیں دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتی ہیں کہ یہ کیا ہوگیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے سورۃ انعام میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ○ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۶/۳۱-۳۲)

یہ جماعت جو سمجھے بیٹھی تھی کہ خدا کے قانونِ مکافات سے ان کا کبھی آمنا سامنا (ٹکراؤ) نہیں ہوگا، تباہ ہوکر رہے گی۔ حتیٰ کہ جب انقلاب کی گھڑی دفعۃً نمودار ہوجائے گی تو وہ کفِ افسوس مل کر کہیں گے کہ اس باب میں جو کچھ ہماری طرف سے ہوتا رہا، اس پر ہمیں ندامت ہے۔ لیکن انہیں یہ پشیمانی اس وقت ہوئی جب ان کے اعمال اپنا نتیجہ مرتب کرچکے تھے۔ ان کے اعمال کس قدر ناہمواریاں پیدا کرنے والے تھے! اس وقت وہ دیکھیں گے کہ قریبی مفاد پرستی کا نظریۂ زندگی کس طرح بچوں کا کھیل اور سعیٔ لاحاصل تھا۔ اس کے برعکس، جن لوگوں نے اپنی جدوجہد کو خدا کے قانونِ ربوبیت سے ہم آہنگ رکھا، ان کے مستقبل کی نئی زندگی کس قدر منفعت بخش ثابت ہوئی۔ اے کاش! یہ لوگ اس حقیقت کو پہلے سمجھ لیتے!

انقلاب کی ساعت (یعنی ظہورِ نتائج کے وقت)، پشیمانی اور ندامت کچھ کام نہیں دے گی۔ اس لئے کہ نتائج برآمد ہونے کے بعد پیچھے نہیں ہٹا کرتے۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ہے کہ تم شروع ہی سے اپنی تمام توجہات اس نظامِ زندگی پر مرکوز

کرو دو جو معاشرہ میں توازن پیدا کرنے کا موجب ہے (فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ - ۳۰/۴۳) قبل اس کے کہ نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں۔ کیونکہ جب نتائج سامنے آجاتے ہیں تو پھر واپس نہیں جایا کرتے (مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ - ۳۰/۴۳) اُس وقت، جس طرح یہ دونوں جماعتیں (اس نظام کی موافق اور مخالف) ایک دوسرے سے الگ الگ تھیں، ان کی جدوجہد کے نتائج بھی متمیز طور پر الگ الگ سامنے آجائیں گے۔ (يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ) جس جماعت نے قانونِ خداوندی سے انکار کیا تھا، اس کی منکرانہ جدوجہد کے نتائج اس کے سامنے ہوں گے (مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ) اور جس نے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل کیا تھا اور اس طرح اپنے مستقبل کی زندگی کے لئے زمین ہموار کر لی تھی (وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ - ۳۰/۴۴)۔ تو اس جماعت کے ایمان اور اعمالِ صالح کے نتائج، زندگی کی مرفہ الحالی اور خوشگواری کی شکل میں سامنے آجائیں گے۔ (لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ - ۳۰/۴۵) یہ وہ خوشگواریاں ہیں جن سے اول الذکر (انکار کرنے والی جماعت) محروم رہے گی۔ (اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ - ۳۰/۴۵)

یہ کچھ یوں ہی اتفاقیہ (BY CHANCE) نہیں ہو جائے گا بلکہ خدا کے اٹل قانون کے مطابق ہوگا۔ وہ قانون جس نے اعلان کر رکھا ہے کہ:-

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ - (۳۸/۲۸)

کیا (یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ) ہم ان لوگوں کو جو دنیا میں ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ہمارے قانونِ ربوبیت پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں؟ کیا وہ لوگ جو اپنی معاشی زندگی کو ہمارے قانون سے الگ رکھتے ہیں (فجار) ان کے برابر ہو جائیں گے جو اس زندگی کو ہمارے قانون سے ہم آہنگ رکھتے ہیں؟

یہ ناممکن ہے کہ ان دونوں جماعتوں کی زندگی ایک جیسی ہو جائے۔ اندھا اور بینا کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ - ۳۵/۱۹) نہ ہی تاریکی اور روشنی ایک جیسے ہو سکتے ہیں۔ (وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ - ۳۵/۲۰) اور نہ ہی سایہ اور دھوپ (وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ - ۳۵/۲۱) اور نہ ہی مردہ اور زندہ برابر ہو سکتے ہیں (وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ - ۳۵/۲۲) اس لئے اس راہ پر چلنے والے اور اس سے نکل جانے والے کبھی کس طرح برابر ہو سکتے ہیں۔ (اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوٗنَ - ۳۲/۱۸) قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ جو معاشرہ میں ناہمواریاں

پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اُن لوگوں جیسے ہو جائیں گے جو زندگی کے صحیح نصب العین پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام کو اختیار کرتے ہیں۔ یہ ان کا زعم باطل ہے۔ انکی زندگی اور موت کبھی یکساں نہیں ہو سکتی۔ ان کا فیصلہ جو یہ اپنے ذہن میں کئے بیٹھے ہیں بالکل غلط ہے۔ (اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۴۵/۲۱) انہیں یہ معلوم نہیں کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات تعمیری نتائج کو مرتب کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اعمال کا صحیح صحیح نتیجہ مرتب نہ ہو۔ (۴۵/۲۲)۔ جب حقیقت یہ ہے تو یہ ناممکن ہے کہ اس قانونِ زندگی سے انکار کرنے والی جماعت (کافرین) اس جماعت پر غالب آجائے جو اس قانون کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے ہوتے ہے۔ (وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا - ۴/۱۴۱) انکار کرنے والی جماعت اس خیال کو دل سے نکال لے کہ وہ اس دوسری جماعت کو پچھاڑ دیں گے (لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۲۴/۵۷؛ ۸/۵۹)، اس لئے کہ صحیح پروگرام پر عمل پیرا ہونے والی جماعت کی نصرت خدا نے اپنے اوپر فرض کر رکھی ہے (وَكَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ - ۳۰/۴۷) خدا نے لکھ دیا ہے کہ اس کا قانون اور وہ جماعت جو اس کی حامل ہو گی غالب رہے گی۔ (كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۵۸/۲۱)۔ غلبہ اور سرفرازی صرف قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے (مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِیْعًا ۳۵/۱۰) یہی وہ بنیادی اصول ہے جس کی سمت ہر وہ نظریۂ زندگی میں خوشگواریاں پیدا کرنے کا موجب ہے، ترقی کرتا جاتا ہے (اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ - ۳۵/۱۰) اور اس کی یہ ترقی ہموار جدوجہد کے سہارے ہوتی ہے (وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ ۳۵/۱۰) اس کے برعکس جو لوگ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے لئے خفیہ تدابیر کرتے رہیں، انہیں سخت سزا بھگتنی پڑیگی۔

آخری کامیابی

(وَالَّذِیْنَ یَمْكُرُوْنَ السَّیِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۳۵/۱۰) اور آخر الامر انکی تدابیر تباہ و برباد ہو کر رہیں گی (وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ یَبُوْرُ - ۳۵/۱۰) اس طرح انجامِ کار اس گروہ کی جڑیں کٹ جائیں گی جو لوگوں کے حقوق میں کمی کرتے ہیں اور اس کے بعد خدائے رب العالمین کا قانونِ ربوبیت سب کے لئے وجہِ ستائش بن جائے گا۔ (فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ - ۶/۴۵) اس خدا کا قانون جس کی ربوبیت پستیوں اور بلندیوں کو محیط ہے (فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ - ۴۵/۳۶) جس کا نظامِ نشوونما تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے (رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ - ۴۵/۳۶) معاشی اور آفاقی دنیا میں کبریائی صرف اسی کے لئے ہے (وَلَهُ الْكِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۴۵/۳۷) اس لئے کہ اس کا

قانون سب پر غالب اور محکم ہے۔ (وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۔ ۴۵/۳۷)۔ وہ کہتا ہے کہ قوت اور ضعف، اقتدار و محکومیت، عزّت و ذلّت کے فیصلے خدا کے کائناتی قانون کے مطابق ہوتے ہیں؛ نہ کہ لوگوں کے خودساختہ آئین و اصول کے مطابق۔ (۳۶/۵)۔ یہاں قانون یہ ہے کہ ہر عمل اپنے نتائج مرتب کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے تاآنکہ وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے نتائج مشہود شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ یہی اس کا مستقر (جائے قرار) ہوتا ہے (۶/۶۷)۔ اسی کا نام وہ "میعادِ مقرر" (اجل) ہے جو ہر قوم کے لئے متعین ہوتی ہے۔ اس میعاد کا تعین کہیں خارج سے نہیں ہوتا، بلکہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس دوران میں وہ دیکھا جاتا ہے کہ اس قوم کے کون کون سے اعمال ایسے ہیں جن کے نتائج باقی رہنے کے قابل ہیں اور کون کون سے ایسے جو مٹا دینے کے قابل ہیں۔ یہ فیصلے خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتے رہتے ہیں (۱۳/۹)۔ لہٰذا، یہ میعاد درحقیقت اس وقفے کا نام ہے جس میں اس قوم کا غلط نظام اپنے نتائج مرتب کرتا ہوا نقطۂ آخریں تک پہنچ جاتا ہے جہاں وہ کسی کے سنبھالے نہیں سنبھل سکتا۔ نہ کسی کے روکے رُک سکتا ہے (۹/۴)۔ کوئی عمل خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس قانون کی زد سے باہر نہیں رہ سکتا۔ ہر ایک نتیجہ خیز ہوتا ہے (۹/۴۱)۔ اس کی گرفت بڑی سخت ... ہے (۱۹/۴۴ ; ۱۲/۸۵) اور اس کا مؤاخذہ بڑا محکم (۱۹/۴۵)۔ لہٰذا جس انقلابِ عظیم کے متعلق تمہیں کہا جا رہا ہے، وہ آکر رہے گا (۷/۱۰۲)۔ اس وقت یہ تمام سرکش اور متمرد اربابِ اقتدار جو اس وقت اس نظام کی مخالفت میں اس قدر زوروں پر ہیں، خاسر و ناکام، بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ اٹھیں گے (۱۲/۵۴-۵۲)۔ اُن سے کہا جائے گا کہ اب کہاں بھاگ رہے ہو (۲۱/۱۲-۱۴) (۲۹/۴-۴)۔ اب کہیں پناہ نہیں مل سکتی (۷۵/۱۱)۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے تمہارا اعمال نامہ جو اس وقت، اس انقلاب کے رنگ میں بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے آیا ہے (۴۵/۲۹)۔ اس وقت ان کی یہ حالت ہو جائے گی جیسے "کٹے ہوئے کھیت یا بجھے ہوئے کوئلے"۔ (۲۱/۱۴) پھر ان پر نہ آسمان روئے گا نہ زمین صفِ ماتم بچھائے گی (۴۴/۲۹) اور نہ ہی ہم متأسف ہوں گے (۹۱/۱۵)۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ ہمارے لگے بندھے قانونِ مکافات کے مطابق ہوگا۔ یونہی اندھا دھند فیصلے کا نتیجہ نہیں ہوگا جس کے بعد انسان خود ہی پشیمان ہو جاتا ہے کہ یہ میں نے کیا کر دیا۔ لہٰذا، ان سے کہو کہ جو کچھ تم سے کہا جاتا ہے (کہ تمہارا انجام یہ ہوگا) اس پر ہنسو نہیں، خون کے آنسو روؤ (۵۳/۶۰) کہ یہ مقام رونے ہی کا ہے۔

قرآنِ کریم ان محکم حقائق اور بیّن شواہد سے ان لوگوں کے دلوں میں، جو اس انقلابِ ربوبیت کے لئے سب سے پہلے تیار ہوتے ہیں، یقینِ راسخ پیدا کرتا ہے، اور، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہی وہ قوت ہے جس کے آسرے پر وہ ایسے عظیم انقلاب کے لئے کمربستہ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا، اگر آج کا مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ نظامِ ربوبیت

یہی وہ صحیح نظام ہے جس کے مطابق قرآن انسانی معاشرہ کی تشکیل چاہتا ہے اور اسے اس کا یقین محکم ہے کہ جو جماعت اس توازن بدوش انقلاب کا عزم لے کر اٹھے گی وہ یقیناً کامیاب ہو گی تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ جن افراد کے دل میں یہ حقیقت ایک زندہ ایمان کی شکل میں جاگزیں ہو چکی ہے، انہیں ایک مرکز پر اکٹھا کر لیا جائے اور اس کے بعد اس قرآنی نظام کی دعوت کا سلسلہ وسیع کرنا شروع کر دیا جائے۔ اس وقت دنیا، اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے جہنم میں اس بری طرح سے ماخوذ ہے کہ اسے اس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس نے اپنے خود ساختہ نظامہائے حیات کو ایک ایک کر کے آزما لیا ہے اور ہر تجربے کے بعد وہ بے ساختہ پکار اٹھتی ہے کہ ع

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

یہی نہیں، بلکہ ہر نیا تجربہ اسے نئی قسم کی مشکلات میں الجھا دیتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا پر عجیب انداز کی مایوسی چھائی ہوئی ہے۔ وہ ہر دور سے اٹھنے والی گرد کو بڑی حسرت سے دیکھتی ہے کہ شاید اسی میں وہ "شاہسوار" چھپا ہوا ہو جو اس کے مصائب و مشکلات کا خاتمہ کر دے لیکن اس کے بعد پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاتی ہے کہ اسے اس گرد میں راہنما کی جگہ راہزن دکھائی دیتے ہیں۔ ان حالات میں اگر کسی ملک کے مسلمانوں نے خدا کے اس نظامِ ربوبیت کو عملی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا تو وہ یقین مانیں کہ ساری دنیا کی امامت ان کے حصہ میں آجائے گی اور جنت سے نکلا ہوا آدم، جو آج اس طرح مبتلائے غم و اندوہ، حیران و پریشان مارا مارا پھر رہا ہے، پھر سے جنت میں پہنچ جائیگا۔

اس مقام پر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ نظامِ ربوبیت نہ تو انفرادی طور پر قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی پارٹی کے ذریعے۔ اس کا قیام صرف ایک مملکت کر سکتی ہے جو ملک میں ایک ایسا معاشی نظام قائم کرے جس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہنے پائے۔ یہ مملکت انہی لوگوں کی ہو سکتی ہے جو قرآنِ کریم کے عطا فرمودہ قوانین اور مستقل اقدار پر یقینِ محکم رکھے اور دین کو عملی صورت میں متشکل کرنے کو اپنی زندگی کا فریضہ سمجھے۔ یہ مملکت قرآن کے نظامِ ربوبیت کی تجربہ گاہ بنے گی۔ اس کے بعد اس نظام کے درخشندہ نتائج ساری دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیں گے۔

(٠)

خدا کا آفاقی قانون

یہ تو وہ طریق کار ہے جس سے نظامِ ربوبیت، انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوتا ہے لیکن اگر انسان اس کے قیام میں کوشش نہ کریں، تو بھی یہ خدا کے آفاقی قانون کے مطابق جسے عام طور پر زمانے کا تقاضا کہا جاتا ہے۔ ایک نہ ایک دن قائم ہو کر رہے گا۔ لیکن خدا کا آفاقی قانون (انسانی عمر کی نسبت سے) بڑا سست رفتار ہے۔ آپ کائنات کے نظامِ ارتقاء (EVOLUTION) کو دیکھئے۔ کسی نوع

(SPECIES) میں ایک ذرا سی تبدیلی کے لئے ہزارہا سال لگ جاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن میں ہے کہ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے"۔ (دیکھئے ۲۲/۴۷ ; ۳۲/۵ ; ۷۰/۴)۔ لہٰذا آفاقی قانون کے مطابق نظامِ ربوبیت کے قیام میں معلوم کتنا عرصہ لگ جائے۔ اس دوران میں انسانیت مصیبتوں اور مشقتوں کے جس جہنم سے گزرے گی وہ ظاہر ہے۔ لیکن اگر اسی آفاقی قانون کے ساتھ انسان کی رفاقت شامل ہو جائے تو ہزار ہزار سال کا یہی عرصہ سمٹ کر دنوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ مفاد پرستانہ ذہنیت کے لوگ مذاق اڑاتے ہیں کہ وہ تباہی اور بربادی کہاں ہے جس سے تم ڈرا رہے ہو؟ خدا کا وہ عذاب کب آئے گا؟ جس انقلاب کا تم ذکر کر رہے ہو، وہ آتا کیوں نہیں؟ (وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ - ۲۲/۴۷) جواب میں کہا جاتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ خدا کا وعدہ غلط نہیں ہوا کرتا، وہ تباہی آکر رہے گی۔ بات صرف یہ ہے کہ خدا کا ایک دن تمہارے اعداد و شمار کے مطابق، ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ (وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۲۲/۴۷) اس لئے آفاقی قانون کے مطابق، اس غلط نظام کی تباہی کچھ عرصہ بعد ظہور میں آئے گی۔ لیکن جب اسی آفاقی قانون کے ساتھ محمد

انسانی رفاقت

رسول اللّٰہ والذین معہٗ۔ کی رفاقت شامل ہو گئی، تو وہ تباہی دنوں میں سامنے آگئی اور قریش نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ یہ موعودہ انقلاب کس طرح آکر رہا ہے چنانچہ وہی سوال جب نبی اکرمؐ سے کیا گیا (یعنی عذاب کب آئے گا؟) تو آپ کی زبان سے کہلایا گیا کہ (اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ - ۶/۱۳۵) جس انقلاب کا وعدہ کیا گیا ہے وہ یقیناً آنے والا ہے۔ تمہاری کوششیں اسے روک نہیں سکتیں۔ بس اتنا ہے کہ تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے جاؤ اور مجھے اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ (قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۶/۱۳۶) تھوڑے ہی دنوں کے بعد نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ (فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ - ۶/۱۳۶) یعنی انقلاب دونوں صورتوں میں آکر رہے گا۔ لیکن اگر اسے تنہا آفاقی قانون کے سپرد کر دیا گیا تو یہ پروگرام اپنی منازل ہزار ہزار سال کے دنوں میں طے کرے گا۔ اور اس میں بڑی بڑی تباہیوں کا سامنا بھی ہوگا۔ اور اگر اس کے لئے انسانوں کی جماعت اٹھ کھڑی ہوتی تو (فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ) وہ ابھی سامنے آجائے گا۔ اور نسبتاً امن و سکون سے قائم ہو جائے گا۔ (LESLI PAUL) اس باب میں لکھتا ہے۔

انسان (اپنی زندگی میں فطری عملِ ارتقاء کے خلاف چلتا ہے وہ اس کا انتظار نہیں کرتا کہ حوادثِ عالم اپنے طریق پر اس کے مقصد کی سمت چلیں۔ نہ ہی وہ زمانہ کا انتظار کرتا ہے کہ وہ اس کا سازگار ہو۔ وہ، وہ حوادث کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کے پروگرام کے مطابق چلیں۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتا ہے، اس کے مطابق اپنا پروگرام

مرتب کرلیتا ہے اور پھر عملِ تخلیق سے اپنے ماحول پر غلبہ پاکر اسے اپنا سازگار بنا لیتا ہے...... جو کچھ اس کائنات میں انسان کے ہاتھوں سے وجود میں آیا ہے، فطرت کا عملِ تخلیق وارتقاء اسے کروڑوں برس میں بھی پیدا نہیں کرسکتا تھا۔

(۵)

آپ غور کیجئے کہ قرآن کا پیغام کیا تھا۔ یہ درحقیقت انقلاب کا پیغام تھا۔ ان تمام غلط نظریہ ہائے زندگی اور تصوراتِ حیات کے خلاف جن پر انسانی معاشرہ کی بنیادیں رکھی جاتی تھیں۔ قرآن نے ان تصورات کو ایک ایک کرکے گنایا اور واضح الفاظ میں بتادیا کہ یہ تصوّرات غلط ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان تصورات کو بھی وضاحت سے بیان کردیا۔ جن کے مطابق صحیح انسانی معاشرہ متشکل ہوسکتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے مسلسل جہاد سے غلط تصوراتِ حیات کو مٹادیا اور ان کی جگہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق صحیح تصورات کو عملاً متشکل فرمادیا۔ یعنی جو انقلاب خدا کے آفاقی قانون کے مطابق ہزاروں سال کے بعد ظہور پذیر ہوتا، اس جماعت کی رفاقت سے وہی انقلاب چند سال کی مدت میں سامنے آگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس قوم نے ان تصورات کو چھوڑدیا اور پھر سے وہی غلط تصورات ان کے معاشرے کے اجزاء بن گئے یعنی انسانوں نے خدا کے قانون کی رفاقت چھوڑ دی۔ اب یہ انقلاب پھر تنہا آفاقی قانون کے سپرد ہوگیا۔ آپ دیکھئے کہ اس ہزار سال کے عرصہ میں، غلط تصورات کس طرح ایک ایک کرکے پیچھے مٹتے گئے اور ان کی جگہ، صحیح تصورات (یا ان تصورات سے ملتے جلتے تصورات) آہستہ آہستہ مسلط ہوتے چلے گئے۔ مثلاً قرآن نے کہا تھا کہ ملوکیت (KINGSHIP) کا نظام باطل کا نظام ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ انسانی معاملات کا حل باہمی مشاورت سے ہونا چاہیئے۔ آپ دیکھئے کہ دنیا کس طرح کشاں کشاں اس انقلاب کی طرف چلی آرہی ہے۔ اگرچہ دنیا ابھی تک اس باب میں، اس منزل تک نہیں پہنچی جو قرآن نے متعین کی تھی۔ لیکن بایں ہمہ اس کا ہر قدم شہنشاہیت کے بت کو توڑ کر شورائیت کی طرف اُٹھ رہا ہے۔

قرآنی تصوّرات کو زمانہ خود قبول کر رہا ہے!

پھر اُس نے کہا تھا کہ پیشوائیت کا ادارہ باطل کی بنیادوں پر قائم ہے۔ خدا اور بندوں کے درمیان کسی ذریعے اور واسطے کی ضرورت نہیں۔ آپ دیکھئے کہ دنیا سے کس طرح پیشوائیت کا خاتمہ ہورہا ہے۔

اُس نے کہا تھا کہ غلامی (SLAVERY) نوعِ انسانی کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ خدا نے ہر فرزندِ آدم کو ایک جیسا پیدا کیا ہے اور ہر آدمی آدمی ہونے کی جہت سے مستحقِ تکریم ہے (وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ) آپ نے دیکھا ہے کہ دنیا نے کس طرح غلامی کو لعنت قرار دے کر مٹایا ہے۔

اس نے کہا تھا کہ رنگ، نسل، زبان، وطن (قومیت) کی تفریق وتقسیم یکسر باطل ہے۔ تمام نوعِ انسانی ایک

عالمگیر برادری ہے۔ ساری دنیا کے انسان، امتِ واحدہ کے افراد ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کس طرح رفتہ رفتہ اسی تصور کو اپنانے کی فکر کر رہی ہے۔

یہ سب کچھ خدا کے کائناتی قانون کی رُو سے از خود ہو رہا ہے۔ یہی ہے وہ قانون جسے قرآن سنۃ اللہ کہہ کر پکارتا ہے (اور جسے اقبالؒ "فطرت کے لطیف اشاروں" سے تعبیر کرتا ہے) یہی وہ قانون ہے جو اس امر کا فیصلہ کرتا ہے کہ دنیا میں کون سا نظریہ، تصوّر یا نظام، باقی رہنے کے قابل ہے اور کون سا مٹ جانے کا مستحق (۱۳/۹)۔ یہ قانون آہستہ آہستہ، بتدریج ایسے حالات پیدا کرتا رہتا ہے جن کی رو سے تخریبی نتائج کے حامل تصورات مٹتے جاتے ہیں، اور تعمیری نتائج کے ضامن تصورات ان کی جگہ لیتے جاتے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس طریقِ عمل کو "احقاقِ حق" اور "ابطالِ باطل" کہا جاتا ہے۔ (۸/۸)۔ اس قانون کا اصل الاصول (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) یہ ہے کہ باقی وہی رہتا ہے جو نوعِ انسانی کی عالمگیر منفعت کا موجب ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہ جاتا ہے (۱۳/۱۷)۔ یہی وہ "شجرِ طیب" ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں اور شاخیں بامِ فلک کو چومتی ہیں۔ (۱۴/۲۴-۲۸)

اسی قانون کے مطابق، قرآن نے کہا ہے کہ سرمایہ پرستی کا مفاد پرستانہ نظام، باطل کا نظام ہے۔ اس لئے یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ باقی وہی نظام رہ سکتا ہے جو نوعِ انسانی کی ربوبیت و منفعت کا ضامن ہوگا۔ یعنی جس میں انسان کے جسم اور اس کی ذات دونوں کی نشوونما ہوتی جائے گی اور اس طرح اس کی اس دنیا کی زندگی بھی خوشگوار ہو جائے گی اور آخرت کی زندگی بھی۔ ظاہر ہے کہ جس طرح قرآن کے پیش کردہ دوسرے انقلابات بتدریج آچکے ہیں یا آرہے ہیں، یہ معاشی انقلاب بھی آکر رہے گا۔

اس حقیقت کا اعتراف کس طرح ہو رہا ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے۔ چند صفحات پہلے امریکہ کے نامور جرنلسٹ (JACK BELDEN) کی اس کتاب (CHINA SHAKES THE WORLD) کا ذکر آچکا ہے جو اس نے انقلابِ چین کے متعلق لکھی ہے۔ مغرب کے بڑے بڑے مدبرین نے اس کتاب کی تعریف کی ہے۔ بیلڈن اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ دنیا حیران ہے کہ چین کا یہ انقلاب رونما کس طرح ہو گیا — ! "خاقانِ چین" (چیانگ کائی شک) لامحدود قوتوں کا مالک تھا۔ پھر اس کے ساتھ امریکہ کی مدد شامل تھی جہاں سے اسے اسلحہ اور دیگر سامانِ جنگ بافراط مل رہا تھا۔ اس قوت و دولت اور ساز و یراق کی موجودگی میں، چیانگ کائی شک کو کس طرح شکست مل گئی اور سرزمینِ چین میں امریکہ جیسی مملکت کی بساطِ سیاست کس طرح الٹ گئی؟ بیلڈن لکھتا ہے کہ اس تحیّر انگیز واقعہ کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے دنیا بیتاب ہے لیکن

نہ تو حکومت امریکہ اور امریکی پریس، نہ ہی امریکہ کے عوام اور ان کے وہ نمائندے جو مشرقِ بعید کے قونصل خانوں میں بیٹھے ہیں، نہ کاروباری حلقے اور نہ ہی فوجی ادارے اپنی نگاہ کو، اپنے ذاتی یا قومی مفاد کی تنگ وادی سے آگے لے جانے ہیں تاکہ وہ اہلِ چین کے درد آگیں اور پُراز جذبات قلوب تک جا پہنچیں۔

اس کے بعد ہیلڈرن لکھتا ہے کہ:-

ان تمام لوگوں کو (جو اس انقلاب کی صحیح علت معلوم کرنا چاہتے ہیں) محمدؐ کے ان الفاظ کی یاد دلانا چاہیئے جو وہ مکہ کے سوداگروں سے کہا کرتے تھے۔ کہ

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۔ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۔ (۸۹/۱۷-۱۸)

نہیں! (تمہاری ہلاکت و بربادی کا اصل سبب یہ ہے کہ) تم یتیم کی عزت نہیں کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو مسکین کی روٹی کا انتظام کرنے کی ترغیب نہیں دیا کرتے تھے۔

آپ نے غور کیا کہ اس غیر مسلم امریکی مصنف کی نگاہ کس طرح قرآن کے ان حقائق تک پہنچی ہے جو اس نے چودہ سو سال پہلے بیان کئے تھے؟ لہٰذا، قرآن کا پیش کردہ معاشی انقلاب آکر رہے گا۔ اس کے متعلق قرآن کریم سے نہایت لطیف اشارات ملتے ہیں (جو اپنے وقت پر حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتے جائیں گے) مثلاً سورۂ انبیاء میں ہے کہ موجودہ نظامِ معیشت (جس کی رو سے ایک فرد واحد بلا حدود و قیود، رزق کے سرچشموں کو اپنی ملکیت میں لے لیتا ہے اور وہ اس کے بعد اس کی نسل میں وراثۃً منتقل ہوتے رہتے ہیں) قرنہا قرن سے چلا آرہا ہے۔ (بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۲۱/۴۴) اس سے یہ لوگ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ یہی نظام صحیح فطرت کے مطابق نظام ہے اور اس کے صحیح ہونے کی دلیل بھی یہی پیش کرتے ہیں کہ یہ اتنے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے (اور ہمارے زمانے کے انسانوں سے بالخصوص کہتا ہے کہ) کیا یہ لوگ دیکھ نہیں رہے کہ ہمارا کائناتی قانون، ایک غیر مرئی قوت کے زور سے، کس طرح معیشت کے ان لامحدود ذرائع کو، ان لوگوں کے ہاتھوں سے چھین چھین کر، انکی ذاتی ملکیتوں کو کم کرتا چلا جارہا ہے۔ (اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا) کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم معاشی وسائل (ارض) کو ان بڑے بڑے لوگوں (اَطْرَافِهَا) کے ہاتھوں سے کم کرتے جارہے ہیں (اطراف کے معنی رؤسا اور اکابر ہیں)۔ اس کے بعد ہے کہ کیا یہ لوگ (محض اس دلیل کی بنا پر کہ موجودہ نظام قرنہا قرن سے چلا آرہا ہے اور ان کی ذاتی ملکیت میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔) ہمارے قانون پر غالب آنا چاہتے ہیں (اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ - ۲۱/۴۴) قرآن کہتا ہے کہ اب وہ دور گزر گیا۔ اب وہ زمانہ آرہا ہے جس میں انصاف کی رو سے میزان کھڑی

کی جائے گی۔ (وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۲۱/۴۷) اس میزان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی کی محنت میں کوئی کمی نہیں کر سکے گا اور محنت کرنے والے کی محنت کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوگا۔ اس کا حساب سرمایہ دار اور زمیندار نہیں کیا کریگا کہ محنت کش کا حصہ کیا ہے اور اس کا کتنا۔ اس کا حساب وہ معاشرہ کرے گا جو قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوگا۔ (فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۲۱/۴۷)

سورۃ الرعد میں بھی اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ لوگ بڑی بڑی محکم تدابیر کرتے رہتے ہیں کہ (یہ نظام اس طرح قائم رہے لیکن) خدا کی تدبیر بڑی جامع ہے۔ وہ کامیاب ہو کر رہے گی۔ (۱۳/۴۲-۴۳) اور ربوبیتِ عالمینی کا دور آکر رہیگا۔ لیکن جس طرح دوسرے انقلاب کے ظہور پذیر ہونے میں (آفاقی قانون کے مطابق) اتنا وقت لگا ہے اسی طرح (اگر اسے آفاقی قانون کے سپرد رکھا گیا تو) اس میں بھی وقت لگے گا۔ (اگرچہ فطرت کے اشاروں سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ اب کچھ زیادہ دور نہیں) نیز جس طرح دوسرے انقلابات تک پہنچتے پہنچتے نوعِ انسان کو جان کاہ مشقتوں سے گزرنا پڑا ہے، اس انقلاب تک پہنچنے میں بھی اسی قسم کے جگر سوز مراحل میں سے گزرنا پڑے گا۔ اگر انسان وحی کی بات مان لے اور اس کے پروگرام کو از خود اختیار کرلے تو نہ صرف یہ کہ اس سے عمل اور اس کے نتیجہ کا درمیانی عرصہ ہی بہت کم ہو جاتا ہے، بلکہ انسان تباہیوں اور بربادیوں کے بغیر منزلِ مقصود تک جا پہنچتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ اپنی فکر سے راہیں تراشتا رہے اور ناکام تجربوں میں اپنا وقت اور توانائی ضائع کرتا رہے تو اسے منزل تک پہنچنے میں وقت بھی بہت زیادہ لگتا ہے اور راستے میں ہزارہا نادیدہ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، وحی کی راہنمائی انسانی محنت میں بڑی کفایت کر دیتی ہے۔ فرشتوں نے جس آدم کے خمیر میں آگ کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے دیکھے تھے، وہ آدم وہی تھا جو وحی کی راہنمائی کے بغیر سفرِ زندگی طے کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس، دوسرا آدم وہ ہے جو سفرِ حیات میں وحی کی راہ نمائی سے راستہ متعین کرتا ہے۔ اس کے متعلق کہہ دیا کہ (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔) وہ راستہ کے خوف و خطر سے محفوظ و مامون رہے گا۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان جب، کائناتی قانون کے دھکے سے غلط راستوں سے ہٹتا ہے تو اس کی نگاہوں کے سامنے صحیح راستہ واضح انداز میں نہیں آتا۔ دھندلا سا نقشہ سامنے آتا ہے اور اسے واضح اور متعین طور پر صحیح راستہ اختیار کرنے کے لئے مزید کد و کاوش کرنی پڑتی ہے جس میں پھر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور تباہیاں آتی ہیں۔ (تفصیل اس کی آخری باب میں ملے گی)۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ دنیا میں نظامِ ربوبیت تو قائم ہو کر رہنا ہے۔ اگر اس کو آفاقی قانون پر چھوڑ دیا گیا تو اس نظام تک پہنچتے پہنچتے، انسان کو عصا شکن ٹھوکریں کھانی پڑیں گی اور نہ معلوم خون کے کتنے دریا اور آگ

کی کتنی خندقیں پار کرنی پڑیں گی قرآن میں ہے کہ

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ۔ (۸۴/۶)

اے انسان! تو خدا کے (نظامِ) ربوبیت تک پہنچے گا تو ضرور لیکن سخت صبر آزما مشقتوں کے بعد۔

قرآنی دور لیکن اگر اس نے اپنا پروگرام مِن وسعادت کے ہاتھوں میں دے دیا تو اس کا حساب بہت آسان ہو جائیگا۔ (فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۔ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۔ ۸۴/۷-۸)

جو قوتیں اس معاشرہ کے قیام میں حائل ہوں گی انہیں راستہ سے ہٹا دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت دنیا کا ہر نظام — خواہ وہ مغرب کا جمہوری نظامِ سرمایہ داری ہو یا روس کا نظامِ اشتراکیت — قرآنی نظام کے راستے میں روک ہے۔ اس لئے کہ وحی کی روشنی نہ اس کے ہاں ہے نہ اُس کے پاس۔ اس لئے قرآنی نظامِ ربوبیت، ان دونوں نظاموں کو ان کی جگہ سے ہٹا کر قائم ہوگا۔ وہ ان میں سے کسی ایک سے مفاہمت بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ اپنے انداز کا منفرد نظام ہے جو سرتاپا حق پر مبنی ہے اور حق کبھی باطل سے مفاہمت نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ نظام یقیناً قائم ہو کر رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کا راستہ روک نہیں سکتی۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

P.204 (1) A History Of Western Philosophy, quoted by C.E.M.Joad, in, Decadenee.p.139

P.207(2) Quoted by E.H.Carr, in, The New Society.p.41-42

(3&4) -do-

P.215 (5) Leslie Paul, in, The Meaning of Human Existence. p.157

گیارھواں باب [۱۱]

حرفِ آخر

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

گذشتہ اوراق میں نظامِ ربوبیت کے تفصیلی گوشے آپ کے سامنے پھیلی ہوئی شکل میں آ چکے ہیں۔ چونکہ پھیلی ہوئی تفاصیل ذہنِ انسانی میں بالعموم ذرا دیر سے محفوظ ہوتی ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان تفاصیل کا ملخص سمٹی ہوئی شکل میں بھی پیش کر دیا جائے تاکہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مفہوم، کتاب ختم ہونے سے پہلے پھر آپ کی نگاہوں کے سامنے آ جائے۔

انسان' دو چیزوں کا نام ہے۔ ایک ہے اس کا جسم اور دوسری چیز ہے اس کی ذات، خودی، 'انا' نفس۔ اس کا جسم طبعی قوانین کے مطابق کام کرتا ہے اور ایک دن' ان ہی قوانین کے مطابق ختم ہو جائے گا لیکن اس کی ذات، نہ طبعی قوانین کے مطابق زندہ ہے اور نہ ہی طبعی قوانین کے مطابق اس کی موت واقع ہو گی۔ اس میں حیاتِ جاوداں کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے لیکن زمان و مکان کے موجودہ تقاضوں کے مطابق، اسے اپنی توانائیوں کے اظہار اور انہیں بروئے کار لانے کے لئے جسم کی ضرورت ہے۔ لہٰذا' انسان کے لئے تربیتِ ذات (یعنی اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما) کے لئے جسم کی پرورش بھی ضروری ہے۔

جسم کی پرورش (حیوانی جبلت یا) عقل کے سپرد کی گئی ہے۔ اس کے لئے عقل اپنا فریضہ سمجھتی ہے کہ سامانِ زیست زیادہ سے زیادہ سمیٹے اور اُسے جمع رکھے۔ یعنی عقل کا کام "لینا" ہے۔

لیکن انسانی ذات کی تربیت کے لئے قانون یہ ہے کہ وہ جس قدر اپنی قوتوں کو عام کرے گی، اسی قدر اس میں استحکام پیدا ہوگا۔ یعنی انسانی ذات کا کام "دینا" ہے۔

کشمکش لہٰذا عقل اور انسانی ذات کے تقاضوں میں تضاد ہے۔ اسی تضاد سے ان دونوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اس کشمکش کا حل انسانی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

ایک گروہ نے اس کا حل یہ سوچا کہ انسان اپنی توجہ صرف تربیتِ ذات پر مرکوز کر دے اور عقل کے تقاضوں کو پامال کرتا جائے۔ اس نے کہا کہ تربیتِ ذات کا راز جسم کے فنا کر دینے میں ہے۔ یہ گروہ روحانیین یا مذہب پرستوں کا گروہ کہلاتا ہے۔

دوسرے گروہ نے کہا کہ انسانی ذات کوئی چیز نہیں، انسانی زندگی کا مقصود، جسم کی پرورش ہے اس لئے عقل کو اپنے فریضہ کی ادائیگی میں بے باک چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہ گروہ مادیّین یا میکانکی تصورِ حیات کے حاملین کا گروہ کہلاتا ہے۔

قرآن نے کہا کہ یہ دونوں نظریئے غلط ہیں۔ انہوں نے اس کشمکش کا جو حل تجویز کیا ہے، وہ غالبؔ کا شاعرانہ حل ہے جس میں اس نے اپنے محبوب سے کہا تھا کہ

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

میں تمہیں اپنی طرف کھینچتا ہوں۔ تم کھنچ کر چلے آؤ۔ کشاکش ختم ہو جائے گی۔ یعنی ایک گروہ نے عقل سے کہہ دیا کہ تم جسم کے تقاضوں کا خیال چھوڑ دو، کشاکش ختم ہو جائے گی۔ دوسرے گروہ نے نفسِ انسانی سے کہہ دیا کہ تم اپنی ہستی کا تقاضا چھوڑ دو، کشاکش کا علاج ہو جائے گا۔ قرآن نے کہا کہ مفاہمت کا طریق غلط ہے۔ سر درد کا علاج سر کے کاٹ دینے میں نہیں۔ انسانی ذات کو اپنی تربیت اور اپنی توانائیوں کے اظہار کے لئے جسم کی ضرورت ہے۔ اس لئے جسم کی پرورش اور نگہداشت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف اُس نے کہا کہ اصل مقصود انسانی ذات کی تربیت و استحکام ہے۔ جسم اس کا صرف ذریعہ ہے۔ ذریعہ کو مقصد بنا لینا اور اصل مقصد کو نظر انداز کر دینا، حقیقت سے چشم پوشی اور بہت بڑی حماقت ہے۔ زندگی کا صحیح پروگرام یہ ہے کہ عقل کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں اور ان کے ساتھ، تربیت و استحکامِ ذات کا مقصدِ عظیم بھی حاصل ہوتا چلا جائے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

غربیاں را زیرکی سازِ حیات | شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس | کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر شود | نقشبند عالمِ دیگر شود

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ

قرآن کی ساری تعلیم کا ماحصل یہی ہے۔ یعنی ایسا پروگرام جس سے عقل کے تقاضے بھی پورے ہوتے جائیں اور اسکے ساتھ تربیت و استحکامِ ذات بھی سرانجام پاتی چلی جائے۔

قرآنی نظام

قرآن نے کہا کہ جب تک افراد الگ الگ رہیں گے، ہر فرد کی عقل اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کے لیئے کوشاں رہے گی۔ اس کا لازمی نتیجہ باہمی مفاد کا تصادم، فلہذا مستقل فساد ہے۔ اس تصادمِ مفاد کا حل یہ ہے کہ افراد کو اپنی ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی کی فکر آپ نہ ہو۔ تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی (رزق) کی فراہمی کی ذمہ داری معاشرہ پر ہو۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ ایک گھرانے کے فرد بن جائیں۔

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم "کنفسٍ واحدہ" (اقبالؒ)

ظاہر ہے کہ اس اندازِ پرورش کے لیئے، رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں رہنے کی بجائے، معاشرہ کی تحویل میں رہیں گے۔ اس لیئے اس نے کہہ دیا کہ "ارض" (سامانِ معیشت) پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

حق زمین را جز متاعِ ما نہ گفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت (اقبالؒ)

جب افرادِ معاشرہ کو ان کے اور ان کی اولاد کے سامانِ زیست کی طرف سے اس طرح بے فکر کر دیا گیا تو عقل کے تقاضوں کی تسکین ہو گئی۔ اب یہی عقل فردِ متعلقہ کے مفاد کے تحفظ میں ہراساں و پریشاں رہنے کے بجائے، انسانی ذات کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بن گئی۔ یعنی اس طرح عقل "خود بین" ہونے کے بجائے "جہاں بین"، ہو گئی۔ نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق، اب "ابلیس مسلمان ہو گیا" اب اس کا کام فرد کے مفاد کے تحفظ کے بجائے، پوری نوعِ انسانی کے مفاد کا تحفظ قرار پا گیا۔ اب انسانی ذات کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ رہی کہ وہ اپنی توانائیوں کو "دینے" میں صرف

کردے۔ "اب" لینے "کا سوال ہی باقی نہ رہا" دینے" سے مراد یہ ہے کہ انسان کے تمام تخلیقی کارنامے اور ان کا ماحصل، دوسروں کی نشوونما اور ارتقائے انسانیت کے لئے عام ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس معاشرے میں افراد کی ذاتی ملکیت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ ہر فرد کی تمام ضروریاتِ زندگی کا کفیل معاشرہ ہوگا اور تمام افرادِ معاشرہ کی استعداد، بہبودِ کلی کے لئے وقف ہوگی۔

یہ ہے وہ پروگرام جس سے عقلِ انسانی کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے اور تربیتِ ذات کا مقصدِ عظیم بھی حاصل ہو جائے گا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ انسانی ذات کی تربیت (نشوونما) کس حد تک ہو چکی ہے، یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ

صبغۃ اللہ

کس حد تک (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو چکی ہے۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں خدا کے رنگ میں رنگے جانا ہے۔ (صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۔ ۲/۱۳۸)

مردِ حق از حق بگیرد رنگ و بو
مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بو

خدا کی ان صفات کا علم صرف بذریعہ وحی ہو سکتا ہے۔ قرآن میں ان صفات کا تفصیلی ذکر ہے۔ اس لئے تربیتِ ذاتِ انسانی کے پرکھنے کا معیار قرآن ہے۔

قرآن کا منتہیٰ

اس قسم کے معاشرے کی تشکیل جس میں

(i) تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل خود معاشرہ ہو۔

(ii) کسی فرد کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ اور اس طرح

(iii) عقل کے تقاضوں کی تسکین کے بعد انسان پورے جذب و انہماک سے نوعِ انسانی کی بہبودِ کلی میں مصروف ہو جائے اور اس سے اس کی ذات کی تربیت و استحکام ہوتا جائے،

قرآن کا منتہیٰ ہے۔ لیکن وہ اس منتہیٰ تک بتدریج پہنچاتا ہے۔ صدقہ و خیرات کی ترغیبات اور لین دین کے ضوابط اور وصیت و میراث کے متعلقہ احکام، اس عبوری دور سے متعلق ہیں جس سے گزر کر منتہیٰ تک پہنچنا ہوتا ہے۔ لیکن اس عبوری دور سے متعلق احکام اور پروگرام میں بھی ہر قدم کا رُخ اُسی منتہیٰ کی طرف اٹھتا ہے۔ اس طرح اس عبوری دور سے گزرتے گزرتے یہ معاشرہ از خود اس منتہیٰ تک جا پہنچتا ہے۔ یہ منتہیٰ خدا کی صفتِ رب العالمینی (تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت)

کا مظہرِ تامہ ہوگا۔ اس معاشرہ کے قیام کے لئے قرآن نے تفصیلی پروگرام دے دیا ہے۔ اس کی بنیادی کڑی یہ ہے کہ انسان کو حتمی اور پختہ یقین ہو کہ:۔

(i) انسانی زندگی جسم کی پرورش (مفادِ عاجلہ) تک محدود نہیں۔ نفسِ انسانی میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ حیاتِ جاوداں حاصل کرے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جس کا خاتمہ موت کے ساتھ نہیں ہو جاتا۔ لہٰذا انسان کی نگاہ قریبی مفاد کے ساتھ مستقبل (آخرت) کی خوشگواریوں پر بھی رہنی چاہیئے۔

(ii) نفسِ انسانی کی تربیت (نشوونما) سے مفہوم یہ ہے کہ اس میں (علیٰ حدِ بشریت) صفاتِ خداوندی (اسماء الحسنیٰ) کی نمود زیادہ سے زیادہ ہوتی جائے۔

(iii) نفسِ انسانی کی تربیت کا راز "دینے" میں ہے۔ یعنی اس میں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کس حد تک نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت اور حسنِ کائنات میں اضافہ کے لئے وقف کرتا ہے۔

جب افراد کے دل میں اس قسم کا یقین (ایمان) پختہ ہو جائے تو اس کی زندگی کی تمام حرکات و سکنات سے اس کا مظاہرہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس سے معاشرہ میں ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس سے یہ تصور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس فضا میں تمام افرادِ معاشرہ، قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس قسم کے معاشرہ کے قیام کا نام، قرآن کی اصطلاح میں "قیامِ صلوٰۃ" ہے۔ یعنی ایسا معاشرہ جس میں قوانینِ خداوندی کا اتباع ہوتا چلا جائے۔ نماز کے وقتی اجتماعات اس نظام کے ضروری اجزاء ہیں۔ اس لئے انہیں بھی قرآن نے اقامتِ صلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔

قیامِ صلوٰۃ کا لازمی نتیجہ "ایتائے زکوٰۃ" یعنی نوعِ انسانی کی نشوونما ہوگا۔ لہٰذا اس نظام کا نقطۂ ماسکہ ہے قیامِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ۔ یہی اسلام کا مفہوم ہے۔ لہٰذا اسلام کی رُو سے، وہی تصور، وہی نظریہ، وہی نظام قابلِ حمد و ستائش ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق، نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کا کفیل ہے (الحمد للہ رب العالمین)۔

نبی اکرمؐ نے اپنے رفقاء کی جماعتؓ کی معیت میں عمر بھر کی مسلسل جد و جہد کے بعد اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس قرآنی نظام کو قائم فرمایا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد مفاد پرستانہ قوتیں غالب آگئیں اور یہ نظام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب یہی مسلک جسے مفاد پرستانہ قوتوں نے وضع کیا تھا، اسلام کے نام سے، صدیوں سے مسلمانوں کے ہاں رائج چلا آ رہا ہے۔ ہمارا مذہب پرست طبقہ اسی اسلام کا حامی اور علمبردار ہے اور اس کے پاس اس کی سند صرف یہ ہے کہ یہ ہمارے اسلاف سے ہم تک متوارث چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ دین کی سند قرآن ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے اور جو ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں (حرفاً حرفاً) محفوظ ہے۔ مسلمانوں کی اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ خود بھی جہنم

کے عذاب میں مبتلا ہیں اور ان کے ساتھ باقی دنیا بھی سکون ناآشنا۔

اس جہنمی حالت سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اندھی تقلید چھوڑ کر، قرآن کے حقائق پر غور کرے اور سوچے کہ خدا کا ضابطہ کس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے آیا تھا اور ہم نے کیا کر رکھا ہے۔ اس طرح جنّت سے نکلے ہوئے آدم کو پھر سے جنت مل سکتی ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں نے اپنا رُخ نہ بدلا اور قرآن کے پروگرام کو اپنی زندگی کا لائحۂ عمل نہ بنایا تو اس نظام کو کوئی اور قوم اپنا لے گی اور وہ کام جو ان کے ہاتھوں انجام پانا تھا، کسی اور کی وساطت سے تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ خدا کا قانون، نہ کسی خاص قوم سے وابستہ ہے نہ کسی خاص ملک و وطن کی حدُود میں مقید۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؎

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است	سازِ قرآن را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر اُفتد اگر	آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از اُمتاں آمد غنی	از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست	احتیاجِ روم و شام او را کجاست
حق اگر از پیشِ ما بر دارد ش	پیشِ قومے دیگرے بگزاردش

ترسم از روزے کہ محرومش کنند

آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند (اقبالؒ)

دیکھئے، قرآن اس باب میں کس قدر واضح الفاظ میں تنبیہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (۴۷/۳۸)

تم وہ لوگ ہو جو اس ضابطہ پر ایمان کے مدعی ہو، جو تمہیں یہ کہتا ہے کہ تم اپنی کمائیوں کو نوعِ انسانی کے بہبود کلّی کے لئے کھلا رکھو۔

اور تم کرتے کیا ہو؟

فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۔ (۴۷/۳۸)

تم سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھ لیتے ہو۔ یاد رکھو اس سے تم دوسروں کو محروم نہیں کرتے بلکہ خود اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں سے محروم کرتے ہو۔

تم سمجھتے ہو کہ چونکہ تم خدا کے ضابطہ پر ایمان کے مدعی ہو اس لئے خدا اپنے اس ضابطہ کو بروئے کار لانے کے لئے

تمہارا محتاج ہو چکا ہے۔ یہ کس قدر غلط خیال ہے۔

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۔ (۴۷/۳۸)

اللہ کا قانون تمہارا محتاج نہیں۔ تم اسکے محتاج ہو۔

یاد رکھو

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۔ (۴۷/۳۸)

اگر تم (اسی طرح) گریز کی راہیں تراشتے رہے تو وہ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا۔ اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔

یہ ہے خدا کا اٹل قانون جو نہ کسی کی مقدس آرزوؤں کی رعایت کرتا ہے اور نہ ہی کسی کے فریبِ نفس سے دھوکا کھاتا ہے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۔ (۴/۱۲۳)

یہ نہ تو تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوتا ہے اور نہ ہی (تمہارے فریقِ مقابل) اہلِ کتاب کی آرزوؤں کے مطابق۔

اس کا قانون یہ ہے کہ:-

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۔ (۴/۱۲۳)

جو قوم بھی ناہمواریاں پیدا کرنے والا پروگرام اختیار کرے گی، وہ اس کا نتیجہ بھگتے گی۔ خدا کے قانون کے علاوہ نہ اس کا کوئی حمایتی ہوگا نہ سرپرست۔

اس کے برعکس

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۔ (۴/۱۲۴)

جس قوم کے افراد (مرد ہوں یا عورت) خدا کے ضابطہ کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیتے ہوئے ہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے، تو اس قوم کے حصے میں جنت آئے گی اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔

اب تم خود ہی سمجھ لو کہ

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ ...... (۴/۱۲۵)

اس سے بہتر نظامِ زندگی اور کس قوم کا ہوگا جو قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جائے اور توازن بدوش پروگرام کو

اپنا لائحہ عمل بنائے۔

وَذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمِ . یہ ہے محکم اور متوازن نظامِ ربوبیتِ خداوندی۔

اس نظام سے جس قسم کا مثالی معاشرہ وجود میں آتا ہے اس کی تصویر اقبالؒ نے ان الفاظ میں کھینچی ہے ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش	خوب روی و نرم خوی و سادہ پوش
فکرشاں بے درد و سوزِ اکتساب	رازدانِ کیمیائے آفتاب
خدمتِ او مقصدِ علم و ہنر	کار ہا را کس نمی سنجد بہ زر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست	این بتاں را در حرم ہا راہ نیست
سخت کش دہقاں چراغش روشن است	از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں	نے کسے روزی خورد از کشت و خون
نے قلم در مر غدیں گیرد فروغ	از فنِ تحریر و تشہیر دروغ
نے ببازاراں زبیکاراں خروش	نے صداہای گدایاں در دگوش

کس در ایں جا سائل و محروم نیست

عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

قرآن اس کا نام "جنت کی زندگی" قرار دیتا ہے۔ اس زندگی میں بھی جنت اور بعد کی زندگی میں بھی جنت اور یہی انسانی سعی و کاوش کا منتہیٰ ہے۔ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ. وہ جنتِ ارض کی زندگی جس کے متعلق فرمایا کہ دَعْوٰهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ۔ (۱۰/۱۰) اس معاشرہ میں ان لوگوں کا دعویٰ (CLAIM) یہ ہوگا کہ خدا کے قانون سے یہ بہت بعید ہے کہ وہ تعمیری نتائج پیدا کرنے والے اعمال کو ضائع کر دے۔ اس لئے وہ اس یقینِ محکم کے ساتھ اس معاشرہ کی تنظیم اور نظامِ ربوبیت کی تشکیل میں ہمہ تن مصروف رہیں گے۔ اس نظام کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ اس میں ہر فردِ معاشرہ دوسرے افراد کی تکمیلِ ذات کا آرزومند ہوگا۔ (وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ۔ ۱۰/۱۰) اور اس طرح آخر الامر ان کا دعویٰ حقیقت بن کر سامنے آجائے گا اور دنیا دیکھ لے گی کہ ہر قسم کی تحسین و ستائش کا مستحق یہی نظام ہے جو تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۱۰/۱۰)

لیکن مجھے اس کا احساس ہے کہ مسلمان اس آواز پر بہت کم توجہ دے گا۔ اس کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہوگا کہ یہ بالکل

نئی آواز ہے۔ یہ ایک "نیا دین" ہے۔ صدیوں کی محکومی اور تقلید سے مسلمان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اس کے قوائے فکر و عمل

اعتراض۔ یہ نئی آواز ہے؟

مفلوج ہو چکے ہیں۔ اس کے نزدیک وہی پامال راہیں پُرامن ہیں جن پر یہ سینکڑوں برس سے چلا آرہا ہے۔ نیا تصور، نیا نظریہ، نئی روشن، یعنی ندرتِ فکر و عمل اس کے "مذہب" میں حرام ہے۔ ہر حدّت اس کے نزدیک بدعت ہے۔ ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی جہنّم کا موجب (کل بدعة ضلالة وکل ضلالة فی النار) حالانکہ زندہ قوموں کی شان یہ ہے

کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

وہ زمانے کے نئے نئے تقاضوں کے مطابق اپنے معاشرے میں نت نئے اضافے کرتی جاتی ہیں اور اس طرح ندرتِ فکر و عمل سے دن بدن آگے بڑھتی جاتی ہیں لیکن وہی مسلمان جس کی کبھی یہ حالت تھی کہ:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان

"نئی بات" سے اس طرح ڈرتا اور سہم جاتا ہے جس طرح قفس کا خوگر پرندہ کھلی فضا سے گھبراتا ہے۔

لیکن "نئی" اور "پرانی" کا تصور بھی ایک عجیب چیز ہے! جو چیز آج نئی نظر آتی ہے جب وہ معاشرہ میں رائج ہو جاتی ہے تو کچھ وقت کے بعد وہی پرانی ہو جاتی ہے اور جو ابھی رائج نہیں ہوتی وہ نئی اور غیر مانوس نظر آتی ہے۔ آج ہمیں قرآنی نظامِ ربوبیت بالکل نیا اور غیر مانوس نظر آئے گا۔ لیکن ذرا سوچئے کہ قرآن نے کتنے ایسے تصورات پیش کئے تھے جو اُس وقت دنیا کی نگاہوں میں بالکل نئے اور غیر مانوس تھے لیکن جو آج ساری دنیا کا معمول بن چکے ہیں۔ کیا یہ تصور کہ بادشاہوں کی حکومت غیر انسانی نظام ہے، اُس وقت کی دنیا کے لئے ایک بالکل نئی بات نہ تھی! کیا یہ تصور کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان مساوی ہیں اور قبائل اور درنوں (ذاتوں) کی تقسیم غیر انسانی ہے، بالکل نیا نظریہ نہیں تھا؟ کیا یہ عقیدہ کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی پیشوا (PRIEST) کی ضرورت نہیں، یکسر نیا عقیدہ نہیں تھا؟ کیا یہ تصور کہ قبائل اور اقوام کی تقسیم غیر انسانی ہے اس کی جگہ تمام نوعِ انسانی کو ایک برادری قرار دے کر ساری دنیا میں ایک ہی آئین رائج ہونا چاہیئے، نیا تصور نہیں تھا؟ لیکن دیکھئے کہ ان تمام "نئے" تصورات کو دنیا نے ایک ایک کر کے قبول کر لیا اور آج ان میں سے کوئی تصور بھی نیا اور غیر مانوس نہیں رہا، نہ مسلمانوں کے نزدیک اور نہ غیر مسلموں کے نزدیک۔ لیکن قرآن کے جن تصورات کو ابھی دنیا نے اپنایا نہیں، وہ نئے اور غیر مانوس نظر آتے ہیں اور اس لئے ناقابلِ قبول۔ ان ہی میں یہ تصور بھی ہے کہ ذاتی املاک کی بنیادوں پر معاشرہ، فساد کا موجب ہوتا ہے۔ معاشرہ کا صحیح نقشہ یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کو مقصودِ حیات سمجھا جائے۔ اسے آج نیا اور غیر مانوس تصور سمجھا جاتا ہے اور اسی بنا پر ہماری طبائع اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں

ہوتیں۔ لیکن جب دنیا اسے بھی اپنالے گی تو یہ تصور بھی زندگی کا معمول بن جائے گا۔

لیکن اس باب میں مسلمان کی حالت بڑی تاسف انگیز ہے۔ اس کا فریضہ یہ تھا کہ یہ زمانے کے تقاضوں کا انتظار کئے بغیر صحیح نظامِ زندگی کو خود بھی اختیار کرتا اور اسے دنیا کے سامنے بھی پیش کرتا۔ لیکن اس کے برعکس اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب دنیا، زمانے کے تقاضوں (فطرت کے اشاروں) کے مطابق کسی تصور کو اپنانے کا قصد کرتی ہے تو یہ سب سے پہلے اس کی مخالفت کرتا ہے اور جب اس کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، اقوامِ عالم اسے اختیار کر لیتی ہیں تو پھر یہ بھی آہستہ آہستہ اُن کی تقلید میں، اس تصور کو قبول کر لیتا ہے۔ یعنی اس نے بہرحال تقلید کرنی ہے، امامت نہیں کرنی!

ذرا غور کیجئے۔ کتنا عرصہ ہوا کہ مغرب نے فطرت کے اشاروں کے ماتحت، ملوکیت کے خلاف، انقلابی آواز اٹھائی اور اپنے ہاں سے رفتہ رفتہ بادشاہوں کو ختم کر دیا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے بادشاہوں کو بدستور سر پر اٹھائے رکھا اور بدستور محراب و منبر سے ان کی تائید و نصرت کی دعائیں مانگتے رہے تا آنکہ زمانے کے شدید تقاضوں نے خود ان کی بادشاہتوں کو الٹنا شروع کر دیا۔

کتنا عرصہ ہوا کہ مغرب نے مذہبی پیشوائیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور رفتہ رفتہ اپنے ہاں کی عملی زندگی سے اس غیر انسانی ادارے کو الگ کر دیا۔ لیکن مسلمان بدستور ملائی و پیری کی مسندوں کو بچھاتا رہا اور اب تک بچھائے چلا جا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب زمانے کی تیز آندھیاں ان کھوکھلی مسندوں کو خود تہ و بالا کر رہی ہیں۔

کتنا عرصہ ہوا کہ اقوامِ مغرب نے غلامی (SLAVERY) کو اپنے ہاں ممنوع قرار دے دیا۔ لیکن مسلمانوں کے ہاں یہ لعنت ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ اگرچہ اب، دنیا کی ندامت کے خیال سے انہیں بھی اپنی اس روش پر کچھ جھینپ سی ضرور محسوس ہو رہی ہے۔

یہ حالت ہے اس قوم کی جسے خدا نے اقوامِ عالم کی امامت کے لئے آگے بڑھایا تھا۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) امامت تو ایک طرف، جب کوئی دوسری قوم قرآنی تصور کو اپنانے کا ارادہ کرتی ہے تو بدقسمتی سے اس کی مخالفت سب سے پہلے مسلمانوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہی حالت نزولِ قرآن کے وقت "اہلِ کتاب" کی تھی۔ کیفیت یہ تھی کہ عرب کے کفار اور مشرکین تو قرآنی تصورات کو سننے کے لئے آمادہ ہو جاتے تھے لیکن یہ لوگ جو آسمانی کتاب کے حامل ہونے کے مدعی تھے، ان تصورات کی مخالفت میں پیش پیش رہتے تھے۔ اسی لئے قرآن کو ان سے کہنا پڑا کہ (وَلَا تَكُونُوٓا أَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهِۦ - ۲/۴۱) یہ تو کسی طرح بھی زیبا نہیں کہ اس کی مخالفت سب سے پہلے تمہاری طرف سے شروع ہو۔ اُن سے کہا گیا کہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ بالکل نئے تصورات ہیں جنہیں قرآن پیش کرتا ہے۔ یہ نئے نہیں ہیں۔ اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ

الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى (۱۸-۱۹ / ۸۷ نیز ۵۳ / ۳۶-۳۷) جو صحائفِ قانون ان انبیاء کو دیئے گئے تھے (ابراہیم و موسیٰ) جن کے تم اپنے آپ کو متبع بتاتے ہو یہ تصورات ان میں بھی موجود تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تم نے ان صحائف کو پس پشت ڈال دیا، اور مذہب اختیار کر لیا انسانوں کا خود ساختہ۔ اس لئے اب تمہیں وہی تصورات بالکل نئے اور غیر مانوس نظر آتے ہیں۔ ان (اہل کتاب) کی اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ان میں سے بہت کم اسلام لائے؛ اور (ان کے برعکس) اہل عرب، جو کسی مصطلحہ مذہب کے پابند نہیں تھے) رفتہ رفتہ مسلمان ہو گئے۔

بعینہٖ آج یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ یہ تمام تصورات قرآن کے اندر موجود ہیں لیکن چونکہ انہوں نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا اور مذہب اختیار کر لیا۔ انسانوں کا خود ساختہ، اس لئے اب انہیں یہ تمام تصورات نئے نئے دکھائی دے رہے ہیں اور اس لئے ان کی مخالفت سب سے پہلے ان ہی کی طرف سے شروع ہو جاتی ہے۔

(٠)

یہ بھی کہا جائے گا کہ قرآن کی یہ تعبیر، روس اور چین کی اشتراکیت سے متاثر ہو کر کی گئی ہے۔ جہاں تک "متاثر ہونے" کا تعلق ہے، قرآن کے ایک بنیادی اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن وہ ضابطہ حیات ہے جو خدا کی طرف سے تمام نوعِ انسانی کے لئے۔ قیامت تک کے لئے، مکمل اور غیر متبدل شکل میں دے دیا گیا ہے۔ انسانی معاشرہ کی کوئی ضرورت اور زندگی کا کوئی تقاضا ایسا نہیں جس کے لئے اس میں راہ نمائی موجود نہ ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ معاشرہ کی تمام ضرورتیں اور زندگی کے تمام تقاضے سب کے سب ایک ہی دور میں اُبھر کر سامنے نہیں آجاتے۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے، زندگی کے مختلف تقاضے نکھر کر سامنے آتے جاتے ہیں۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جس تقاضے کو کسی پچھلے دور میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی، وہی تقاضا بعد کے دور میں زندگی کا سب سے بڑا اور عالمگیر تقاضا بن گیا۔ لہٰذا، قرآنی راہ نمائی کی صورت یہ ہے کہ زندگی کا جو تقاضا اہمیت اختیار کرتا ہے، اس کے متعلق قرآنی راہ نمائی، اربابِ فکر و نظر کے سامنے نمایاں ہو کر آجاتی ہے۔ قرآن میں ہے۔ (سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ ۴۱/۵۳) ہم (اربابِ علم و بصیرت کو) خود ان کی اپنی قوم میں اور بین الاقوامی (آفاق[1]) زندگی کے تغیرات میں

---

[1] "آفاق" سے خارجی کائنات اور "انفس" سے انسان کی داخلی دنیا بھی مراد لی جاسکتی ہے۔ لیکن انسان کے سامنے جو تغیرات زیادہ محسوس و مرئی شکل میں آتے ہیں وہ قومی اور بین الاقوامی تمدن کی زندگی کے تغیرات ہوتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس مفہوم کو ترجیح دی ہے۔ بات دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔

اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے، تاآنکہ (رفتہ رفتہ) یہ چیز ان پر آشکار ہو جائے کہ قرآن کا قانون فی الواقعہ ایک ٹھوس تعمیری نتیجہ برآمد کرنے کا پروگرام دیتا ہے۔" یہ "نشانیاں" جن سے قرآن کا ایک ایک قانون حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آجاتا ہے، قوموں کی الگ الگ اور بین الاقوامی زندگی کے تمدنی، عمرانی اور نفسیاتی تغیرات ہیں جنہیں زمانے کے تقاضے یا فطرت کے اشارے کہا جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست ہر جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش می دہد قرآں جہانے دیگرش

بنا بریں، اگر اپنے زمانے کے تقاضوں کی حل طلبی کے لئے قرآن میں غور و فکر کرنا جرم ہے تو پھر قرآن میں چھپی ہوئی حقیقتیں اُبھر کر کبھی سامنے نہیں آسکتیں! ہمارا زمانہ عصرِ معیشت (AGE OF ECONOMICS) کہلاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے مذکورہ صدر اصول کے مطابق، اس زمانے کے رجحانات خود اس کے متقاضی تھے کہ قرآن میں غور کرنے سے اس کا نظامِ ربوبیت ابھر کر سامنے آجاتا اور اس طرح اس کی مستور حقیقت مشہود بن جاتی ہے۔

باقی رہا یہ کہنا کہ قرآن کی یہ تعبیر، روس اور چین کی اشتراکیت سے متاثر ہو کر کی گئی ہے سو اس قسم کی سطحی بات وہی کہہ سکتا ہے جس نے نہ چین اور روس کی اشتراکیت کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہو اور نہ ہی قرآن کے نظامِ ربوبیت کا۔ جس نے ان دونوں نظامہائے زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے' وہ جانتا ہے کہ یہ دونوں نظام' اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے کس قدر باہمدگر مختلف اور متغائر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں شروع سے' قرآنی نظامِ ربوبیت کو پیش کرنے کے ساتھ کمیونزم کا تجزیہ بھی کرتا چلا آرہا ہوں تاکہ سطح بین نگاہوں کو یہ دھوکا نہ لگ جائے کہ اصل کے اعتبار سے یہ دونوں ایک ہیں جیسا کہ میں نے گذشتہ اوراق میں مختصر الفاظ میں بتایا ہے۔ کمیونزم اس مسئلہ کے حل کی تلاش میں ضرور نکلی لیکن اس تلاش میں اس کی کیفیت یہ ہوگئی کہ

خواستم پیکاں بر آرم، در جگر نشتر شکست

وہ چلی تھی جنت کی تلاش میں لیکن انسانیت کو لے گئی جہنم کی طرف۔ اس کی بنیادی غلطی یہ تھی (اور یہ لازمی نتیجہ تھا میکانکی تصورِ حیات کا جو مارکس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا) کہ اس نے انسان کا سارا مسئلہ "روٹی" میں محدود کر دیا۔ اس نظریہ کے ماتحت انسان" ریل کا انجن" بن کر رہ گیا کہ اس کے پیٹ میں ایندھن اور حلق میں پانی ڈال دیجئے

تو اس کے سارے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ریلوے کا آفیسر اسے جس پٹڑی پر جی چاہے ڈال دے وہ ڈرائیور کے اشاروں پر اندھوں کی طرح دوڑتا چلا جائے گا۔ نہ اسے یہ معلوم ہوگا کہ میں کیوں دوڑ رہا ہوں نہ اس کی زندگی کا اپنا کوئی مقصد ہوگا نہ منزل۔ نہ کوئی اختیار ہوگا نہ ارادہ۔ عمر بھر دوسروں کی بچھائی ہوئی پٹڑیوں پر، دوسروں کے اشاروں کیمطابق دوڑتے رہے اور جب دوڑتے دوڑتے دم توڑ دیا تو اس انجن کی جگہ ایک اور انجن آگیا اور اس ساری تگ و تاز کی قیمت وہ ایندھن جو اس کے پیٹ میں ڈالا گیا تھا اور وہ پانی جو اس کے حلق میں انڈیلا گیا۔ اس نظریہ حیات کے ماتحت، انسان، انسان رہتا ہی نہیں، مشین کے پُرزے بن جاتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک جیتے جاگتے صاحبِ اختیار و ارادہ انسان کو مشین کا پُرزہ یا ریل کا انجن بنانے کے لئے کس قدر استبداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا، کمیونزم استبداد کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ اس مقصد کے لئے کمیونزم کے پاس دو حربے ہیں۔ پہلا یہ کہ موجودہ نسل کے انسانوں کو آہنی شکنجوں میں اس طرح جکڑے رکھا جائے کہ وہ اپنی مرضی سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہل سکیں اور دوسرا حربہ یہ کہ آنے والی نسل کو تعلیم اس انداز کی دی جائے کہ وہ اُبھریں ہی (انسانوں کی بجائے) مشین کے پُرزے بن کر ان میں اپنی انفرادیت اور اختیار وارادے کا احساس ہی باقی نہ رہے۔

یہ ہے وہ قیمت جو کمیونزم، انسان سے روٹی کے بدلے میں وصول کرتی ہے۔ یعنی

ایں خدا نانے دہد، جانے برد

روٹی دیتی ہے اور جان لے لیتی ہے!!

اس کی وجہ یہ نہیں کہ مارکس یا اس کے دیگر رفقاء کار یہ چاہتے تھے کہ غریبوں اور مزدوروں کو روٹی کا لالچ دے کر ان کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات تنہا عقل کے بس کی ہے ہی نہیں کہ وہ کوئی ایسا نظامِ زندگی سوچ سکے جو انسانی زندگی کے تمام تقاضوں کو (جو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا) حسن کارانہ توازن کے ساتھ پورا کرتا جائے۔ تنہا عقل، انسان کے مختلف گوشوں کو دیکھ سکتی ہے، وہ انسان کو تماماً (AS A WHOLE) دیکھ ہی نہیں سکتی۔ اس لئے جب وہ اس کا ایک تقاضا پورا کرنے کی کوشش کریگی تو سو تقاضوں کا گلا گھٹ جائے گا۔ اس کے برعکس وحی انسان کو تماماً دیکھتی ہے۔ اس لئے اس کی رُو سے دیا ہوا نظام انسانی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ انسان کی مشکل یہ نہیں رہی کہ وہ زندگی کے تقاضوں سے واقف نہیں ہوتا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس کی زندگی کے مختلف تقاضے اُبھر کر سامنے آتے رہے ہیں۔ اس لئے اگر ان پنکھڑیوں کو جو شاہراہِ تاریخ پر بکھری پڑی ہیں، اکٹھا کر لیا جائے تو انسانی زندگی کے تقاضوں کا اچھا خاصا مجموعہ ہاتھ آ سکتا ہے۔

لیکن اس کی مشکل یہ رہی ہے کہ وہ تنہا عقل کی رو سے کسی ایسے نظام کا سراغ نہیں پا سکا جس میں ان تمام تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم ہو جائے۔ قرآن نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں ایک ایسی حقیقت کا پتہ دیتا ہوں جو اس سے پہلے تم میں۔ سے کسی کے پاس آئی نہیں۔ اس نے یہ کہا ہے کہ میں ایک ایسا نظام بتاتا ہوں جو ان تمام حقیقتوں کو **سچا کر کے دکھائے گا** جو تمہارے پاس آئی تھیں۔ (مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ) انسان کو ایک ایسے ہی نظام کی تلاش تھی اور اس تلاش میں وہ بُری طرح ناکام رہا تھا۔ یہ نظام قرآن نے دیا اور اس دعویٰ کے ساتھ دیا کہ اس کی مثیل و نظیر پیدا کرنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہی وہ نظام ہے جس میں ہر فردِ معاشرہ کی طبیعی ضروریات بھی پوری ہو جاتی ہیں اور اس کی ذات کی تکمیل بھی ہو جاتی ہے اور یہی مقصودِ انسانیت ہے۔ یہ نظام قرآن کے سوا کہیں نہیں ملے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی فکر، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر صحیح راستہ کی تلاش میں ہاتھ پاؤں ضرور مارتی ہے لیکن وہ فوراً اس راستہ تک نہیں پہنچ جاتی۔ اس کے سامنے صرف پگڈنڈیاں آتی ہیں جو بڑے پیچ و خم کھاتی، کوہ و دریا کو عبور کرتی، بڑے بڑے دشوار گزار مراحل طے کرتی مختلف تجارب کے بعد، زندگی کی متوازن شاہراہ (صراطِ مستقیم) میں جا کر ملتی ہیں اور یہ کچھ بھی زندگی کے کسی ایک تقاضے کے متعلق ہوتا ہے اِتمامًا (AS A WHOLE) نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے وحی کی راہ نمائی زندگی کے تمام تقاضوں کو سامنے رکھتی ہے اور انسان کو براہِ راست صراطِ مستقیم پر لے جاتی ہے جس سے وہ راستے کی پُر پیچ گھاٹیوں سے (جن میں کھو جانے کا ہمیشہ خطرہ ہوتا ہے) محفوظ و مصئون نکل جاتا ہے (لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔) یہی وجہ ہے کہ فکرِ انسانی نے زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر جو راستے اختیار کئے ان میں حق و باطل ملے جلے رہے۔ حق متمیز ہو کر سامنے نہیں آیا۔ مثلاً روسو (اور اس کے رفقاء) کی فکر نے ملوکیت سے اُبا کر کے جمہوریت کا تصور تلاش کیا تو ان کی یہ کوشش غلط راستے سے صحیح راستے کی طرف ایک قدم ضرور تھی لیکن ان کی جمہوریت انہیں اس مقام تک نہ پہنچا سکی جو وحی کی راہ نمائی سے مل سکتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مغرب باہمہ ادعائے جمہوریت، ابھی تک انسانیت کی صحیح جمہوریت سے دور ہے اور مختلف تجربہ گاہوں سے گزر رہا ہے اگر اُس وقت زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر روسو کی بجائے کوئی ایسا صاحبِ فکر آگے بڑھتا جو قرآن کی روشنی میں نشانِ منزل متعین کرتا تو دنیا ایک قدم میں صحیح راستہ پر بھی جا پہنچتی اور زندگی کے دوسرے تقاضے جو اسوقت جمہوریت کے غلط تصور کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں، ساتھ کے ساتھ پورے ہو جاتے۔

اسی طرح عصرِ حاضر کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، مارکس اور اس کے رفقاء نے بھی صحیح راستے کی تلاش کی کوشش کی اور ان کی فکر انہیں راستے کا دھندلا سا تصور دے سکی۔ لیکن صراطِ مستقیم (زندگی کی متوازن راہ) نکھر کر اُن کے

سامنے نہ آسکی۔ ان کی نگاہیں "مساواتِ شکم" میں الجھ کر رہ گئیں، انسانی ذات کے غیر متناہی تقاضوں کو بے نقاب نہ دیکھ سکیں۔ اگر اُس وقت ان کی جگہ کوئی ایسی فکر آگے بڑھتی جو قرآن کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل طلب کرتی تو دنیا اِس وقت تک کبھی کی، نظامِ ربوبیت کو اختیار کر چکی ہوتی۔ یہ کام مسلمانوں کے کرنے کا تھا جو اپنی بغل میں خدا کی زندہ کتاب رکھتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان وحی کی روشنی میں دنیا کی راہ نمائی نہ کریں تو فکرِ انسانی کے لئے اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ وہ اپنی کوششوں سے راستے کا سراغ لگاتی رہے۔ اس کی یہ کوشش بہرحال، اس قوم کی روش سے تو بہتر ہے جو نہ خدا کی وحی سے کام لے اور نہ ہی عقل کی روشنی سے۔

لیکن جب خدا کی وحی سامنے آجائے تو پھر عقلِ سلیم کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنی حدود (LIMITATIONS) کا اعتراف کرکے، وحی کی راہ نمائی میں صراطِ مستقیم پر چل نکلے۔ اس کی یہ روش، انسانیت کو اس جنت کی طرف لے جائے گی جس کی بہاروں پر کبھی خزاں نہیں آسکتی (تجری من تحتہا الانہٰر) اور جس میں پہنچ کر انسان کو کسی قسم کا خوف وحزن باقی نہیں رہ سکتا۔

میں نے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن جس نظام کو انسانی زندگی کے تقاضوں کے لئے بطور ایک مکمل حل کے تجویز کرتا ہے، اسے عصرِ حاضر کے سامنے پیش کردوں، اس امید کے ساتھ کہ وہ اپنے ذاتی امیال وعواطف سے الگ ہٹ کر علمی بصیرت اور تاریخی شواہد کی روشنی میں اس پر غور کرے۔ اور اس طرح اگر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس میں واقعی انسانیت کے مصائب کا حل پوشیدہ ہے تو اس پر عملاً تجربہ کرے اس لئے کہ کسی نظام کے نتائج مشہود شکل میں کبھی سامنے نہیں آسکتے جب تک اس پر عملاً تجربہ نہ کیا جائے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے پیش کردہ نظام کو عملاً آزما کر دیکھو۔ اس کے نتائج میرے دعوے کی صداقت کی دلیل بن جائیں گے۔

قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ میری دعوت کے مخاطب صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن میں زندگی کی رمق موجود ہے۔ (لتنذر من کان حیًّا) جن میں زندگی کی حرارت باقی نہیں وہ اس کے نزدیک درخورِ تخاطب ہی نہیں اس لئے جس نظامِ ربوبیت کا خاکہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے اس کے حیات آفرین ممکنات کا اندازہ وہی لوگ کر سکیں گے جن کے قلوب میں زندہ رہنے کا ولولہ، جن کے بازوؤں میں زندگی بخش خون، اور جن کی نگاہوں میں زندگی کو مشہود دیکھنے کی آرزو ہوگی، جو چلتی پھرتی لاشیں، زندگی اور اس کی توانائیوں سے محروم ہو کر محض پیکرِ آب وگل بن چکی ہیں، ان سے نہ تو قرآن کا تخاطب ہے اور نہ ہی مجھے کوئی توقع۔ قرآن کا تو پیغام یہ ہے کہ ؎

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

جیساکہ پہلے لکھا جاچکا ہے، قرآن شدومد سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ آخر کار نوعِ انسانی کے معاشرے کو ان ہی خطوط پر متشکل ہوکر رہنا ہے جو اس نے تجویز کی ہیں۔ یہ فطرت کا اٹل فیصلہ ہے جسے واقعہ ہوکر رہنا ہے جو بڑی بڑی طاقتیں اس نظامِ ربوبیت کی راہ میں حائل ہوں گی انہیں اس طرح راستے سے ہٹا دیا جائے گا جس طرح تیز و تند ہوا بڑے بڑے تناور درختوں کو جڑ سے اکھیڑ کر پرِ کاہ کی طرح اڑا دیتی ہے۔ (وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا - ۲۰/۱۰۵) اور اس کے بعد میدان بالکل صاف ہوجاتا ہے (فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا - ۲۰/۱۰۶) جس میں نہ کسی قسم کا ٹیڑھ پن باقی رہتا ہے نہ اونچ نیچ (لَا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا - ۲۰/۱۰۷) ان سے اس طرح میدان صاف کر دینے کے بعد انسانیت کا وہ گروہِ عظیم جو آج تک اس بُری طرح سے کچلا جا رہا ہے ابھر کر اوپر آجائے گا (وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً - ۱۸/۴۷) اس لئے کہ اس ربوبیتِ عامہ کی رو سے اس کی دبی ہوئی صلاحیتیں اور چھپے ہوئے جوہر پوری پوری نشوونما پاکر مشہود ہو جائیں گے اور یوں نوعِ انسانی اپنے پاؤں پر کھڑی ہوجائے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ انقلابِ عظیم واقع ہوکر رہیگا۔

مندرجہ بالا الفاظ کو پھر دہرایئے کہ یہ انقلاب عظیم واقع ہوکر رہے گا۔ ان الفاظ کو آپ اس سے پہلے بھی کتنی ایک مقامات پر دیکھ چکے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی قوت ہے جس کی بنا پر یہ انقلاب واقع ہوکر رہے گا؟

قوت کون سی ہے؟

اس کا جواب عام طور پر تو یہی دیا جائے گا کہ یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے ہوگا۔ وہ بڑا قادر و توانا ہے۔ ہر شے اس کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے حضور کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ اس لئے جب اُس خدا نے کہہ دیا ہے کہ ایسا ہوکر رہیگا تو ضرور ایسا ہو کر رہیگا۔

یہ درست ہے کہ خدا بڑی قدرتوں کا مالک ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے ارادے اور فیصلے کے سامنے رکاوٹ بن کر کھڑا ہوجائے۔ لیکن اس خدا نے خود ہی بتا دیا ہے کہ ہماری اس قدرت اور قوت کا ظہور یونہی ہنگامی طور پر نہیں ہوتا بلکہ ایک قاعدے اور ضابطے کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی کو ہم نے (گذشتہ صفحات میں) قانونِ خداوندی سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا یہ انقلاب قانونِ خداوندی کی قوت سے ظہور میں آئے گا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم بہت کم سمجھتے ہیں کہ قانون میں کتنی بڑی قوت ہوتی ہے۔ اوّل تو جب ہم قانون کا لفظ بولتے ہیں تو ہماری نگاہ عدالتوں کی طرف اٹھ جاتی ہے کیونکہ ہم نے قانون کا لفظ عدالتوں ہی کے ضمن میں سُنا ہے لیکن قانون (LAW) عدالتوں تک محدود نہیں،

قانون کی قوت

یہ ساری کائنات کو محیط ہے۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے قانون کے تابع ہو رہا ہے۔ یہ بڑے بڑے اجرامِ فلکی اس فضائے بیکراں کی پہنائیوں میں جس نظم و ضبط کے ساتھ تیرتے پھر

رہے ہیں، یہ سب قانون کی قوت سے ہے۔ سورج اسی کے زور پر ٹھیک اپنے وقت پر نکلتا اور ایک خاص راستہ طے کرتا ہوا اپنے وقت پر غروب ہو جاتا ہے۔ چاند، اسی کی قوت سے بڑھنے اور سمٹنے کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔ سمندر میں مدوجزر اسی کی قوت سے واقع ہوتا ہے۔ عظیم الجثہ جہاز اتنا اتنا وزن لے کر سینۂ بحر پر بط کی طرح اسی کے بل بوتے پر تیرتے پھرتے ہیں۔ ہوائیں اسی کے زور سے چلتی ہیں۔ بارش اسی کی قوت سے برستی ہے۔ ننھے ننھے بیجوں سے شاہ بلوط جیسے تناور درخت قانون ہی کے زور سے اُبھرتے ہیں۔ کھیتیاں اسی کی قوت سے پروان چڑھتی اور وجۂ زلیست بنتی ہیں۔ دھوئیں کا انجن جو اتنی اتنی لمبی گاڑیوں کو پرِکاہ کی طرح اڑائے پھرتا ہے تو یہ بھی قانون ہی کے زور سے ہوتا ہے۔ بجلی، جس نے آج روئے زمین کا نقشہ بدل دیا ہے، قانون ہی کی قوت سے حرکت اور روشنی پیدا کرتی ہے۔ خود انسان کی طبعی زندگی، جو صحنِ کائنات میں اس قدر رنگ و بو پیدا کرتی رہتی ہے، قانون ہی کے زور پر قائم ہے۔ غرضیکہ اس پوری کائنات میں قانون خداوندی ہی کی کارفرمائی اور اسی کی کبریائی ہے۔ قانون کے معنی ہیں (IF.... THEN.... ALWAYS) یعنی اگر فلاں شرائط پوری ہو جائیں گی تو ان کا نتیجہ یہ نکلے گا اور ایسا ہمیشہ ہوگا۔ جو شخص کائناتی قانون کو سمجھتا ہے وہ پورے حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ فلاں بات کا نتیجہ یہ ہوگا جو ڈاکٹر مرض کی صحیح تشخیص کر لیتا ہے اور اسے اپنی دوائی کی صحت پر بھی اعتماد ہوتا ہے، وہ پورے اعتماد سے کہہ دیتا ہے کہ یہ دوائی دو۔ گھنٹہ بھر کے بعد بخار اُتر جائے گا۔ یعنی وہ کہہ سکتا ہے کہ "ایسا ہو کر رہے گا"۔ اس لئے کہ اُسے خدا کے قانون طبعی پر یقین ہے۔ ایک ماہر فلکیات

ایسا ہو کر رہے گا

پورے یقین کے ساتھ کہہ دیتا ہے کہ آج سے سو سال کے بعد، فلاں دن فلاں وقت سورج گہن میں آجائے گا۔ اسے قانونِ فلکیات پر ایسا یقین ہے کہ وہ ساری دنیا کو چیلنج دے کر کہہ دیتا ہے کہ "ایسا ہو کر رہے گا"۔ دور کیوں جائیے! جب ہم انگیٹھی میں کوئلہ سلگا کر اُس پر پانی کی دیگچی رکھ دیتے ہیں تو پھر کس یقین کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ دس منٹ میں چائے تیار ہو جائے گی اور چائے تیار ہو کر رہتی ہے۔ یہ ہے قانون کی قوت !!

قرآن یہ کہتا ہے کہ جس طرح خدا کا قانون، خارجی کائنات میں جاری و ساری ہے اسی طرح اس کا قانون خود انسانوں کی تمدنی اور معاشرتی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں سے ایک "مومن" اور "کافر" کا فرق شروع ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عام لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اسے تو مانتے ہیں کہ کائنات میں ایک خارجی قانون جاری و ساری

کائناتی قانون

ہے۔ لیکن جب وہ انسانوں کی دنیا میں آتے ہیں تو یہاں کسی خارجی قانون کو تسلیم نہیں کرتے۔ خارجی قانون کا مطلب یہ ہے کہ وہ قانون خود ان چیزوں کا پیدا کردہ نہیں ہوتا۔ ان پر خارج

سے وارد ہوتا ہے۔ مثلاً یہ قانون کہ پانی اتنی حرارت کے بعد بھاپ بن جائے گا خود پانی کا اپنا تجویز کردہ نہیں۔ کوئی خارجی قوت ہے جس نے یہ قانون پانی کے لئے تجویز کر رکھا ہے۔ یہ لوگ اشیائے کائنات کے لئے تو اس قسم کا قانون تسلیم کرتے ہیں لیکن انسانوں کی دنیا میں اس قسم کا قانون نہیں مانتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ انسانوں کو خود حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے آپ قانون تجویز کریں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی بھول ہے۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ اگر تو اُن سے پوچھے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو کس نے پیدا کیا اور کس کا قانون ہے جو سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کئے ہوئے ہے تو یہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ سب خدا کے قانون سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ جب تم خارجی کائنات میں ایسے قانون کو تسلیم کرتے ہو تو انسان کی معاشرتی اور معاشی دنیا میں قانون کے لئے کسی اور طرف کیوں دیکھنے لگ جاتے ہو؟ (فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔ ۲۹/۶۱) اور اسے کیوں نہیں مانتے کہ (اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ۔ ۲۹/۶۲) سامانِ زیست کی فراوانی اور تنگی بھی، انسانوں کے خود ساختہ قانون کی رُو سے نہیں، بلکہ اُسی خدا کے قانون کی رو سے واقعہ ہوتی ہے جس کا قانون کائنات میں، بایں ہمہ جلال و جبروت کارفرما ہے؟ ان لوگوں کو جو خارجی کائنات میں خدا کے قانون کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن انسان کی معاشی اور تمدنی دنیا میں کسی قانون کو نہیں مانتے، قرآن کافر کہہ کر پکارتا ہے۔ اور جو لوگ خارجی کائنات میں تو خدا کے قانون کو مانتے لیکن انسان کی معاشی اور تمدنی دنیا میں انسانوں کے خود ساختہ قانون کو مانتے ہیں، وہ انہیں مشرک قرار دیتا ہے۔ مثلاً مغرب کی قومیں خارجی کائنات میں قانون کی کارفرمائی تسلیم کرتی ہیں، چنانچہ وہ اِن قوانین کا علم حاصل کر کے، نت نئے دن فطرت کی بے پناہ قوتوں کو مسخر کئے جاتی ہیں۔ لیکن وہ انسانوں کی تمدنی دنیا میں خدا کے قوانین کو تسلیم نہیں کرتیں اور فطرت کی قوتوں کے ماحصل کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دنیا جہنم بن رہی ہے۔ اگر وہ انسانی دنیا میں بھی خدا کے قوانین کو رائج کرلیں تو یہی دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔

اِنسانوں کی دُنیا میں قانون

کائناتی قوانین اور انسانی دنیا سے متعلق قوانین میں فرق یہ ہے کہ:۔

(۱) کائناتی قانون ہر شے کے رگ و پے میں از خود جاری و ساری ہے اور

(۲) کسی شے کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ اس قانون کی خلاف ورزی کر سکے۔

اس کے برعکس انسانی زندگی سے متعلق قانون

(ا) وحی کے ذریعے ملتا ہے اور

(ب) انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس قانون کو اختیار کرے اور چاہے تو اپنے لئے دوسرا قانون وضع کر لے۔

لیکن جس طرح کائناتی قانون کی قوت ایسی ہے کہ اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق قانون کی قوت بھی اس قدر بے پناہ ہے کہ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی چاہیں کہ اس کے خلاف نتیجہ پیدا کرسکیں تو یہ ناممکن ہے وَمَآ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ (۲۹/۲۲) جس طرح تمہارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہمارے کائناتی

خدا کے قانون کو شکست نہیں دے سکتے

قانون کو شکست دے سکو اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ تم اپنی تمدنی اور معاشی دنیا میں بھی ہمارے قانون کو ناکام بنا دو۔ تمہیں اس کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیئے کہ تم ایسا کر سکتے ہو (۲۲/۵۱) سورۂ جاثیہ میں ہے۔ اَمۡ حَسِبَ الَّذِيۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ کیا وہ لوگ جو انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں یہ خیال کئے بیٹھے ہیں اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ كَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ کہ ہم انہیں ان لوگوں جیسا بنا دیں گے جو ہمارے قانون کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اس کے بتائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں؟ کیا یہ لوگ اس زعم میں ہیں کہ سَوَآءً مَّحۡيَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ ان کی زندگی اور ان کی موت ایک جیسی ہوگی؟ کبھی ایسا نہیں ہوسکتا (سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ۔ ۲۱/۴۵) ان کا یہ اندازہ بڑا غلط ہے۔ ان کا یہ فیصلہ بہت بُرا ہے جو ان کے حق میں تباہی لے آئے گا۔ اس کے بعد اس کی دلیل بھی دی ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ کیا ان لوگوں نے کائناتی نظام پر غور نہیں کیا کہ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ۔ خدا نے اس تمام سلسلۂ کائنات کو اس طرح پیدا کر رکھا ہے کہ وہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرے۔ لہٰذا، جو قوم ہمارے قانون کے مطابق عمل پیرا ہوگی (جو وحی کے ذریعے دیا گیا ہے) اس کی جد و جہد ٹھوس تعمیری نتائج پیدا کرے گی اور جو اس کے برعکس چلے گی، اس کی کوششیں تخریبی نتائج مرتب کریں گی۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنے لئے خوشگوار نتائج مرتب کر لوگے تو اس خیالِ خام کو جتنی جلدی اپنے دل سے نکال سکو نکال دو۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ یہ سارا سلسلۂ کائنات اسی لئے سرگرمِ عمل ہے لِتُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ۔ (۲۲/۴۵) تاکہ ہر ایک کو اس کے اعمال کے نتائج ملیں اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہونے پائے۔ وہ کہتا ہے کہ جاؤ تاریخ کے اوراق کو الٹ کر دیکھو کہ

تاریخی شواہد

كَمۡ قَصَمۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ كَانَتۡ ظَالِمَةً۔ ہم نے کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جو حقوقِ انسانیت میں کمی کیا کرتی تھیں۔ وَاَنۡشَاۡنَا بَعۡدَهَا قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ (۲۱/۱۱) اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوموں کو اُٹھا

کھڑا کیا۔ ان تباہ ہونے والی قوموں کی حالت یہ تھی کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ (۲۱/۱۲) جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے محسوس شکل میں دیکھا تو اس سے بھاگنے لگے۔ لیکن ہمارے قانون نے انہیں للکار کر پکارا اور کہا کہ لَا تَرْكُضُوْا یہیں کھڑے رہو۔ اب تم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ تم نے دوسروں کی کمائی سے اپنے لئے جو سامانِ عیش فراہم کر رکھا تھا اور ایسے ایسے سر بفلک محلات تعمیر کر رکھے تھے اُن کی طرف لوٹ کر چلو۔ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ (۲۱/۱۳) تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ تم نے یہ کچھ کہاں سے لیا تھا اور تمہیں کیسے حق پہنچتا تھا کہ تم دوسروں کی کمائی پر عیش اڑاؤ؟

آپ اس آخری ٹکڑے (لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ) پر غور کیجئے۔ جب کوئی گروہ اتنی طاقت فراہم کر لیتا ہے کہ اس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے تو وہ جو جی میں آئے کرتے ہیں اس لئے کہ انہیں اطمینان ہوتا ہے کہ ہم سے کون پوچھنے والا ہے؟ ان کی قوت، از منۂ مظلمہ کے کسی ہلاکو خان کی وحشت و

بازپرس ہوگی

بربریت کی شکل اختیار کرے یا ہمارے دورِ تہذیب و تمدن کی جمہوریت میں "اکیاون فیصد ووٹ" کی میجارٹی (MAJORITY) کے لباس میں سامنے آئے، خیال ہر جگہ یہی غالب ہوتا ہے کہ اب ہمیں کون پوچھنے والا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ ان کا یہ زعم باطل ہے کہ ان کا فیصلہ 'قانون' بن جاتا ہے جس کے بعد انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں رہتا۔ ان کا جو فیصلہ بھی ہو، اس کے نتائج ہمارے قانون کے مطابق مرتب ہوں گے۔ جس طرح اگر ان کی اکثریت [۵۱ نہیں بلکہ ۹۹ کی اکثریت] یہ فیصلہ کر دے کہ آج سے سنکھیا، ممدِ حیات سمجھا جائے گا تو اس سے ہمارا یہ قانون کہ سنکھیا زہرِ قاتل ہے، بدل نہیں جائے گا، سنکھیا اپنا اثر ان کے فیصلے کے مطابق نہیں کرے گا بلکہ ہمارے قانون کے مطابق کرے گا۔ اسی طرح اگر ان کا گروہِ غالب یہ فیصلہ کر دے کہ ان کا حق ہے کہ دوسرے محنت کریں اور یہ عیش اڑائیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے اس فیصلے کے نتائج ان کی مرضی کے مطابق مرتب ہونے لگ جائیں گے۔ یہ جو جی میں آئے فیصلہ کرتے رہیں، نتائج تو خدا کے قانون کے مطابق ہی مرتب ہوں گے۔ اسی کا نام "بازپرس" ہے۔ چنانچہ اس گروہ کے متعلق کہا گیا ہے اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ (۳۷/۲۴) یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ غلط ہے۔ ہمارا قانونِ مکافات ان سے پوچھے گا۔ یہ اس کے احاطے سے باہر جا ہی نہیں سکتے۔ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (۹/۴۹) ان کے اعمال کے انسانیت سوز نتائج انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں (وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ - ۸۲/۱۶) یہ لوگ اپنے فیصلے کرنے کے بعد بڑے فخر سے اتراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن انہیں اس کا علم نہیں کہ خدا کا قانونِ مکافات انہیں چاروں طرف

قانونِ مکافات

سے گھیرے ہوتے ہے۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ۔ (۸۵/۱۹-۲۰)

یہ لوگ جو ہمارے قانون سے انکار کرتے ہیں خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے اس قانون کو غلط ثابت کر دیا۔ لیکن ہمارا قانون انہیں اس کے باوجود چاروں طرف سے گھیرے ہوتا ہے۔

یعنی نتائج آخرالامر اس قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔

یہ ہے قانون کی وہ قوت جس کی بنا پر پورے حتم و یقین سے کہا جاتا ہے کہ یہ انقلاب آکر رہے گا۔ بلاشک و شبہ آکر رہے گا۔ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا۔ (۵۹/۴۰) جس مقام پر آکر انسان فریب کھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ قانونِ طبعی کی خلاف ورزی کرنے کے نتائج فوراً محسوس ہو جاتے ہیں (آگ میں انگلی ڈالنے سے اس کا نتیجہ فوراً محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے) لیکن خدا کے مقرر کردہ معاشرتی قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج کو انسان فوری طور پر محسوس نہیں کرتا اس لئے اس پر یقین نہیں رکھتا۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۵۹/۴۰) یہ ہے وہ مقام جہاں ایمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی اس حقیقت پر یقین رکھنے کی ضرورت کہ کائنات میں کوئی اندھی قوت کام نہیں کر رہی بلکہ یہاں ایک ایسی ذات کا قانون کارفرما ہے جو حکیم ہے خبیر ہے۔ علیم ہے۔ سمیع ہے۔ بصیر ہے۔ یہ قانون جس طرح خارجی کائنات میں جاری و ساری ہے اسی طرح انسانوں کی تمدنی اور معاشی دنیا میں بھی اسی کی کبریائی ہے۔ لہٰذا جو نظام قانونِ خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے وہ زندگی کی خوشگواریوں کا حامل ہوتا ہے۔ جو اس کے خلاف جاتا ہے اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ قوت اس اٹل قانون کو شکست دے سکے۔ یعنی نظام تو خلافِ قانونِ خداوندی قائم کرے، اور اس کا نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں اور شادابیاں ہوں۔ قرآنی تصورِ حیات سے، وہ نظام جس کا نتیجہ تباہیاں ہوتا ہے، اُس نظام میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ عالمگیر خوشگواریاں ہوتا ہے۔ اس تبدیلی کو آسمانی انقلاب کہا جاتا ہے۔

ایمان کی ضرورت

انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کے خود ساختہ نظام نے جو بساط بچھا رکھی ہے اس کی جگہ صحیح نظام رائج ہو جائے۔ ان دونوں نظاموں کے تفصیلی تقابل کے لئے ایک جداگانہ تصنیف کی ضرورت ہے لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو ان کے نمایاں خط و خال حسب ذیل نظر آئیں گے۔

(۱) انسانوں کے خود ساختہ نظام میں ہمیشہ ایک طبقہ ایسا رہا ہے جو خود کچھ نہیں کرتا اور دوسرے انسان ان کا تمام بوجھ اٹھاتے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ بجائے اس کے کہ بھکاریوں کا یہ طبقہ اپنے آپ کو حقیر و ذلیل سمجھے، یہ معاشرہ میں سب

سے اونچے مقام پر متمکن رہتا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ اقتدار کی کرسیاں سنبھال لیتے ہیں اور دوسرے لوگ مذہبی پیشوائیت

دونوں نظاموں کا تقابل

کی مسندوں پر براجمان ہوجاتے ہیں۔ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ (۹/۳۴) تاکہ عوام کی محنت کی کمائی کھاتے رہیں اور تخریبی نتائج پیدا کرتے رہیں۔

صحیح نظامِ ربوبیت میں اس قسم کا کوئی طبقہ نہیں رہے گا۔ اس میں کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ (۳۵/۱۸) ہر ایک کو اپنا بوجھ آپ اٹھانا ہوگا۔

(۲) غلط نظام میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جو محض روپیہ لگاتا ہے (INVEST کرتا ہے) اور خود کوئی کام نہیں کرتا۔ دوسرے لوگ کام کرتے ہیں اور ان کی محنت کا بہترین حصہ اس کے گھر آجاتا ہے۔ اسے ربٰو کہا جاتا ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔

صحیح نظامِ ربوبیت میں (بجز ان لوگوں کے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو چکے ہیں) ہر شخص کو کام کرنا ہوگا۔ جو شخص (بلا عذر) کام نہیں کرے گا اس کا معاشرہ کے ثمرہ میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ (۵۳/۳۹) وہاں کا اصل الاصول ہوگا۔ یعنی بلا سعی و عمل کسی کو کچھ نہیں ملے گا۔

(۳) غلط نظام میں اصول یہ ہوتا ہے کہ جو شخص اپنی ہنرمندیوں سے جتنا کچھ سمیٹ لے، سب اس کی ملکیت ہو جاتا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اس کی ملکیت میں دخل انداز ہو سکے۔ اس طرح ایک شخص کے گھر میں چاندی اور سونے کے ڈھیر جمع ہو جاتے ہیں اور ہزاروں انسان نانِ شبینہ تک کے لئے محتاج رہ جاتے ہیں۔

نظامِ ربوبیت میں ہر شخص پوری پوری محنت کرتا ہے لیکن اس کے ماحصل میں سے صرف اتنا لیتا ہے جتنا اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔ باقی سب، نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رہتا ہے۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) تجھ سے پوچھتے ہیں کہ (اپنی محنت کی کمائی میں سے) کس حد تک نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھا جائے گا۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہوگا سب کا سب۔ اس نظام میں دولت جمع کرنا ایک سنگین جرم ہوگا جس کی سزا بڑی عقوبت انگیز ہوگی۔ (۹/۳۴)

(۴) غلط نظام میں بعض لوگ رزق کے بنیادی سرچشمہ (زمین) پر لکیریں کھینچ کر اسے اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیتے ہیں۔ اور اس طرح عوام کے ذریعۂ پرورش پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔

نظامِ ربوبیت میں رزق کے سرچشمے کسی کی انفرادی ملکیت میں نہیں رہتے۔ یہ سب ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱/۱۰) نظامِ مملکت ان کا ایسا انتظام کرتا ہے۔

(۵) غلط نظام میں "ہیئتِ حاکمیہ" کا فریضہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے واجبات (DUES) وصول کرے۔ یہ کسی کا ذمہ نہیں ہوتا کہ دیکھے کہ افرادِ معاشرہ کو ان کی زندگی کی ضروریات بہم پہنچ رہی ہیں یا نہیں۔

نظامِ ربوبیت میں، معاشرہ میں ہر متنفس کے لئے سامانِ پرورش بہم پہنچانے کی ذمہ داری خود نظام پر ہوتی ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) صرف انہی کی نہیں، بلکہ ان کی اولاد کی بھی نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

صرف روٹی کی ذمہ داری نہیں بلکہ تمام ضروریاتِ زندگی کی۔ (اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اس میں نہ کوئی بھوکا ہو گا نہ ننگا۔ نہ پیاسا نہ بغیر مکان کے۔

غلط نظام میں انسانی زندگی کا مسئلہ صرف "روٹی کا مسئلہ" تصور کیا جاتا ہے اور اسی کے حل کو انسانی تگ و تاز کی معراج قرار دیا جاتا ہے۔

نظامِ ربوبیت میں انسان کی طبعی ضروریات کے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ تمام افرادِ معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ اس نظام کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام انسانی صلاحیتوں کی بالیدگی کا سامان بہم پہنچائے۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ (۲۲/۴۱) جب اس نظام کے حاملین کو تمکن حاصل ہو گا تو یہ "نظامِ صلوٰۃ" قائم کریں گے اور نوعِ انسانی کو نشوونما بالیدگی عطا کریں گے۔

یہ نشوونما اور ارتقاء و بالیدگی انسانی ذات کی ہوگی اس لئے کہ صحیح نظام میں کامیاب و شادکام اس کو کہا جاتا ہے جس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ (۹۱/۹) اس نظام میں معاشرہ، فرد کی ذات کی تکمیل کے لئے ہوتا ہے۔ فرد، معاشرہ کی قربان گاہ پر ذبح ہونے کے لئے نہیں ہوتا۔

چونکہ انسانی ذات، نشوونما پا کر طبعی موت کے بعد زندگی کے مزید مراحل طے کرتی ہے اس لئے نظامِ ربوبیت میں اس دنیاوی زندگی کی خوشگواریوں کے ساتھ مستقبل کی زندگی کی شادابیاں بھی حاصل ہوتی جاتی ہیں فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔ (۲/۲۰۱)

(۶) انسانوں کے خودساختہ نظام میں نوعِ انسانی کو مختلف گروہوں (قوموں) میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر قوم اپنی منفعت اور دیگر اقوام کی تخریب کے درپے رہتی ہیں۔

نظامِ ربوبیت میں انسانوں کی خودساختہ تمام حدود و قیود مٹ جاتی ہیں اور پوری نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری بن جاتی ہے۔ اس نظام کے پیشِ نظر پوری انسانیت کی منفعت ہوتی ہے کیونکہ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ وَاَمَّا مَا

یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (۱۳/۱۷)۔ وہی تصورِ حیات اور وہی نظامِ زندگی باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہو۔

(۷) غلط نظام میں عزت و تکریم کے معیار اضافی ہوتے ہیں۔ جو بڑے گھرانے میں پیدا ہو، جس کے پاس بہت سا مال و دولت ہو، جو کسی نہ کسی طرح قوت فراہم کرے، وہی واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ باقی انسان ان کی نگاہوں میں ذلیل و حقیر ہوتے ہیں۔

نظامِ ربوبیت میں ہر انسان صرف انسان ہونے کی جہت سے قابلِ عزت و تکریم ہوتا ہے۔ وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ۔ (۱۷/۷۰)۔ ہم نے ہر فرزندِ آدم کو واجب الاحترام بنایا ہے۔ عزت و تکریم کے مدارج کا فرق بھی اس معیار کے مطابق ہے کہ جو شخص اپنی ذمہ داریوں کو سب سے زیادہ پورا کرتا ہے وہ سب سے زیادہ عزت کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰکُمۡ۔ (۴۹/۱۳)

(۸) اور سب سے آخر یہ کہ انسانی ذہن نے جو نظام بھی قائم کیا اس میں ہمیشہ یہ حالت رہی کہ ایک گروہ نے قانون بنانے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور دوسرا گروہ ان کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت پر مجبور قرار دیا گیا۔ ہیئتِ حاکمیہ (قانون بنانے والی قوت) خواہ عصرِ قدیم کی شاہنشاہیت ہو یا عصرِ حاضر کی جمہوریت، ہر جگہ یہی اصول کارفرما نظر آئے گا کہ ایک گروہ پر دوسرے گروہ کے احکام و قوانین کی اطاعت لازم آتی ہے۔ حکومت کسی انداز کی ہو، اس میں حاکم اور محکوم کی تمیز ضروری ہوتی ہے۔

نظامِ ربوبیت میں انسانوں کی حکومت کا تصور ہی باقی نہیں رہتا اس لئے کہ اس میں وہ اصولی قوانین جن کے تابع زندگی بسر کرنا تمام انسانوں کے لئے ضروری ہے، خود خدا کے متعین کردہ ہوتے ہیں اور کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَهُ اللّٰهُ الۡکِتٰبَ وَالۡحُکۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (۳/۷۹) کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین، قوتِ فیصلہ اور نبوت عطا کر دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے قوانین کے نہیں بلکہ میرے غلام بن جاؤ۔ اس نظام میں جو گروہ ان اصولی قوانین کی جزئیات (قوم کے مشورے سے) مرتب کریگا اور انہیں نافذ کریگا، وہ سب سے پہلے خود ان احکام کی اطاعت کرے گا اور کہے گا کہ اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ۔ (۶/۱۶۴) سب سے پہلے میں خود ان کی اطاعت کرتا ہوں۔

یہ ہے وہ نظامِ ربوبیت جس میں کسی انسان پر کسی قسم کا جبر و استبداد نہ ہوگا۔ لَاۤ اِکۡرَاهَ فِی الدِّیۡنِ (۲/۲۵۶)

اور جس میں ہر فرد اپنے ذاتی تجربہ کے بعد کہہ سکے گا کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

یہ ہے وہ نظام جو اس ارض پر انسانی معاشرہ کا منتہیٰ ہے اور جس کے متعلق پورے حتم و یقین کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یہ قائم ہو کر رہے گا۔

انقلاب کا طریقہ

جس طرح یہ نظام دنیا کے ہر نظام سے نرالا ہے، اسی طرح اس نظام کو قائم کرنے کے لئے جو انقلاب پیدا کیا جاتا ہے، اس کا طریق بھی باقی انقلابات سے بالکل انوکھا ہے۔ دنیا میں جو معاشی انقلاب عام طور پر برپا کیا جاتا ہے اس کی دعوت کا نعرہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں کسی ضرورتمند کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں (اگر ۹۹ فیصدی نہیں تو کم از کم) نوّے فیصد لوگ ایسے ہیں جن کی کوئی نہ کوئی ضرورت رُکی رہتی ہے۔ انہیں عرفِ عام میں (HAVE - NOTS) کہا جاتا ہے اور (ایک فی صد نہیں تو زیادہ سے زیادہ) دس فی صد لوگ شاید ایسے ہوں گے جن کے پاس سب کچھ فراوانی سے موجود ہو گا۔ اندریں حالات جو انقلاب اس آواز کو لے کر اُٹھے کہ اس میں ہر ضرورتمند کی ضروریات پوری ہو جائیں گی، دنیا کی نوّے فی صد آبادی خود بخود اس کے ساتھ ہو گی۔ اس کے لئے اس سے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ان سے کہہ دیا جائے کہ اٹھو اور آگے بڑھ کر ان لوگوں سے جن کے پاس اس کثرت سے دولت موجود ہے سب کچھ چھین لو۔ تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا حقیقت یہ ہے کہ یہ ضرورتمند لوگ اس کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں کہ موقعہ ملے تو دولتمندوں کا سب کچھ چھین لیا جائے۔ یہ تو قانون کی زنجیریں ہیں جو انہیں اس چھینا جھپٹی سے روکے رکھتی ہیں۔ اگر ان سے کوئی کہہ دے کہ ان زنجیروں کو توڑ کر باہر نکل آؤ۔ اس کے نتائج کے ہم ذمہ دار ہیں تو یہ ایک رات میں انقلاب (یعنی فساد) برپا کر دیں گے۔ یہی آواز تھی جو مارکس نے بلند کی۔ اس کا نعرہ یہ تھا کہ

مارکسی انقلاب

> دنیا کے مزدورو! اکٹھے ہو جاؤ۔ اس انقلاب میں اگر تم سے کچھ چھینے گا تو صرف وہ زنجیریں چھینیں گی جن میں تم اس وقت جکڑے ہوئے ہو۔ اس سے زیادہ تمہارے ہاتھ سے کچھ نہیں جائے گا۔

لیکن سوچئے کہ اس قسم کے "انقلاب" کے بعد ہو گا کیا؟ آپ نے ان ضرورتمندوں کو آواز دی۔ وہ آپ کی آواز پر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دولت مندوں کی دولت چھین لی اور اس طرح دیکھ لیا کہ اس انقلاب میں انہیں کچھ ملا ہی ہے ان کے ہاتھ سے گیا کچھ نہیں۔ وہ ہنوز اس لوٹ سے فارغ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آپ نے اُن سے کہا

کہ اٹھو کام کرو۔ پہلے تو انہیں یہی چیز ناگوار گزرے گی۔ وہ کہیں گے کہ اگر ہم نے وہی محنت مزدوری کرنی تھی تو اس انقلاب کا فائدہ کیا تھا؟ لیکن جب وہ طوعاً و کرہاً کچھ کام کریں گے تو آپ اُن سے کہیں گے کہ تم نے جس قدر اپنی ضروریات سے زیادہ کمایا ہے وہ ہمارے حوالے کردو تاکہ اُسے ان لوگوں پر صرف کیا جائے جو زیادہ کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ سوچئے کہ وہ اس پر کس طرح آمادہ ہو سکیں گے؟ وہ کہیں گے کہ آپ نے یہ کہہ کر ہمیں دعوتِ انقلاب دی تھی کہ اس سے تمہیں ملے ہی ملیگا۔ تمہارے ہاتھ سے جائے گا کچھ نہیں۔ لیکن اب آپ کہتے ہیں کہ ہمیں کام بھی کرنا ہوگا اور اپنی محنت کی کمائی سے بیشتر حصہ دینا بھی ہوگا۔ ہم آپ کے ساتھ کچھ **لینے** کے لئے ہوئے تھے، **دینے** کے لئے نہیں۔ غور کیجئے کہ اس طرح آپ نے پھر وہی طبقہ پیدا کر دیا جو دوسروں کو کچھ "دینے" کے لئے تیار نہ تھا۔ ان کا مقصدِ زندگی لینا ہی لینا تھا۔ اب اس طبقے کے خلاف بھی آپ کو وہی کچھ کرنا ہوگا جو آپ پہلے سرمایہ دار طبقہ کے خلاف کر چکے ہیں۔ یعنی استبداد۔ آپ استبداد کے بغیر نہ تو ان لوگوں سے پورا پورا کام لے سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی محنت کی کمائی کا کچھ حصہ۔ جس شخص کو معلوم ہے کہ میں اگر بیس من غلہ بھی پیدا کرلوں تو بھی مجھے اس میں سے دو ہی من ملے گا۔ وہ بیس من غلہ پیدا کرنے کے لئے اپنی جان کیوں مارے گا؟ آپ کو اس سے مار مار کر کام لینا ہوگا تاکہ وہ بیس من غلہ پیدا کرے اور پھر مار مار کر اسے مجبور کرنا ہوگا کہ وہ اٹھارہ من غلہ آپ کے حوالے کر دے۔ اس کا لازمی نتیجہ وہ "آہنی پردہ" (IRON CURTAIN) ہوگا جو روس کو، اپنے انقلاب آفریں مزدوروں کی پہلی ہی نسل کے بعد وہاں آویزاں کرنا پڑا تاکہ دنیا کو معلوم نہ ہو سکے کہ وہاں کا نظام کس استبداد کے زور سے چلایا جا رہا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جہاں لوگ بطیبِ خاطر سب کچھ کرنے اور سب کچھ دوسروں کو دے دینے کے لئے آمادہ ہوں وہاں آہنی تو ایک طرف ریشمی پردوں کی بھی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ وہاں ہر چیز کھلے بندوں ہوتی ہے۔ بلکہ ایسے لوگوں کو بلا بلا کر دکھایا جاتا ہے تاکہ وہ اس نظام کے خوشگوار نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کے اندر داخل ہوتے چلے جائیں۔ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔

نظامِ ربوبیت کا انقلاب

نظامِ ربوبیت کا انقلاب اس طرح برپا نہیں کیا جاتا۔ اس طرح برپا کردہ انقلاب، درحقیقت انقلاب نہیں محض ھنگامہ یا شورش ہوتی ہے۔ نظامِ ربوبیت کا داعی ضرورت مندوں (HAVE NOTS) کو آواز نہیں دیتا کہ آؤ! تمہیں یہاں کچھ ملے گا۔ وہ ان لوگوں کو آواز دیتا ہے جن کے پاس دینے کے لئے فالتو ہوتا ہے کہ آؤ اور ایک ایسا نظام قائم کرو جس میں تمہارا فالتو رزق دوسروں کی نشوونما کے کام آئے۔ آپ قرآن میں دیکھئے۔ ہر مقام پر اسی طبقہ کو دعوتِ انقلاب

دی گئی ہے۔ انہی سے کہا گیا ہے کہ تم نے ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں تم نے پوری پوری محنت کرنی ہے اور پھر اس محنت کی کمائی میں سے جس قدر فالتو ہوگا وہ سب کا سب دوسروں کو دے دینا ہوگا۔ وہ "دینے والوں" کو آواز دیتا ہے اور انہی کے ہاتھوں اس نظام کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ "لینے والوں" کو آواز نہیں دیتا۔ آپ قرآن کے پہلے ورق پر دیکھئے۔ اس نظام کا آغاز ان لوگوں سے ہوتا ہے جن کا وصف یہ ہوتا ہے کہ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲/۳) وہ ان پر کوئی استبداد نہیں کرتا۔ انہیں کسی قسم کے جبر و اکراہ سے اس نظام کے قیام پر مجبور نہیں کرتا۔ وہ ان کے سامنے زندگی کا وہ حقیقی تصور پیش کر دیتا ہے جس کے سمجھ لینے کے بعد وہ از خود اپنا سب کچھ لے کر اس نظام کے قیام کے لئے آ جاتے ہیں۔ وہ اپنی چشمِ بصیرت سے دیکھ لیتے ہیں کہ زندگی کا راز دینے میں ہے لینے میں نہیں۔ وہ اس حقیقت کو سمجھ کر اس نظام کے اندر قدم رکھتے ہیں اور پھر زیادہ سے زیادہ محنت کرتے ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دے سکنے کے قابل ہو جائیں اور اس طرح حقیقی زندگی کی خوشگواریوں سے زیادہ سے زیادہ بہرہ یاب ہو سکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس آواز پر ضرورت مند طبقہ بھی لبیک کہتا ہے۔ بلکہ سب سے پہلے وہی اس کی طرف آتا ہے۔ لیکن وہ اس کی طرف اس لئے نہیں آتا کہ دولت مندوں کی دولت لوٹی جائے۔ وہ اس لئے آتا ہے کہ دنیا سے غلط نظام کو مٹایا جائے۔ خواہ اس میں انہیں کتنی تکالیف بھی کیوں نہ برداشت کرنی پڑیں۔ حتیٰ کہ انہیں جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑے۔ غرضیکہ اس نظام کی طرف جو بھی آتا ہے وہ اس مقصد کو لے کر آتا ہے کہ میں نوعِ انسان کی منفعت کے لئے کیا دے سکتا ہوں؟ وہ وقت ہو، توانائی ہو، صلاحیتیں ہوں حتیٰ کہ جان بھی کیوں نہ ہو۔ اور اسی مقصد کو پورا کرنے میں اپنی زندگی کا راز سمجھتا ہے۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے نظامِ ربوبیت کا "انقلاب" پیدا کیا جاتا ہے۔ یہ انقلاب درحقیقت دلوں کی دنیا میں پیدا کیا جاتا ہے۔ باہر کا انقلاب اس اندرونی انقلاب کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس انقلاب کے پیدا کرنے میں اس قدر محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے۔

(۸)

برنارڈ شا نے کہا ہے (اور کس قدر صحیح کہا ہے) کہ

فالتو روپیہ

دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ فالتو دولت (SPARE MONEY) ہے۔ یعنی وہ روپیہ جو تمہاری بنیادی ضروریاتِ زندگی سے زائد ہو۔ اسی کو سرمایہ (CAPITAL) کہتے ہیں۔ ①

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی معاشی دنیا کا سارا مسئلہ ہی "فالتو روپیہ" ہے۔ جس کے پاس "فالتو روپیہ" ہے وہ اسے چھپاتے چھپاتے پھرتا ہے کہ اسے کوئی چھین نہ لے اور چھیننے والے اس کی گھات میں رہتے ہیں۔ وہ اسے جیب میں رکھتا ہے تو وہاں سے جیب تراش نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیش بکس میں رکھتا ہے تو چور نقب لگا لیتا ہے۔ آئرن سیف

میں رکھتا ہے تو ڈاکو آ پڑتے ہیں۔ بینک میں رکھتا ہے تو مختلف ٹیکسوں والے گھیر لیتے ہیں۔ وہاں سے کچھ بچ جاتا ہے تو "جنت بیچنے والے" اپنے نذرانے وصول کرنے کو آ موجود ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کا "فالتو روپیہ" اس کی جیب سے نکال لیا جائے۔ لیکن قرآن کسی کی جیب سے روپیہ نکالتا نہیں وہ اس کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دیتا ہے (اور یہ تبدیلی علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا ہے) کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے اور اس کے بعد "فالتو روپیہ" ازخود لئے لئے پھرتا ہے کہ خدا کے لئے اسے لو۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ———— قُلِ الْعَفْوَ - (۲/۲۱۹)

یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی محنت کی کمائی میں سے کس حد تک دوسروں کے لئے دے دیں۔ اُن سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری بنیادی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔

اور یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے تابع ہوتا ہے تاکہ اس سے تمام افرادِ انسانیہ کی تکمیلِ ذات ہو سکے جس سے وہ اس زندگی کو بھی انسانیت کی سطح پر بسر کر سکیں اور اس کے بعد کی زندگی کی خوشگواریوں کے بھی اہل ہو سکیں۔ یہ ہے وہ انقلاب جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی انقلاب کا نام اسلام ہے اور اس کے برپا کرنے والوں کا نام مُسلم۔

(۰)

یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ کون سا طریق کار ہوگا جس سے لوگ اتنی بڑی تبدیلی کے لئے ازخود آمادہ ہو جائیں گے؟

اس کا طریق کیا ہوگا؟

یہ طریق کار وہ ہوگا جسے "انقلاب اندر شعور" کہا جاتا ہے۔ یعنی فکر و نظر کی تبدیلی، قلب و نگاہ کی تبدیلی، دل اور دماغ کی تبدیلی۔ اُس زاویۂ نگاہ کی تبدیلی جس سے اشیائے کائنات کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے **تعلیم** سے۔ قرآن نے اس انقلاب کے داعیِ اول نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا کہ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۳/۱۶۳) وہ ان کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتا ہے ان کی تطہیرِ فکر و نظر کرتا ہے۔ انہیں قانونِ خداوندی کی تعلیم دیتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ اس قانون کی غایت کیا ہے۔ یہ کن محکم بنیادوں پر استوار ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس جماعت کے ارکان یہی تعلیم ایک دوسرے کو دیتے ہیں اور اس طرح تعلیم دیتے ہیں کہ اس کے گہرے نقوش اُن کے دل پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ اس سے وہ ربّانی بن جاتے ہیں۔ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸) وہ ایک دوسرے کو اس کی تلقین کرتے رہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ قانونِ خداوندی کے مطابق تعمیری کاموں میں حصہ لیں اور اس پروگرام پر نہایت استقامت اور استقلال سے عمل پیرا رہیں۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۳) اس لئے

اس معاشرہ میں ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس سے اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، اس کے سامنے یہی نصب العین رہتا ہے اور اس طرح یہ حقیقت ان کے اعماقِ قلب میں یوں غیر محسوس طور پر جاگزین ہو جاتی ہے جس طرح سانس لینے سے آکسیجن خون میں حلول کر جاتی ہے۔ ان کے بچے اسی فضا میں پیدا ہوتے، بڑھتے اور پھولتے پھلتے ہیں اس لئے زندگی کے یہ حقائق اُن کی گھٹی میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی تعلیم و تربیت اس انداز سے ہوتی ہے کہ جو اثرات وہ اس طرح غیر شعوری طور پر لیتے ہیں علمی تحقیقات کی رُو سے مسلّمہ حقائق بن کر سامنے آجاتے ہیں اور اس طرح وہ انہیں شعوری طور پر، علیٰ وجہ البصیرت قبول کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ ہے وہ طریق جس سے قرآن قلب و نگاہ میں وہ تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ جس سے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ نوعِ انسان کی پرورش میں انسان کی اپنی ذات کی نشوونما کا راز پوشیدہ ہے اور انسانی ذات کی نشوونما مقصودِ حیات ہے۔ جو لوگ اس طرح اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیتے ہیں انہی کے ہاتھوں اس نظام کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس میں نہ کسی کو زبردستی شامل کیا جاتا ہے اور نہ ہی شامل ہو جانے کے بعد اس کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے کہ کوئی اس میں سے نکلنے نہ پائے۔ جس نظام کی بنیاد ہی انسانی ذات کی حریت اور بالیدگی پر ہو اس میں زبردستی کی کہیں گنجائش نہیں ہوتی۔ البتہ اگر کوئی قوت ان کے راستہ میں مزاحم ہو اور ان کے نظام کے قائم رہنے اور آگے بڑھنے کو زبردستی روکے اور ان خیالات کی نشر و اشاعت کی اجازت نہ دے تو ان کے لئے ضروری ہوگا کہ اس استبدادی مزاحمت اور قہرمانی مخاصمت کا مقابلہ قوت سے کریں۔ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ (۲/۱۹۳)۔ لیکن اس میں بھی کسی خلافِ انسانیت حرکت کا کوئی دخل نہیں ہوگا نہ کسی سے دھوکا کیا جائیگا۔ نہ فریب۔ نہ کسی قسم کی سازش ہوگی نہ خیانت۔ نہ ظلم ہوگا نہ زیادتی۔ اللہ کے انسانیت ساز قانون کی اطاعت ان کا مقصد اور نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود ان کی دلیلِ راہ ہوگی۔

شاید آپ خیال کریں کہ اتنی بڑی وسیع و عریض دنیا میں اس طریقِ عمل سے اتنا بڑا انقلاب برپا کر دینا کس طرح ممکن ہوگا؟ لیکن آپ شاید بھول گئے ہیں کہ وسائلِ رسل و مواصلات کی کثرت سے یہ دنیا اب سمٹ سمٹا کر ایک بستی اور اسکے رہنے والے ایک برادری بن چکے ہیں۔ اب کسی نظریہ کو ساری دنیا میں پھیلانا اور کسی تصور کو عام کرنا کچھ بھی مشکل نہیں بشرطیکہ کسی کے پاس سامانِ نشر و اشاعت موجود ہو۔ آج اگر کوئی خطۂ زمین بھی اس قرآنی تصور کو عملاً قبول کرلے تو اس کے حسین و خوشگوار نتائج سے ساری دنیا کا متاثر ہو جانا نہ بعید ہے نہ دشوار۔ اس لئے ہمارا زمانہ اس انقلاب کے لئے بڑا سازگار اور موجودہ فضا اس کے لئے بڑی مساعد ہے۔

آپ سوچئے کہ اگر یہ نظام کہیں قائم ہو جائے تو اس کے ساتھ کتنے اہم مسائل کا حل خود بخود ہو جاتا ہے جو اس وقت

اس طرح لاینحل دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے قیام کے ساتھ ہی معاشی غلامی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ زمیندار اور کاشتکار کی نزاع جو آج اس درجہ وجہ مصائب بن رہی ہے ختم ہو جائے گی۔ کارخانہ دار اور مزدور کی کشمکش جو آج ہمارے وقت اور توانائی کا اتنا بڑا حصہ ضائع کر دیتی ہے، مٹ جائے گی۔ مالک مکان اور کرایہ دار کے سب جھگڑے نپٹ جائیں گے۔ قرض خواہ اور مقروض کی جانکاہ چپقلش کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دوکاندار اور گاہک کی کھینچا تانی معدوم ہو جائے گی۔ جائیداد وں اور ان کے "اصلی اور نقلی" وارثوں کے قضیئے مفقود ہو جائیں گے۔ ربوٰا اور منافع کی اکاس بیل شجرِ انسانیت سے اتر جائے گی۔ وہ تمام اخلاقی جرائم جو افلاس کی بنا پر سرزد ہوتے ہیں خود بخود ختم ہو جائیں گے اور وہ تمام فسادات جو دولت کی زیادتی سے پیدا ہوتے ہیں، مٹ جائیں گے۔ نشۂ قوت کی سرمستیاں کافور ہو جائیں گی اور محکومیت و زیردستی کا پیدا شدہ جذام نابود ہو جائے گا۔ گھروں کے اندر سکون و اطمینان کی جنت ابھر آئے گی۔ بازاروں میں اعتماد اور بھروسہ کی تسکین بخش فضا عام ہو جائے گی۔ کاروبار میں دیانت اور امانت کی فردوس آفریں طمانیت نکھر کر سامنے آ جائے گی۔ ہر فردِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا سودا سر میں اور دیگر افرادِ انسانیہ کی بہبود اور خیر سگالی کا جذبہ دل میں لئے ہوگا۔ اور اس طرح یہ ساری زمین جنت بداماں ہو جائے گی۔

یاد رکھئے! یہ محض ایک شاعر کا حسین تخیل اور ایک تصوراتی کا سنہرا خواب نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جو واقع ہو کر رہے گی۔ یہ ایک انقلاب ہے جو برپا ہو کر رہے گا۔

اے خنک قومے کہ ..... زمانہ کی آنکھیں ابھر ابھر کر دیکھ رہی ہیں کہ وہ خوش بخت قوم کونسی ہے جس کے ہاتھوں قرآن کا یہ انقلاب ظہور میں آئے گا اور دنیا میں خدا کا نظامِ ربوبیت عامہ عملاً قائم ہو جائے گا۔ یہی وہ قوم ہوگی جس کے حصے میں تمام نوعِ انسان کی امامت آئے گی اور جو عالمگیر انسانیت کو اس جنت کی طرف لے جائے گی جس کے لئے جنت سے نکلا ہوا آدم اس قدر مضطرب اور پریشان ہے اور جو انسانی آرزوؤں کی منتہیٰ اور کاروانِ انسانیت کی منزلِ حسنیٰ ہے۔ طُوبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ (۱۳/۲۹)

P.246 (1) Bernard Shaw, in, The Intelligent Woman's Guide To Socialism, Capitalism, Sovietism And Fascism. p.128

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے، نظامِ ربوبیت کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا نظر ثانی شدہ متن سابقہ صفحات میں سامنے آچکا ہے۔ اس دوران میں پاکستان میں معاشیات سے متعلق مختلف تقاضے ابھرے اور متنوع نظریوں نے جنم لیا ہیں۔ ان سب کا قرآنی روشنی میں جائزہ لیتا گیا اور مختلف مقالات اور خطابات میں اسلام کے معاشی نظام کی وضاحت کرتا رہا۔ یہ مقالات اور خطابات طلوعِ اسلام میں بھی چھپے اور پمفلٹوں کی شکل میں بھی شائع ہوتے رہے۔ احباب کا تقاضا تھا کہ اگر نظامِ ربوبیت کی اشاعت میں تاخیر ہے تو ان مضامین کو کتابی شکل میں منضبط کر دیا جائے۔ اب جبکہ نظامِ ربوبیت کو از سرِ نو شائع کیا جارہا ہے، میں نے مناسب سمجھا کہ ان میں سے بعض اہم مقالات و خطابات کو کتاب میں شامل کر دیا جائے۔ ان میں آپ کو بعض ایسے مسائل بھی ملیں گے جو سابقہ صفحات میں سامنے آچکے ہیں۔ لیکن یہ بے مقصد تکرار نہیں ہوگی۔ ان سے اُن نکات کی مزید وضاحت ہو جائے گی مجھے امید ہے کہ قارئین انہیں مفید پائیں گے۔

پرویز

○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اپریل ۱۹۷۰ء میں پیش کردہ خطاب

اسلامی سوشلزم

حق و باطل میں پیوندکاری کی ناکام کوشش

ہمارے ملک ہی میں نہیں، آج ساری دنیا میں جو مسئلہ سب سے زیادہ شدت سے مابہ النزاع ہے وہ معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس زمانہ کو کہا ہی دورِ اقتصادیات (AGE OF - ECONOMICS) جاتا ہے۔ اس نزاع میں، دنیا دو گروہوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک گروہ قدیم نظامِ معیشت کا علمبردار ہے جسے عام اصطلاح میں نظامِ سرمایہ داری (کیپٹیل ازم) کہا جاتا ہے اور مارکسزم کی رو سے بورژوا (BOURGEOIS) اور دوسرا گروہ وہ ہے جو مزدوروں یا محنت کشوں کا طبقہ (PROLETARIAT) کہلاتا ہے۔ یہ گروہ جس معاشی نظام کا حامل ہے، اسے بنیادی طور پر مارکسزم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مارکسزم، صرف ایک معاشی نظام کا نام نہیں۔ یہ ایک مخصوص فلسفۂ زندگی ہے جس کی بنیادوں پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس معاشی نظام کے اولین مرحلہ کو سوشلزم کہا جاتا ہے، جو اس کے دوسرے (اور آخری) مرحلہ تک پہنچنے کے لئے عبوری دور کا کام دیتا ہے۔ اس آخری مرحلہ کو کمیونزم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، جہاں تک اس فلسفۂ زندگی کا تعلق ہے جو اس نظام کی بنیاد ہے، سوشلزم اور کمیونزم میں کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف ان معاشی پروگراموں میں ہے۔ سوشلزم ابتدا کے لئے ہے، کمیونزم انتہا کے لئے۔ کمیونزم لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ (COMMON) ہے۔ اسے عام طور پر اشتراکیت کہا جاتا ہے اور سوشلزم کو اجتماعیت۔ یہ دونوں نظام — یعنی نظامِ سرمایہ داری اور مارکس ازم

کا نظام، ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اس وقت ان میں پوری شدت سے جنگ جاری ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ اقوامِ عالم کی ساری سیاست اسی کشمکش کے تابع ہے۔ خود ہمارا ملک، پاکستان بھی اس کشمکش سے غیر متاثر نہیں رہا ــــ یہ غیر متاثر رہ نہیں سکتا تھا۔ دنیا کا کوئی ملک بھی اس سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا ــــ لیکن یہاں اس نزاع میں ایک اور پہلو ابھرا ہے۔ یہ مملکت اسلام کے نام پر حاصل کی گئی ہے اور اس کا دعویٰ یہ ہے کہ یہاں اسلامی نظامِ زندگی نافذ اور رائج ہوگا۔ ظاہر ہے کہ "نظامِ زندگی" میں معاشی نظام کو بڑی اہمیت ہوگی۔ بنا بریں، یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی نظامِ معیشت کیا ہے؟ کیا وہ قدیم نظامِ سرمایہ داری کا مؤید ہے یا جدید نظام، سوشلزم یا کمیونزم کا حامی۔

ہماری مذہبی پیشوائیت کا مؤقف

دنیا میں جو اسلام (مذہب کی شکل میں) صدیوں سے رائج ہے، وہ ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ ہے، فلہٰذا نظامِ سرمایہ داری کا مؤید۔ لیکن چونکہ آجکل سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف، عوام میں جذباتِ نفرت و انتقام بڑی شدت اختیار کر چکے ہیں اس لئے کوئی شخص بھی کھلے بندوں اس کی تائید کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بنا بریں، ہمارے مذہب پرست طبقہ نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام خود اپنا معاشی نظام رکھتا ہے جو نہ سرمایہ دارانہ ہے اور نہ ہی سوشلزم۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اسلام کا وہ نظام ہے کیا، تو وہ اس کا کوئی متعین جواب نہیں دیتے ــــ جو لوگ آج تک متعین طور پر یہ نہ بتا سکے ہوں کہ اسلام کسے کہتے ہیں اور مسلمان کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے، وہ اسلام کے معاشی نظام کے متعلق متعین طور پر کیا بتائیں گے؟ ــــ دوسرا گروہ سوشلزم کا حامی ہے۔ لیکن چونکہ سوشلزم کے متعلق عام طور پر معلوم ہے کہ یہ مسلک، خدا، رسول، وحی، آخرت کا منکر ہے، اس لئے یہ حضرات (اس اعتراض سے بچنے کی خاطر) اپنے نظام کو اسلامی سوشلزم کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ سوشلزم اور اسلامی سوشلزم میں فرق کیا ہے تو اس سوال کا یہ بھی کوئی متعین جواب نہیں دیتے۔ اس اعتبار سے یہ بدنصیب ملک (عام تصور کے مطابق) عالمِ برزخ میں معلّق ہے۔ کیپٹلزم کے حامی بھی متعین طور پر جانتے ہیں کہ ان کا مسلک کیا ہے اور وہ اسے صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ دوسری طرف سوشلزم کے علمبردار بھی اپنے مسلک کے متعلق واضح ہیں اور اسے نہایت وضاحت سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہاں، نہ اسلامی نظام کے مدعی، کچھ متعین طور پر بتاتے ہیں، نہ اسلامی سوشلزم کے حامی۔ بایں ہمہ ان میں جنگ اسی طرح جاری ہے جس طرح نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم کے مدعی طبقات ہیں۔

میں، قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور میرا مسلک یہ ہے کہ زندگی کا جو مسئلہ بھی سامنے آئے، قرآن

کی روشنی میں اس کا جائزہ لوں، اور میری بصیرت جس نتیجہ پر پہنچائے اسے بلاکم وکاست قوم کے سامنے پیش کر دوں۔ میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے نہ کسی سیاسی جماعت سے۔ نہ ہی میں عملی سیاسیات میں حصہ لیتا ہوں۔ لہٰذا، زیرِ نظر مسئلہ میں میری بحث خالص علمی اور تحقیقاتی ہوگی نہ کہ گروہ بندانہ۔ مارکسزم کے متعلق میں جو کچھ کہوں گا، اس کی بنیاد اس مسلک کے معمارانِ اول ــــ مارکس، اینگلز، فیورباخ، لینن وغیرہ کی تحریرات پر ہوگی اور اسلامی نظام کی سند خدا کی عظیم کتاب، قرآنِ کریم کے ارشادات۔ اس ضمن میں اتنا اور عرض کر دوں کہ اس موضوع پر میں پہلی بار لب کشائی نہیں کر رہا ہوں سالہا سال سے یہ کچھ کہتا چلا آرہا ہوں۔ آج کی نشست میں صرف اتنا ہوگا کہ ان بکھرے ہوئے حقائق اور پاشیدہ افکار کو، ایک سمٹی ہوئی، مربوط شکل میں آپ حضرات کے سامنے پیش کر دیا جائے گا تاکہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

مارکسزم

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، مارکسزم خالصتہً ایک معاشی نظام کا نام نہیں۔ وہ ایک فلسفۂ زندگی ہے۔ ایک تصورِ حیات ہے، ایک نظریۂ کائنات ہے جس کی بنیادوں پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ ان کا وہ فلسفہ اور نظریہ بڑا فنی اور الجھا ہوا ہے لیکن میں اسے عام فہم الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس فلسفہ یا نظریہ کو عمومی طور پر پانچ شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی انسان کیا ہے۔ (۲) نظریۂ تاریخ۔ (۳) مذہب کے متعلق اس کا تصور۔ (۴) ضابطۂ اخلاق۔ (۵) فلسفۂ جدلیت۔ (DIALECTICISM)۔

اس نظریہ کے بانی

مارکسزم کا بانی کارل مارکس تصور کیا جاتا ہے۔ یہ یہودی النسل تھا اور جرمنی کا رہنے والا۔ ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا اور اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے مختلف ممالک۔ جرمنی، بلجیم، فرانس، انگلینڈ میں جلاوطن رہا، اور بالآخر ۱۸۸۳ء میں لنڈن میں وفات پا گیا۔ لیکن مارکسزم اکیلے مارکس کا کارنامہ نہیں۔ اس میں، اس کا زندگی بھر کا رفیق، فریڈرک اینگلز بھی برابر کا شریک ہے۔ منشورِ اشتراکیت جو ان کی تحریک کا عروۃ الوثقیٰ ہے، ۱۸۴۸ء میں، ان دونوں کی طرف سے مشترکہ طور پر شائع ہوا۔ مارکس کی معرکہ آرا تصنیف، کیپیٹل کے نام سے موسوم ہے۔ مارکس کی زندگی میں اس کی صرف پہلی جلد شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کی دو جلدیں اینگلز نے شائع کیں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ مارکس اور اینگلز کی مشترکہ تصنیف ہے۔ وہ اس کی چوتھی جلد کی تکمیل نہ کر پایا تھا کہ ۱۸۹۵ء میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ جہاں تک فلسفۂ جدلیت (DIALECTIC MATIRIALISM) کا تعلق ہے، اس کا بنیادی سرچشمہ مارکس کے استاد ہیگل کی فکر ہے۔ اگرچہ مارکس نے اس

میں جو تبدیلی کی اس سے وہ ایک الگ جداگانہ فلسفہ بن کر رہ گیا۔ جہاں تک مارکس اور اینگلز کی مذہب کے خلاف بغاوت کا تعلق ہے، اس میں وہ ایک اور شخص کی فکر سے متاثر ہیں جس کا نام لڈوگ فیورباخ (LUDWIG FEURERBACH) ہے۔ (اگرچہ مارکس، اپنے نظام کے سلسلہ میں اس کی مخالفت کرتا تھا)۔ یہ عیسائیت کا شدید ترین دشمن تھا اور دہریت کا متشدد مبلغ۔ روس کے انقلابی لیڈر (V. I. LENIN) نے ان تمام انقلابیوں کے افکار و کردار کو مربوط شکل میں پیش، اور سوشلزم کو عملاً رائج کیا۔ اس کی تالیف (MARX, ENGELS MARXISM) اس موضوع پر ایک مستند صحیفہ ہے اور اس کا ۱۹۴۷ء کا ایڈیشن، جو ماسکو سے شائع ہوا تھا، میرے پیشِ نظر ہے۔ اس تمہیدی تعارف کے بعد ہم مارکسزم کے فلسفہ یا نظریہ کی طرف آتے ہیں۔

انسانی زندگی کا تصور

انسانی زندگی کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ خود انسان ہے، یعنی یہ کہ انسانی زندگی بھی، دیگر حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی ہے، یا اس سے ماوراء کچھ اور بھی ہے۔ اگر اس کی زندگی محض طبیعی زندگی ہے جس میں مقصدِ حیات اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ کھایا، پیا، افزائش نسل کی اور مر گئے، تو پھر اس کے لئے مابعد الطبیعیاتی مسائل — خدا، وحی، رسالت، مستقل اقدار، آخرت وغیرہ کچھ معنی نہیں رکھتے۔ کوئی حیوان ایسا نہیں جس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتے ہوں، یا ان کا اس کی زندگی سے کچھ بھی واسطہ ہو۔ حیوانات کے سامنے ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے یعنی بقائے حیات (زندہ رہنے) کے لئے کھانے کا مسئلہ۔ اسے انسانوں کی زبان میں "روٹی کا مسئلہ" کہتے ہیں۔ اگر کسی جانور کا پیٹ بھر جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے تو وہ آرام سے سو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد، اس کے سامنے کوئی اور سوال ہوتا ہی نہیں۔ اس تصورِ حیات کی رو سے، انسان کے سامنے بھی مسئلہ صرف ایک ہی رہ جاتا ہے، یعنی روٹی کا مسئلہ۔ اگر یہ حل ہو جائے تو پھر زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ مارکسزم کی رو سے، انسانی زندگی کا تصور کیا ہے۔ اس سوال کا جواب کہ انسانی زندگی کیا ہے، فیورباخ نے پانچ لفظوں میں اس جامعیت سے دیا ہے کہ ان کی روشنی میں مارکسزم کا سارا فلسفہ بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ وہ اپنی بنیادی تصنیف (ESSENCE OF CHRISTIANITY) میں کہتا ہے کہ

MAN IS WHAT HE EATS

"انسان عبارت ہے اس سے جو کچھ وہ کھاتا ہے"۔ یعنی اس کی زندگی، دیگر حیوانات کی طرح، طبیعی زندگی ہے اور بس۔ اور مسئلہ اس کے سامنے صرف روٹی کا ہے۔ مارکسزم کی ساری عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔

حیوان صاحبِ اختیار نہیں ہوتا، مجبور ہوتا ہے۔ جب انسانی زندگی کو حیوانی زندگی تصور کر لیا گیا تو اگلا سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا یہ بھی دیگر حیوانات کی طرح مجبور ہے یا اسے کچھ اختیار بھی حاصل ہے۔ یاد رہے کہ انسان کو اس کے اعمال و کردار کا ذمہ دار اسی صورت میں ٹھہرایا جا سکتا ہے جب اسے صاحبِ اختیار تسلیم کیا جائے۔ اس باب میں مارکس لکھتا ہے کہ:۔

> انسان اپنی تاریخ آپ مرتب کرتے ہیں، لیکن ایسا کچھ وہ اُن حالات کے تابع نہیں کرتے جنہیں انہوں نے برضائے خویش، خود منتخب کیا ہو۔ اس کے برعکس، وہ ان شرائط و کوائف کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں خارج سے ملتی ہیں اور پہلے سے طے شدہ (DETERMINED) ہوتی ہیں۔

(THE EIGHTEENTH BRUMAIRE)

مارکس انسان کی انفرادیت کا قائل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "انسانی ذات کوئی ایسی شے نہیں جو ہر فرد میں الگ الگ موجود ہو۔ یہ صرف معاشرتی روابط کے مجموعی اثر کا نام ہے۔" (SIXTH THESIS AGAINST FEUERBACH)

وہ اپنی تصنیف، کیپٹیل، کے پہلے انگلش ایڈیشن کے دیباچہ میں لکھتا ہے:۔

> اگر میں کہیں افراد کا ذکر کرتا ہوں تو وہ صرف ان معنوں میں کہ وہ معاشی اصناف کے مجسمے ہوتے ہیں اور خاص طبقاتی مفاد اور روابط کے ترجمان۔ جب میرے نزدیک، صحیح طریقِ فطرت، معاشرہ کے اقتصادی ڈھانچے کا نشوونما ہے، تو میں وہ آخری شخص ہوں گا جو افراد کو ان حالات کا ذمہ دار قرار دے جن کے پیدا کردہ وہ (افراد) خود ہیں۔ (یعنی افراد، حالات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ حالات افراد کے پیدا کردہ نہیں ہوتے)۔

انسانی جبر اور اختیار کے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے، ایک بہت بڑا مارکسسٹ (G. U. PLE - KHANOV) اپنی مشہور کتاب (THE ROLE OF INDIVIDUAL IN HISTORY) میں لکھتا ہے:۔

> جب مجھ پر میرے مجبور ہونے کا احساس، اس طرح منکشف ہو کہ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ نہ بیرونی حالات کی رو سے اور نہ ہی کسی اندرونی تبدیلی کے مطابق۔ کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس سے مختلف بھی کر سکوں۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے اس کا اطمینان بھی حاصل ہو کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، اس سے بہتر کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، تو اس وقت، میرے نزدیک، جبر اختیار میں بدل جاتا ہے اور اختیار جبر میں۔ (اور میں اپنے آپ کو مجبور محض ہونے کے باوجود، صاحبِ اختیار و ارادہ تصور کرنے لگ جاتا ہوں)۔

یہ ہے مارکسزم کی رو سے کائنات میں انسان کی پوزیشن یعنی

(۱) اس کی زندگی، حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی ہے جس کا خاتمہ موت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اور

(۲) یہ حیوانات ہی کی طرح، مجبورِ محض ہوتا ہے اسے انتخاب اور ارادہ کی صلاحیت نصیب ہی نہیں ہوتی جن مادی حالات میں یہ آنکھ کھولتا ہے، ان کے مطابق بننے اور کام کرنے کے لئے یہ مجبور ہوتا ہے۔ اس کی ساری تاریخ، اس کے اس جبر کی داستان ہے۔

تاریخ

مارکسزم میں تاریخ (ہسٹری) کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ وہ اپنے دعاوی اور نظریات کی صداقت کی شہادت (بزعمِ خویش) تاریخ سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن مارکس کو تاریخِ انسانیت میں کیا دکھائی دیتا ہے اس کا اندازہ اس ایک فقرہ سے لگائیے جو منشورِ اشتراکیت (کمیونسٹ مینی فیسٹو) میں ان الفاظ میں ہمارے سامنے آتا ہے کہ

کاروانِ انسانیت کی تاریخ طبقاتی جنگ کے سوا کچھ نہیں۔

اینگلز اس میں صرف اتنا اضافہ کرتا ہے کہ انسان کے ابتدائی دور کے بعد، جب وہ ہنوز اپنے عہدِ طفولیت میں تھا، اس کی ساری تاریخ طبقاتی نزاع کی داستان ہے۔ طبقاتی جنگ سے مارکس اور اینگلز کی مراد ہے" لٹنے والوں اور لوٹنے والوں کی نزاع۔ حاکموں اور محکوموں کی جنگ" (منشورِ اشتراکیت)۔ اسے تاریخ کی مادی تعبیر کہا جاتا ہے۔ اینگلز اس باب میں لکھتا ہے کہ

تاریخ کی مادی تعبیر کی رو سے، تاریخ میں آخری اور فیصلہ کن عنصر یا عامل یہ حقیقت ہوتی ہے کہ اس دور میں پیداوار کا کیا انداز تھا........ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اپنی تاریخ آپ متشکل کرتے ہیں لیکن، ایسا کچھ متعین شرائط اور پہلے سے طے شدہ حالات کے تابع کیا جاتا ہے۔ ان میں، سب سے آخری اور فیصلہ کن عناصر وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق معاشیات سے ہوتا ہے۔

(MARX - ENGELS CORRESPONDENCE)

اپنے اس نظریہ کی مزید تشریح کرتے ہوئے، اینگلز لکھتا ہے :-

تاریخ کے مادی تصور کی ابتداء اس اصول سے ہوتی ہے کہ ہر معاشرتی نظام کی بنیاد، پیداوار اور پیدا شدہ اشیاء کا تبادلہ ہوتی ہے۔ تاریخ میں جو معاشرہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے، پیداوار کی تقسیم اور اس کے ساتھ معاشرہ کی طبقاتی تفریق کا مدار اس امر پہ ہوتا ہے کہ اس معاشرہ نے کیا پیدا کیا اور اسے کس طرح تقسیم کیا اور پیدا کردہ اشیاء

کا تبادلہ کس طریق سے کیا۔ اس تصور کی رو سے، تمام معاشرتی تبدیلیوں اور سیاسی انقلابات کی علت العلل (آخری سبب) انسانوں کے قلوب کے اندر، یا ابدی صداقت اور عدل کے متعلق ان کی بڑھتی ہوئی بصیرت میں تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ اسے تلاش کرنا چاہیئے اس امر میں کہ اس معاشرہ میں طریق پیداوار اور تبادلہ اشیاء کا اصول کیا تھا۔ بالفاظ دیگر، ان انقلابات کی بنیاد کو، فلسفہ حیات میں نہیں بلکہ اس دور کی اقتصادیات میں تلاش کرنا چاہیئے۔

(ANTI - DUHRING)

مارکس کے حسب ذیل الفاظ اس کی مزید تشریح کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

مادی زندگی میں طریق پیداوار، درحقیقت اس معاشرہ کے عام کیریکٹر اور سیاسی اور روحانی نہج زندگی کو متعین کرتا ہے یہ انسانی شعور نہیں جو ان کی ہستی کو متعین کرتا ہے بلکہ اس کے برعکس، ان کی معاشی زندگی ان کے شعور کو متعین کرتی ہے۔ (A CONTRIBUTION OF POLITICAL ECONOMY)

آپ نے دیکھ لیا کہ مارکسزم کی رُو سے، تاریخ کی مادی تعبیر سے کیا مراد ہے؟ ان کے نزدیک انسان کی ساری تاریخ، افراد اور اقوام کے ہر فیصلہ اور عمل کا جذبۂ محرکہ، طبقات کا باہمی نزاع، کسی معاشرہ کا تمدن، نہج زندگی، اسلوبِ حیات، سب "روٹی کے مسئلہ" کے تابع ہوتے ہیں جس قسم کا طریقۂ پیداوار اور اصولِ تقسیم و تبادلۂ اشیاء، اسی قسم کے انسان، اسی قسم کا معاشرہ، اسی قسم کے ان کے تصورات، اسی قسم کا ان کا شعور۔ "روٹی کے مسئلہ" سے بلند تو ایک طرف، اس سے الگ اور مختلف، یا اس کے سوا، نہ انسانی فیصلوں کا کوئی جذبۂ محرکہ ہوتا ہے نہ مختلف گروہوں میں باہمی کشمکش کی کوئی علت، انسانی زندگی کی ساری کارفرمائیاں۔ اس کی جملہ تگ و تاز۔ اس کی تمام سعی و کاوش۔ اس کی جدوجہد، اس کا تمدن، ثقافت، تہذیب، علمی کاوشیں، فکری کاوشیں، فنونِ لطیفہ اور ان کی ندرت کاریاں، اس کے جذبات لطیفہ اور ان کی جگر سوزیاں، اس کے احساسات اور ان کی حرارت سامانیاں، اس کے عشق و محبت کی داستانیں، بلند مقاصد کی خاطر اس کی بے لوث قربانیاں، مطلق اقدار کے تحفظ کے لئے اس کی جانفروشیاں، غرضیکہ زندگی اور اسکی ساری رعنائیاں اور زیبائیاں، اس کی رفعت اور بلند بالی' یہ سب اس سوال کی پیداوار ہیں کہ گیہوں کیسے بویا جاتا ہے، اور راشن ڈپو میں آٹے کی تقسیم کس طریق سے ہوتی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب مسئلہ سارا گیہوں اور آٹے کا ہے تو پھر انسانی زندگی کے لئے کسی ضابطۂ اخلاق یا اقدار

ضابطۂ اخلاق و اقدار

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لینن نے ۱۹۲۰ء میں، یوتھ کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانگریس میں، نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:۔

ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے، دھوکا ہے۔ یہ تصور، زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر، محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق، محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے مفاد کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطۂ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطۂ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے (ہم اس تصور کو ٹھکراتے ہیں)۔ ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم اسے مانتے ہی نہیں۔ اخلاق: انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے۔ اس سے ماوراء جو کچھ ہے، فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔

(MARX - ENGELS MARXISM _ PP 461 - 465)

مارکس، کیپٹل (جلد اول) میں لکھتا ہے:۔

اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات، اور اسی قسم کے دیگر نظریات کا آزادانہ وجود کوئی نہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں، ان کی کوئی نشو و ارتقاء نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان اپنی مادی پیداوار اور مادی روابط کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اپنے خیالات، اور ان خیالات سے پیدا شدہ تصورات کو بدلتا رہتا ہے۔ (انہی کا نام اس کے عقائد یا اخلاقیات و اقدار ہیں)۔

اینگلز کے الفاظ میں:۔

(ہمارے فلسفۂ جدلیت کی رُو سے) دنیا میں کوئی شے حرفِ آخر، مطلق یا مقدس نہیں۔ کائنات کی ہر شے (انسانی فکر سمیت) تغیر پذیر ہے اور پیچھے سے آتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ (لینن۔ صفحہ ۲۳)

یہ ہے مارکسزم کے نزدیک، اقدار و اخلاقیات کی حیثیت۔ اس کی رُو سے، دنیا میں کوئی قدر (VALUE) مستقل نہیں، کوئی ضابطۂ اخلاق غیر متغیر نہیں۔ یہ سب تصورات، ذہنِ انسانی کے پیدا کردہ ہیں — اس ذہنِ انسانی کے جو خود اپنے احوال اور معاشی طرق و مناہج کے تابع ہوتا ہے۔ ضابطۂ اخلاق ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ اپنی پارٹی کے مفاد میں ہو وہ جائز، جو اس کے مفاد کے خلاف جائے وہ ناجائز۔ اس مقصد (یعنی پارٹی کے مفاد) کے لئے کذب و افتراء، اور فریب و دجل، ہر حربہ سے بلا تأمل کام لیا جا سکتا ہے۔ (GOLLANCZ نے اپنی کتاب (OUR THREATENED VALUES) میں تو یہاں تک بھی لکھا ہے کہ جب مشہور اشتراکی راہنما

(Dr. G. LUCKNZ) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی کذب اور فریب دہی سے کام لیں، تو اس کے جواب میں اس نے کہا کہ:-

اشتراکی اخلاق کی رو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جاتے کہ عندالضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی ہے جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

مذہب

ہم نے دیکھا ہے کہ لینن نے کہا تھا کہ ہم ہر ایسے ضابطۂ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جس کا سرچشمہ انسانی ذہن سے ماوراء ہو۔ ہم خدا کی ہستی کا انکار کرتے ہیں اور اس کے احکام کے تصور تک کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہاں سے مذہب سے متعلق مارکسزم کا نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔ مارکس کا یہ فقرہ تو اب زبان زدِ خلائق ہو چکا ہے کہ:-

(RELIGION IS THE OPIUM OF THE PEOPLE.)

مذہب، عوام کے لئے افیون ہے۔ (LENIN - P. 240)

لینن اس باب میں پکار کر کہتا ہے کہ:-

مذہب کو تباہ کرنا اور دہریت (ATHEISM) کو فروغ دینا ہمارا مقصدِ اولین ہے۔ (لینن۔ صفحہ ۲۴۳)

وہ ذرا آگے چل کر لکھتا ہے:-

ایک مارکسٹ کے لئے مادہ پرست ہونا ضروری ہے۔ یعنی مذہب کا دشمن۔ لیکن اسے جدلی مادیت پرست ہونا چاہیئے اس سے مراد یہ ہے کہ اس سے مذہب کی مخالفت محض نظری اور تجریدی (ABSTRACT) طریق سے نہیں کرنی چاہیئے۔ اسے عوامی جدوجہد کے ذریعے مذہب کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ (صفحہ ۲۴۵)

اس پر اضافہ کرتے ہوتے وہ کہتا ہے کہ جو لوگ مارکسزم کے حامی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے، اس لئے مارکسزم کو کسی کے ذاتی عقیدہ سے سروکار نہیں ہونا چاہیئے، وہ موقعہ پرست ہیں۔ مارکسزم اور مذہب پر عقیدہ، دونوں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ مارکسزم میں، مذہب کسی کا پرائیویٹ عقیدہ نہیں رہ سکتا۔ مارکسسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مذہب کو تیاگ کر دہریت کو عملاً اختیار کرے۔ (صفحہ ۲۴۶)

اینگلز واضح تر الفاظ میں کہتا ہے کہ:-

مذہب (کوئی خاص مذہب نہیں۔ بلکہ خود نفسِ مذہب) اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو خارجی قوتیں انسان کی روزمرہ کی زندگی کو کنٹرول کرتی ہیں، ان کا عکس انسانی ذہن پر منعکس ہو جاتا ہے (انہیں وہ خدا سمجھ لیتا ہے)۔

(ANTI - DUHRING)

فیورباخ لکھتا ہے کہ :-

> فطرت اور انسان کے سوا کائنات میں کسی شے کا وجود نہیں۔ وہ بلند و بالا ہستیاں جن کا وجود مذہبی افسانہ گردوں نے تراش کر رکھا ہے، خود ہماری اپنی ہی ذات کے طلسمی عکس ہیں۔

(ESSENCE OF CHRISTIANITY)

اور آخر میں ہم، مارکس کے ان الفاظ کو پیش کرتے ہیں، جن کے بعد، اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اپنی کتاب (CRITIQUE OF THE PHILOSOPHY OF LAW OF HEGEL) میں لکھتا ہے :-

> مذہب، انسان کی پیداوار ہے۔ انسان مذہب کی پیداوار نہیں۔ مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے جو یا تو ابھی تک اپنے مقامِ انسانیت سے بے خبر ہو یا جس نے اس مقام کو پاکر اسے پھر سے کھو دیا ہو۔ مذہب، مظلوموں کی سسکیاں، ایک پتھر کی دنیا کا قلب اور ان حالات کی روح ہے جو خود روح سے محروم ہیں۔ مذہب کی فنا میں حقیقی انسانی مسرت کا راز پنہاں ہے۔ اخلاقیات، مذہب، مابعد الطبیعیات اور دیگر تمام تصورات، حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ صرف مادی انسان کی ہے۔

فلسفہ جدلیت

مارکس کی شہرت (بلکہ تعارف) ایک مخصوص معاشی نظام کی حیثیت سے ہے' جسے سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے، لیکن اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس میں اس معاشی نظام کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ یہ بات تو سامنے آئی ہے کہ مارکس کے نزدیک، انسان کا اصلی اور واحد مسئلہ معاشی ہے۔ یہی اس کی تاریخ ہے۔ اسی سے اس کے خیالات، تصورات، نظریات، عقائد ترتیب پاتے ہیں۔ اسی سے اخلاقیات اور مذہب (خدا) سے متعلق تمام مسائل وابستہ ہیں۔ اسی بنیاد پر مختلف طبقات وجود میں آتے ہیں، اور یہی ان کی باہمی کشمکش کی وجہ نزاع ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے سامنے آیا ہے لیکن اس معاشی نظام کا کوئی ذکر نہیں آیا جو اس ساری بحث کا ماحصل ہے اور خود ہماری اس گفتگو کا نقطۂ ماسکہ۔ اس تک پہنچنے کے لئے ہمیں اس فلسفہ کو مختصر اور (جہاں تک ہو سکے) عام فہم الفاظ میں بیان کرنا ہوگا جس کا مارکس کے تصور کے مطابق، فطری نتیجہ وہ معاشی نظام ہے۔ یعنی مارکس کا کہنا ہے کہ اس معاشی نظام کی نمود اس فلسفہ کی شاخ سے ہوتی ہے۔ یہ فلسفہ، جدلیت (DIALECTICISM) کہلاتا ہے جس کے بنیادی معنی تضادات کی کشمکش ہے۔ اس فلسفہ کا بانی

جرمن فلاسفر، ہیگل ہے جو مارکس کا استاد تھا۔

ہیگل کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات میں کوئی تصور (IDEA) مستقل، ابدی، غیر متبدل، یا جامد نہیں۔ ہر تصور حقیقت اور صداقت، ارتقائی مراحل میں سے گزر رہی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک تصور منصۂ شہود پر آتا ہے۔ یہ مطلق یا مکمل صداقت کا پیکر نہیں ہوتا بلکہ نیم صداقت (PARTIAL TRUTH) کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں سے ایک اور تصور نمودار ہوتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے، لیکن ہوتا ہے یہ بھی نیم صداقت ہی کا پیکر۔ ان دونوں باہمدگر متضاد تصورات کی کشمکش سے ایک تیسرا تصور جنم لیتا ہے۔ یہ پہلے دونوں تصورات سے ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے۔ لیکن ہوتا ہے پھر بھی نیم صداقت کا حامل۔ یہ تصور، پھر ایک نئی کشمکش کا قدمِ اول بنتا ہے اور جو نزاع پہلے سامنے آئی تھی، اس قسم کی نزاع پھر وجود میں آجاتی ہے۔ تضادات کی اس کشمکش کا نام ارتقائی طریقِ عمل ہے جس سے آخرالامر مطلق اور مکمل صداقت (WHOLE TRUTH) کی نمود ہو جاتی ہے۔

مارکس اور اینگلز دونوں ہیگل کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اس جدلیاتی طریقِ ارتقاء کو ہیگل سے لیا لیکن کہا یہ کہ تصورات کی دنیا، محض واہمہ ہے، اس جدلیت کا تعلق انسان کی مادی دنیا سے ہے۔ اور مادی دنیا میں بھی اساسی حیثیت معاشی طریق کو حاصل ہے۔ اس معاشی طریق کو وہ پیداوار کی قوت (POWER OF PRODUCTION) سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پیداوار کا ایک طریق سامنے آتا ہے جس سے انسان دو متضاد طبقات (CLASSES) میں بٹ جاتے ہیں۔ ان طبقات میں باہمی جنگ ہوتی ہے جس سے ایک نیا طریق پیداوار (یا معاشی نظام) وجود میں آتا ہے جو پہلے نظام کی خوبیاں لئے ہوتا ہے، لیکن ہوتا ہے اس کی ضد۔ اس نئے نظام کی رُو سے، پھر باہمدگر متضاد طبقات ابھرتے ہیں جن کی باہمی کشمکش سے پھر ایک اور نظام وجود میں آتا ہے۔ اسی کشمکش کا نام، مارکس کے الفاظ میں مادی جدلیت یا جدلی مادیت (DIALECTIC MATERIALISM) ہے۔ یہ سلسلۂ نزاع و تضاد اسی طرح جاری رہے گا تاآنکہ ایک ایسا نظام وجود میں آجائے گا جس میں طبقات کا وجود ختم ہو جائے گا، یعنی وہاں انسانی معاشرہ (CLASSLESS) ہو جائے گا، اور ظاہر ہے کہ جب طبقات کا وجود ہی نہیں رہے گا تو باہمی نزاع بھی ختم ہو جائے گی۔

جب یہ کہا گیا کہ یہ تصور تو مادی جدلیت کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتا ہے۔ جب طبقات ختم ہو گئے تو باہمی تضاد نہ رہا۔ اور جب تضاد نہ رہا تو تغیرات کا سلسلہ بھی اختتام تک پہنچ گیا۔ وہ نظام غیر متبدل اور جامد ہو گیا۔ تو فلسفہ جدلیت کی خود تردید ہو گئی۔

اس کے جواب میں اس نے کہا کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ تضاد اور نزاع کا سلسلہ تو بہر حال جاری رہے گا۔ لیکن اس کی نوعیت کیا ہوگی، اور یہ کن متضاد عناصر میں جاری رہے گا۔ اس کی بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اس نے کہا کہ ہمارے زمانے میں یہ نزاع یہاں تک پہنچی ہے کہ پرانا سرمایہ دارانہ نظام ختم ہو رہا ہے۔ اور اس کی جگہ، اس کی ضد، ایک نیا نظام وجود کوشش ہے۔ پرانے نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر تھی کہ معاوضہ محنت (LABOUR) ہی کا نہیں بلکہ سرمایہ (CAPITAL) کا بھی ہے۔ سرمایہ دار، محنت کش مزدور کو اس کی طے کردہ اجرت دے کر، باقی سارے کے سارے منافع کا واحد مالک بن جاتا ہے اور کوئی قانون اُسے اس کے اُس حق ملکیت سے محروم نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس، اب جو نظام وجود میں آ رہا ہے اس کی بنیاد اس کلیہ پر ہے کہ سرمایہ کا کوئی معاوضہ نہیں ہوتا۔ معاوضہ سارے کا سارا محنت کا ہوتا ہے۔ اس کلیہ کی رو سے جو معاشی نظام وجود میں آ رہا ہے اس کی پہلی سٹیج کو سوشلزم کہا جاتا ہے، اور اگلی (اور آخری) سٹیج کو کمیونزم۔ (اس کی تفصیل ذرا آگے جا کر سامنے آئے گی)۔

یہ ہے وہ فلسفہ مادی جدلیت جس کی رُو سے، مارکسزم کے عقیدہ کے مطابق، نظام سرمایہ داری کی جگہ سوشلزم کا نظام آ کر رہے گا۔

قبل اس کے کہ ہم اس نظام کی تفصیلات سامنے لائیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مارکسزم کے بنیادی دعاوی پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ چونکہ یہ بات محض ضمنی طور پر سامنے آ رہی ہے — ہمارے موضوع کا نقطۂ ماسکہ نہیں اس لئے اس سلسلہ میں محض چند اشارات پر اکتفا کیا جائے گا۔ تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔

(۰)

اس فلسفہ پر تنقید

مارکسزم کا پہلا دعویٰ یہ ہے کہ جس دور میں جس قسم کا معاشی نظام ہوگا، اس دور کے تصوراتِ حیات، نظریاتِ زندگی، خیالات، معتقدات، سب اسی قسم کے ہوں گے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں ذہن انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں اور انسانی ذہن، اپنے مادی یا معاشی ماحول سے متاثر اور اسکی فکر انہی عوامل کی پیداوار ہوتی ہے۔ ہم اس دعویٰ کی تردید میں صرف ایک تاریخی شہادت پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

چھٹی صدی عیسوی میں یا تو غلامی کا نظام رائج تھا، اور جہاں وہ نظام پیچھے ہٹ رہا تھا، وہاں جاگیرداری نظام (FEUDAL SYSTEM) اپنی بساط بچھا رہا تھا۔ بالفاظِ دیگر، اس دور میں غلامی اور جاگیرداری نظام کا دور دورہ تھا۔ مارکسزم کے مفروضہ کی رُو سے، اس دور کے خیالات، تصورات و معتقدات، انہی کی تائید میں ہونے

چاہئیں۔ لیکن ہمارے پاس اس دور کی ایک کتاب، اپنی اصلی شکل میں موجود ہے جس کا جی چاہے اسے دیکھ لے۔ اس کتاب میں، غلامی کو بدترین جرمِ انسانیت قرار دیا گیا ہے اور جاگیرداری نظام کی جڑ بنیاد اکھیڑنے کے لئے اعلان کیا گیا ہے کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ تمام انسانوں کے لئے ذریعہ رزق ہے اس لئے اس سے متمتع ہونے کا ہر ایک کو، بقدرِ ضرورت، حق حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ معاوضہ صرف محنت کا ہو سکتا ہے، سرمایہ کا نہیں اور فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی شخص کے پاس نہیں رہ سکتی کیونکہ یہی نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے (تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

ہم پوچھتے ہیں مارکسزم کے حامیوں سے کہ چھٹی صدی عیسوی کی ایک کتاب میں یہ خیالات اور نظریات کہاں سے آ گئے؟ یہ بہرحال، اُس دور کے معاشی ماحول کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ مارکسزم کا یہ کلیہ غلط ہے کہ ہر دور کے خیالات اُس دور کے معاشی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں۔ مذکورہ صدر تاریخی شہادت سے واضح ہے کہ ایک اور سرچشمۂ علم بھی ہے جو ماحول سے ماوراء اور معاشی نظام کے اثرات سے بلند اور غیر متاثر ہوتا ہے۔ اسے اس کتاب کی اصطلاح میں وحی کہا جاتا ہے۔

اب آگے بڑھیے۔ مارکسزم کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ طبقات معاشی نظام کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ زیردستوں کا ہوتا ہے اور دوسرا بالادستوں کا۔ ان دونوں میں باہمی کشمکش ہوتی ہے اور وجہِ نزاع معاشی تفاوت ہوتے ہیں (ان کے قول کے مطابق) ساری تاریخِ انسانیت، اسی نزاع و کشمکش کی داستان ہے۔ اس کی تردید میں بھی ہم پھر اُس دور کی ایک تاریخی شہادت پیش کرتے ہیں۔ اس معاشرہ کا بالادست طبقہ، مکہ کے قریش پر مشتمل تھا۔ نسلی تفاخر کے اعتبار سے، غیر عرب تو ایک طرف، خود عربوں کا کوئی قبیلہ بھی ان کا شریک و سہیم نہیں تھا۔ وہ دولت اور ثروت کے مالک اور کعبہ کے متولی ہونے کی جہت سے سارے ملک میں، بلند ترین مقامِ عزت و تکریم پر فائز تھے۔ لیکن ایک عقیدہ کے اختلاف سے (جس کا تعلق مادیت سے نہیں بلکہ مابعد الطبیعیات (METAPHYSICS) سے تھا) یہ طبقہ دو گروہوں میں بٹ جاتا ہے اور ان میں بائیس تئیس سال تک باہمی کشمکش، آویزش اور جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس میں کسی مقام پر، کسی قسم کی مفاہمت نہیں ہوتی۔ ہم پوچھتے ہیں مارکسزم کے حامیوں سے کہ وہ کونسی معاشی نزاع تھی جس سے یہ دونوں برابر کے فریق، زندگی بھر برسرِ پیکار رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ملک کے زیریں طبقہ کے بعض افراد نے بھی ان میں کے ایک گروہ (جسے تعارف کی غرض سے "محمدی گروہ" کہہ لیجئے) کا ساتھ دیا، لیکن وہ ان کا ساتھ دیتے یا نہ دیتے یہ کشمکش ان برابر کے گروہوں میں شروع ہوئی اور ان میں برابر جاری رہی اور جب

یہ نزاع ختم ہوئی ہے تو کسی معاشی معاہدہ کی رُو سے ایسا نہیں ہوا۔ اُس عقیدہ کی ہم آہنگی سے یہ کشمکش ختم ہوئی۔ لہٰذا، تاریخ مارکسزم کے اس دوسرے کلیہ کی بھی تردید کرتی ہے۔

مارکسزم کا دعویٰ ہے کہ دنیا کا کوئی تصور، کوئی عقیدہ، کوئی قانون غیر متبدل نہیں۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ قانون کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کی محنت کا استحصال (EXPLOIT) کرے، غیر متبدل رہنا چاہیئے یا نہیں! ایک نظریاتی گروہ یہ کہتا ہے کہ اس قانون کو غیر متبدل، اور عالمگیر رہنا چاہیئے۔ اور جو اس کی مخالفت کرے گا ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ اور دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ نہیں! آج یہ قانون نافذ رہے گا اور کل کو یہ قانون بدل جائے گا اور اس کی جگہ دوسرا قانون لے لیگا جو اس کی ضد ہوگا۔ آپ فرمائیے کہ ان میں سے کون سا گروہ ہے کہ نوعِ انسانی کے ہمدردوں کو اس کا ساتھ دینا چاہیئے!

مارکسزم کا دعویٰ ہے کہ قانونِ جدلیت غیر متبدل ہے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایسا تسلیم کرنے سے آپ خود اپنے ہاتھوں اپنے اس فلسفہ کی ساری عمارت منہدم نہیں کر دیتے جس کی بنیاد اس کلیہ پر ہے کہ کائنات میں کوئی شے غیر متبدل نہیں۔ ثبات صرف تغیر کو ہے!

پھر آگے بڑھیئے۔ آپ کہتے ہیں کہ یہ جو تضاد کی کشمکش سے، ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام آجاتا ہے، اس تبدیلی کو دنیا کی کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ یہ تبدیلی انسانوں کی لائی ہوئی نہیں ہوتی۔ یہ طریقِ جدلیت کی آوردہ ہوتی ہے نہ کوئی انسان، یا گروہ اپنی سعی و کاوش سے، اس تبدیلی کو روک سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو اس کی قوت حاصل ہے کہ جو نظام اس طریق کی رُو سے آتا ہے اس کی جگہ دوسرا نظام لے آئے۔ بالفاظِ دیگر، اس فلسفہ کی رُو سے انسان مجبورِ محض ہوتا ہے۔ اسے اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنی ہوتی ہے جو طریقِ جدلیت کی رُو سے اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر انسان اس سلسلہ میں مجبورِ محض ہوتا ہے تو آپ جو نظام سرمایہ داری کے حاملین کو اس قدر سنگین مجرم قرار دیتے ہیں کہ تختۂ دار سے ورے ان کا کوئی مقام ہی تجویز نہیں کرتے تو ان کے کس جرم کی پاداش میں آپ ایسا کرتے ہیں؟ وہ بیچارے اس نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے مجبورِ محض تھے جسے طریقِ جدلیت نے ان پر مسلط کر دیا تھا۔ نہ وہ اس نظام کو خود لائے تھے نہ ہی اس کی جگہ کوئی دوسرا نظام لا سکتے تھے۔

دوسری طرف یہ جو آپ محنت کشوں اور مزدوروں سے کہتے ہیں کہ اٹھو! انقلاب برپا کر دو۔ لوٹو۔ مارو۔ چھینو۔ جھپٹو۔ جنگ کرو۔ تو یہ سب کاہے کے لئے؟ اگر جدلیت کی رو سے، سوشلزم کے نظام نے آکر رہنا ہے۔ نہ اسے کوئی روک سکتا ہے، نہ وقت سے پہلے لا سکتا۔ تو پھر یہ عالمگیر تحریکیں۔ یہ شعلہ فشانیاں یہ تلاطم خیزیاں۔ یہ جنگ و جدل کس

مقصد کے لئے ہیں!

اور آخری بات وہی جسے ہم پہلے سامنے لا چکے ہیں کہ اس طریقِ جدلیت کی رُو سے جب طبقات ختم ہو جائینگے، اور باہمی کشمکش باقی نہیں رہے گی، تو پھر جدلیت کہاں جائے گی! جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس سوال کا جواب مارکس اور اینگلز کے پاس تھا، نہ ہی کوئی مارکسسٹ اس کا جواب دے سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں تو صرف اس قدر کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اُس وقت جدلیت، معاشی کشمکش کے بجائے کوئی اور بنائے نزاع تلاش کر لے گی! یعنی انہیں تسلیم ہے کہ انسانوں کی دنیا میں، بنائے نزاع صرف معاشی نہیں۔ نزاع کی بنیادیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔

حاصلِ مطالعہ

یہ ہیں مارکسزم کے فلسفہ اور طریقِ جدلیت کی بنیادی کمزوریاں۔ مارکسزم کے متعلق ہمارا حاصلِ مطالعہ اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ:-

(۱) مارکس کو فطرت نے ایک حساس اور رقیق قلب عطا کیا تھا جو مظلوم اور مقہور انسانوں کی مظلومیت پر خون کے آنسو روتا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کے دُکھ درد دور ہو جائیں۔ وہ فلسفہ کا طالب علم تھا اس لئے اس نے ان کے دکھوں کا علاج فلسفہ کی رو سے دریافت کرنا چاہا۔

(۲) وہ ہیگل کے فلسفہ جدلیت سے متاثر تھا لیکن ہیگل صرف تصورات سے بحث کرتا تھا جو (مارکس کی فکر کی رو سے) عملی دنیا میں کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتے تھے۔ اس لئے اس نے تصوراتی جدلیت کی جگہ مادی جدلیت کو اپنا راہ نما بنایا لیکن اس کی بنیاد، دلائل پر نہیں رکھی بلکہ کہا یہ کہ انسانیت کی تاریخ ایسا بتاتی ہے۔

(۳) لیکن بدقسمتی سے اس کا تاریخ کا مطالعہ ناقص تھا اس لئے وہ اس کی رو سے جن نتائج پر پہنچا ان میں بنیادی اسقام تھے۔ لیکن چونکہ وہ حساس طبع اور متشدد مزاج تھا اس لئے اس نے ان اسقام پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کیا اور اپنے مطالعہ کو فطرت کا اٹل قانون قرار دے دیا۔ یہ اس کی بنیادی غلطی تھی۔

(۴) اس مقام پر فیور باخ اس کے قریب آیا۔ اس نے عیسائیت سے بغاوت اختیار کی تھی کیونکہ وہ زیردست طبقہ کو راضی برضا رہنے کی تعلیم دیتی تھی۔ اس نے جب اپنے حاصلِ مطالعہ کو مارکس کے سامنے پیش کیا تو وہ فوراً اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ مذہب واقعی عوام کے لئے افیون ہے اور خدا کا تصور، بالادست طبقہ کا پیدا کردہ۔ اس میں شبہ نہیں کہ جسے مذہب[1] (RELIGION) کہتے ہیں، اس سے انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ میں نے جیسا کہ اپنی

[1] اسلام دین ہے، مذہب نہیں۔

تصنیف، "کتاب التقدیر" میں تفصیل سے بتایا ہے، مذہب درحقیقت تقدیر کا ایسا غلط مفہوم پیش کرتا ہے جس سے ایک ذی شعور، صاحبِ فکر، حساس انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جس پر مارکس پہنچا تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ قرآن نے جو دین پیش کیا تھا اور تقدیر کا جو صحیح مفہوم بتایا تھا، مارکس کی اس تک رسائی نہ ہو سکی۔ ایک اتنے بڑے مفکر سے یہ توقع بے جا قرار نہیں دی جانی چاہیئے کہ وہ تاریخ اور مذہب سے متعلق اپنے مطالعہ کو وسیع کرتا۔ اس نے ایسا نہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت اس کے سامنے آنہ سکی۔ اور چونکہ ایک صاحبِ فکر کی غلط نگہی کا اثر بڑا دُوررس ہوتا ہے، اس لئے اس کے بہک جانے سے نہ معلوم کتنے انسان غلط راستے پر پڑ گئے اور یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا لیکن اس کے ذمہ دار بھی خود ہم (مسلمان) ہیں جنہوں نے اسلام کو بھی ایک مذہب قرار دے رکھا ہے اور قرآن کو محض ایک مذہبی کتاب۔ اس لئے مارکس، دین کا تصور لیتا کہاں سے ؟ قرآنِ کریم نے جو کہا تھا کہ جہنم میں اکثریت ان لوگوں کی ہوگی جو اپنے جرائم کا بوجھ بھی اپنی پیٹھ پر لادے ہوں گے اور ان لوگوں کے جرائم کا بوجھ بھی جو ان کی وجہ سے غلط راہوں پر چل نکلے، تو مجھے تو (معاف فرمائیں) اس کے مخاطب خود ہم (مسلمان) ہی دکھائی دیتے ہیں۔

بہرحال، اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور مارکس کے پیش کردہ معاشی نظام کو سامنے لاتے ہیں۔

سوشلزم

مارکس نے کہا کہ قانونِ جدلیت کی رو سے، نظامِ سرمایہ داری کے بعد جو معاشی نظام وجود میں آئے گا، وہ اپنے ابتدائی مرحلہ میں سوشلزم ہوگا اور آخری سٹیج میں کمیونزم۔ چونکہ سوشلزم نظامِ سرمایہ داری کے بطن سے جنم لے گا اس لئے اس پر اُس نظام کے کچھ کچھ نقوش مرتسم رہیں گے۔ یہ دھبے کمیونزم میں پہنچ کر پوری طرح دھل سکیں گے۔ جیسا کہ سوسائٹی یا سوشل وغیرہ کے الفاظ سے ہویدا ہے۔ سوشلزم کے معنی اجتماعیت کے ہیں۔ یہی تصور اس نظام کی بنیاد ہے۔ لینن نے اپنی کتاب میں، مارکس اور اینگلز کے خیالات کے حوالے سے اس نظام کے جو بنیادی خطوط متعین کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس نظام میں، ذرائع پیداوار، انفرادی ملکیت کے بجائے، سوسائٹی (یعنی اسٹیٹ) کی اجتماعی ملکیت میں ہونگے۔ اس تبدیلی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ داری کا وجود ختم ہو جائے گا۔ سرمایہ دار سے مراد ہے ذرائع پیداوار پر ذاتی ملکیت رکھنے والا۔

(۲) سوسائٹی کے سب افراد (WORKERS)، ذرائع پیداوار پر اجتماعی حیثیت سے کام کریں گے۔

(۳) جو کچھ پیدا ہوگا اس میں سے انتظامی امور، رفاہِ عامہ، ریزرو فنڈ وغیرہ کے لئے روپیہ الگ کر کے، باقی آمدنی

انہی محنت کشوں (کام کرنے والوں) میں تقسیم کر دی جائے گی۔

(۴) اس تقسیم کا اصول یہ ہوگا کہ ہر شخص کو اس کے کام کی کیفیت (QUALITY) اور کمیت (QUANTITY) کے مطابق حصہ ملے گا۔ جیسا اور جتنا کام، اتنا ہی معاوضہ جس نے کچھ کام نہیں کیا ہو گا اسے کچھ نہیں ملے گا۔

اِس نظام کی کمزوریاں

ظاہر ہے کہ اس اصولِ تقسیم کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ

(ا) بعض لوگوں کو اتنا مل جائے گا جو ان کی ضروریات سے زیادہ ہوگا۔

(ب) بعض کو اتنا ملے گا جس سے ان کی ضروریات پوری نہیں ہو سکیں گی۔

(ج) جو لوگ کام کر سکنے کے قابل نہیں ہوں گے، ان کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

بادنیٰ تدبّر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ موجودہ نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم میں فرق صرف اتنا ہوگا کہ سوشلزم میں کوئی شخص، سرمایہ کا معاوضہ نہیں لے سکے گا۔ باقی سب کچھ وہی ہوگا جو نظامِ سرمایہ داری میں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں طبقات (CLASSES) کا وجود بھی برقرار رہے گا۔ مارکسؔ اس باب میں کہتا ہے :۔

> لوگوں کی صلاحیتیں اور حالات مختلف ہیں۔ کوئی طاقتور ہے کوئی کمزور۔ کوئی شادی شدہ ہے کوئی مجرد۔ کسی کے بچے زیادہ ہیں کسی کے کم۔ لیکن (سوشلزم کے اصولِ تقسیم کی رُو سے) ایک کو زیادہ ملے گا دوسرے کو کم۔ ایک مقابلتاً امیر ہوگا دوسرا غریب (اس لئے لینن کے الفاظ ہیں) اس نظام میں مساوات اور عدل نہیں ہوگا۔ اس میں دولت کا تفاوت، اور غیر منصفانہ تفاوت باقی رہے گا۔ (مارکسؔ کے الفاظ میں) یہ اس نظام کا بہت بڑا سقم ہے لیکن اس عبوری دور میں یہ سقم باقی رہے گا۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔
>
> (لینن صفحہ ۵۴ - ۳۵۱)

ہم فلسفۂ جدلیت کے ضمن میں دیکھ چکے ہیں کہ اس نظریہ کی رُو سے، نظامِ سرمایہ داری کا خاتمہ اور اس کی جگہ سوشلزم کا قیام اس قانون کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے اس لئے اسے بہرحال قائم ہو کر رہنا ہے۔ یہ نہ کسی کے روکے رُک سکتا ہے، نہ کسی کی خواہشات اور آرزوؤں کے مطابق قبل از وقت نمودار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس نظریہ کے حامل خود ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ انقلاب، محنت کشوں کو اپنی سعی و عمل سے لانا ہوگا۔ لیننؔ اس باب میں، مارکسؔ اور اینگلزؔ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ

> یہ انقلاب، نیک افراد کی مخلصانہ کوششوں سے نہیں بلکہ منظم محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے ذریعے عمل میں آسکے گا۔ (صفحہ ۱۵) اس کے لئے محنت کشوں کے شعور کو بیدار کرنا ضروری ہوگا۔ اس طرح، جب یہ انقلاب،

محنت کشوں کی سیاسی کشمکش کا نصب العین قرار پاجائے گا، تو انہیں کامیابی ہو جائے گی۔ (صفحہ ۵۴-۵۵)

ہم نے دیکھا ہے کہ مارکس نے ہیگل کے نظریہ کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ تصور یا نظریہ اپنے اندر کوئی قوت نہیں رکھتا۔ یہ صرف مادی عناصر ہیں جن کی رُو سے انقلاب واقع ہوتا ہے۔ لیکن عملی تجربہ کے بعد، ان حضرات پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ نظریہ کے بغیر کوئی انقلاب رونما ہو نہیں سکتا۔ چنانچہ لینن اس باب میں کہتا ہے کہ:-

ایک انقلابی نظریہ کے بغیر، انقلابی تحریک وجود میں نہیں آسکتی۔

(COLLECTED WORKS, VOL. II - P. 45)

لیکن اس نظریہ کے پرچار سے بھی انقلاب خود بخود ظہور پذیر نہیں ہو جاتا۔ یہ کس طرح ظہور میں آسکتا ہے، اس کے لئے لینن لکھتا ہے کہ:-

سرمایہ داری نظامِ حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسرِ اقتدار آجانا، تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔

(STATE AND REVOLUTION)

لینن اسی کتاب میں دوسری جگہ، اینگلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ:-

انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رُو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصے پر اپنا اختیار و تسلّط، قوت و استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی کراتا ہے۔

اس انقلاب کے بعد، سوشلزم کی رو سے، نظامِ حکومت کس قسم کا ہوگا، اس کے متعلق مارکس لکھتا ہے کہ:-

نظامِ سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان (عبوری دور میں) وہ طریق کارفرما ہوگا جس کی رُو سے اوّل الذکر، ثانی الذکر میں بتدریج تبدیل ہوگا۔ اسی نسبت سے، اس عبوری دور (یعنی سوشلزم) میں، سیاسی نظام بھی عبوری قسم کا رائج ہوگا۔ اس میں اسٹیٹ، محنت کشوں کی ڈکٹیٹر شپ کا نام ہوگا۔

(لینن۔ صفحہ ۲۴۶)

اس ڈکٹیٹر شپ کے متعلق، سٹالن اپنی کتاب (LENINISM) میں لکھتا ہے:-

ڈکٹیٹر ایسی مختارِ عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود یکسر قوت پر مبنی ہے۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظامِ حکومت کے علمبردار سن لیں اور اچھی طرح سن لیں کہ ڈکٹیٹر شپ کے معنی ہیں قوت، غیر محدود قوت اور قاہرہ قوت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور قانون و شریعت سے کچھ سروکار نہ ہو۔

یہ تو رہا سوشلزم میں عام اندازِ حکومت۔ خود حکمران (کمیونسٹ) پارٹی میں بھی نظم و نسق اسی قسم کے فولادی شکنجہ کی

رو سے قائم رکھا جاسکے گا۔ انقلابِ روس ۱۹۱۷ء میں عمل میں آیا۔ اور لینن نے اپریل ۱۹۲۰ء میں کہا کہ :۔

اس حقیقت کو اب ہر ایک نے محسوس کر لیا ہوگا کہ بالشویک، اڑھائی سال تو ایک طرف، اڑھائی ماہ تک بھی برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتے تھے، جب تک ہماری پارٹی میں، متشدد اور صحیح معنوں میں فولادی ڈسپلن قائم نہ رکھا جاتا۔ (لینن۔ صفحہ ۸۰)

چنانچہ جونہی یہ آہنی گرفت ڈھیلی پڑی، روس کی مرکزی کمیونسٹ پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کے ساتھ ہی فلسفہ جدلیت اور اشتراکی نظام کے عالمگیر تصور کی دھجیاں بکھر گئیں، اور وہ، اس مسلک کو چھوڑ کر، اس روش پر گامزن ہو گئے جسے چین ارتداد یا تحریف (REVISIONISM) سے تعبیر کرتا ہے۔

اب آگے بڑھیئے۔

کمیونزم

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مارکسزم کی رو سے، سوشلزم محض عبوری دور کا نظام ہے۔ ان مشکلات کا حل جو طبقاتی تفاوت اور معاشی اختلاف کی پیدا کردہ ہیں، اس نظام کی اگلی سٹیج میں جا کر ہوگا جسے کمیونزم کہا جاتا ہے۔ اس میں پیداوار کی تقسیم کا اصول بدل جائے گا۔ اس وقت اصول یہ ہوگا کہ

ہر ایک اپنی استعداد کے مطابق کام کرے گا اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کےمطابق ملے گا۔

اس اصول کی رو سے نہ کسی کی کوئی ضرورت رکی رہے گی اور نہ ہی کسی کے پاس ضرورت سے زائد کچھ رہے گا۔ اس طرح انسانوں کی طبقاتی تفریق کا خاتمہ ہو جائے گا۔ باہمی نزاع اور کشمکش باقی نہیں رہے گی اور چونکہ مملکت کی ضرورت، ان نزاعات کے تصفیہ کے لئے ہوتی ہے، اس لئے جب نزاعات ہی نہ رہیں گی تو مملکت کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ کمیونزم کی رو سے ایک (CLASS - LESS) اور (STATE - LESS) سوسائٹی وجود میں آجائیگی۔ ایسا معاشرہ جس میں نہ طبقاتی امتیازات باقی ہوں گے نہ مملکت کا وجود۔ یہ نظام کس طرح وجود میں آئے گا، اس کا جواب کسی سوشلسٹ کے پاس نہیں۔ لینن اس باب میں لکھتا ہے :۔

نوعِ انسانی، کن مراحل سے گزر کر اور کن عملی اقدامات کی رو سے، اس بلند مقصد کو حاصل کر سکے گی، اسکی بابت ہم نہ کچھ جانتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں۔ (صفحہ ۳۵۸) یہ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی مواد (MATERIAL) ایسا نہیں جس سے ان سوالات کا جواب دیا جاسکے۔ (صفحہ ۳۵۵)

یہ ہے وہ مقام جہاں ہر کمیونسٹ ششدر و حیران، انگشت بدنداں و سر بگریباں، مبہوت کھڑا ہے اور اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس سوال کا جواب کیا دے؟ یہ صرف موجودہ کمیونسٹوں ہی کی حالت نہیں، خود مارکس بھی اس مقام

پر جس بُری طرح دنفتِ اضطراب تھا، اس کا اندازہ اُس کی تحریروں سے لگ سکتا ہے۔ اس نے اپنے ہم نواؤں کو سختی سے روک دیا تھا کہ وہ اس بحث میں قطعًا نہ الجھیں۔ جب کوئی اُس سے اس قسم کا سوال کرتا، وہ جھلّا اٹھتا، اور انہیں (UTOPIANS) یعنی "موہوم خوابوں کی دنیا میں بسنے والے" کہہ کر جھٹک دیتا۔ جو بنیادی سوال انہیں تنگ کرتا تھا اور جس کا جواب ان کے پاس کوئی نہ تھا، نہ ہے۔ وہ یہ تھا کہ وہ جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) کیا ہوگا جس سے ایک محنت کش صبح سے شام تک، جان مار کر کام کرے اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے بقدرِ اپنی ضرورت کے، تھوڑا سا لے کر، باقی سب دوسروں کے لئے دیدے۔ انہیں یہ جذبۂ محرکہ نہیں ملتا تھا۔ لینن (زیادہ سے زیادہ) کہہ سکا تو اتنا کہ :-

جب سوشلزم کے تحت یہ ورکرز، اپنے طور پر، پوری آزادی سے، اپنا حساب کتاب آپ رکھیں گے، اور جو اس میں کوتاہی کرے گا، اور اسے فوری اور سخت سزا مل جائے گی تو باہمی روابط کا احساس ان کی عادت (HABIT) بن جائے گا اور اس سے، کمیونزم کا دروازہ کھل جائے گا۔ (صفحہ ۳۶۳)

سٹالن نے ۱۹۳۵ء میں ایک کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس کے لئے جذبۂ محرکہ یہ ہوگا کہ :-

ایسا ورکر، محنت کا شہزادہ (HERO OF LABOUR) کہلائے گا۔ اس کے گرد شہرت اور عظمت کا ہالہ ہوگا۔ (STRACHEY. P.143)

لیکن اس کے بعد انہوں نے خود ہی محسوس کیا کہ یہ چیزیں، اتنے عظیم پروگرام کے لئے، قابلِ اعتماد اور مستحکم جذبۂ محرکہ نہیں بن سکتیں۔ چنانچہ لینن کو ہار تھک کر کہنا پڑا کہ

محنت کش، اپنی اپنی استعداد کے مطابق، بھرپور محنت، صرف رضامندانہ (VOLUNTARILY) کر سکتے ہیں۔ کمیونزم میں کچھ اسی طرح سے ہوگا۔ (صفحہ ۳۵۵)

اس ایک لفظ کے اندر، کمیونزم کے پورے کے پورے فلسفہ کا عجز اور اس کے نظام کی شکست کا راز، سمٹ کر آجاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مزدور کے اندر اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کیسے آجائے گی کہ وہ کسی نگران کی نگرانی، اور کسی سزا کے خوف کے بغیر اپنی استعداد کے مطابق مسلسل اور متواتر، جان مار کر کام کرتا رہے، اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے تھوڑا سا اپنے پاس رکھ کر، باقی سب دل کی کامل رضامندی سے دوسروں کو دیتا چلا جائے۔ یہ "دل کی رضامندی" کیسے پیدا ہوگی۔ اس کے اندر ایسا عظیم انقلاب کس طرح آجائے گا۔ مارکسزم کے مدعیوں کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

اس سوال کا جواب قرآن دیتا ہے !

نہ ہی مارکسزم اس سوال کا جواب دے سکتی ہے کہ جب کمیونزم کے نظام کی رو سے، طبقاتی تضاد اور کشمکش کا خاتمہ ہو جائے گا تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس مرحلہ کے بعد، انسانی ارتقا کا رُخ کس سمت کو ہوگا ؟ مارکس نے اس سوال کے جواب میں کہا تو فقط اتنا کہ "وہاں پہنچ کر، سابقہ تاریخ کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور اس کے ایک نئے باب کا آغاز ہوگا لیکن اس نئے سلسلہ کے لئے قانون کیا ہوگا، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہاں "انسانی ارتقاء کا سلسلہ ختم نہیں ہو جائے گا۔ جمود، قانون جدلیت کے خلاف ہے۔"

(THE MEANING OF MARXISM - BY COLE. P. 275)

اس سوال کا جواب بھی، اس آسمان کے نیچے، صرف ایک بارگاہ سے مل سکتا ہے۔ اور وہ بارگاہ ہے خدا کی کتابِ عظیم، قرآنِ کریم کی۔ آیئے اب ہم، اس کے آستانہ پر دستک دیں۔

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم (اقبالؒ)

بابِ دوم

قرآنی نظام

انسانی زندگی ہم جن راہوں سے گزر کر مارکسزم کے نظام تک پہنچے تھے، اب انہی راہوں سے قرآن کریم کے نظام تک پہنچیں گے۔ اس شاہراہ پر سب سے پہلا سنگِ میل خود انسانی زندگی کے متعلق تصور ہے۔ مارکسزم کی رو سے، انسانی زندگی، حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی ہے۔ انسان بھی کھاتا، پیتا، افزائشِ نسل کرتا ہے اور اس کے بعد موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم اس تصورِ حیات کو، کفر یعنی حقیقت اور صداقت سے انکار قرار دیتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ - (۴۷/۱۲) "اس تصورِ حیات کے حامل حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور مر جاتے ہیں"۔ اس سطح پر، زندگی کے تقاضے یا محرکات وہی ہوتے

ہیں جنھیں حیوانی جبلّت (ANIMAL INSTINCT) کہا جاتا ہے۔ اربابِ علم کی تحقیق کی رُو سے، بنیادی جبلّتیں تین ہیں۔ (۱) جذبۂ تحفظِ خویش (SELF - PRESERVATION)۔ (۲) غلبۂ خویش (SELF - AGGRESSION) اور (۳) افزائشِ نسل (SELF - REPRODUCTION) ان تقاضوں کی رُو سے، نہ تو کسی دوسرے کی ضروریات پورا کرنے کا تصوّر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی جائز و ناجائز کی تمیز کا سوال ابھرتا ہے۔ اس میں معاشرہ کا ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے، معاشرتی قوانین وضوابط کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے حیوانی زندگی میں (HERD INSTINCT) کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک فرد کا یہ احساس کہ وہ گروہ کے ساتھ رہنے میں زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ انسانی دنیا میں اسی کو سوشل لائف کہا جاتا ہے جہاں سے سوشلزم کی اصطلاح نے جنم لیا ہے۔

اس کے برعکس، انسانی زندگی کا جو تصور قرآن پیش کرتا ہے، اس کی رُو سے،

(۱) انسانی زندگی محض طبیعی زندگی نہیں۔ انسان کے اندر ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات، ان طبیعی قوانین کے تابع نہیں ہوتی جن کے مطابق اس کے جسم کی مشینری سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ اسی لئے جسم کی موت کا انسانی ذات پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔

(۲) انسانی ذات، ہر انسانی بچہ کو یکساں طور پر ملتی ہے، اور اسی بنیاد پر ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے، یکساں واجب التکریم قرار پاتا ہے۔ انسانی ذات، انسان کو غیر نشوونما یافتہ شکل میں ملتی ہے۔ اس کی نشوونما، انسانی زندگی کی غایت ہے۔

(۳) زندگی کی موجودہ سطح پر، انسانی ذات کی نشوونما، جسم کے ساتھ رہتے ہوئے ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ انسانی جسم کی نشوونما بھی ہوتی رہے۔ انسانی جسم کی نشوونما رزق (سامانِ زیست) کے ذریعے ہوتی ہے، جس کی پیدائش اور تقسیم کا صحیح نظم ونسق نہایت ضروری ہے۔ اسی کو معاشی نظام کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کی رو سے، معاشی نظام ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق ہر نظام — سیاسی، معاشی، معاشرتی، تمدنی وغیرہ — اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ خود دین اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

(۴) انسانی جسم کی پرورش تو قوانینِ فطرت کی رو سے ہوتی ہے، لیکن انسانی ذات کی نشوونما ان اصول و ضوابط کی رُو سے ہوتی ہے جنھیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار مستقل، غیر متبدل اور ابدی ہوتی ہیں۔ ان کی

یہی بنیادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہ فکرِ انسانی کی پیداوار نہیں ہوتیں۔ فکرِ انسانی کا پیدا کردہ کوئی تصور غیر متبدل نہیں ہوسکتا۔ غیر متبدل اصول و اقدار اسی کی طرف سے مل سکتے ہیں جو خود غیر متبدل ہو ــــ اور اس کائنات میں غیر متبدل صرف ایک ذات ہے جسے خدا کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۔ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ۔ (۵۵/۲۶-۲۷) کائنات کی ہر شے میں ہر آن تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے مبرّا، منزہ، بلند اور ماوراء صرف ایک ذاتِ خداوندی ہے جو جلال وجمال (قوت اور حسن) کا سرچشمہ ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۲۸/۸۸)۔ کائنات کی ہر شے ہر آن، ایک حالت کو چھوڑتی اور دوسری حالت میں نمود پذیر ہوتی ہے۔ اس عملِ تغیر سے مستثنیٰ صرف خدا کی ذات ہے۔ اور اُسی کے دیئے ہوئے نظریات و تصورات، تغیرنا آشنا ہوسکتے ہیں۔ یہ نظریات و تصورات، یعنی مستقل اصول و اقدارِ حیات، وحی کی رُو سے ملتے ہیں (ملتی تھیں۔ کیونکہ اب وحی کا سلسلہ ختم ہوچکا ہے) اور اس آسمان کے نیچے، صرف قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں، جس میں ایک لفظ کا ردوبدل نہیں ہوا۔ تاریخی شہادات اس کی مصدق ہیں۔

(۰)

مستقل اقدار

ان مستقل اقدار کی تفصیل تو طول طویل ہے، لیکن ہمارے پیشِ نظر موضوع کے اعتبار سے، ان میں سے چند ایک نمایاں اقدار و اصول حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے (۱۷/۷۰)۔ اس لئے پیدائش کے اعتبار سے ایک بچے (انسان) اور دوسرے بچے (انسان) میں کسی قسم کی تفریق و تمیز، اس مستقل قدر کے خلاف ہے۔

(۲) انسانی معاشرہ میں مدارج کا تعین، افراد کے ذاتی جوہر اور حسنِ کردار و سیرت کے اعتبار سے ہونا چاہیئے نہ کہ اضافی نسبتوں کی رو سے۔ (۴۶/۱۹)

(۳) معاشرہ میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ اِن اقدار و اصول کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ (۴۹/۱۳)

(۴) معاشرہ کے بنیادی ستون، عدل اور احسان ہیں (۱۶/۹۰)۔ عدل کے معنی ہیں کسی کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ادا کر دینا۔ اور احسان سے مراد یہ ہے کہ جس میں کسی وجہ سے کوئی کمی آجائے، اس کی اس کمی کو پورا کر دینا۔

(۵) انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود استعمال کرتا ہے۔ لیکن اس کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جو وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیتا ہے۔ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸)

جو اپنی محنت کی کمائی ـــ مال و دولت ـــ کو دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے تاکہ اس سے اس کی اپنی کی ذات نشو ونما ہو جائے۔

(۲) ایسا کرنے والے کی نفسیاتی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جنھیں کچھ دیتا ہے، ان سے برملا کہہ دیتا ہے کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۔ (۷۶/۹) ہم، تم سے معاوضہ تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ اس طرح وہ اپنا زائد از ضرورت سارے کا سارا مال دوسرے ضرورتمندوں کے لئے دیدیتا ہے (۲/۲۱۹) بلکہ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔ (۵۹/۹)۔ وہ خود تنگی میں گزارہ کر لیتا ہے اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا ہے۔

(۷) اگلی مستقل قدر یہ ہے کہ پوری پوری کی انسانیت ایک وحدت ہے ـــ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ (۲/۲۱۳)۔ اس لئے کسی تصور، کسی نظریہ، کسی نظام کے صحیح اور اچھے ہونے کا معیار یہ نہیں کہ وہ کسی خاص پارٹی، خاص گروہ، یا خاص قوم کے لئے نفع رساں ہے۔ اس کا معیار یہ ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)۔ وہی نظریہ، اصول یا نظام، باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہے۔

ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، انسانی ذات کی اس طرح نشو ونما ہو جاتی ہے کہ وہ، جسم کی موت کے بعد، زندگی کی اگلی ارتقائی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل اور مستحق ہو جاتی ہے۔ اس یقین (CONVICTION) کا نام حیاتِ آخرت پر ایمان کہلاتا ہے۔ یاد رہے کہ ایمان اندھے (FAITH) کو نہیں کہتے۔ یہ کسی تصور کو علیٰ وجہ البصیرت، دلائل و براہین کی رُو سے، صحیح تسلیم کرنے کا نام ہے اور یہی وہ یقین ہے جو اس بات کا جذبۂ محرکہ بنتا ہے کہ انسان اپنے مفاد اور اغراض کو پس پشت ڈال کر بھی، دوسروں کی نشو ونما کا سامان بہم پہنچانے کی فکر و کاوش کرے۔ اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ ایمان بالآخرت وہ محکم اور قابلِ اعتماد جذبۂ محرکہ ہے جس سے انسان ایتائے زکوٰۃ کرتا ہے۔ یعنی دوسروں کی نشو ونما بہم پہنچانے کا سامان مہیا کرتا ہے۔ (۲۷/۳ و ۳۱/۴) جو شخص حیوانی زندگی ہی کو اصل و غایت سمجھتا ہے، اس کے پاس کوئی ایسی بنیاد نہیں ہوتی جس سے وہ دوسروں کی نشو ونما کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہے۔ اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۔ (۴۱/۷) تسلسلِ حیات کے تصور اور قانونِ مکافاتِ عمل سے انکار ایتائے زکوٰۃ (دوسروں کی نشو ونما کرنے) کا محکم جذبۂ محرکہ نہیں بن سکتا۔

کشمکشِ تضادات

مارکسزم کے فلسفۂ جدلیت کی رو سے، تضادات کی کشمکش ہر آن جاری ہے۔ قرآن بھی کشمکشِ تضادات کو زندگی کا خاصا قرار دیتا ہے۔ لیکن اس کی رُو سے، اس کشمکش کی نوعیت، یا وہ عناصر جن میں یہ کشمکش برپا رہتی ہے، مارکسزم کے تصور سے مختلف ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ انسانی زندگی کے دو تقاضے ہیں۔ ایک اس کے جسم کی پرورش کا تقاضا، اور دوسرا تقاضا اس کی ذات کی نشو و نما کا۔ جسم کی پرورش کا جذبۂ محرکہ، تحفظِ خویش اور افزائشِ نسل کا جبلی تقاضا ہوتا ہے۔ اس جذبہ کا تقاضا ہے کہ ایک فرد ہر ممکن طریقے سے، اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے، زیادہ سے زیادہ اکٹھا کرے۔ حیوان زیادہ سے زیادہ اکٹھا کرنے کے تقاضے سے بے نیاز، اس لئے ہوتا ہے کہ اس کے سامنے موت کا تصور نہیں ہوتا ہے۔ لیکن انسان کے سامنے موت کا تصور ہوتا ہے اور اس کا وقت متعین نہیں ہوتا۔ اسی لئے یہ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے، کم از کم وقت میں، زیادہ سے زیادہ اکٹھا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔

یہ اس کی جسم کی پرورش کی جبلت کا تقاضا ہے۔ اس کے برعکس، جن مستقل اقدار پر، اس کی ذات کی نشو و نما کا انحصار ہے، ان کی رو سے، یہ حصولِ رزق (یعنی سامانِ زیست) کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا جو کسی مستقل قدر کے خلاف ہو۔ یاد رہے کہ کسی کی محنت کا غصب و استحصال (EXPLOITATION) مستقل قدر کی خلاف ورزی ہے — اور دوسرے یہ کہ اس کا مقصدِ حیات سب کچھ لینے اور اپنی اولاد کے لئے حاصل اور جمع کر کے رکھنا نہیں دوسروں کی پرورش بھی اس کے ذمے ہوتی ہے۔ یہ ایک اور مستقل قدر ہے۔

یہ ہے اضداد کی وہ کشمکش جس کی آماجگاہ انسان کا سینہ بنا رہتا ہے۔ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کو قرآن حق قرار دیتا ہے اور انہیں نظر انداز کر کے، صرف جسمانی تقاضوں کے پورا کرنے کو مقصدِ حیات قرار دے لینا باطل کہلاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے، انسانی زندگی میں کشمکش، حق و باطل کی ہوتی ہے — حق کے معنی ہوتے ہیں تعمیری نتائج پیدا کرنے والے تصورات اور نظام، اور باطل سے مراد ہوتی ہے تخریبی نتائج کے موجب نظریات اور نظام — قرآن کریم سلسلۂ کائنات کے متعلق کہتا ہے کہ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (۴۴/۳۹) ہم نے اسے تخریب کیلئے نہیں، تعمیر کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور چونکہ اس کی غایت اور مقصد تعمیری ہے اس لئے حق و باطل (تعمیری اور تخریبی قوتوں) کی اس کشمکش میں تعمیری قوتیں غالب آتی ہیں اور اس طرح کائنات، اپنے ارتقائی منازل طے کرتی حسین سے حسین تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَيْلُ

مِمَّا تَصِفُوْنَ - (۲۱/۱۸)
ہم حق کی ضربیں باطل پر لگاتے رہتے ہیں تا آنکہ حق، باطل کا بھیجہ نکال دیتا ہے اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھتا ہے۔ جو لوگ اپنے تصورات کے مطابق اس کے خلاف کچھ سمجھتے ہیں تو ان کے حصے میں تباہی کے سوا کچھ نہیں آسکتا۔

انسانی معاشرہ میں، مفاد پرست گروہ، باطل کو غالب رکھنے کی کوشش کرتے ہیں (۴۰/۵)۔ لیکن حق کی محافظ جماعتیں ان کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتر آتی ہیں۔ اور اس طرح حق قائم ہو جاتا ہے اور باطل شکست کھا جاتا ہے۔ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (۸/۸) خواہ، یہ بات مفاد پرست، قانون شکن، استحصال پسند، قوتوں پر کیسی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔ یہ کچھ یونہی اتفاقیہ نہیں ہو جاتا۔ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ - (۴۲/۲۴) حق کا ثبات اور باطل کا محو، خدا کے مقرر کردہ نظریات و تصورات کی رو سے ہوتا ہے۔

ان نظریات کی رو سے، قرآن ایک ایسا عملی نظام قائم کرتا ہے، جس میں انسان کے جسم کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں اور اس کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی رہے۔ ان دونوں میں کشمکش نہ ہو۔ اس کا یہ نظام، زندگی کے تمام دوائر کو محیط ہوتا ہے۔ اسے الاسلام کہا جاتا ہے۔ اس کلی نظامِ حیات کا ایک گوشہ معاشی نظام ہے۔ واضح رہے کہ اس نظام کے مختلف گوشے ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہیں ہوتے، بلکہ یہ ایک وحدت کے ناقابلِ تفریق (INSE - PARABLE) اجزا ہوتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ وہ وحدت، متشکل ہی ان اجزاء کے باہمی ادغام و توافق (INTEGRATION) سے ہوتی ہے۔ اس کے معاشی نظام کی تفصیلات ذرا آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی لیکن جو راستہ ہم نے طے کر لیا ہے اس سے آپ نے اتنا دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن، اپنے نظام کی عمارت جس فلسفۂ حیات اور نظریۂ زندگی کی بنیاد پر اٹھاتا ہے، وہ مارکسزم کے فلسفۂ حیات سے الگ ہی نہیں بلکہ اس کی ضد ہے اور قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ نظام جس میں نہ طبقاتی تفاوت باقی رہے نہ افراد میں باہمی اضدادی کشمکش، صرف قرآن کے تصورِ حیات اور نظریۂ زندگی کی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے۔ اس نظریہ اور تصور کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کہیں باہر سے عائد کردہ نہیں ہوتا۔ یہ انسان کے دل کی گہرائیوں سے ابلتا ہے۔ اور ابلتا ہے اس یقین (CONVICTION) کے زور دروں سے، جو اسے علم و بصیرت، دلائل و براہین اور تفکر و تدبر سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اس نظام کے قیام کیلئے جو کچھ کرتا ہے برضا و رغبت کرتا ہے، دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے کرتا ہے۔ یوں کہئے کہ اس نظام کا قیام اور استحکام، اس کی اپنی زندگی کا تقاضا، اور مقصدِ حیات کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ قرآن، انسانی معاشرہ میں

صرف خارجی اسباب وعلل سے تبدیلی لانے کا قائل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے خارجی ماحول میں تبدیلی کا انحصار اس کی داخلی زندگی کی تبدیلی پر ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ (۱۳/۱۱)
اس کا ابدی اصول ہے۔ یعنی خدا کسی قوم کے خارجی ماحول کو نہیں بدلتا جب تک اس کے اندر نفسیاتی تغیر نہ آجائے جو افرادِ قوم ان ابدی اقدار و قوانین کی صداقت کو علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کرلیں اور اس طرح اپنے اندر اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرلیں، ان کی ٹیم کو جماعتِ مومنین کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جو فرد اس جماعت کا رکن بننا چاہتا ہے اسے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوتے ہیں جس کی رُو سے "وہ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ اور خدا اسے، اس کے عوض، اس دنیا کی زندگی میں بھی، اور آخرت میں بھی، جنت کی ضمانت دے دیتا ہے (۹/۱۱۱)۔ آپ نے دیکھا کہ اس سب سے پہلے معاہدہ کی رُو سے، کس طرح انسان کے دل سے، ذاتی ملکیت کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی محنت کی کمائی (مال) ہی کو اپنی ذاتی ملکیت نہیں سمجھتا، بلکہ اپنی جان کو بھی اپنی جان نہیں سمجھتا۔ کسی کی امانت تسلیم کرتا ہے۔
آپ نے دیکھا کہ اس نظام کے قیام کے لئے، قرآن بنیادی اہمیت فرد کو دیتا ہے اور مارکسزم کا فلسفہ فرد کی انفرادیت کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ بھی ان ہر دو نظریات کا بنیادی فرق ہے۔

قرآن کا معاشی نظام

قرآنِ کریم، اپنے کلی معاشی نظام کو بطور نصب العین، پیش کرتا ہے، لیکن اس تک، پہنچاتا ہے احوال و ظروف کے مطابق، بتدریج۔ اس مقصد کے لئے وہ اس کے عبوری دور کے لئے بھی راہ نمائی دیتا ہے اور انتہائی مرحلہ کے لئے بھی۔ آیئے، ہم پہلے اس پیش کردہ عبوری نظام کے خط و خال کا مشاہدہ کریں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ وہ اس نظام کو جس میں انسان کے جسم کی پرورش کے تقاضے باطمینان پورے نہ ہوتے ہوں، خدا کا عذاب قرار دیتا ہے یعنی

بھوک خدا کا عذاب ہے

وہ نظام جس میں افرادِ معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جائیں۔ اسے عام طور پر بھوک اور افلاس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورہ النحل میں ہے کہ ہم اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں۔ ایک بستی تھی جو نہایت امن اور اطمینان سے رہتی تھی۔ سامانِ زیست نہایت افراط اور فراوانی سے اس کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔ لیکن اس کے رہنے والوں نے خدا کی ان نعمتوں کی قدر نہ کی، اور

اپنا خود ساختہ غلط نظام اپنے ہاں رائج کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر خوف اور بھوک کا عذاب طاری ہو گیا۔ رزق کی فراوانیاں بھی ختم ہو گئیں اور امن کی طمانیت بخشیاں بھی۔ (۱۶/۱۱۲)۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ جو لوگ ہمارے قوانین سے اعراض برتتے ہیں، ان کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور ہم انہیں قیامت کے روز بھی اندھا اٹھائیں گے (۲۰/۱۲۴)۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے، اس دنیا میں رزق کی تنگی، انسان کی عاقبت خراب کرنے کا موجب بھی ہو جاتی ہے۔ اسی سورۃ میں چند آیات پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں جنت کی زندگی کی محسوس علامات کیا ہیں؟ یہ کہ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی۔ (۲۰/۱۱۸)۔ اس میں نہ کھانے پینے کے متعلق کوئی پریشانی ہو گی نہ لباس اور مکان کے متعلق کوئی فکر مندی۔ اس میں کیفیت یہ ہو گی کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵) ہر شخص کو، ہر جگہ، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے گا۔ کسی کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے گی۔

ان تصریحات سے ہم نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ:-

(۱) اگر نظامِ معاشرہ اس کے متعین کردہ اصولوں کے مطابق متشکل کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ سامانِ زیست کی فراوانی ہو گی۔ اور

(۲) اگر ان اصولوں سے اعراض برتا گیا تو اس کا نتیجہ بھوک اور افلاس ہو گا جو خدا کا عذاب ہے۔

زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی

ان اصولوں میں سرِ فہرست یہ اصول ہے کہ ذرائع پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں، ذریعۂ پیداوار زمین تھی۔ انڈسٹری (صنعت کاری یا نظامِ کارخانہ داری) ابھی وجود پذیر نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو ذریعۂ پیداوار اپنی اصل کے اعتبار سے، زمین ہی ہے۔ اسی کی پیداوار ہے جسے کارخانے مختلف شکلوں میں ڈھالتے ہیں۔ اس لئے قرآنِ کریم نے نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ زمین خدا کی ملکیت ہے اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس چیز کو قرآن "خدا کی ملکیت" کہتا ہے، اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام نوعِ انسان کے فائدے کے لئے ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس حقیقت کو اس نے ایک تاریخی واقعہ سے نہایت بصیرت افروز انداز سے واضح کیا ہے۔ قومِ ثمود کے زمانہ میں معاش کا دار و مدار گلہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ قوم کے مستبد سرداروں نے چراگاہوں اور چشموں پر قبضہ کر کے، کمزور انسانوں کے مویشیوں کو ان سے متمتع ہونے سے محروم کر رکھا تھا۔ ان کے اس نظام کو توڑنے کے لئے

آسمانی انقلاب کے داعی، خدا کے رسول حضرت صالحؑ اٹھے۔ کافی جد وجہد کے بعد، ان کے مخالفین اس پر رضامند ہو گئے کہ چراگاہیں اور چشمے تمام مویشیوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ لیکن حضرت صالحؑ نے کہا کہ جب تک اس معاہدہ کا عملی ثبوت سامنے نہ آجائے، یقین نہیں کیا جا سکتا کہ تم اس پر قائم رہو گے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہوگا کہ یہ ایک اونٹنی ہے۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ ۔ اس کے متعلق یہ نہ سمجھو کہ یہ زید کی، بکر کی، امیر کی، غریب کی اونٹنی ہے۔ اس کے متعلق بس یہ سمجھو کہ یہ خدا کی اونٹنی ہے۔ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْٓ اَرْضِ اللّٰهِ۔ (۱۱/۶۴) یہ خدا کی اونٹنی ہے اور یہ خدا کی زمین ہے۔ اس اونٹنی کو آزاد چھوڑ دو کہ یہ خدا کی زمین میں چرے چگے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم نے ناقۃ اللہ اور ارض اللہ کہہ کر کیسے حسین اور بلیغ انداز سے اس حقیقت کو واشگاف کر دیا کہ ذرائع رزق کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ انہیں خدا کی مخلوق کے فائدے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ قرآن نے اس بنیادی اصول کو اس شرح وبسط سے بیان کیا ہے کہ اس مقالہ میں ان تمام مقامات کا احاطہ مشکل ہے۔ اس لئے یہاں صرف چند ایک آیات کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ (مثلاً)

(۱) خدا نے زمین کو تمام مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا ہے۔ (۵۵/۱۰)

(۲) اس میں تمہارے لئے معاش، یعنی روزی کا سامان ہے۔ (۷/۱۰ ؛ ۱۵/۲۰)

(۳) اس میں بندوں کے لئے رزق ہے۔ (۵۰/۱۱)

(۴) رزق کے یہ دروازے ہر صاحبِ ضرورت کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ (۴۱/۱۰)

(۵) تم اس رزق کو خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ (۲۰/۵۴)

(۶) کسی کو زمین کا مالک سمجھنا، اسے خدا کا شریک بنانا ہے (۲/۲۲)۔ فرعون یہی کہتا تھا کہ یہ زمین میری ہے۔ اس میں بہنے والے دریا میرے ہیں۔ اس لئے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی (۷۹/۲۴) میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ اس کے اس دعوے کے ابطال کے لئے اس کی طرف صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ جیسے عظیم انقلاب آفریں پیغمبر کو بھیجا گیا تھا۔

قرآن کریم کا یہ وہ اساسی دعویٰ ہے جس کی بنا پر علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت این متاعِ بے بہا مفت است مفت

باطنِ الارض للّٰہ ظاہر است ہر کہ این ظاہر نہ بیند کافر است

یعنی الارض للّٰہ کہنے سے مقصود، خدا کی شانِ ملکوتی کا اظہار نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زمین کسی انسان کی

ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ ایسا نہ سمجھنا (یعنی کسی انسان کو زمین کے رقبے کا مالک قرار دینا) کفر ہے۔ شرک ہے۔ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا۔ (۲/۲۲ ; ۲۳/۸۴ ; ۱۰-۱/۹)۔ سوائے مسلمانو! دیکھنا تم خدا کے شریک اور ہمسر نہ کھڑے کر دینا۔
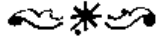
پہلے کہا جاچکا ہے کہ قرآنِ کریم اپنے پیش کردہ نظام کو بتدریج نافذ کرتا ہے۔ یعنی معاشرہ جس حالت میں ہوتا ہے، وہ اپنے نظام کی ابتدا اس کے تقاضوں کے مطابق کرتا ہوا' اسے منزل بہ منزل آخر تک پہنچاتا ہے۔ اس نے ان منازل کے لئے الگ الگ ہدایات دی ہیں۔ انہی کے مطابق اسلام کے صدرِ اول میں یہ معاشرہ قائم ہوا تھا۔ ان مختلف منازل سے متعلق احکام وہدایات کا سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ اس عملِ تدریج کے سامنے نہ ہونے سے قرآنی احکام کے متعلق قسم قسم کی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

منزل اوّل

انفرادی زندگی

نزولِ قرآن سے، اس نظام کی آواز اُس معاشرہ میں بلند کی جاتی ہے جو نظامِ سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اُس میں ایک طرف' ایسے متموّل افراد ہیں جو اپنی دولت کے نشہ میں' بدمست ہیں اور دوسری طرف ایسے مفلوک الحال' جو نانِ شبینہ تک سے محروم ہیں۔ اس معاشرہ میں سب سے پہلے متموّل لوگوں سے اپیل کی جاتی ہے۔ کہ وہ ان ناداروں اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام کریں جو خود اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے سے کسی طرح معذور ہو چکے ہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے ان مسکینوں اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام نہ کیا تو یاد رکھو! تم پر جہنم کا عذاب مسلّط ہو جائے گا۔ (۴۹/۴۳ ; ۸-۱۰/۷۶)۔ اُخروی زندگی میں یہ عذاب کس قسم کا ہوگا اس سے ابھی زیادہ بحث نہیں کی جاتی لیکن انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر تم نے معاشرہ کا موجودہ نقشہ نہ بدلا جس میں بیشتر انسان اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی تک سے محروم رہتے ہیں تو ملک میں ایسا فساد برپا ہوگا جس میں تمہاری عزتیں خاک میں مل جائیں گی۔ اُس وقت تم حواس باختہ ہو کر پوچھو گے کہ ایسا کیوں ہوا۔ فطرت کا اٹل قانون تمہیں بتائے گا کہ یہ اس لئے ہوا کہ تمہارے ہاں عزت وتکریم کا معیار دولت اور جتھہ کی اکثریت تھی۔ تم میں

انفرادی اپیل

سے جو تنہا رہ جاتا تھا تم اسے عزت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور جس کا چلتا ہوا کاروبار کسی حادثہ کی وجہ سے رُک جاتا تھا تم نہ خود اس کی روٹی کا انتظام کرتے تھے، نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دلاتے تھے۔ (۸۹/۲۰-۱۷)۔ ان میں سے جو لوگ اس نئی آواز پر لبیک کہہ کر اس داعیٔ انقلاب کی رفاقت کا عہد کرتے (انہیں جماعتِ مومنین کہا جاتا)۔ ان سے بھی کہا جاتا کہ یاد رکھو! اس آواز کی ہمنوائی سے تم بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر پر لیتے ہو۔ تمہیں محتاجوں، یتیموں اور اسیروں کی روٹی کا انتظام کرنا ہوگا، اور ستائش کی تمنا اور صلہ کی امید کے بغیر ایسا کرنا ہوگا۔ (۷۶/۸-۹)۔ یہ ایک سخت گھاٹی ہے جس پر تمہیں چڑھنا ہوگا۔ (۹۰/۱۱-۱۶) جو ایسا نہیں کرے گا وہ اپنے دعویٰ ایمان کی تکذیب کریگا (۱۰۷/۱-۳) تمہارے دعویٰ ایمان کی صداقت کا ثبوت یہ ہوگا کہ تم محتاجوں اور ناداروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کیا کچھ دیتے ہو۔

صدقات

(اسے قرآن کی اصطلاح میں صدقہ کہتے ہیں۔) اس کی ابتدا تم اپنے اعزہ و اقارب سے کرو اور پھر اس کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اپنے اور بیگانے کی تمیز سے بلند ہوکر، ہر ضرورتمند کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام کرو۔ (۲/۲۱۵ ; ۳۰/۳۸)۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ جس محتاج کی کوئی ضرورت پوری کرو اس کے سر پر احسان کی من بھر کی سل رکھ دو کہ وہ بیچارہ ساری عمر اس کے بوجھ تلے دبا رہے۔ نہ ہی اُسے، لوگوں کو دکھا دکھا کر اپنے پندارِ نفس کی تسکین کا سامان پیدا کرو۔ اسے انسانیت کا فریضہ سمجھ کر ادا کرو۔ عقلِ فریب کار تم سے یہ کہے گی کہ ہم دوسروں پر خرچ تو کریں لیکن اس سے نہ اُن لوگوں سے اپنا احسان منوائیں اور نہ ہی معاشرہ میں پاپولر ہونے کے لئے لوگوں میں اس کا چرچا کریں تو ہم اپنی دولت دوسروں پر خرچ کیوں کریں؟ تم اسے سمجھاؤ کہ جو کچھ اس طرح سے خرچ کیا جائے گا وہ ضائع نہیں جائے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کسان بیج کے دانے مٹی میں ملا دیتا ہے تو وہ ضائع نہیں جاتے۔ ایک ایک دانے کے عوض سینکڑوں دانے اسے واپس مل جاتے ہیں۔ ان صدقات سے ایسے معاشرہ کی بنیاد رکھی جائے گی جس میں حقوقِ انسانیت محفوظ ہوجائیں گے اور تم اس تباہی سے بچ جاؤ گے جو انسانی ناہمواریوں کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ (۲/۲۶۱-۲۷۶) ; (۱۴/۳۱)

مال و دولت میں اصلاح

قرآن کریم نے اس پہلی اسٹیج پر، جہاں ایک طرف ضرورتمندوں کی ضروریات پوری کرنے کی انفرادی طور پر ترغیب و تحریص دی، اس کے ساتھ ہی دوسری طرف مالی معاملات میں اصلاح کی ہدایات بھی دیں۔ اس نے کہا کہ دوسروں کا پیسہ باطل طور پر مت کھاؤ۔ (۲/۱۸۸ ; ۴/۲۹)۔ اس سلسلہ میں اس کی تصریح کر دی کہ مذہبی علماء و مشائخ، لوگوں کا مال باطل طور پر کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا انہیں کچھ نہ دو۔ وہ خود محنت کر کے کمائیں کھائیں (۹/۳۴)۔ یتیموں کے مال کی حفاظت کرو (۴/۲ ; ۶/۱۵۲ ; ۱۷/۳۴)۔ اگر عورت بھی کچھ کمائے تو مرد خواہ مخواہ غاصبانہ

طور پر اس کے مالک نہ بن جائیں۔ عورت اپنی کمائی کی مالک ہوگی، مرد اپنی کمائی کا۔ (۴/۳۲) مقروض اگر تنگ دست ہو تو اسے قرضہ معاف کر دو (۲/۲۸۰) اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کرو۔ (۲/۱۸۰ ؛ ۵/۱۰۶)۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ متوفی وصیت نہیں کر سکا یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہیں ہوتی تو ترکہ کی تقسیم ان احکام کے مطابق کر دو جو قرآنِ کریم میں دیئے گئے ہیں (۴/۷ ؛ ۴/۱۱-۱۲) اور جن کی رُو سے دولت ایک جگہ مرکوز ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ خرید و فروخت یا آجر و مستاجر (مزدور) کے تعلقات میں حسنِ معاملہ کے سلسلہ میں بار بار تاکید کی کہ کبھی کم نہ تولو۔ خریدار کو اس کی قیمت کے بدلے میں صحیح صحیح چیز دو۔ مزدور کی مزدوری قاعدے اور معاہدے کے مطابق ادا کرو۔ (۶/۱۵۲ ؛ ۷/۸۵ ؛ ۱۱/۸۴ ؛ ۱۷/۳۵ ؛ ۸۳/۱-۳)

زرعی اصلاح

عربوں کی معیشت (بالخصوص مکہ میں) زرعی نہیں تھی۔ اس لئے اس منزل میں زیادہ تر توجہ کاروباری معاملات کی طرف مبذول کی گئی۔ زرعی اصلاح کے سلسلہ میں کہا گیا کہ جو کچھ تم اپنی محنت سے کماؤ اس میں سے بھی نادار ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دو، اور زمین کی پیداوار میں سے بھی (۲/۲۶۷)۔ اسے "خدا کا حق" کہہ کر پکارا گیا (۶/۱۴۱)۔ جس طرح صدقات کے سلسلہ میں کہا تھا کہ اگر تم نے مفلوک الحال محتاجوں کی ضروریات پوری نہ کیں تو معاشرہ میں ایسا فساد برپا ہو جائے گا جو تمہارے موجودہ مقاماتِ عزت و تکریم کو الٹ کر رکھ دے گا۔ اسی طرح زمین کے سلسلہ میں بھی کہا کہ اگر تم نے اس میں سے "خدا کا حق" محتاجوں کو نہ دیا تو تمہارے کھیتوں کا ہر دانۂ گندم جل کر راکھ ہو جائے گا۔ (۶۸/۱۷-۳۳) ؛ (۱۸/۳۲-۴۴)۔ اور تمہارے بال بچے تک تباہ ہو کر رہ جائیں گے (۲/۲۶۶)

منزلِ دوم

اجتماعیت کی طرف اقدام

منزلِ اول میں تمام ہدایات اور تاکیدات انفرادی تھیں۔ اس دوران میں، وہ لوگ جو اس دعوتِ انقلاب کی صداقت کے قائل ہو گئے، اس داعیٔ انقلاب کے گرد جمع ہوتے چلے گئے اور اس طرح ان کا (یوں کہئے کہ) ایک الگ معاشرہ وجود میں آنا شروع ہو گیا۔ یہ اس پروگرام کی دوسری منزل تھی۔ اس میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف قدم اٹھایا گیا۔

منزلِ اول میں کہا گیا تھا کہ وہ ناداروں اور محتاجوں کی اپنے اپنے طور پر مدد کریں۔ (اسے "صدقات" سے تعبیر کیا گیا تھا)

صدقات کا اجتماعی نظم و نسق

اب کہا کہ نہیں۔ صدقات (اپنے عطیات) کو اپنے اپنے طور پر خرچ نہ کرو، بلکہ اسے اپنے نظام کے مرکز کے پاس جمع کرو۔ بلکہ اس مرکزِ نظام (یعنی نبی اکرمؐ) سے کہا گیا کہ ان کے صدقات خود وصول کرو۔ (۹/۱۰۳) اور اس روپے کو معاشرہ کے فلاحی امور کے لئے ان مدات پر صرف کرو جن کا ذکر سورۃ توبہ کی آیت نمبر ۶۰ (۹/۶۰) میں آیا ہے[1]۔ پہلے کہا گیا تھا کہ اہلِ حاجت کو قرض دیا کرو اور اس کی ادائیگی میں مقروض کی سہولت کو پیشِ نظر رکھا کرو۔ اب کہا کہ "قرض اللہ کو دیا کرو"! (۵۷/۱۸ ؛ ۲/۲۴۵) یعنی جب تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (یعنی خود نبی اکرمؐ) کسی اجتماعی ضرورت کے لئے اپیل کرے تو جو کچھ کسی سے بن پڑے، اسے دے دیا کرو۔ وہ اس قرضہ کو تمہارے حفاظتی امور میں صرف کرے گا اور تھوڑے عرصہ کے بعد، جب تمہارا معاشرہ مضبوط ہو جائے گا اور یہ نظام پوری طرح متشکل، تو جو کچھ تم اب "اللہ کو" بطور قرض دو گے، اس کی پائی پائی تمہیں واپس مل جائے گی۔ (۲/۲۴۵) لیکن اگر تم نے اس وقت بخل سے کام لیا تو پھر تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس لئے تم اپنے ہاتھوں اپنی تباہی مول نہ لو۔ (۲/۱۹۵)۔ یہ ہلاکت یا تباہی کیا ہو گی؟ یہ کہ تم مٹ جاؤ گے اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ (۴۷/۳۸) انفرادی مفاد پرستی کے جذبات (جنہیں شیطانی وساوس کہا جاتا ہے) تمہیں ورغلائیں گے کہ اپنا پیسہ اپنے پاس رکھو۔ وقت پر تمہارے کام آئے گا (۲/۲۶۸) لیکن تم اس فریب میں نہ آجانا۔ معاشرہ میں ناہمواریوں سے جو فساد رونما ہوتا ہے اس میں انفرادی ملکیتیں کچھ کام نہیں آیا کرتیں۔ ایسا سمجھنے والے کہ، ہمارا ذاتی پیسہ ہمیں تباہی سے بچا لے گا) اور دوسروں کو بھی اسی قسم کی پٹی پڑھاتے والے: تباہیوں اور ہلاکتوں کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھاتے ہیں۔ (۴/۳۷ ؛ ۵۷/۲۴ ؛ ۹۲/۹-۱۱) یاد رکھو! جو کچھ تم اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے دو گے اس سے تمہاری حفاظت ہی نہیں ہو گی، بلکہ مزید نشو و نما بھی ہوتی جائے گی۔ (۹۲/۱۸) — تمہاری طبیعی نشو و نما بھی اور تمہاری ذات کی نشو و نما بھی جو درحقیقت منتہیٰ و مقصود ہے موجودہ سطح زندگی کی تمام تگ و تاز و جد و جہد کا — انسانی ذات کی نشو و نما کو اصطلاح میں "قربِ خداوندی" کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے انسان میں (حدِ بشریت کے اندر) خدا کی صفات کی نمود ہوتی ہے۔ یہ "تقرب الی اللہ" مال و دولت جمع کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اُسے "خدا کو دے دینے" سے حاصل

---

[1] یہ "صدقات" کے مصارف ہیں جنہیں ہمارے ہاں (غلطی سے) "زکوٰۃ" کے مصارف سمجھ لیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کا بیان آگے چل کر آئے گا۔

ہوتا ہے۔ (۱۴/۱۵) اس میں شبہ نہیں کہ زن و فرزند کی طرح مال و دولت میں بھی کشش و جاذبیت ہے (۳/۱۴) لیکن اگر زن و فرزند یا مال و دولت کی جاذبیت، اجتماعی مفادِ انسانیت پر غالب آ جائے تو یہی زن و فرزند اور مال و دولت فتنہ بن جاتے ہیں۔ (۸/۲۸) اس لئے تم انفرادی مفاد پرستی کے فریب میں نہ آؤ۔ اسی سے تمہیں کامیابی نصیب ہوگی (۶۴/۱۴-۱۶)۔ انفرادی دولت جمع کرکے، یہ نہ سمجھ لو کہ تم معاشرہ کے اجتماعی تعاون سے مستغنی ہو جاؤ گے رتم خود کفیل ہو گئے، تم (SELF-SUFFICIENT) ہو گئے۔ قطعاً نہیں۔ جو ایسا سمجھتا ہے تباہ ہو جاتا ہے (۹۲/۱۰؛ ۹۶/۷)۔ منزلِ اول میں ضرورتمندوں کی امداد کے لئے اپیل کی گئی تھی جس کے معنی یہ تھے کہ وہ تم سے اپنے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگتے۔ تم انہیں بطورِ امداد کچھ دو۔ لیکن اب کہا کہ تمہارے مال و دولت میں ضرورت مندوں کا حق ہے۔ یعنی وہ اس میں سے، اپنی ضروریات کے بقدر، بطور استحقاق (AS OF RIGHT) لے سکتے ہیں۔ (۵۱/۱۹؛ ۷۰/۲۴-۲۵) اگر تم خود ان کے اس حق کو ادا نہ کرو گے تو معاشرہ تم سے ان کا یہ حق دلوائیگا۔

مال و دولت کے نظام میں اصلاح

سائل و محروم کا حق

آپ نے دیکھا کہ اس منزل میں صدقات کی حیثیت خیرات کی نہیں رہی، حق کی ہو گئی۔ خیرات لینے والا ذلت محسوس کرتا ہے اور دینے والے کے دل میں اس سے جذبۂ احسان اُبھرتا ہے۔ لیکن جو چیز بطورِ حق وصول کی جائے اس سے نہ لینے والے کے دل میں احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) پیدا ہوتا ہے، نہ دینے والے کے دل میں جذبۂ برتری (SUPERIORITY COMPLEX)۔

مالِ غنیمت

عربوں کے ہاں، مالِ غنیمت بہت بڑا ذریعۂ آمدنی تھا، اور ان کے معاشرہ کا رواج تھا کہ جنگ میں، جو کچھ کوئی دشمن کا لوٹ لے، وہ اُسی کا ہو جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس میں بھی اصلاح کی اور کہا کہ مالِ غنیمت انفرادی ملکیت نہیں ہوگا اسے مرکز میں جمع کرنا ہوگا۔ مرکز اس میں سے ایک حصہ اجتماعی ضروریات کے لئے الگ کرکے، باقی مال سپاہیوں میں تقسیم کرے گا۔ (۸/۱؛ ۸/۴۱)۔ اس ایک تبدیلی سے نہ صرف یہ کہ اس ذریعۂ آمدنی کی حیثیت اجتماعی ہو گئی، بلکہ جنگ کا جذبۂ محرکہ بھی بدل گیا۔ پہلے جنگ کا جذبۂ محرکہ لوٹ کا مال حاصل کرنا تھا۔ جو جتنا حاصل کر سکے لے جائے ــــ اب جذبۂ حقوقِ انسانیت کی حفاظت قرار پا گیا۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں قتال فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں جنگ۔ واضح رہے کہ جو کچھ اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے کیا جاتا ہے، اُسے قرآن کی رُو سے فی سبیل اللہ (یعنی اللہ کی راہ میں)، کہا جاتا ہے۔

دولت اُسی صورت میں اپنا مقصد پورا کر سکتی ہے جب یہ گردش میں رہے ــــ خود لفظ دولت کے معنی

دولت کا اکتناز

گردش کرنے کے ہیں ــ لیکن انفرادی ہوسِ زرپرستی، اسے گردش میں رکھنے کے بجائے جمع کرکے روک لیتی ہے۔ اس سے معاشرہ کا اقتصادی نظام الٹ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے بڑے تہدید آمیز انداز میں کہا کہ دولت کا اکتناز ــ یعنی اسے جمع کرکے روک رکھنا ــ سنگین ترین جرم ہے۔ اس سے جہنم کے شعلے بھڑکتے ہیں جن میں یہ دولت اور اس کے جمع کرنے والے، دونوں بُری طرح جھلستے اور جلتے ہیں۔ (۹/۳۴-۳۵)۔ یہ شعلے ان کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ (۱۰۴/۲-۷)۔ یہ اس آگ سے لاکھ بچنا چاہیں؛ وہ انہیں آوازیں دے دے کر بلا لیتی اور آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح، ان کا سب کچھ تباہ کر دیتی ہے۔ (۷۰/۱۸-۱۵)

دولت کو گردش میں رکھنے کے سلسلے میں، اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ اوپر کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ اسے پورے کے پورے معاشرے کے رگ و پے میں اس طرح گردش کرتے رہنا چاہیے جس طرح انسانی جسم میں خون گردش کرتا ہے۔ (۵۹/۷)

ربوٰ قرآنی نظام کے خلاف جنگ ہے

دولت جمع کرنے کے خلاف اس قسم کی تنبیہات و تاکیدات کے بعد، اس نے ایک ایسا حکم دیا جس سے دولت جمع کرنے کے مقصد اور جذبہ ہی کو جڑ سے کاٹ دیا۔ روپیہ، مبادلۂ اشیائے ضروریہ کا ذریعہ ہے۔ اس سے ازخود کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ایک سو روپیہ کسی بکس میں رکھ دیجئے۔ اسے آپ دس برس کے بعد بھی نکالیں گے تو وہ سو کا سو ہی ہوگا۔ وہ ایک پیسہ بھی پیدا نہیں کرے گا۔ اگر روپے کی حیثیت یہی ہے کہ وہ جتنی دیر جی چاہے پڑا رہے، اس میں کوئی اضافہ نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ روپیہ جمع کرکے رکھ چھوڑنا حماقت ہوگا۔ لیکن اگر آپ وہی سو روپیہ کسی ضرورت مند کو سود پر دے دیں تو وہ روپیہ اپنے ساتھ کچھ اور روپے لے کر آئے گا۔ یعنی اب آپ کا روپیہ، اپنے جیسے اور روپے پیدا کرے گا۔ جو روپیہ، محنت سے نہیں بلکہ روپے سے ازخود پیدا ہو، اسے قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ربوٰ کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ربوٰ کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ حرام ہے اور سنگین ترین جرم ــــ ایسا جرم جسے اس نے اسلامی نظام کے مدِمقابل ایک باغی نظام قرار دیا، اور کہہ دیا کہ ایسا نظام قائم کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو ہماری طرف سے اعلانِ جنگ سمجھیں۔ (۲/۲۷۵-۲۷۹)۔ دلیل کے طور پر اس نے کہا کہ ربوٰ سے تمہاری انفرادی دولت میں بے شک اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس نظامِ معیشت کے نتائج و عواقب اس قدر مضرت رساں ہیں کہ انجام کار، اس سے اجتماعی دولت میں بے حد کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ایک طبقہ، دوسرے کی

محنت کا غاصب بن کر، قوتِ عمل سے محروم اور سعادات انسانیہ سے عاری ہو جاتا ہے اور دوسرا طبقہ اپنی محنت کے ماحصل سے محروم ہو کر مفلس و نادار ہو جاتا ہے اور اس سے اس کے سینے میں انسانیت کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ پہلے سلگتی رہتی ہے اور آخرالامر بھڑک اٹھتی ہے۔ (۳/۱۲۹-۱۳۰)

واضح رہے کہ قرآن کریم نے اتنا ہی نہیں کہا کہ کسی ضرورت مند کو قرضہ دے کر اس سے جو زائد روپیہ لیا جائے وہی ربٰو ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو روپیہ تم دوسروں کے روپے کے ساتھ اس مقصد سے شامل کر دو کہ اس سے تمہیں کچھ زائد حاصل ہو جائے گا، وہ بھی ربٰو ہے۔ (۳۰/۳۹) اسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں کمرشل انٹرسٹ کہا جاتا ہے۔ نیز اس میں مضاربت (SLEEPING PARTNERSHIP) اور مزارعت (زمین کی بٹائی یا کرایہ) وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ اس نے اصول یہ بتایا کہ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ (۵۳/۳۹) معاوضہ صرف محنت کا ہے، سرمایہ کا نہیں۔ سرمایہ کا معاوضہ ربٰو ہے خواہ اس کی کوئی سی شکل بھی کیوں نہ ہو۔

ربٰو کو حرام قرار دے کر، قرآن نے روپیہ جمع کرنے کا مقصد اور جذبہ ہی ختم کر دیا۔

زمین کے متعلق اگلا قدم

اب آگے بڑھیے۔ انسانی معیشت میں زمین کے مسئلہ کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا گیا ہے حالانکہ بات اس قدر واضح اور صاف ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے نہ کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت پڑتی ہے، نہ ارسطو کے منطق کی حاجت۔ خدا نے اپنے آپ کو اَلْحَیُّ کہنے کے ساتھ ہی القَیُّوم بھی کہا ہے۔ یعنی زندگی عطا کرنے والا اور زندگی کو قائم رکھنے والا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے زندگی عطا کی تو زندگی کے قائم رہنے کے لئے جس قدر سامان و اسباب کی ضرورت تھی، اسے بھی ساتھ ہی عطا کر دیا۔ قیامِ زندگی کے لئے روشنی، حرارت، ہوا، پانی اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، اس نے ان تمام اشیاء کو، انسان کے پیدا کرنے سے پہلے مہیا کر دیا۔ روشنی، حرارت، ہوا، پانی تو عام طور پر سطحِ ارض کے اوپر موجود رہتے ہیں۔ خوراک کے متعلق اس نے کہا کہ اس کے ذخائر زمین میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ انسان انہیں اپنی ضرورت کے مطابق نکال لے۔ (۱۵/۲۱) وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ (۱۵/۲۰) ہم نے اس میں تمہارے لئے سامانِ معیشت رکھا ہے اور ان کے لئے بھی جن کے تم رازق نہیں ہو۔ آپ غور کیجئے کہ "معیشت" کا لفظ قرآن نے زمین کی پیداوار کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس میں سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ (۲۰/۵۴) دوسری جگہ اس نے کہا ہے مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ۔ (۷۹/۳۳ نیز ۸۰/۳۲)۔

جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، ارض اور دیگر ذرائع حیات انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ اب آپ سوچئے کہ دنیا کے کسی مبنی بر عدل قانون اور قاعدے کی رُو سے، کوئی شخص، اُن ذرائع حیات (حرارت، روشنی، ہوا، پانی، زمین) میں سے کسی کا مالک قرار پا سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے مشترکہ اور یکساں وجہِ قیام زندگی ہوں. آج آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے یہ قطعہ زمین فلاں شخص سے خریدا ہے یا اپنے باپ سے ورثہ میں پایا ہے۔ آپ اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لوٹاتے جایئے اور اُس شخص تک پہنچ جایئے جس نے پہلی مرتبہ اس قطعہ اراضی کو اپنی ملکیت کہا تھا۔ آپ اس سے پوچھئے کہ اس نے اسے کس سے خریدا یا کس سے ورثہ میں پایا تھا؟ ظاہر ہے کہ اس نے دھاندلی سے اس قطعہ کو اپنی ملکیت بنا لیا تھا۔ اب جو چیز شروع میں دھاندلی سے کسی کے قبضہ میں آئی ہو، اس پر اس کے بعد آنے والوں کا قبضہ کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ ذرائع حیات میں سے کسی پر، کسی شخص کا مالک بن کر بیٹھ جانا، اُس نوعِ انسان کے خلاف جرمِ عظیم ہے جس کی زندگی کے قیام کا اسے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ظلم اور دھاندلی زمانہ قدیم سے رواجاً یا قانوناً جائز چلے آ رہے تھے اس لئے قرآن کریم نے اس باطل تصور کو ذہن سے محو کرنے کے لئے بڑے محکم دلائل پیش کئے۔ اس نے خدا کو ماننے والوں سے کہا کہ تم جب آسمانوں کے اوپر خدا کے اقتدار و اختیار کو تسلیم کرتے ہو تو زمین پر اس کی حاکمیت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ یاد رکھو! وہ جس طرح الٰہ السماء ہے اسی طرح الٰہ الارض بھی ہے۔ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ۔ (۴۳/۸۴) دوسری جگہ ہے۔ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ (۶/۳) اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ آسمان میں اور خدا تسلیم کرنا اور ارض میں کوئی دوسرا خدا، کھلا ہوا شرک ہے۔ (۱۲/۱۴) سورۃ النحل میں ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ تم دو الٰہ اختیار نہ کرو۔ الٰہ صرف ایک ہے اور وہ الٰہ وہ ہے لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ (۱۶/۵۱-۵۲) سمٰوٰت اور ارض میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ اس لئے تم انسانوں کو زمین کے رقبوں کا مالک قرار دے کر، انہیں خدا کا ہمسر نہ بناؤ۔ (۲/۲۲) اس کا مالک وہی ہو سکتا ہے جس نے انہیں پیدا کیا اور تمام ذی حیات کے لئے ذریعہ رزق بنایا ہے۔ (۲۹/۶۰-۶۱)

اس قدر واضح دلائل دینے کے بعد اس نے کہا کہ اے رسولؐ! اب تم ان سے پوچھو کہ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا۔ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کس کی ملکیت ہے۔ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ لیکن اس کا جواب علم کی بارگاہ سے دے کر دو۔ اس کے بعد ہے کہ اگر انہوں نے علم و بصیرت سے کام لیا تو۔ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ۔ انہیں کہنا پڑے گا کہ یہ سب خدا کی ملکیت ہیں۔ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (۲۳/۸۴-۸۵) ان سے کہو کہ جب تمہیں خود اس کا اعتراف ہے کہ یہ سب خدا کی ملکیت ہے تو پھر تم اس حقیقت کا سامنا کرنے سے کیوں گریز کرتے ہو کہ اس پر کسی انسان کی

ملکیت نہیں ہو سکتی؟ اس حقیقت کو تسلیم کرو گے تو زمین کی پیداوار تمہارے لئے حلال و طیب ہوگی، ورنہ تم شیطان کے نقشِ قدم پہ چلتے جاؤ گے جس نے تمہارے کان میں پھونک دیا ہے کہ تم ذرائع رزق کے مالک بھی ہو سکتے ہو۔ (۲/۱۶۸)

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، روشنی، حرارت، ہوا، پانی اور زمین میں ایک فرق ہے۔ پہلی سب چیزیں اپنی استعمالی شکل میں ازخود موجود ہیں لیکن خوراک کو زمین سے نکالنا پڑتا ہے جس میں محنت صرف ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر نہایت دلنشیں انداز میں واضح کر دیا

معاوضہ محنت کا

کہ زمین کی پیداوار میں سے تم صرف محنت کے معاوضہ کے حقدار ہو۔ باقی "خدا کا حصہ" ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ تم کسی زمیندار سے بٹائی پر زمین لے کر اس میں کاشت کرتے ہو تو اس میں سے ایک حصہ خود لے لیتے ہو اور دوسرا حصہ زمیندار کو دے دیتے ہو (جسے تم زمین کا مالک سمجھتے ہو) اُسی قاعدے کے مطابق، زراعت میں اپنی محنت کا معاوضہ تم لے لو، اور حقِ مالکانہ خدا کو دے دو۔ سورۃ الواقعہ کی آیات ۶۳ تا ۷۴ میں اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ غور سے سنیئے۔ فرمایا:-

(اس مقصد کے لئے تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشوونما ہوتی ہے اور سوچو کہ کیا سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے وضع کردہ قوانین کے مطابق۔ مثلاً) تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر، اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اُگاتا ہے؟ کیا یہ تم ایسا کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ایسا ہوتا ہے۔

اس کے بعد کہا:-

پھر کھیتی کے اُگنے کے بعد اس کی حفاظت کون کرتا ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آجائے جس سے اُگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے ۔۔۔ اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم بکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلہ ملنا تو ایک طرف، ہماری محنت اور بیج بھی بیکار میں گئے۔

اس کے بعد ہے:-

پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے؟

(یہ بادل سمندر کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں جو اس قدر کھاری ہوتا ہے کہ نہ پینے کے کام آسکتا ہے نہ کھیتی باڑی

کے) ذرا سوچو کہ اگر بادلوں کا پانی (بارش) ویسے کا ویسا کھاری رہتا تو تم کیا کرتے؟ حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج سے غور کر کے، صحیح نتیجے تک کیوں نہیں پہنچتے اور نشو و نما کے متعلق خدا کے نظام کی قدرشناسی کیوں نہیں کرتے!

اس کے آگے ہے :-

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کر کے، اس سے اپنے کام لیتے ہو؟ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا — رگِ خس میں شعلے کو پنہاں کر دینا — تمہاری کاریگری سے ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ :-

(رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس تمام پروگرام میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر؟ تم کسی نہج سے بھی غور کرو، بہرحال اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو۔ باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے ماحصل (سامانِ زیست) میں بھی تمہارا حصہ بقدر تمہاری محنت کے ہو سکتا ہے۔ تم پورے کے پورے کے مالک نہیں بن سکتے)۔ یہ تمام ذرائع پیداوار از خود موجود رہتے ہیں۔ یہ نہ تمہارے بناتے ہوئے ہیں نہ خریدے ہوئے۔ یہ تمہیں اس حقیقت کی یاددہانی کراتے ہیں کہ انہیں خدا نے بھوکوں کے لئے سامانِ زندگی بنایا ہے۔

یعنی اس کاروبار میں محنت تمہاری ہے اور ذرائع پیداوار ہمارے۔ لہٰذا، تم اس میں سے اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو اور "ہمارا حصہ ہمیں دے دو"۔ سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ کو کس طرح پہنچائیں؟ جواب دیا کہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ۔ یہ ان تک پہنچا دو جو اپنے لئے سامانِ پرورش حاصل کرنے کے قابل نہیں۔ ان تک پہنچ گیا تو سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا۔ اسی حقیقت کو (٦٧/٢١ ; ٦٧/٣٠ ; ٣٢ — ٢٤/٣٠) میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم کی ان تصریحات کی روشنی میں، اسلامی نظام نے عملی قدم اٹھایا اور جو لوگ "بے حد و نہایت" زمین کے رقبوں کے مالک بنے بیٹھے تھے، ان کی ملکیت کی تحدید (حدبندی) کرنی شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے معیار یہی ہوگا کہ ایک شخص کے پاس اُسی قدر رقبۂ اراضی رہے جس کی پیداوار اس کی اور اس کے اہل و عیال کی پرورش کے لئے کافی ہو۔ اس طرح اس نے زمین پر ذاتی ملکیت ختم کرنے کے عملی پروگرام کی ابتداء کر دی۔ سورۃ الرعد میں ہے

رقبوں کی تحدید

کہ داعئ انقلاب حضور نبی اکرمؐ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جس انقلاب کیلئے میں نے اپنی تمام عمر صرف کر دی ہے، کیا اس کی تکمیل میری زندگی میں ہو جائے گی یا نہیں؟ اس کے جواب میں کہا کہ تم اس کی فکر نہ کرو کہ اس کی تکمیل تمہاری موجودگی میں ہو گی یا تمہاری وفات کے بعد، تم اس پیغام کو عام کرتے جاؤ۔ یہ مکمل ہو کر رہے گا۔ خواہ تمہاری زندگی میں اور خواہ اس کے بعد۔ تم دیکھتے نہیں کہ۔

ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سکیڑتے اور سمیٹتے (کم کرتے) چلے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے (کہ ان پر ان کی ملکیت ختم ہو گی) اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے فیصلے کو لوٹا نہیں سکتی۔ ہم بہت جلد حساب کرنے والے ہیں۔ (۱۳/۴۱)

سورۃ الانبیاء میں کہا ہے کہ انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو زمین، متاعِ حیات حاصل کرنے کے لئے ملی تھی۔ اس پر زمانہ گزر گیا تو انہوں نے اس پر قبضۂ مخالفانہ جما لیا۔ اب ہم آہستہ آہستہ اسے ان کے ہاتھوں سے نکال رہے ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کی تکمیل ہو کر رہے گی۔ یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکیں گے۔ (۲۱/۴۴)

یوں اس دوسری منزل میں اس نظام کے عملاً قیام کی ابتدا کر دی۔

تیسری منزل

تکمیلِ کار

اب ہم اس پروگرام کی تیسری (اور آخری) منزل پر پہنچ رہے ہیں۔ اب اسلامی مملکت وجود میں آگئی ہے۔ اور خدا نے ربوبیتِ عالمینی (یعنی تمام افراد کو سامانِ نشوونما دینے) کا جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے کی ذمہ داری اس مملکت نے اپنے سر پر لے لی ہے۔ یہی اس مملکت کے وجود کی وجہ جواز تھی۔ سورۃ الحج میں ہے۔

اسلامی مملکت کی وجہ جواز

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ ...... (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہو گا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے۔

یہ آیۂ جلیلہ اسلامی مملکت کی وجہِ جواز اور اس کی ذمہ داری کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ میں اس وقت "اقامتِ صلوٰۃ" کی تشریح میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ وہ جداگانہ موضوع ہے۔ اپنے آپ کو ایتائے زکوٰۃ تک محدود رکھنا چاہتا ہوں کہ یہی ہمارا موضوع زیرِ نظر ہے۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں "زکوٰۃ دینا"۔ یعنی قرآن نے کہا یہ ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یا ذمہ داری "زکوٰۃ دینا" ہے۔ یہ نکتہ بڑا توجہ طلب ہے۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ سے مراد لی جاتی ہے وہ رقم جو ایک مال دار، ایک خاص شرح کے مطابق، اپنی دولت سے نکالتا ہے اور حکومت کا فریضہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اس رقم کو وصول کر کے اسے متعین مصارف کے مطابق خرچ کرتی ہے۔ یعنی ہمارے مروجہ مفہوم کی رو سے، حکومت کا فریضہ لوگوں سے زکوٰۃ لینا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ "زکوٰۃ دینا" ہے۔ زکوٰۃ کا یہ مفہوم کہ وہ ایک متعینہ رقم ہے جسے مالدار (صاحبِ نصاب) اپنی دولت سے نکالتا ہے، قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ نہ ہی اس میں "زکوٰۃ کے مصارف" کا کوئی ذکر ہے۔ (جنہیں مصارفِ زکوٰۃ کہا جاتا ہے وہ صدقات کے مصارف ہیں نہ کہ زکوٰۃ کے۔ دیکھئے ۹/۶۰)۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں "نشوونما"۔ لہٰذا "ایتائے زکوٰۃ" کے معنی ہوں گے سامانِ نشوونما عطا کرنا۔ اس سے بات صاف ہو گئی۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے اور اس طرح ربوبیتِ عالمینی اور رزاقیت کی وہ ذمہ داری، جسے خدا نے اپنے اوپر لیا تھا، پوری کرے۔ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری کو کس طرح پورا کرے گی، اس کی تفصیل قرآن کریم میں بڑی شرح و بسط سے دی گئی ہے۔ اسی کا نام "قرآن کا معاشی نظام" ہے۔

خدا سے معاہدہ

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جو شخص اسلامی سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے (یعنی مسلمان ہوتا ہے) اسے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۔ (۹/۱۱۱)

یعنی اس سوسائٹی کا ممبر بننے والا، اپنا مال اور اپنی جان، خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے اور اس کے بدلے میں خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عملاً یہ معاملہ (TRANSACTION) اسلامی مملکت کے ساتھ ہوتا ہے (۹/۱۱۱)۔ اس طرح، ایک عبدِ مومن کا جان و مال، انفرادی ملکیت کے بجائے، اسلامی نظام کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اس کے عوض اُسے اِس دنیا میں بھی جنتی زندگی مل جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنت۔ جس کا وعدہ خدا نے بےشمار مقامات پہ کر رکھا ہے۔ لہٰذا اسلامی نظام میں، مال پر انفرادی ملکیت کسی فرد کی نہیں رہتی۔ وہ "خدا کا مال" ہو جاتا ہے۔ (۲۴/۳۳)۔

قرآن اسے تسلیم کرتا ہے کہ مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ مختلف بھی اور کم و بیش بھی۔

اختلافِ صلاحیت

میں اس وقت اس موضوع کی طرف نہیں جانا چاہتا کہ صلاحیتوں کا یہ فرق کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس فرق کو کس طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت میں اس امرِ واقعہ کو تسلیم کرتے ہوئے کہ مختلف افراد کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے، اس باب میں قرآنی نقطۂ نگاہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

قرآن کہتا ہے کہ صلاحیتوں کے اختلاف سے معاشرہ کے مختلف کام بآسانی سرانجام پاتے رہتے ہیں (۴۳/۳۲)۔ لیکن (وہ کہتا ہے کہ) اس اختلاف کو صرف اسی حد تک رکھو۔ اس سے معاشی ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ چنانچہ اس نے سورۃ النحل میں واضح الفاظ میں کہا کہ "اکتسابِ رزق کے سلسلہ میں مختلف افراد میں صلاحیتوں کا فرق ہوتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کا مطلب یہ نہیں کہ جو لوگ، زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ اپنی کمائی کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اسے دبا کر بیٹھ جائیں۔ انہیں چاہیئے کہ اس فاضلہ کمائی کو اپنے ان ماتحتوں کی طرف لوٹا دیں جن کے تعاون و اشتراک سے کمائی میں اتنا اضافہ ہوا ہے۔ لوگ یہ کہہ کر ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ واہ! اس سے تو اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہو جائیں گے۔ ایسا کہنے والے اس فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ انہیں جو زیادہ صلاحیت حاصل ہے وہ ان کی ذاتی پیدا کردہ ہے۔ یہ غلط ہے۔ بنیادی طور پر یہ صلاحیت ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں، خدا کی عطا کردہ نعمت ہے جو انہیں بلا مزدو معاوضہ ملی تھی (۱۶/۷۱ ؛ ۱۶/۵۳)۔

قارونیت

اس نے کہا ہے کہ قارون (جسے قرآن نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے) بھی اسی فریب میں مبتلا تھا جب اس نے کہا تھا کہ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي (۲۸/۷۸)۔ "میرا مال و دولت، میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ میں اسے دوسروں کو کیوں دے دوں؟" قرآن کہتا ہے کہ یہی ذہنیت سارے فتنہ کی جڑ اور دنیا میں فساد برپا کرنے کی موجب ہے۔ (۳۹/۴۹)۔ دوسرے مقام پر وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے سے جب کہا جاتا ہے کہ کیا تمہیں اس کا احساس اور خیال نہیں کہ تم نے ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے جہاں اس کی عطا کردہ نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ (۱۰۲/۸) تو (ہرچند اسے اس قسم کی باز پرس پر یقین نہیں ہوتا لیکن وہ خود فریبی یا فریب دہی کے لئے) کہہ دیتا ہے کہ میں اس مال و دولت میں سے جو دو چار پیسے خیر خیرات کے طور پر "خدا واسطے" دے دیتا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ اس کے عوض مجھے اس دنیا میں بھی اسی طرح خوشگواریاں حاصل ہو جائیں گی جس طرح اس دنیا میں حاصل ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسا سمجھنا کفر ہے اور اس کا نتیجہ سخت عذاب۔ (۴۱/۵۰)

قُلِ العَفْوَ

یہ سب کچھ واضح کر دینے کے بعد، قرآن کریم نے وہ فیصلہ سنا دیا جس سے یہ مسئلہ ہمیشہ

کے لئے اور قطعی طور پر طے ہوگیا۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ـــ اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ انہیں حتمی طور پر بتا دیا جائے کہ ان کی کمائی میں ان کا اپنا حق کس قدر ہے اور دوسروں کا کس قدر۔ کہا گیا کہ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹)۔ ان سے کہہ دو کہ اس میں تمہارا حق صرف اتنا ہے جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب کا سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا موقعہ آ جائے کہ دوسرے کی ضرورت تمہاری ضرورت سے زیادہ شدید ہے تو تم اپنی ضرورت پر اس کی ضرورت کو ترجیح دو۔

اس (قل العفو کے) فیصلہ نے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے طے کر کے رکھ دیا۔ اس سے کسی کے پاس فاضلہ دولت (SURPLUS - MONEY) نہ رہی۔ اور جب کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ رہی تو معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی تمام خرابیوں اور تباہیوں کا خاتمہ ہو گیا ـــ قرض خواہ اور مقروض۔ مالک مکان اور کرایہ دار۔ زمیندار اور کاشتکار۔ کارخانہ دار اور مزدور۔ غریب اور امیر کا تفاوت ختم ہوگیا ـــ اور یوں

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

زمین کا مسئلہ

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام افرادِ انسانیہ (بلکہ تمام ذی حیات) کے لئے سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ ہے (۵۵/۱۰)۔ اس لئے ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ یہ ذریعۂ رزق، تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ (۴۱/۱۰)۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے خدا کی طرف سے عطیہ ہے۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (۱۷/۲۰)۔ اور جو چیز تمام انسانوں کو بطورِ عطیہ ملی ہو، کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اس پر چہاٹک لگا کر "میری اور تیری" کی حد بندیاں قائم کرنے لگ جائے۔ جو لوگ، رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں آبِ رواں کی طرح بہتے رہنا چاہیئے تاکہ ہر ضرورت مند اپنی ضروریات بلا روک ٹوک پوری کر سکے، اپنے لئے روک لیتے ہیں، وہ دیندار ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود عملاً دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ ان کی نمازیں لوٹا کر ان کے منہ پر مار دی جاتی ہیں ـــ غور کیجئے کہ قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر فکر انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ـ کہ تو نے اس شخص کی حالت پر کبھی غور کیا ہے جو دین کی تکذیب کرتا

ہے۔ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ۔ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ۔ یہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مسکین کی روٹی کا نہ خود انتظام کرتا ہے نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ میں جو نماز پڑھ لیتا ہوں تو اس سے دین کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی فریب خوردگی ہے۔ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ۔ ایسے نمازیوں کے لئے انجام کار تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بےخبر اور اس کی غرض و غایت سے غافل رہتے ہیں۔ هُمْ یُرَآءُوْنَ۔ وہ سمجھتے یہ ہیں کہ نماز کے محسوس و مرئی ارکان کی ادائیگی کا نام صلوٰۃ ہے۔ وہ انہیں ادا کر لیتے ہیں۔ وَ یَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ۔ (۱۰۷/۱-۷) اور رزق کے آبِ رواں کو روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر یہ تکذیبِ دین نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ نے غور فرمایا کہ مارکسزم کے عبوری دور (یعنی سوشلزم) اور قرآنی نظام کے عبوری دور میں بھی کس قدر بنیادی فرق ہے۔ جب اسی عبوری دور میں افرادِ معاشرہ کے قلب و دماغ میں یہ نفسیاتی تبدیلی پختگی حاصل کر لیتی ہے تو انہیں اس نظام کی اگلی منزل میں لے جایا جاتا ہے، جسے اس پروگرام کی آخری کڑی کہنا چاہیئے۔ یعنی اس منزل میں جسے مارکسزم نے کمیونزم کہہ کر پکارا تھا اور جس کے متعلق انہوں نے سرِ بگریباں اس کا اعتراف کیا تھا کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دور کیسے آئے گا اس لئے کہ (خود ان کے اعتراف کے مطابق) یہ نظام، افرادِ معاشرہ کی دل کی رضامندی سے قائم ہو سکتا ہے اور مادی تصورِ حیات میں اس کی قطعاً صلاحیت نہیں کہ وہ دلوں میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کر سکے۔ قرآن نے کہا کہ معاشی نظام کی اس اگلی منزل کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ اس میں

(۱) تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا، اللہ کی، یعنی خدا کے قوانین کے مطابق قائم کردہ مملکت کی ذمہ داری ہوگی۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

(۲) مملکت، افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دے گی کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِیَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲)۔ ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔ دوسری طرف افرادِ معاشرہ سے بھی کہا جائے گا کہ اس جماعت میں شامل ہوتے وقت تم نے ایک معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے تم نے اپنی جان اور مال کو خدا کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اب اس معاہدہ کو مکمل طور پر پورا کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اس کے لئے عملی پروگرام یہ ہوگا کہ ہر شخص پوری پوری محنت سے کام کرے گا اور اسے اس کی ضروریات کے مطابق ملتا جائے گا۔ اس مقام پر کہا گیا کہ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹)۔ اے رسول! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اب ہمیں کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دینا ہوگا۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہو گا سب کا سب۔ اُن سے یہ کہا

گیا اور انہوں نے کہا کہ لبیک ۔ اللّٰھُمَّ لبیک ۔ ہم حاضر ہیں ، جان اور مال دونوں لے کر حاضر ہیں۔

لیجئے صاحب ! جس نظام کو مارکس ، طبقاتی کشمکش کا آخری اور کامیاب حل قرار تو دیتا تھا لیکن اسے پکارنا تھا "خواب خیال" (UTOPIA) کہہ کر ، وہ عملاً متشکل ہو گیا ۔ مارکسزم اسے "خواب وخیال" کی دنیا اس لئے قرار دیتی تھی کہ اس کے پاس وہ بنیاد نہیں تھی جس پر اس قدر عظیم عمارت استوار ہو سکے ۔ وہ صرف تشدد کے ذریعے انقلاب لانے کا طریقہ جانتی تھی ، اور اسے تسلیم بھی کرتی تھی کہ تشدد کے ذریعے ایسا نظام کبھی عمل میں نہیں لایا جا سکتا ۔ قرآن کریم نے وہ بنیاد عطا کر دی جس پر یہ عظیم انقلاب ، افرادِ معاشرہ کی دلی رضامندی سے ، بطریقِ احسن استوار ہو جائے ۔ یہ تھی وہ حقیقت جس کی طرف ، علامہ اقبالؒ نے روس کی توجہ اُس زمانے میں منعطف کرائی تھی جب وہ خود بھی سوشلزم کے نشہ میں مخمور و بدمست تھا ۔ اور باقی دنیا بھی یہ سمجھ رہی تھی کہ دنیا کا مستقبل اس کے ہاتھ میں ہے ۔ انہوں نے پہلے قرآن کا وہ معاشی نظام پیش کیا جسے مارکس ، اپنے تصور کے نظام کی آخری کڑی (یعنی کمیونزم) قرار دیتا تھا لیکن جس تک پہنچنے کا اسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا ۔ اس سلسلہ میں (جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے) انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ زمین پر ذاتی ملکیت کا تصور کفر ہے۔

باطنِ الارض للہ ظاہر است ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

انہوں نے زمیندار اور جاگیردار سے للکار کر کہہ دیا کہ

دہ خدایا ! یہ زمین تیری نہیں ، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں ، تیری نہیں ، میری نہیں

اس کے ساتھ ہی زائد از ضرورت دولت کے متعلق قرآن کا یہ فیصلہ سامنے لے آئے کہ ـــ ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ ـــ اور دین کا ماحصل یہ بتایا کہ

کس نگردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں ، این است و بس

انہوں نے روسی انقلاب میں اس کا نتائی تحریک کے آثار دیکھے جو انسان کو قرآن کے معاشی نظام کی طرف لا رہی تھی ۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

جو حرفِ قُلِ العفو میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

لیکن اس کے ساتھ ہی جب انہوں نے مارکسزم کے اس فلسفۂ حیات پر غور کیا جس میں، خدا، وحی، رسالت، فرد کی اہمیت، انسانی ذات اور حیاتِ آخرت سے انکار کیا جاتا ہے تو انہوں نے روس سے للکار کر کہہ دیا کہ تمھاری آرزوئیں لاکھ حسین سہی، اس فلسفہ کی بنیاد پر، کمیونزم کے معاشی نظام کی عمارت کبھی استوار نہیں ہو سکے گی۔ یہ عمارت، قرآن کے پیش کردہ فلسفۂ زندگی ہی پر قائم ہو سکے گی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں، مارکسزم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ — لاسلاطیں، لاکلیسا، لا الٰہ

لیکن، (انہوں نے کہا کہ) زندگی کے تعمیری مقاصد کے لئے لَا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ اِلّا کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ

درمقامِ لَا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات

لَا و اِلّا برگ و سازِ امتاں — نفی بے اثبات، مرگِ امتاں

اس کے بعد انہوں نے ملتِ روسیہ کو یہ پیغام دیا کہ :-

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی

کردہ کارِ خداونداں تمام — بگذر از لَا، جانبِ اِلّا خرام

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے — جستۂ او را اساسِ محکمے؟

یہ اساسِ محکم کہاں سے ملے گی — کہتے ہیں

داستانِ کہنہ شستی باب باب

فکر را روشن کن از امّ الکتاب (جاوید نامہ)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ اقبالؒ مارکسزم کے معاشی نظام کی تو حمایت کرتا ہے کیونکہ وہ قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے لیکن اس کے فلسفۂ حیات کا سخت مخالف ہے۔ مسلمان ہونے کی جہت سے اسے اس کا مخالف ہونا ہی

چاہیئے تھا کیونکہ یہ فلسفہ، قرآنی تصورِ حیات کی ضد ہے۔ لیکن وہ کمیونسٹوں سے کہتا ہے کہ تم اگر، اندھے تعصب کو چھوڑ کر دلیل و برہان کی رو سے سوچو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ تمہارا فلسفۂ حیات خود تمہارے نقطۂ نگاہ سے بھی بیحد ناقص ہے کیونکہ یہ اس معاشی نظام کی بنیاد نہیں بن سکتا جسے تم انسانیت کی مشکلات کا حل اور منتہائے نگاہ قرار دیتے ہو۔ اسی تجزیہ کا نتیجہ تھا کہ مارکس کے متعلق اقبالؔ کا ردِّ عمل، ملامانہ غصے اور نفرت کی بجائے، اس مومنانہ شفقت اور ہمدردی کا ہو گیا جس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ کے متعلق کہا تھا کہ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۔ (۱۸/۶) اے رسول! ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ لوگ صحیح نظریۂ حیات کو تسلیم کیوں نہیں کرتے۔ حسرت و ہمدردی کے یہی ملے جلے جذبات تھے جن کی بنا پر علامہ اقبالؔ کبھی مارکس کے متعلق کہتے تھے کہ

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل　　　یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

اور کبھی یہ کہ

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است　　　قلبِ او مومن دماغش کافر است

ارمغانِ حجاز میں، وہ ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے، مارکس کے متعلق کہلواتے ہیں۔

وہ کلیم بے تجلّی، وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

میں سمجھتا ہوں کہ اقبالؔ نے جو کچھ مارکس کی تعریف میں کہا ہے، کسی بڑے سے بڑے مارکسسٹ نے بھی شاید وہ کچھ نہ کہا ہو اور انہوں نے اس کے خلاف جو کچھ کہہ دیا ہے وہ، کسی کٹر سے کٹر "اسلام پسند" کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ مارکسزم کے معاشی نظام کی یہی وہ افادیت اور اس کے فلسفۂ حیات کا بنیادی سقم تھا، جس کی بنا پر حضرتِ علامہ نے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام اپنے خط میں وہ فقرہ لکھا تھا جو اب بطور ضرب المثل زبان زدِ خلائق ہے۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

> میں اسے تسلیم نہیں کرتا کہ روسی فطرۃً لا مذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال یہ ہے کہ روسی مرد اور عورتیں شدید مذہبی رجحانات کے حامل ہیں۔ اور روسی ذہن کی حالیہ منفی کیفیت غیر معین عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی۔ کیونکہ انسانی معاشرہ کا کوئی نظام بھی الحاد کی بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتا۔ جب روس کے حالات بہتر ہوں گے اور لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقعہ ملے گا تو وہ اپنے نظام کی بنیادیں کسی محکم اصول پر قائم کرنے

کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔ چونکہ "بالشوازم جمع خدا بڑی حد تک اسلام کے مماثل ہے" اس لئے مجھے تعجب نہ ہوگا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد، یا اسلام روس کو نگل لے یا روس اسلام کو۔

بالشوازم کے ساتھ خدا ملا لینے کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی مارکسزم کے معاشی نظام کو قرآنی فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کرنا۔ اسے اسلامی نظام کہا جائے گا۔ باقی رہا، اسلام کا روس کو نگل جانا یا روس کا اسلام کو، تو اس کا مفہوم بھی واضح ہے کہ یا روس، اپنی منفیانہ ذہنیت سے تنگ آکر، اسلام کا فلسفۂ حیات قبول کر لے گا، یا کوئی ایسا ملک جس میں قرآن کا معاشی نظام رائج ہوگا، روس کو اپنے اندر جذب کر لے گا۔

یہ ہے مارکسزم اور یہ ہے قرآن کا معاشی نظام۔ لیکن جس طرح قرآن کے معاشی نظام کو اس کے فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح مارکسزم کے حامیوں کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ سوشلزم یا کمیونزم کے معاشی نظام کو، مارکسزم کے فلسفۂ زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے نزدیک سوشلزم نام ہے اس معاشی نظام کا جو مارکسزم کے فلسفۂ زندگی کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جو ان کے نزدیک، مادی جدلیت کا فطری اور اٹل نتیجہ ہے۔

لیکن اس سے ہمارے ہاں (یعنی مسلمانانِ عالم میں)، عجیب قسم کی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں، یا پیدا کی جا رہی ہیں۔ ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ جس کے نزدیک اسلام نام ہے اس سرمایہ دارانہ نظام کا جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا، سوشلزم کے فلسفۂ زندگی کی ایک ایک شق کو سامنے لاکر، اسے اسلام کی ضد ثابت کرتا، اور اس کے ماننے والوں کو ملحد، بے دین، دہریہ، کافر، مرتد قرار دیتے چلا جاتا ہے۔ ایسا کہتے میں وہ بالکل حق بجانب ہوتا ہے۔ کوئی شخص، مارکسزم کے فلسفۂ حیات کو صحیح مان کر، مسلمان نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے بعد، وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور سوشلزم کے معاشی نظام کو اس کے فلسفہ کے کفن میں لپیٹ کر، جہنم رسید کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ نظامِ سرمایہ داری عین اسلام بن کر سامنے آجاتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ مارکسزم کے فلسفۂ حیات کی اس قدر مخالفت کرتا ہی اس لئے ہے کہ نظامِ سرمایہ داری مطابقِ اسلام ثابت ہو جائے۔ آپ دیکھیئے کہ اس فلسفہ کی مخالفت کرنے والوں کے نزدیک اسلام کا معاشی نظام کس قسم کا ہے۔ ان مخالفین میں سرِفہرست جماعتِ اسلامی کا نام آتا ہے۔ اس جماعت کے امیر سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب، اسلام کے معاشی نظام کے سلسلہ میں، اپنی کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین" میں لکھتے ہیں:-

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے جائز ذرائع سے

جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلاحد و نہایت رکھی جاسکتی ہیں۔ روپیہ پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ (پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۵۲) (پھر) جس طرح وہ (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو...... (نیز) وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت ہی حاصل نہیں ہیں۔ (صفحہ ۴۳)

قومی ملکیت یا (NATIONALISATION) کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ

اس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد ہی نہیں کر سکا۔ (صفحہ ۷)

یہ ہے وہ نظام جسے اسلامی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، اور جسے قائم رکھنے کے لئے مارکسزم کے فلسفہ کی اس قدر مخالفت کی جاتی ہے۔ جب ہمارا نوجوان طبقہ دیکھتا ہے کہ اسلام اس قسم کا نظام پیش کرتا ہے جسے اب سوشلسٹ تو ایک طرف دنیا کے سرمایہ دار بھی نیا گتے چلے جا رہے ہیں، تو وہ اس نظام کے کفن میں خود اسلام کو لپیٹ کر دریا بُرد کر دیتا ہے۔ یہ ہے وہ کشمکش جس میں اس وقت پورا عالمِ اسلام یعنی تمام مسلم اقوام بُری طرح گرفتار ہیں۔ نہ قدامت پرست مذہبی طبقہ، سوشلزم کے فلسفہ کو خلافِ اسلام قرار دینے کے بعد قرآن کا معاشی نظام پیش کرتا ہے اور نہ ہی قوم کا نوجوان طبقہ، قرآنی نظام اور ملا کے پیش کردہ اسلام میں تمیز (DISTINCTION) کی بصیرت اپنی نگاہوں میں رکھتا ہے کیونکہ ہم نے اس کی تعلیم و تربیت ہی ایسی نہیں کی جس سے اس میں اس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی۔ ہمارے ہاں اس کشمکش سے نکلنے کا ایک نیا طریق سوچا گیا ہے۔ یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم سوشلزم نہیں بلکہ **اسلامی سوشلزم** رائج کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ان حضرات نے سمجھا یہ ہے کہ سوشلزم کے ساتھ لفظ اسلام کا اضافہ کر دینے سے، یہ کشمکش دور ہو جائے گی۔ لیکن

اسلامک سوشلزم

اس سے، بجائے اس کے یہ کشمکش رفع ہو جاتی، اس میں ایک اور الجھن کا اضافہ ہو گیا۔ اس سے پہلے، قدامت پرست طبقہ کے پیش کردہ اسلامی نظامِ معیشت کا مفہوم بھی واضح تھا اور سوشلزم کا مفہوم بھی متعین۔ لیکن اس نئی اصطلاح ــــ اسلامک سوشلزم ــــ کے متعلق کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس کا بالآخر مفہوم کیا ہے۔ جب یہ اصطلاح نئی نئی سامنے آئی

تو ہم نے اس کے واضعین کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ وہ براہِ کرم اس کی وضاحت فرمادیں کہ سوشلزم اور اسلامک سوشلزم میں فرق کیا ہے۔ لیکن جہاں تک میری نگاہ یاوری کرتی ہے، ان کی طرف سے اس سوال کا کوئی متعین جواب نہیں دیا گیا۔ جو کچھ ان کی طرف سے کہا جاتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ اسلامک سوشلزم کی اصطلاح، علامہ اقبالؒ نے بھی استعمال کی تھی اور قائداعظمؒ نے بھی۔ اس لئے اگر اسے ہم نے بھی اختیار کر لیا تو کون سا جرم یا گناہ ہوگیا؟ — میں اس وقت اس اصطلاح کی تاریخی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ اگرچہ ذرا آگے چل کر میں بتاؤں گا کہ اسے پہلے پہل کس نے استعمال کیا تھا۔ میں اس مقام پر صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ علامہ اقبالؒ نے یہ اصطلاح (اسلامی سوشلزم) کہیں استعمال نہیں کی۔ انہوں نے "سوشل جسٹس" یا "سوشل ڈیماکریسی" کے الفاظ ضرور استعمال کئے ہیں لیکن سیاسیات یا معاشیات کا طالب علم اچھی طرح جانتا ہے کہ ان الفاظ اور سوشلزم میں کیا فرق ہے۔ قائداعظمؒ کی تقاریر اور بیانات میں صرف ایک جگہ یہ الفاظ ملتے ہیں اور انہی کو بہت اچھالا جاتا ہے۔ وہ تشکیل پاکستان کے بعد پہلی بار چٹاگانگ تشریف لے گئے تو وہاں کی پبلک نے انہیں (۲۶ مارچ ۱۹۴۸ء کو) ایک استقبالیہ دیا۔ اس استقبالیہ میں جو ایڈریس پیش کیا گیا اس کا متن تو کہیں نظر نہیں آتا البتہ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے جو کچھ فرمایا، وہ ان کے مجموعۂ تقاریر میں موجود ہے۔ میں یہاں ان کے اصل (انگریزی) الفاظ پیش کر دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں انہوں نے فرمایا۔

> YOU ARE ONLY VOICING MY SENTIMENTS AND THE SENTIMENTS OF MILLIONS OF MUSLIMANS WHEN YOU SAY THAT PAKISTAN SHOULED BE BASED ON SURE FOUNDATIONS OF SOCIAL JUSTICE AND ISLAMIC SOCIALISM WHICH EMPHASISES EQUALITY AND BROTHERHOOD OF MAN.
>
> آپ میرے اور لاکھوں مسلمانوں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں جب کہتے ہیں کہ پاکستان کو اس سوشل جسٹس اور اسلامک سوشلزم کی محکم بنیادوں پر استوار ہونا چاہیئے جو انسانی اخوت اور مساوات پر زور دیتی ہے۔

اس سے دو باتیں واضح ہوجاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسلامک سوشلزم کے الفاظ خود قائداعظمؒ کے وضع کردہ نہیں تھے۔ یہ الفاظ اس ایڈریس میں تھے جسے قائداعظم کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ قائداعظمؒ کے نزدیک

ان الفاظ کا مفہوم، انسانی اخوت اور مساوات سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، اصلی سوال یہ نہیں کہ ان الفاظ کو اس سے پہلے کس نے استعمال کیا تھا۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہاں ایک پارٹی، ایک خاص معاشی نظام رائج کرنا چاہتی ہے جسے وہ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح سے تعبیر کرتی ہے۔ اہلِ پاکستان کا حق ہے کہ وہ ان حضرات سے پوچھیں کہ اس نظام سے ان کی مراد کیا ہے اور وہ کس طرح سوشلزم سے مختلف ہو گا۔ سوشلزم کے ساتھ اسلامک کے لفظ کا اضافہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ ... خود ان حضرات کے نزدیک بھی سوشلزم اسلامی نظریہ یا نظام نہیں۔ جبھی تو اسے اسلامی بنانے کے لئے اس لفظ کے اضافہ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اور اسی وجہ سے ان سے یہ دریافت کرنے کی بھی ضرورت لاحق ہوئی کہ وہ بتائیں کہ سوشلزم کیا ہے اور اسلامک سوشلزم کیا، اور ان دونوں میں فرق کیا ہے۔

اس اصطلاح کا اولین استعمال

جہاں تک مجھے معلوم ہے، ان الفاظ کا سب سے پہلے استعمال، نوابزادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے کیا تھا۔ وہ جب ۱۹۵۰ء میں امریکہ گئے تو وہاں ان سے پوچھا گیا کہ نوزائیدہ مملکتِ پاکستان کا معاشی نظام کس قسم کا ہو گا؟ اہلِ امریکہ کی طرف سے اس سوال کی لِم یا ضرورت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ پاکستان کا نظام اسلامک سوشلزم پر مبنی ہو گا اور اسلامک سوشلزم وہ نظامِ حیات ہے جس کی نظیر اور کہیں نہیں مل سکتی۔ وہ اس "سیاسی زبان" (DIPLOMATIC LANGUAGE) کی آڑ میں بات بھی گول کر گئے اور اہلِ امریکہ کے دل میں ایک خلش بھی ابھار آئے۔ وہ تو وہاں سے یہ کہہ کر چلے آئے لیکن امریکن پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے امریکن سیمینار کے کچھ نمایندوں کو یہاں بھیجا جنہوں نے کراچی کی ایک تقریب میں براہِ راست دریافت کیا کہ

> ہم اسلامک سوشلزم کے متعلق بہت کچھ سنتے چلے آرہے ہیں۔ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامک سوشلزم کیا ہے اور سوشلزم کے عام تصور اور اسلامک سوشلزم میں کیا فرق ہے۔ نیز یہ کہ کیا اسلامک سوشلزم میں نجی کاروبار (PRIVATE ENTERPRISE) کی اجازت ہو گی۔

اس سوال کا جواب، پہلے مسٹر الطاف حسین (مرحوم) ایڈیٹر ڈان نے ان الفاظ میں دیا۔

> چونکہ پاکستان میں ابھی اسلامک سوشلزم کی جزئیات مرتب ہو رہی ہیں اس لئے اس موضوع پر سرِ دست تفصیلی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اسلامک سوشلزم اور عام سوشلزم میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں انفرادی کاروبار کی اجازت ہو گی لیکن اس کا منافع غیر محدود طور پر افراد کے پاس نہیں جا سکے گا۔ اس

منافع میں جمہور کا بھی حصہ ہوگا۔ پاکستان اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ سوشلزم اور نجی کاروبار میں امتزاج پیدا کر سکے۔

اس کے بعد مسٹر سرور حسن صاحب نے فرمایا کہ اسلامک سوشلزم میں انفرادی کاروبار کی اجازت ہوگی لیکن دولت کو چند افراد کے ہاتھ میں جمع نہیں ہونے دیا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پاکستان اس تصور کو حالاتِ حاضرہ کے مطابق روبہ عمل لانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ان کے بعد ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے فرمایا کہ اسلامک سوشلزم اس نظامِ زندگی کا نام ہے جس میں ہر ایک کو یکساں مواقع میسر ہوں گے۔ اس ضمن میں پاکستان نے جو قدم اٹھائے ہیں ان میں وہ شش سالہ قومی منصوبہ (PLAN) شامل ہے جس کا مقصد عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنا اور ملک کی اقتصادیات میں توازن پیدا کرنا ہے۔

امریکن یہ سن کر واپس چلے گئے کیونکہ انہیں اطمینان ہوگیا کہ اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ جس طرح ان لوگوں کا مروجہ اسلام بالکل بے خطر اور معصوم ہے اسی طرح ان کی اسلامک سوشلزم بھی بس اللہ میاں کا جی ہے۔ اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد، نہ انہوں نے اس کی مزید وضاحت کی ضرورت سمجھی نہ کسی نے اس سوال کو اٹھایا۔ البتہ اُسی سال (یعنی اگست ۱۹۵۱ء میں) پروفیسر ٹوئن بی نے اس سوال کو اٹھایا۔ انتظام یہ تھا کہ پروفیسر موصوف لندن سے ٹیلی فون پر سوال پوچھیں اور پاکستان کے نمائندہ کراچی سے اس کا اسی طرح ٹیلی فون پر جواب دیں۔ پاکستان کی نمائندگی چوہدری ظفر اللہ خان صاحب کے حصے میں آئی۔ پروفیسر صاحب نے سوال کیا:-

> آج دنیا جن لاینحل مسائل سے دوچار ہے ان میں اقتصادی مسئلہ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اقتصادی مسئلہ کی اصل و بنیاد کاشتکاروں کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ خود پاکستان کے سامنے بھی ہے اس لئے دریافت طلب امر یہ ہے کہ پاکستان اس مسئلہ کا حل کس طرح کرنا چاہتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے اس کا جواب کیا دیا گیا۔ اس کے جواب میں چوہدری صاحب نے فرمایا کہ ہم نے ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم بنائی ہے جس سے ہماری انڈسٹریز کو فائدہ پہنچے گا اور انڈسٹریز اور زراعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہم نے خود زراعت کی ترقی کے لئے بھی کچھ تجاویز سوچی ہیں۔ سندھ اور پنجاب میں ایسی قانونی اصلاحات کی ہیں جن سے مزارعین کو مزید رعایات حاصل ہوں گی۔ مشرقی پاکستان میں دوامی بندوبست کی لعنت کو دور کر دیا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد، پروفیسر ٹوئن بی نے بھی اہل برطانیہ سے کہہ دیا ہوگا کہ آپ اطمینان کی نیند سویئے اس اسلامی مملکت کے معاشی نظام سے ہمیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

بہرحال یہ تھا اسلامک سوشلزم کا وہ مفہوم جو ۱۹۵۱ء میں امریکہ اور برطانیہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ لیکن اب صورت کچھ اور ہے، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، ایک پارٹی یہاں اس نظام کو عملاً رائج کرنا چاہتی ہے، اس لئے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ قوم کو بتایا جائے کہ اس نظام کا عملی مفہوم کیا ہے۔ یہ کس طرح اسلامی ہے اور سوشلزم سے کس طرح مختلف۔

باقی رہی یہ دلیل کہ اس اصطلاح کو علامہ اقبال نے بھی استعمال کیا تھا اور قائد اعظمؒ نے بھی، اس لئے اگر اسے ہم نے بھی اختیار کرلیا تو کون سا گناہ ہو گیا، تو میں ان حضرات کی خدمت میں عرض کروں گا کہ جہاں تک عام معاملات کا تعلق ہے، اس قسم کے دلائل قابلِ قبول قرار پا سکتے ہیں، لیکن جب آپ کسی بات کو اسلام کی طرف منسوب کریں۔ یعنی اسے اسلامی کہہ کر پکاریں، تو اس کے جواب میں اس قسم کی دلیل کافی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے دلیل ایک ہی قابلِ پذیرائی قرار پا سکتی ہے، اور وہ یہ کہ اس کے متعلق خدا کی کتاب کیا کہتی ہے کہ وہی کسی نظریہ، تصور، عقیدہ، یا نظام کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کی سند اور دلیل ہے ـــ اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است ـــ دو چار نامور حضرات تو ایک طرف اگر ساری دنیا کے انسان (یا مسلمان) بھی کسی بات کو اسلامی کہہ دیں اور خدا کی کتاب اس کی تائید نہ کرے تو وہ قطعاً اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ ہم یہ سوال انہی حضرات سے نہیں کرتے، اگر آج علامہ اقبال یا قائد اعظم زندہ ہوتے اور وہ کوئی نظام رائج کرنا چاہتے جسے وہ اسلامی سوشلزم کہہ کر پکارتے، تو اول تو وہ خود ہی اس کی وضاحت فرما دیتے کہ اس سے ان کی مراد کیا ہے، اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہم ان سے بھی گزارش کرتے کہ وہ اس کی وضاحت فرما دیں ـــ معاملہ مجھ سے، زید سے یا بکر سے متعلق نہیں۔ معاملہ متعلق ہے اسلام سے۔ اس لئے یہ خود اسلام کا تقاضا ہے کہ جس بات کو اس کی طرف منسوب کیا جائے اس کی وضاحت بھی کی جائے اور ایسا کہنے کی قرآنی سند بھی پیش کی جائے۔ ہمارے ساتھ، یا بالفاظِ صحیح اسلام کے ساتھ ہزار برس سے یہی کچھ ہوتا چلا آرہا ہے۔ ہم نے سینکڑوں غیر اسلامی معتقدات، تصورات، نظریات، نظامہائے حیات، غیروں سے مستعار لئے، اور ان کے ساتھ لفظ اسلامی کا اضافہ کر کے انہیں اپنے ہاں رائج کر لیا۔ اور، یہ آہستہ آہستہ عین اسلام قرار پا گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ غیر اسلامی نظریات و نظام، زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے اور اس طرح ناکام ثابت ہو گئے تو دنیا نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام کسی زمانے میں تو کامیاب نظام ثابت ہو گیا تھا لیکن اب اس کی حیثیت ایک چلے ہوئے کارتوس سے زیادہ نہیں۔ ہمارے ہاں کا نوجوان طبقہ بھی انہی خیالات سے متاثر فلہٰذا اسلام سے متنفر اور سرکش ہو رہا ہے۔ دوسری طرف قیامت یہ کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ یہ کہنے کی جرأت کرے کہ فلاں نظریہ یا عقیدہ خلافِ اسلام ہے (کیونکہ وہ خلافِ قرآن

ہے، تو اسلام کے اجارہ دار، پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، اور اپنی مخالفت کے جواز میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اتنے اتنے بڑے ائمہ کرام اور مشائخ عظام صدیوں سے اس راستے پر گامزن چلے آرہے ہیں، اس لئے یہ خلافِ اسلام کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہی وہ خطرہ ہے جس کے پیشِ نظر میں، ان حضرات سے مطالبہ کرتا چلا آرہا ہوں کہ وہ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح اور اس نظام کی وضاحت فرما دیں۔

اس سلسلہ میں میرے پاس، اکثر تعلیم یافتہ نوجوان آتے رہتے ہیں ـــ اور جو خود نہیں آتے ان کی طرف سے اس قسم کے خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ ہمارے ہاں خدا خدا کر کے، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف ایک تحریک اُبھری ہے۔ اس کے خلاف مُلّا کی چیخ و پکار تو قابلِ فہم ہے ـــ لیکن آپ جو معاشی نظام پیش کرتے ہیں وہ مارکس کے تصور سے بھی دس قدم آگے جاتا ہے، اس لئے آپ کا طرزِ عمل ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کا اختلاف تو محض لفظی اصطلاح کا نظر آتا ہے۔ آپ اس لفظی اختلاف پر اس قدر زور کیوں دیتے ہیں؟ اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ کی مخالفت سے اس تحریک کو کچھ بھی نقصان پہنچ گیا تو سوچئے کہ اس سے نظامِ سرمایہ داری کے مؤید کس قدر خوش ہوں گے اور آپ کتنے بڑے جرم کے مرتکب!

آپ حضرات کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے قوم کے نوجوان طبقہ سے کس قدر لگاؤ ہے کہ میرے نزدیک قوم کا مستقبل انہی کی پیشانیوں میں جھلکتا ہے۔ مجھے ان کے جذبات کا بڑا احترام، اور اس بنیادی تمنا کا شدت سے احساس ہے جس کی بنا پر وہ مجھ سے گلہ کرتے ہیں۔ لیکن میں ان عزیزوں سے شفقت اور محبت کے بھرپور جذبات کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں سوشلزم کی اصطلاح ایک خاص مفہوم کی حامل قرار پا چکی ہے۔ اس لئے اسے جب بھی استعمال کیا جائے گا اس کا وہ مفہوم فوراً ذہن میں آجائے گا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ عربی زبان میں لفظ شراب کے معنی ہر پینے والی چیز (مشروب) کے ہیں۔ لیکن اردو زبان میں شراب کا لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے جب بھی کوئی شخص شراب کا لفظ زبان پر لائے گا تو اس سے ذہن فوراً اس نشہ آور شے کی طرف منتقل ہو جائے گا جسے شراب کہا جاتا ہے۔ لہٰذا، جو شخص اس سے یہ مفہوم نہیں لینا چاہتا اسے اس لفظ کو استعمال ہی نہیں کرنا چاہئے۔ اور اگر وہ اسے کسی اور معنوں میں استعمال کرتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی وضاحت کر دے۔ یا مثلاً جب آپ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی بڑا سوشل ہے تو اس کا مفہوم کچھ اور ہوتا ہے اور جب آپ کہتے ہیں کہ وہ سوشلسٹ ہے تو اس کا مفہوم کچھ اور، کیونکہ سوشلسٹ کی اصطلاح خاص مفہوم کی ہیکر بن چکی ہے۔ یہی کیفیت لفظ سوشلزم کی کی ہے۔ یہ ایک خاص مفہوم کی حامل قرار پا چکی ہے جس میں مارکس کا نظریۂ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام

دونوں شامل ہیں۔ اور چونکہ وہ نظریۂ حیات اسلام کی ضد ہے اس لئے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح جمع بین النقیضین ہوگی۔

دوسرے یہ کہ جہاں تک میرے اعتراض کا تعلق ہے، اس میں سوال لفظی نزاع کا نہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، اصل سوال کسی نظریہ یا نظام کو اسلامی قرار دینے کا ہے اور اس باب میں قرآن کے ایک طالب علم، اور قرآنی نظام کے داعی ہونے کی جہت سے، مجھ پر، خود اسلام کی طرف سے جو عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس بات کو مبہم نہ رہنے دیا جائے۔ اس کی وضاحت کر دی جائے۔ اسے آپ مخالفت نہیں کہہ سکتے۔ میں اپنے ان عزیزوں سے کہوں گا کہ بجائے اس کے کہ وہ مجھ سے تقاضا کریں کہ میں بربنائے مصلحت خاموش رہوں، وہ اس اصطلاح کے مؤیدین سے کیوں نہ کہیں کہ وہ اس کی وضاحت کر دیں تاکہ معاملہ یکسو ہو جائے۔ باقی رہا اس تحریک کو نقصان پہنچانا، سو حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کو سارا نقصان، اس اصطلاح کو واضح نہ کرنے کی وجہ سے پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے۔ ہمارا مذہب پرست طبقہ، اس ابہام سے فائدہ اٹھا کر، سوشلزم کے خدا فراموش نظریہ کی ایک ایک شق کو ان کی طرف منسوب، اور اس طرح عوام کے جذبات کو مشتعل کئے چلا جاتا ہے۔ میرا مطالبہ تو اس تحریک کو اس نقصان سے محفوظ رکھنے کے لئے مشفقانہ مشورہ اور مخلصانہ اقدام ہے۔

(۰)

آخری مرحلہ

اب ہم اپنے سفر کی آخری منزل میں پہنچ گئے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سوشلزم ایک ایسی اصطلاح ہے جو ہمارے زمانہ میں ایک خاص مفہوم کی حامل بن چکی ہے۔ اس سے مراد وہ معاشی نظام ہے جس کی عمارت مارکسزم کے فلسفۂ زندگی پر استوار ہوتی ہے۔ سوشلسٹ اس معاشی نظام کو اس کے فلسفہ سے الگ نہیں کرتے، اس لئے جب بھی یہ اصطلاح استعمال کی جائے گی، اس سے مقصود اس نظام اور فلسفہ کا امتزاج یا مرکب ہوگا۔ مارکسزم کا فلسفہ اسلام کے فلسفہ کی ضد ہے اس لئے نہ ان میں باہمی امتزاج ہو سکتا ہے نہ مفاہمت۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے

اقبالؒ علامہ اقبالؒ نے غلام السیدین صاحب کے نام اپنے مکتوب (مورخہ ۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء) میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:۔

سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون

اصطلاح میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔

باقی رہا سوشلزم کا معاشی نظام، سو وہ قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے، لیکن جس طرح سوشلزم کے معاشی نظام کو اس کے فلسفۂ زندگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح قرآن کے معاشی نظام کو اس کے فلسفۂ حیات سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ علاوہ ازیں، قرآن، پوری کی پوری انسانی زندگی کے لئے ایک جامع اور کلی نظام دیتا ہے جس کے مختلف گوشے ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ اس نظام کے کسی ایک جزو کو، اس کے باقی اجزاء سے الگ کر کے، اسے اسلامی کہہ سکیں۔ اسلامی نظام پورے کا پورا اپنایا جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد (دکن) میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ :۔

قائداعظمؒ

اشتراکیت، بالشویت، یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، درحقیقت اسلام اور اس کے نظام سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی شکلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزا کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا۔

اس لئے قرآنی نقطۂ نگاہ سے، جس طرح اسلامی جمہوریت کہنا صحیح نہیں (کہ جمہوریت کی اصطلاح ایک خاص مفہوم کی حامل ہے جو غیر اسلامی ہے۔ اس میں اقتدار کا سرچشمہ عوام کو تسلیم کیا جاتا ہے، جبکہ اسلام میں اقتدار کا سرچشمہ صرف خدا کی کتاب ہے) اسی طرح، اسلامی سوشلزم کہنا بھی درست نہیں۔ صحیح اصطلاح **قرآنی نظام** ہے جو معاشی، سیاسی، تمدنی، عمرانی، وغیرہ گوشوں کو محیط ہے۔ ان گوشوں کی وضاحت قرآن کریم کی روشنی میں کی جاسکتی ہے۔

قرآنی نظام کا تصور نہ مذہب کے مدعیوں کے ذہن میں ہے، نہ اسلامی سوشلزم کے پیش نظر۔ ان دونوں کے ذہن میں مملکت کا تصور سیکولر ہے۔ ہمارے ہاں جس شکل میں اسلام صدیوں سے چلا آرہا ہے اس میں مملکت کا تصور ہے ہی سیکولر۔ یعنی اس میں افراد معاشرہ کو عقائد اور عبادات کی آزادی ہوتی ہے اور شخصی قوانین بھی حکومت کی حدود سے باہر ہوتے ہیں۔ حکومت کا تعلق پبلک لاز سے ہوتا ہے۔

سیکولر نظام

مملکت پاکستان کا بھی ایسا ہی نقشہ، مذہب پرست طبقہ کے ذہن میں ہے۔ یہاں مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب وسنت" کے خلاف نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کتاب وسنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اس الجھن سے نکلنے کا طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے وہ ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے۔ باقی رہے ملکی قوانین، سو ان کے متعلق یا تو خاموشی

اختیار کر لی جاتی ہے، اور یا یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اکثریت کی فقہ (یعنی فقہ حنفی) کے مطابق ہوں گے۔ جو فرقے فقہ حنفی کے پابند نہیں، ان کی طرف سے اس تجویز کی سخت مخالفت ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عملاً یہاں وہی نظام رائج ہو سکے گا جس میں عقائد، عبادات، شخصی قوانین کی ہر ایک کو آزادی ہو، اور ملکی قوانین عام اصولِ جمہوریت کے مطابق، اکثریت مرتب کرے۔ اسی کو سیکولر نظامِ مملکت کہتے ہیں۔ یہی نظام اسلامی سوشلزم کے حامیوں کے ذہن میں بھی نظر آتا ہے۔ اس حد تک ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اب رہا معاشی نظام، سو مذہب پرست طبقہ کے اسلام کی رُو سے، وہ وہی فرسودہ سرمایہ دارانہ نظام ہو گا جس کی ایک جھلک آپ پہلے دیکھ چکے ہیں۔ میں تو کچھ ایسا سمجھتا ہوں کہ انسان نے سرمایہ داری جیسے جذامی نظام کو اختیار کر کے دانسانیت کے خلاف جس سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس کی سزا کی مدت ابھی ختم نہیں ہوئی۔ علامہ اقبال نے ۱۹۳۵ء میں روس سے کہا تھا کہ سرمایہ داری کو ختم کرنا چاہتے ہو تو اپنے نظام کی عمارت کو قرآن کی اساسِ محکم پر استوار کرو۔ اس نے اپنے جنون میں اس مشورہ کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا تو چار قدم چل کر رہ گیا۔ چین کا نظام، ماؤزے تنگ کی شخصیت کے سہارے کھڑا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی لڑکھڑا کر گر پڑے گا۔[1] یہ نظام اس اسلامی ملک میں استوار ہو سکتا تھا جو اسے قرآن کی بنیادوں پر قائم کرتا۔ پاکستان میں اس کا امکان تھا لیکن ہماری بدقسمتی کہ جس گوشے سے یہ آواز بلند ہوئی وہ قرآنی نظام سے آشنا نہیں تھا۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ سوشلزم کا معاشی نظام تو ایک طرف، قرآن، کمیونزم کے معاشی نظام تک لے جاتا اور اسے عملاً قائم کر کے دکھا سکتا ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس حرم کو چھوڑ کر، سوشلزم کے بت کدے میں پناہیں تلاش کرتے۔ اُس وقت وہ، اسلامی سوشلزم جیسی مبہم اور متصادم اصطلاح کے بجائے، کچھ اس قسم کا اعلان کرتے کہ

> ہم پاکستان میں اس نظامِ حیات کے قیام کے داعی ہیں جو قرآن مجید کے ابدی اور غیر متبدل اصول و اقدار کی بنیادوں پر متشکل ہوتا ہے ...... اس نظام میں نہ ذرائع پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت قرار پاتے ہیں اور نہ کوئی فردِ معاشرہ اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہتا ہے۔

یہ اعلان اسلامی بھی ہوتا اور سوشلزم، بلکہ کمیونزم کے معاشی نظام کے تقاضوں کو بھی پورا کر دیتا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ پھر ہماری مذہبی پیشوائیت کے لئے عوام کو گمراہ اور مشتعل کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہتی۔ یاد رکھیئے انسانیت کی مشکلات کا حل قرآنی نظام کے سوا کہیں نہیں مل سکے گا۔ یہی نظام وہ معاشرہ متشکل کرے گا جسے مارکس، اینگلز،

---

[1] اب وہ لڑکھڑا رہا ہے۔ (۱۹۷۸ء)

اور یقین کی چشم تصور نے جنتِ ارضی کے حسین وجمیل پیکر میں دیکھا، لیکن جسے ناممکن العمل خواب کہہ کر، پیچھے ہٹ گئے۔
یہ وہ معاشرہ ہوگا جس میں ہر فرد، انتہائی فخر ومسرت سے، سر اٹھا کر کہہ سکے گا کہ

کس درینجا سائل و محروم نیست
عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اور یہی وہ جنتِ ارضی ہے جس کے انتظار میں، مَیں نے بھی اپنی زندگی کی راتوں کو ان آرزوؤں کے سہارے گذارا ہے کہ :

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

تتمہ

میں نے یہ خطاب طلوعِ اسلام کی اس کنونیشن کے لئے لکھا تھا جو نومبر ۱۹۷۱ء میں منعقد ہونے والی تھی۔ یہ پمفلٹ کی شکل میں چھپ بھی گیا تھا لیکن جنگ سے پیدا شدہ حالات کی وجہ سے وہ کنونیشن ملتوی ہو گئی اور جب دوبارہ اپریل ۱۹۷۲ء میں منعقد ہوئی تو اس میں اس خطاب کو پیش کیا گیا۔ اس دوران میں ملک ایک قیامت خیز بحران سے دوچار ہوا اور جب یہ خطاب پیش کیا گیا تو اس وقت خود پیپلز پارٹی جو اسلامی سوشلزم کی داعی ہے، برسر اقتدار آ چکی تھی۔ اس خطاب کو پڑھتے وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیے کہ یہ نومبر ۱۹۷۱ء میں لکھا گیا تھا۔ اس پارٹی نے برسر اقتدار آنے کے بعد بھی اس کی وضاحت نہیں کی کہ "اسلامی سوشلزم" سے ان کی مراد کیا ہے۔ اس وقت تک ان کی طرف سے جو چند ایک اقدامات کئے گئے ہیں (مثلاً اراضی کی انفرادی حد ملکیت یا چند ایک صنعتوں کے انتظام کو سرکاری تحویل میں لے لینا) انہیں سوشلزم کے معاشی نظام کے مبادیات قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ گذشتہ صفحات میں جو کچھ آپ کی نظروں سے گزر چکا ہے اس میں آپ نے دیکھ لیا ہے کہ سوشلزم کا معاشی نظام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس میں ذرائع پیداوار کو حکومت کی ملکیت میں لے لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں فاضلہ دولت بھی افراد کے پاس رہ سکتی ہے (جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے) اور طبقاتی تفریق بھی نہیں مٹتی۔ (زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ طبقات میں تفاوتی فاصلے نسبتاً کم ہو جاتے ہیں)۔ اس میں اس امر کی وضاحت

بھی نہیں کی جاتی کہ محنت کا معاوضہ مقرر کرنے کا معیار کیا ہوگا۔ یعنی کس اصول اور معیار کے مطابق یہ طے کیا جائے گا کہ مزدور کو اتنے روپے یومیہ ملیں گے اور انجینئر کو اتنے؟ نہ ہی اس میں اسٹیٹ اس امر کی ذمہ داری لیتی ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کو ان کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے گی — یہ ذمہ داری کمیونزم میں لی جاسکتی ہے، اور کمیونزم کے متعلق (جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں) مارکس، لینن وغیرہ سب اعتراف کرتے ہیں کہ وہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیسے قائم ہوسکے گی۔ جس بنیاد پر وہ نظام قائم ہوسکتا ہے، وہ ان کے پاس ہے نہیں۔

قرآنِ کریم وہ بنیاد مہیا کرتا ہے جس کی رُو سے اولاً سوشلزم جیسا معاشی نظام قائم ہوسکتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ نظام بھی جو کمیونزم کے معاشی نظام کے مماثل ہی نہیں بلکہ اس سے بھی ارفع ہے۔ اس بنیاد کا نام قرآنی فلسفۂ حیات ہے جسے اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے۔ سوشلزم کی رو سے اس کا معاشی نظام تشدد کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ لیکن قرآنِ کریم اپنے نظام کو تشدد کے بغیر، قلب و نظر میں انقلاب کی رُو سے قائم کرتا ہے۔ اسی لئے نہ اسے قائم کرنے کے لئے فساد انگیزیوں اور خون ریزیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ قائم رکھنے کے لئے استبداد کی حاجت۔

مارکسزم کے فلسفہ کا عملی نتیجہ

اس سلسلہ میں، میں آپ کی توجہ ایک اور اہم نکتہ کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آجکل یہ شکایت عام ہو رہی ہے کہ ہماری نئی نسل کے دلوں سے قانون کا احترام اُٹھ گیا ہے۔ سرکشی بڑھتی چلی جارہی ہے جرائم عام ہو رہے ہیں۔ خلفشار، انتشار، فسادات ان کا عام شعارِ زندگی بن رہا ہے — اس میں شبہ نہیں کہ اس سے پہلے بھی جرائم کا ارتکاب ہوتا تھا لیکن معاشرہ میں مجرموں کا شمار مستثنیات میں ہوتا تھا۔ جرم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور خود مجرمین کو بھی اپنے کردار پر ندامت ہوتی تھی لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جرائم عام ہو رہے ہیں اور مجرمین اپنے ان کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔ یعنی ہماری اس نئی نسل کے نزدیک، ارتکابِ جرم، کوئی قابلِ مذمت یا سزاوارِ ندامت فعل نہیں رہا۔ ان کے دل سے ندامت کا احساس ہی مٹ گیا ہے — ندامت کا احساس مٹ ہی نہیں گیا، اس کی جگہ فخر کے احساس نے لے لی ہے — اور یہ کچھ، ہماری نسل ہی سے مختص نہیں۔ ساری دنیا میں یہ روش عام ہو رہی ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ اس کی بنیادی وجہ ہے مارکسزم کا **فلسفہ** جو ساری دنیا میں عام کیا جارہا ہے۔

مارکسزم کے فلسفہ کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان صاحبِ اختیار نہیں بلکہ ان حالات کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے جو تاریخ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص مجبور ہو اسے اس کے کسی عمل کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب کبھی کسی خرابی کا ذکر کیا جائے یا اس کی اصلاح کا ارادہ، تو جواب میں کہا یہ جاتا ہے کہ یہ تمام خرابیاں اس نظام کا نتیجہ ہیں جو ہم پر مسلط ہے۔ اتنا کہنے کے بعد ہر شخص اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص اپنے کسی غلط کام کے لئے اپنے آپ کو ذمہ دار ہی نہ سمجھے تو وہ اس پر نادم کیسے ہوگا اور اس کی اصلاح کس طرح کرے گا؟ شیر کبھی اس پر نادم نہیں ہوتا کہ اس نے کمزور ہرن کو پھاڑ کھایا۔ سانپ کبھی اس پر منفعل نہیں ہوگا کہ اس نے معصوم بچے کو ڈس کر ہلاک کر دیا۔ مارکسزم کے فلسفہ نے یہ بات نوجوانوں کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کہ جو خرابیاں ان سے سرزد ہوتی ہیں وہ ان کے ذمہ دار نہیں۔ ان کا ذمہ دار باطل کا اقتصادی نظام ہے۔

مارکسزم کے فلسفہ کی دوسری بنیادی شق یہ ہے کہ فرد کی کوئی حیثیت نہیں حیثیت سب کی سب سوسائٹی کی ہے۔ اسے آپ عوام کہہ لیجئے یا ہجوم۔ پارٹی کہہ لیجئے یا جماعت (MASSES) کہہ لیجئے یا (MOB)۔ یہ واضح ہے کہ جماعت ہو یا ہجوم۔ "پبلک" ہوں یا عوام۔ سب افراد ہی کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ فرد جو کچھ ہجوم کے اندر رہ کر کرتا ہے اس کا ذمہ دار اپنے آپ کو قرار نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل جس قدر فسادات برپا کئے جاتے یا درندگیاں عمل میں لائی جاتی ہیں، ہجوم بن کر لائی جاتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ اگر ایک فرد انارکلی کی کسی دوکان کا شیشہ توڑنے، اس کا سامان چرانے، یا اسے آگ لگانے کا ارادہ کرے تو وہ یہ کچھ چوری چھپے کرے گا۔ دن دہاڑے۔ بھرے بازار میں ایسا کرنے کی جرأت کبھی نہیں کرے گا۔ لیکن اگر یہی فرد، ہجوم کا جزو بن کر یہی کچھ کرنا چاہے، تو وہ نعرے بلند کرتا ہوا آئے گا اور سینہ تان کر ان تباہ کاریوں کا مرتکب ہوگا۔ اور نہایت فخر سے دندناتا ہوا چلا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ ان افعال کا ذمہ دار اپنے آپ کو نہیں بلکہ ہجوم کو قرار دیگا۔

یہ ہے وہ بنیادی سبب جس کی وجہ سے ہماری نئی نسل کے دل میں نہ قانون کا احترام باقی رہا ہے، نہ ارتکابِ جرم پر احساسِ ندامت و انفعال۔ جب ان کی نیت سرکشی اور فساد انگیزی کی ہوتی ہے تو یہ سب سے پہلے ایک یونین بنا لیتے ہیں۔ اور پھر وہ سب کچھ کرتے ہیں جو یہ انفرادی طور پر کبھی نہیں کرتے۔ سب کچھ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیتے ہیں کہ یہ فیصلہ یونین کا تھا۔ اور جو کچھ کیا گیا ہے اس کی ذمہ دار یونین ہے ہم نہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ مارکسزم کا فلسفہ دنیا میں کس قدر عالمگیر تباہیاں لا رہا ہے، اور ہماری نوجوان نسل کے دل سے

شعوری یا غیر شعوری طور پر، کس طرح جرم کا احساس ختم ہو گیا ہے۔ قرآن کریم اس فلسفہ کو ابلیسیت کہہ کر پکارتا ہے۔ اس نے، پہلے ہی پارہ میں قصہ آدم و ابلیس کو جو تمثیلی انداز میں بیان کیا تو اس کا بنیادی مقصد یہی تھا۔ اس نے کہا کہ آدم سے بھی معصیت (قانون سے سرکشی کا ارتکاب) ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ جب آدم سے پوچھا گیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا، تو اس نے ندامت سے سر جھکا لیا اور کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ تم نے اپنی ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی اصلاح کر سکتے ہو۔ لہٰذا تمہارے لئے باز آفرینی کا دروازہ کھلا ہے۔ اس کے برعکس جب ابلیس سے یہی سوال کیا گیا تو اس نے نہایت ڈھٹائی سے کہا کہ میں نے کب ایسا کیا ہے۔ میں تو مجبور محض ہوں۔ جواب ملا کہ تم جب اپنی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتے تو تمہارے لئے اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔ یہ ہے قصہ ابلیس و آدم کا نقطۂ ماسکہ۔ اور یہی ہے مارکسزم کے فلسفۂ حیات اور قرآن کے نظریۂ زندگی کا فرق۔ قرآن، ہر فرد کو اس کے عمل و ارادہ کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ اور اس کی انفرادیت کو کبھی گم نہیں ہونے دیتا، بلکہ اسے مستحکم سے مستحکم تر کئے چلا جاتا ہے۔

لیکن زمانے کے تقاضے اب مار مار کر مارکسسٹوں کو بھی قرآنی فلسفۂ حیات کی طرف لا رہے ہیں، اور وہ فرد کی انفرادیت تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ پولینڈ کے فلاسفر (LEOPOLD KOLAKOWSKI) کا، مارکسی دنیا میں بڑا بلند مقام ہے۔ لیکن اس نے مارکسزم کے فلسفۂ جبر اور تاریخی وجوب (HISTORICAL NECCESSITY) کے خلاف جہاد شروع کر رکھا ہے جس کی پاداش میں اسے ۱۹۶۶ء میں یونائیٹڈ پولش لیبر پارٹی سے نکال دیا گیا۔ اس کے فلسفہ کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ جب تک ہم فرد کی انفرادیت کو تسلیم نہیں کرتے، اور اسے اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار نہیں دیتے، خود مارکسزم کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ اختیار و انتخاب، جوہر انسانیت ہے۔

> اور اس کی عملی نمود اس وقت ہوتی ہے جب ایک فرد اپنے لئے زندگی کی کسی قدر کا انتخاب کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے اخلاقی عمل کا اپنے آپ کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ یاد رکھیے۔ ہر فرد کا عمل اس کے اختیارِ مطلق کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔

مارکس نے مذہب کو عوام کی افیون قرار دیا تھا۔ کولاکوسکی کا کہنا ہے کہ عوام کی افیون خود مارکسزم کا فلسفۂ جبر ہے جو فرد کو اس کے اعمال کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا۔ اس نے اپنے ایک مقالہ میں جس کا عنوان ہے — (THE GREAT DEMIURGE) "فرد کو 'خلاقِ اعلیٰ' قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:-

اگر ایک شخص یہ نظری عقیدہ رکھتا ہے کہ جرم کا وجود، حالات کی رُو سے ناگزیر ہے، تو بھی اسے جرم کی مذمت کی اخلاقی ذمہ داری سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا...... ہم اس قسم کے ضابطہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی آخری کتاب، ارمغانِ حجاز' میں " ابلیس کی مجلسِ شوریٰ "کے عنوان سے ایک ایسی نظم لکھی ہے جس میں ان کا سارا پیغام سمٹ کر آگیا ہے۔ کولاکوسکی نے ۱۹۶۳ء میں ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا۔" ابلیس نے ۲۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو وارسا کی مادراء الطبیعیاتی پریس کانفرنس سے جو خطاب کیا اس کی شارٹ ہینڈ رپورٹ" ـــ اس میں اس نے مارکسی فلسفۂ جبر کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے، خود ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے کہ

اگر شر کا مقابلہ پوری توانائی سے کیا جائے تو وہ کبھی ظہور ہی میں نہیں آسکتا۔[1]

یہ ہیں وہ خیالات جو اب مارکسزم کے فلسفہ کے خلاف خود مارکسسٹی دنیا میں ابھر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ جس طرح مغرب کی سائنسی ایجادات ہمارے ہاں اس وقت پہنچتی ہیں جب وہ وہاں پرانی ہو چکی ہیں، اسی طرح مغربی تصورات و نظریات کی بھی یہی حالت ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ہماری اسی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ـــ تازہ اَش جز کہنۂ افرنگ نیست ـــ ہمارے ہاں مغربی نظریات اُس وقت فروغ پاتے ہیں جب وہ مغرب میں افسردہ ہو چکے ہیں۔ مارکسزم کا فلسفۂ حیات، خود مارکسسٹوں کے ہاں مسترد کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اسے ایک ابدی حقیقت کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا ہے۔

پھر ہمارے ہاں ایک اور مشکل بھی ہے۔ ہم اس "برزخی" عالم میں ہیں جہاں ہماری حالت یہ ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

نہ ہم خالصتہً اسلام اختیار کرتے ہیں، نہ خالصتہً کفر۔ ہم ان دونوں کا ملغوبہ تیار کرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ غالبؔ ہی کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے کہ ـــ بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں ـــ اسی مارکسزم کے سلسلہ میں دیکھئے ـــ مارکسزم نے اگر فرد کو سوسائٹی کے اندر مدغم کر کے اس کی انفرادی ذمہ داری کو ختم کیا تو اس کے ساتھ ہی اس کے انفرادی حقوق کا تصور بھی ختم کر دیا۔ لیکن ہمارے ہاں، فرد کو اس کی ذمہ داریوں سے سے مبّرا قرار دیا لیکن اس کے انفرادی

---

[1] کولاکوسکی کے یہ تمام اقتباسات (JOHN BOWKER) کی کتاب (PROBLEMS OF SUFFERING IN RELIGIONS OF THE WORLD) سے لئے گئے ہیں، جسے مجھے پروف فارم میں دیکھنے کا اتفاق ایک دوست کی وساطت سے ہوا۔

حقوق کے دعوے کو بدستور تسلیم کئے رکھا نتیجہ اس کا یہ کہ یہاں جب کسی فرد پر کوئی اخلاقی پابندی عائد کی جاتی ہے تو یہ دہائی مچ جاتی ہے کہ یہ اس کی آزادی سلب کو لینے کے مرادف ہے۔ یہ بنیادی حقوق کی پامالی ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ اس کے سر پر ایک ذمہ داری بھی عائد ہوتی تھی جسے اس نے پورا نہیں کیا۔ یعنی ہمارے ہاں اب حقوق ہی حقوق ہیں، ذمہ داری کوئی نہیں، حالانکہ ہر حق (RIGHT) ایک ذمہ داری (RESPONSIBILITY) کا پیدا کردہ ہوتا ہے جب معاشرہ میں، ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بغیر حقوق کے تقاضے بلند ہونے شروع ہو جائیں تو اس کا نتیجہ انتشار (CHAOS) کے سوا کچھ نہیں ہوتا جو ہمارے ہاں اس وقت عام ہو رہا ہے۔ قرآنِ کریم فرد کے حقوق کا سب سے بڑا محافظ ہے لیکن وہ اس کے ساتھ ہی اس سے ذمہ داریوں کی ادائیگی کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ آپ قرآنِ کریم کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے۔ اس میں ہر مقام پر لکھا ملے گا کہ "اگر یہ کرو گے تو یہ ملے گا"۔ یعنی اگر فلاں ذمہ داری پوری کرو گے تو تمہارا فلاں حق ثابت ہوگا۔ (مثلاً) معاشرہ میں سب سے بنیادی اور اہم حق، امن و سلامتی اور اطمینان و سکون کا مہیّا کیا جانا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ ان سے کہہ دو کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸)۔ "جو کوئی ہماری ہدایات کا اتباع کرے گا تو انہیں نہ کسی قسم کا خوف و خطر ہوگا نہ حزن و ملال"۔ اسی طرح فارغ البالی اور مرفہ الحالی بھی افرادِ معاشرہ کا بنیادی حق ہے۔ اس ضمن میں بھی کہا گیا کہ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۷/۹۶)۔ "اگر یہ لوگ صحیح روشِ زندگی کی صداقت پر یقین رکھتے اور اس کی خلاف ورزی سے محتاط رہتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے"۔ آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم کس طرح ہر حق کو ایک ذمہ داری سے مشروط قرار دیتا ہے۔ مشروط کیا، وہ حق کو ذمہ داری کی ادائیگی کا فطری نتیجہ بتاتا ہے۔ اسی کو قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں اور اس کی صداقت کو تسلیم کر لینے کا نام ایمان بالآخرۃ ہے۔ لہٰذا، جب تک ہم فرد کی انفرادیت کو تسلیم کر کے اس کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین قرآنِ کریم سے نہیں کرتے، نہ ہم معاشرہ کے موجودہ انتشار سے نکل سکتے ہیں اور نہ ہی نئی نسل کے دل میں قانون کے احترام کا جذبہ بیدار کر سکتے۔ یہ مقصد صحیح تعلیم و تربیت سے حاصل ہوگا۔ نہ سوشلزم کے فلسفۂ حیات سے، اور نہ ہی اس کے ساتھ اسلامی کا لیبل چسپاں کر دینے سے۔

میں نے ۱۹۶۹ء میں اسی موضوع پر ایک درس دیا تو اس کے بعد مجھ سے ایک اہم سوال پوچھا گیا۔ چونکہ زیرِ نظر موضوع سے اس کا گہرا تعلق ہے اس لئے اس سوال اور اس کے جواب کو درج ذیل کیا جاتا ہے۔

طریقِ کار؟

اس خطاب کے بعد سوال یہ سامنے لایا گیا کہ قرآن کے معاشی نظام کو عملاً متشکل اور نافذ کرنے کے لئے طریقِ کار (METHODOLOGY) کیا ہوگا۔ اس کے جواب میں پرویز صاحب نے کہا۔

جو جماعت کسی مستقل قدر یا غیر متبدل اصول کی پابند نہیں ہوتی، وہ اپنے نظام کو نافذ کرنے کے لئے جو طریق بھی چاہے اختیار کر سکتی ہے۔ ان کے نزدیک طریقِ کار کے جائز یا ناجائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو طریق بھی حصولِ مقصد کے لئے ممد و معاون ہو، وہ ان کے ہاں جائز قرار پاتا ہے۔ ان کے نزدیک طریقِ کار کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار یہ ہوتا ہے کہ (MEANS ARE JUSTIFIED BY THE ENDS ACHIEVED.)۔ دورِ حاضر میں اس کا زندہ ثبوت مارکسزم اور لینن ازم ہے، جن کے نزدیک، لوٹ مار، توڑ پھوڑ، قتل و غارت گری، دنگا فساد، اور اس کے ساتھ جھوٹ، مکاری، عیاری، فریب، سازش وغیرہ نہ صرف جائز بلکہ نہایت مستحسن طریقِ کار ہیں۔ مارکسزم کا یہ فلسفہ اس حد تک اثر انگیز ہو چکا ہے کہ جو جماعتیں اس کی مخالفت کے لئے سامنے آتی ہیں، طریقِ کار وہ بھی اسی قسم کا اختیار کرتی ہیں۔

ان کے برعکس جو جماعت مستقل اقدارِ حیات اور غیر متبدل اصولوں پر ایمان رکھتی ہے، اس کے نزدیک ذرائع اور مقصد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد بھی حق پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے ذرائع بھی وہی اختیار و استعمال کر سکتی ہے جو مبنی بر حق ہو۔ وہ اس حقیقت پر یقین رکھتی ہے کہ غلط راستہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ لہٰذا جو جماعت قرآن کا معاشی نظام نافذ کرنا چاہے وہ کبھی کوئی ایسا طریقہ

اختیار نہیں کرسکتی جو قرآن کی رُو سے باطل ہو۔ لوٹ مار۔ قتل و غارت گری۔ خلفشار۔ انتشار وغیرہ قرآن کے نزدیک سخت مذموم اور جھوٹ۔ فریب۔ مکاری۔ عیاری بدترین جرائم ہیں۔ وہ اس طریقِ کار کو فساد قرار دیتا ہے۔ اور مفسدین اس کے نزدیک بدترین خلائق ہیں۔ اس کا طریق "انقلاب" ہے، فساد نہیں۔ اور ان دونوں میں جو بنیادی فرق ہے' اس کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے، بالخصوص اس لئے کہ آجکل بدقسمتی سے فساد ہی کو انقلاب کہہ کر پکارا جا رہا ہے، حالانکہ جسے "انقلاب زندہ باد" کہا جاتا ہے، اس سے مفہوم درحقیقت "فساد زندہ باد" ہوتا ہے — آج اس نے فساد برپا کر دیا، کل کسی اور نے کر دیا۔

قرآنِ کریم کے نزدیک، خارجی دنیا (یا نظام) میں کوئی صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس تبدیلی کی متمنی جماعت کے افراد کے قلب و نگاہ میں، قرآنی اقدار کے مطابق تبدیلی پیدا نہ ہو۔ وہ قلب و نگاہ کی اس داخلی تبدیلی کو انقلاب قرار دیتا ہے۔ یعنی انقلاب، قلب کی گہرائیوں سے ابھرنے والے مقاصد کے مظاہرہ کا نام ہے نہ کہ محض خارج میں فساد برپا کر دینے کا نام۔ قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی کا مظاہرہ، انسان کے اخلاق و کردار سے ہوتا ہے۔ اسے وہ "اعمالِ صالحہ" کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی قلب و نگاہ کی بنیادی تبدیلی کا نام ایمان ہے اور اس ایمان کے عملی مظاہرہ کا نام اعمالِ صالحہ — اور ان دونوں کے حاملین کا نام — جماعتِ مومنین — یہ ہے وہ جماعت جو قرآن کے معاشی نظام (بلکہ ہر قسم کے قرآنی نظام) کی داعی بن کر اٹھتی ہے اور انہی کے ہاتھوں سے یہ انقلاب ہویدا ہوتا ہے۔ قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی کا کام ایک دن کی بات نہیں۔ یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب بھی ہوتا ہے اور کافی وقت کا متقاضی بھی۔ اس مرحلہ میں صبر طلبی ہی دشواری نہیں ہوتی۔ اس سے آگے بڑھ کر ایک دشواری اور بھی سامنے آتی ہے جو بڑی الجھنیں پیدا کرنے کا موجب بن جاتی ہے۔ وہ دشواری یہ ہے کہ قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنے کا یہ مرحلہ بڑا غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ اس میں بظاہر نہ کوئی حرکت نظر آتی ہے نہ حرارت۔ اس لئے سطح بین نگاہیں اسے "بے عملی" سے تعبیر کر دیتی ہیں۔ اور ان کے اس طعن سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود اس جماعت کے زیرِ تربیت افراد، اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ دنیا بہت آگے نکلے جا رہی ہے اور ہم یونہی اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن قرآنی جماعت نہ اغیار کے اس قسم کے طعنوں سے متاثر ہوتی ہے نہ خود اپنے اندر کے افراد سے مصالحت کی خاطر اپنا راستہ بدلنے کے لئے تیار — خود نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین کی مکی زندگی کی تیرہ سالہ طول طویل (اور بظاہر بے حس و حرکت) مدت اسی صبر طلبی عشق

کی مظہر تھی۔ جب اس جماعت کے افراد میں قلب و نگاہ کی ایسی تبدیلی اور سیرت و کردار میں ایسی پختگی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس نظام کے قیام کے لئے عملی قدم اٹھاتی ہے اور اس میں کوئی حربہ ایسا استعمال نہیں کرتی جسے قرآن فساد قرار دیتا ہو۔

میں قرآن کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میرا فریضۂ زندگی ہے۔ میں جہاں قرآن کے تجویز فرمودہ نظامِ حیات کی تبلیغ کرتا ہوں، اس کے ساتھ ہی اس کے بتائے ہوئے طریقِ کار پر بھی زور دیتے چلا آرہا ہوں۔ یہی میری دعوت ہے جس پر میں خود بھی کاربند ہوں اور دوسروں کو بھی اس پر کاربند رہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ اور چونکہ مجھے قرآن کی اس راہنمائی پر یقینِ محکم ہے اس لئے میں کسی خارجی اثر کے ماتحت اس سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر نہیں ہٹنا چاہتا۔

جہاں مارکس ناکام رہ گیا

(اُس سے آگے)

[میں نے یہ خطاب، طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ ۱۹۷۵ء میں پیش کیا تھا۔ اس میں کچھ باتیں تو ایسی ملیں گی جو پہلے بھی سامنے آچکی ہیں لیکن اس میں جس انداز سے نظامِ اشتراکیت اور قرآنی نظام کا تقابل کیا گیا ہے اس سے یہ سارا مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔]

انسان کا طربیہ یہ ہے کہ کرۂ ارض پر اس کی نمود سے پہلے وہ تمام سامان موجود تھا جس پر اس کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ ہوا، پانی، روشنی، حرارت اور زمین میں غذا کے ذخائر ـــ اور اس کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے باوجود کرۂ ارض پر انسانوں کی نصف سے زیادہ آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھوک کی یہ شدت اور کثرت ہمارے زمانے میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، لیکن مسئلہ یہ آج کا نہیں، قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔

ہم تاریخِ انسانی کے ابتدائی ادوار میں دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی آبادی بالعموم زمین کے اُن خطوں میں ہوتی تھی جہاں کی آب و ہوا گرم اور پانی کی افراط ہو۔ ان طبیعی اسباب کی وجہ سے غذائی پیداوار بکثرت ہو جاتی تھی اور چونکہ آبادی ابھی بہت کم تھی اس لئے اس زمانے میں روٹی کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہی وہ دور تھا جسے قرآنِ کریم نے قصۂ آدم

کے تمثیلی انداز میں جنتِ ارضی کی زندگی کہہ کر پکارا ہے۔ جس میں کیفیت یہ تھی کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵)
جہاں کسی کو بھوک لگتی، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا۔ اُس وقت "میری" اور "تیری" کی تمیز ابھری ہی نہیں تھی۔ ہم تاریخ میں ذرا آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ زور آور انسانوں نے کمزور انسانوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے جو ان کے لئے خوراک پیدا اور جمع کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ انہیں اُس زمانے میں غلام اور دورِ حاضر میں محنت کش یا مزدور کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نوعِ انسان کی تاریخ میں وہ دن سیاہ ترین تھا جب ایک غلام نے اپنے آقا کے لئے اس سے زیادہ پیدا کر دیا جتنا اس پر خرچ آتا تھا۔ اس دن نظامِ سرمایہ داری کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔ اس کے بعد یہ روش اس طرح پھیلی اور مستحکم ہوتی کہ آقا اور غلام کا یہ فرق، فطرت کا تقاضا اور خدا کا منشا تسلیم کیا جانے لگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف منظّمِ فکرِ انسانی کا ابوالآباء، افلاطون (PLATO) انسانوں کی جو طبیعی تقسیم کرتا ہے تو اس میں ایک طبقہ غلاموں کا قرار دیتا ہے۔ یہی نظریہ ارسطو کا بھی تھا۔ دوسری طرف ہم قدیم ہندو مذہب کو دیکھتے ہیں تو اس میں برہما کے پیدا کردہ ورنوں (ذاتوں) کی تقسیم میں شودر (محنت کش) سب سے نچلے درجے میں رکھے جاتے ہیں۔ اور اسے دھرم کا تقاضا اور خدا کا فیصلہ قرار دیا جاتا ہے۔ ابتدا میں جب ہر فرد، یا خاندان، اپنے لئے آپ خوراک پیدا کرتا تھا تو وہ اتنا ہی رقبہ زمین اپنی تحویل میں رکھتا تھا۔ جتنے پر وہ محنت کر سکے، یا جو اس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہو۔ بعد میں جب اس نے غلاموں (محنت کشوں) سے کام لینا شروع کیا تو ان رقبوں کو بھی وسیع کرنا شروع کر دیا۔ اس سے وسائلِ رزق پر ذاتی ملکیت نے جنم لیا اور میری اور تیری کی تفریق (تمیز) وجود میں آ گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جن لوگوں نے زمین کے وسیع رقبوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا، ان کے پاس ان کی ضروریات سے زائد سامانِ زیست جمع ہو گیا اور اسی نسبت سے وہ کمزور انسان ان کے تابع فرمان ہوتے گئے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ان کے محتاج تھے۔ اسی سے رقابتوں، کشمکشوں، آویزشوں فسادانگیزیوں اور خونریزیوں کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا جسے قرآنِ کریم نے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (۲/۳۶) کا لازمی نتیجہ قرار دیا ہے۔ انسانوں کے یہ باہمی تضادات افراد سے آگے بڑھ کر خاندانوں، خاندانوں سے قبیلوں، قبیلوں سے نسلوں اور نسلوں سے قوموں تک پہنچے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں آج انسان اس حالت میں کھڑا ہے کہ اس کا جسم لہو لہان اور اس کی ہڈیاں چُور چُور ہو چکی ہیں۔ اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ـــ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ انسانی فکر نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی جس قدر کوشش کی، یہ اور الجھتا گیا۔ اس کی اس وقت تک کی کاوشوں کے سلسلہ دراز کی آخری کڑی وہ نظریہ، تحریک یا نظام ہے جسے کمیونزم یا سوشلزم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ بیشتر اس کے کہ ہم اس

نظریہ یا نظام پر تفصیلی گفتگو کریں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم مغربی مفکرین کی ان کوششوں پر طائرانہ سی نگاہ ڈال لی جائے جو اس باب میں اس سے پہلے کی گئیں تاکہ اس پس منظر میں، یہ نظریہ زیادہ اجاگر ہو کر سامنے آسکے۔

مغربی مفکرین کی کوشش

ہم نے بات شروع کی تھی یونانی مفکر، افلاطون سے۔ اس نے کہا کہ اس فساد کا سرچشمہ زمین کی غلط تقسیم ہے۔ اس کا حل اس نے یہ بتایا کہ ہر فرد کو زمین کا ایک ٹکڑا دے دیا جائے جو مستقل طور پر اس کی تحویل میں رہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے صرف ایک وارث کی طرف منتقل ہو۔ اس زمین کی پیداوار اس فرد کے خاندان کی مشترکہ ضروریات پوری کرے۔ بالفاظِ دیگر اس نے اشتراک (کمیونزم) کا تصور تو دیا، لیکن جہاں تک زمین کا تعلق تھا اسے محدود رکھا خاندان تک۔ لیکن اس نے کاشتکاروں کے ان خاندانوں کو امورِ مملکت میں دخل انداز نہیں ہونے دیا۔ حکومت کو اس نے مفکرین اور "شمشیر زنوں" تک محدود رکھا۔

افلاطون کے شاگرد، ارسطو نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور کہا کہ مشترکہ ملکیت میں کم از کم چیزیں رکھی جائیں۔ اور زیادہ سے زیادہ چیزیں افراد کی ذاتی ملکیت میں دیدی جائیں۔

لیکن افلاطون کا نظریہ تھا یا ارسطو کا، یہ دونوں ناکام رہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں، غلاموں (محنت کشوں) کے وجود کو فطرت کا منشاء اور انسان کی تمدنی زندگی کا لازمی تقاضا قرار دیتے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انسان بدستور دو گروہوں میں بٹے رہیں ـــ ایک طبقہ پیدا کرنے والوں کا، اور دوسرا ان کی کمائی پر زندگی بسر کرنے والوں کا، جنہیں قرآنِ کریم "مترفین" کہہ کر پکارتا اور انسانیت کا بدترین دشمن قرار دیتا ہے۔

اب ہمیں آگے بڑھ کر سولہویں صدی کے یورپ میں پہنچ جانا چاہیئے۔ جب اس مسئلہ (یعنی معاشیات) نے ایک الگ اور مستقل شعبۂ علم کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس وقت وہاں وہ معاشی نظام رائج تھا جسے عام طور پر مرکنٹلزم (MERCANTALISM) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ نظام وہاں اٹھارویں صدی تک رائج رہا۔ اسے بہ حیثیت ایک معاشی نظریہ کے سب سے پہلے اٹلی کے ایک صاحبِ قلم (SERRA) نے ۱۶۰۳ء میں پیش کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نوکھر کی تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے بعد یورپ میں (HUMANISM) کا دور دورہ تھا۔ اس فلسفہ کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ذاتی مفاد (SELF - INTEREST) کے سوا کوئی ایسا جذبہ نہیں جو انسان کو کسی کام کے لئے آمادہ کر دے۔ لہٰذا مفادِ خویش ہی وہ اصول ہے جو کاروبارِ حیات میں حرکت پیدا کرتا اور اسے رہنمائی دیتا ہے۔

اور مفادِ خویش کا تحفظ ذاتی ملکیت کے سوا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس فلسفہ کا ایک نامور مؤید ہابز تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ انسان کو حیوانات پر شرف اور امتیاز ہی اس لئے حاصل ہے کہ اس کے ہاں ذاتی ملکیت کا تصور ہے۔ مرکنٹلزم کے معاشی نظام کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوئی۔ لیکن انہوں نے ذاتی ملکیت کے تصور کو آگے بڑھا کر قومی ملکیت تک پہنچا دیا اور کہا کہ مملکت کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسری قوموں سے اس طرح تجارت کرے کہ ان کی دولت کھنچ کر اپنی قوم کی ملکیت میں آجائے۔ آپ نے دیکھا کہ اس معاشی نظام کی بنیاد خالصتاً مادیت یعنی مفادِ خویش پر ہے، خواہ وہ مفاد ایک فرد کا ہو یا ایک قوم کا۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ دوسروں پر کیا گزرتی ہے۔ اس کا نام (CAPITALISM) یا نظامِ سرمایہ داری ہے۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں اس نظریہ کے خلاف شدید ردِ عمل ہوا اور فرانس کے مفکرین کے ایک گروہ نے ایک اور نظام کا نظریہ پیش کیا جو (PHYSIOCRACY) کی اصطلاح سے متعارف ہوا۔ اس کے معنی ہیں "فطرت کی حکمرانی"۔ بنیادی طور پر اس کا مفہوم یہ تھا کہ نظام وہی صحیح قرار پا سکتا ہے جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، فطرت کا عطا کردہ ہو۔ لیکن چونکہ نہ فطرت کا کوئی متعین مفہوم ان کے سامنے تھا، نہ نظامِ فطرت کا، اس لئے ان کا اولین مطالبہ یہ تھا کہ فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہونی چاہیئے اور حکومت کو اس کے معاملات میں کم از کم دخیل۔ اسی نظریہ کو عدم مداخلت یا (LAISSEZ - FAIRE) کہا جاتا ہے — جہاں تک اس کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ ان کے ایک مشہور رہنما (TURGOT) کا وضع کردہ ہے۔ اس نظریہ کی رو سے معاشرہ دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے — ایک طبقہ پیدا کرنے والوں کا اور دوسرا طبقہ "بانجھ"۔ اس کے نزدیک پیدا کرنے والا طبقہ صرف کاشتکاروں کا ہے۔ باقی لوگوں کی زیست کا دار و مدار اس پیداوار پر ہے جو کاشتکار کی ضرورت سے زائد ہو۔ چنانچہ ان کے ہاں کا مشہور مقولہ ہے "غریب کاشتکار، غریب مملکت، غریب بادشاہ"

ان کے نزدیک، معیشت کا بہترین نظام، مبادلۂ اشیاء (BARTER SYSTEM) ہے۔ ایک شخص کے پاس گیہوں ہے لیکن اسے ضرورت تیل کی ہے۔ دوسرے کے پاس تیل ہے اور اسے گیہوں کی ضرورت ہے۔ لہذا وہ گیہوں اور تیل کا باہمی تبادلہ کر لیتے ہیں، اور اس طرح دونوں کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس اتنا تیل فالتو ہے جتنے کی کسی کو ضرورت نہیں، تو اس کے لئے اس فاضلہ جنس (تیل) کا سنبھال کر رکھنا ایک مسئلہ ہو جائے گا۔ ان کی تحقیق کی رو سے، اس مسئلہ کے حل کے لئے چاندی سونے کے ٹکڑوں کو استعمال میں لایا گیا۔ اس طرح "سکہ" کا وجود عمل میں آیا۔ شروع شروع میں لوگ، ایکدوسرے

سے مانگ کر سکوں کو استعمال کر لیتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ سکّہ کے مالکوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ہم اپنے سکے دوسروں کے استعمال کے لئے مفت کیوں دے دیں۔ چنانچہ انہوں نے ان کے استعمال (USE) کا معاوضہ لینا شروع کر دیا۔ اس کا نام سود یا (USURY) تھا۔ تر گوٹ کے نزدیک بانجھ طبقوں میں بدترین طبقہ وہ تھا جو پیدا کچھ نہیں کرتا تھا اور دھات کے چند ٹکڑوں کے استعمال کے معاوضہ پر زندگی گزارتا تھا۔ ان لوگوں کا نظریہ یہ تھا کہ پیداوار کے حقیقی سرچشمہ، یعنی کاشتکار کو معاشرہ میں بلند ترین مقام ملنا چاہیئے۔ حتیٰ کہ حکّام سے بھی برتر۔ وہ ان (حکام) کا شمار بھی "بانجھ" طبقہ میں کرتا تھا۔

ممکن ہے (PHYSIOCRATS) کا نظریہ زیادہ پھیل جاتا لیکن عین اسی زمانے میں سکاٹ لینڈ میں ایک مفکر پیدا ہوا جو دیگر تمام مفکرین پر چھا گیا۔ اس کا نام ہے (ADAM SMITH) جس کی کتاب (THE WEALTH OF NATIONS) نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ یہ

نظامِ سرمایہ داری

کتاب درحقیقت نظامِ سرمایہ داری کی بائبل ہے۔ اسمتھ کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ دولت کا سرچشمہ زمین نہیں، صنعت کاری (انڈسٹری) ہے۔ اس سے مغرب کے نظامِ کارخانہ داری کی بنیاد پڑی۔ وہ کہتا ہے کہ جو قوم ایسی چیزیں تیار کرے جن سے دوسرے لوگوں کی ضرورتیں بڑھتی جائیں، اس کے پاس دوسروں کی دولت کھنچی چلی آئے گی۔ وہ فرد کی ذاتی ملکیت پر کسی قسم کی پابندی کو جائز قرار نہیں دیتا۔ اس کا نظام خالصتہً مادہ پرستانہ ہے۔ اس کے سامنے کوئی اخلاقی تصور نہیں۔ اسمتھ کے متبعین میں بنتھم، مالتھوس، ریکارڈو وغیرہ نے اس کے نظریہ کو مزید تقویت پہنچائی اور یورپ میں نظامِ سرمایہ داری آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس نے محنت کشوں کے خون چوسنے کے جذبہ کو کس حد تک شدید اور ناقابلِ تسکین بنا دیا تھا، اس کا اندازہ اُس دَور کے لٹریچر سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ مثلاً (DEFOE) نے ۱۷۰۴ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں لکھا کہ "غریبوں کی مدد بالکل نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر ان کی مدد کی گئی تو وہ سہل انگار ہو جائیں گے۔ اور اگر انہیں سرکاری اداروں میں کام پر لگایا گیا تو اس کا اثر پرائیویٹ اداروں پر بہت بُرا پڑے گا۔ اس لئے انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ وہ اپنا رزق آپ تلاش کریں اور کام نہ ملنے کی صورت میں فاقہ کشی کریں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد (MANDEVILLEE) نے اپنی کتاب (FABLE OF THE BEES) شائع کی جس کا ملخص یہ تھا کہ:-

> غریبوں سے کام لینے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انہیں محتاج رکھا جائے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ضروریات کو تھوڑا تھوڑا پورا کیا جائے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز

کر دینا حماقت ہے۔ سوسائٹی کی خوشحالی کا راز اس میں ہے کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد تباہ حال اور مفلس رہے۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں برطانیہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ دیہی آبادی کو کس طرح مجبور کیا جائے کہ وہ شہروں میں آکر کارخانوں میں مزدوری کریں۔ اس باب میں (WILLIAM TOWNSEND) نے ۱۷۸۵ء میں اپنی کتاب (DESSERTATION ON THE POOR LAWS) میں لکھا کہ:-

> بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تندخو سے تندخو جانور کو بھی رام کر دیتا ہے۔ اس سے سرکش سے سرکش انسان بھی مطیع و فرماں بردار بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ یعنی بھوک — بھوک ہی وہ جذبہ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔

یہ تھی وہ فضا جسے نظامِ سرمایہ داری نے پیدا کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ فضا عام ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود معاشرہ

ردِ عمل

میں کچھ افراد تو ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کے سینے انسانی جذباتِ ہمدردی سے یکسر خالی نہیں ہو جاتے۔ چنانچہ وہاں بھی ایسے انسان پیدا ہوئے۔ غریبوں اور ناداروں کے خلاف نظامِ سرمایہ داری کی اس شدت نے، اس قسم کے انسانوں کے جذباتِ ہمدردی کو بیدار کر دیا۔ ان میں سب سے پہلے ہمارے سامنے (Saint Simon) آتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ محنت کش طبقہ کی جسمانی اور تعلیمی حالت میں خوشگوار تبدیلی پیدا کی جائے اور معاشرے کی از سرِ تو تنظیم اس طرح کی جائے کہ تمام افراد کام کریں، اور کوئی شخص بیٹھ کر بیکار دوسروں کی محنت پر زندگی بسر نہ کرے۔ اس کے متبعین میں بعض گرم رو بھی تھے، جو چاہتے تھے کہ سرمایہ دار طبقہ کو یکسر مٹا دیا جائے اور مزدوروں میں زیادہ سے زیادہ اشتراکیت اور اجتماعیت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ ان میں سب سے نمایاں شخصیت رابرٹ اوون (ROBERT OWEN 1771-1858) کی ہے۔ اس کی فکر کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ اپنا کیریکٹر خود نہیں بناتا۔ اس کا معاشرہ اس کا کیریکٹر متشکل کرتا ہے۔ اوون ایک نظری مفکر ہی نہیں تھا، عملی مصلح تھا۔ چنانچہ اس نے گلاسگو کے نزدیک مزدوروں کے لئے ایک کارخانہ قائم کیا۔ اس کے پاس ہی ان کی ایک بستی بسائی۔ ان کے لئے عمدہ رہائش گاہیں تعمیر کیں۔ مدرسے کھولے۔ ان کے حفظانِ صحت کا انتظام کیا۔ وہ کہتا تھا کہ سرمایہ دار کے لئے پانچ فی صد سے زیادہ منافع نہیں ہونا چاہیئے۔ باقی سب مزدوروں کی بہبود پر صرف ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے

اس کی مخالفت ہوتی تھی۔ سو ہوئی اور بڑی شدت کے ساتھ ہوئی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ پاگل ہے اور وہ کہتا تھا کہ یہ سب پاگل ہیں ـــــ جوں جوں اس کی مخالفت بڑھتی گئی وہ اور متشدد ہوتا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد اس نے مذہب کی بھی مخالفت شروع کر دی۔ وہ کہتا تھا کہ اس قسم کے تمام باطل نظریوں کا ذمہ دار مذہب ہے۔ اس سے اسکے دوستوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا ـــ یہ نظریہ اووَن ہی کا ہے کہ انسان کی ترقی کے راستے میں تین بڑے بڑے موانع ہیں۔ ذاتی جائیداد، مذہب اور شادی۔ اس کا خیال تھا کہ صحیح اشتراکی زندگی میں ان تینوں کو مٹا دینا ہوگا۔

اسی قسم کا ایک اشتراکی ریفارمر فرانس کا رہنے والا لوئی بلان (LOUIS BLANC) تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ہر فرد کے لئے کام مہیا کرے، اور یہ کہ مزدوروں کو ان کی محنت کے مطابق ہی معاوضہ نہیں ملنا چاہیئے، بلکہ اتنا زیادہ ملنا چاہیئے جس سے ان کی تمام ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں۔

اس جماعت کا ایک اور ممتاز فرد پرادھن (PROUDHAN 1809 — 1865) تھا۔ یہ درحقیقت مارکسی اشتراکیت کا طائرِ پیش رس تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ جائداد درحقیقت چوری ہے اور جائیدادوں کے مالک سب چور ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ جائیداد اس طرح بنتی ہے کہ دوسرے لوگ محنت کرتے ہیں اور ان کی محنت کا ماحصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ زمین کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ یہ فطرت کا عطیہ ہے جس پر ملکیت کا کسی کو حق نہیں۔ نہ ہی اسے بٹائی یا پٹہ پر دیا جا سکتا ہے۔ اس سے صرف انسان کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔

کارل مارکس

یہ تھا وہ ماحول جس میں کارل مارکس نے آنکھ کھولی، اور یہ تھے وہ اشتراکیین جنہوں نے مارکس کے لئے زمین ہموار کی۔ مارکس بالخصوص رابرٹ اووَن سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ چنانچہ (COLE) جس نے اووَن کے سوانح حیات مرتب کئے ہیں، لکھتا ہے کہ اشتراکیین کے نزدیک، نظریۂ اشتراکیت مارکس کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا مصنف اووَن ہے۔ بلکہ ہم کہیں گے کہ اس کا سہرا، اس سے زیادہ پرادھن کے سر ہے۔ بہرحال، یہ تھے وہ مارکس کے پیش روجن کی فکر سے وہ بہت متاثر تھا۔

کارل مارکس (1818 — 1883) یہودی النسل، جرمنی کا باشندہ تھا۔ برلن یونیورسٹی میں وہ ہیگل کے فلسفہ سے متاثر ہوا، اور یہی اس کے معاشی فکر کی بنیاد بنا۔ شروع شروع میں اس نے جرمنی ہی میں اپنی فکر

کی اشاعت کی، لیکن وہاں کی فضا سازگار نہ رہی تو وہ پیرس چلا آیا۔ وہاں اُس کی ملاقات فریڈرک انجلز سے ہوئی جو اس کی فکر کا بہت بڑا ستون ثابت ہوا۔ وہیں یہ پرآدھن سے بھی ملا اور اس کے خیالات سے بہت متأثر ہوا۔ اسے پیرس سے نکال دیا گیا تو یہ برسلز چلا گیا اور اُس کے بعد لندن، جہاں سے اس کی مشہور کتاب سرمایہ (CAPITAL) شائع ہوئی جس نے معاشی فکر کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں مارکس کا فلسفہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن میں آپ کو فلسفہ کی گتھیوں میں الجھانا نہیں چاہتا۔ بالخصوص اس لئے کہ ہمارے پیشِ نظر موضوع سے اس کا بہت کم تعلق ہے۔ عام فہم الفاظ میں، مارکس کے فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ:۔

مارکس کا فلسفہ

(۱) کائنات میں تغیّر کا عمل مسلسل جاری ہے یہاں نہ کوئی نظریہ، تصوّر یا عقیدہ غیر متبدل ہے، نہ کوئی نظام مستقل۔ یہاں ہر شے تغیّر پذیر ہے۔

(۲) دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک اور نظام اس کی جگہ لے لیتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ پھر اس نظام کی جگہ ایک اور نظام لے لیتا ہے، جو اس کی بھی ضد ہوتا ہے۔ یہ سلسلۂ تغیرات و اضداد، ازل سے جاری ہے اور ابد تک ساری رہے گا۔

(۳) اس وقت نظامِ سرمایہ داری رائج ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس کی جگہ ایک اور نظام لے لے جو اس کی ضد ہو۔ یہ نظامِ اشتراکیت پر مبنی ہوگا۔

جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی قوت ہے جو سلسلۂ تغیرات و اضداد کو اس نظم و ضبط کے ساتھ وجود میں لاتی ہے، تو اس نے کہا کہ ایسا تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی رُو سے ہوتا ہے۔ "تاریخی وجوب" ایک ایسی اصطلاح ہے جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکی۔ (NESSECITY) یا وجوب کے معنی ہوتے ہیں ایسی بات جو بہرحال ہو کر رہے۔ اسے (HISTORICAL DETERMINISM) بھی کہتے ہیں یعنی تاریخی جبریت۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، ایسا بہرحال ہو کر رہتا ہے۔ کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔ لہٰذا، نظامِ سرمایہ داری کے لئے اب یہ مقدر ہے کہ وہ مٹ جائے اور اس کی جگہ ایک ایسا نظام لے لے جو اس کی ضد ہو۔ اس سے ایک بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے اور وہ یہ کہ مارکس بھی اپنے پیش روؤں کی طرح اپنے سینے میں دلِ دردمند رکھتا تھا۔ اس لئے چاہتا تھا کہ وہ نظام جس نے انسانیت پر اس قدر ظلم و تشدد روا رکھے ہیں، کسی نہ کسی طرح مٹ جائے۔ اس تغیر کے لئے اسے کوئی ایسی اساس نہیں مل سکی جو دلیل

وبرہان (REASON —) پر مبنی ہو، اس لئے اس نے نظریۂ جبریت کے سایہ میں پناہ لی۔ حالانکہ یہ نظریہ ایک ایسی مبہم اندھی قوت کے تصور پر مبنی ہے جس کے سامنے، عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک — علامہ اقبالؒ نے مارکس کے اس اندرونی تضاد کو ایک مصرعہ میں واشگاف کر دیا ہے جب کہا کہ — قلبِ او مومن دماغش کافر است — وہ سینے میں دل تو دردمند رکھتا تھا لیکن اس کی سوچ غلط تھی۔ اس سلسلہ میں مہاتما بدھ کی بین مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے اپنے معاشرہ پر نظر ڈالی تو اس میں بے شمار اندھے، لولے، لنگڑے، کوڑھی، اپاہج، دکھائی دیئے۔ وہ ایک ریاست کے ولی عہد تھے۔ اگر ان کی فکر صحیح ہوتی تو وہ لوگوں کے ان مصائب کے حقیقی اسباب کی تحقیق کرتے، اور اس تحقیق میں انہیں نظر آجاتا کہ اس کی ذمہ داری خود ان کی ریاست کے نظام پر عاید ہوتی ہے۔ لیکن ان کی سوچ صحیح نہیں تھی، جس کی وجہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ دنیا ہے ہی مصیبتوں کا گھر، اور اس کا علاج صرف یہ ہے کہ اسے تیاگ کر انسان جنگلوں میں چلا جائے۔ آپ غور کیجئے کہ اس غلط سوچ نے نوعِ انسان کو کس قدر تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس نے ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی، جو دو اڑھائی ہزار سال سے دنیا کی اس قدر کثیر آبادی کے اعصاب پر مسلط چلا آرہا ہے۔ اور جس نے انہیں شل کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اوون کا نظریہ یہ تھا کہ نظامِ سرمایہ داری مذہب کا پیدا کردہ ہے۔ اس لئے اس نظام سے رستگاری کے لئے مذہب کا مٹا دینا ضروری ہے۔ مارکس انہی فلاسفروں سے متاثر تھا۔ اسی لئے وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچا اور اس نے بھی یہی کہا کہ نظامِ سرمایہ داری کا تختہ الٹنے کے راستے میں مذہب سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس لئے اس کا راستے سے ہٹانا از بس ضروری — سوال یہ ہے کہ وہ اس نتیجہ پر کیسے پہنچا۔ اور اس کا جواب نہایت آسان اور سیدھا سا ہے۔ وہ یہودی النسل تھا اور یہودیوں کی صدیوں سے یہ حالت چلی آرہی تھی کہ وہ دنیا کی ذلیل ترین قوم بن کر رہ گئے تھے۔ نہ صرف یہ کہ ان کی کہیں اپنی حکومت نہ تھی، ان کے رہنے کا ٹھکانہ تک بھی کوئی نہیں تھا۔ انہیں کہتے ہی (THE WANDERING JEWS) دشت پیما، خانہ بدوش قوم تھے اور انکی اس حالت کا ذمہ دار وہ مذہب تھا جسے وہ اس تقدس سے سینے سے لگائے پھرتے تھے۔ مارکس سب سے پہلے اس مذہب سے متنفر ہوا۔ اس کے بعد اس کے سامنے عیسائیت آئی۔ یہ وہ مذہب تھا جس کے انسانیت کش نتائج سے غیر تو غیر، خود عیسائی بھی چلّا اٹھے تھے۔ مشہور مورخ اور مفکر رابرٹ بریفو اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے:-

عیسائیت کا جرم یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری تاریخ میں ہمیشہ استبداد کا ساتھ دیا ہے اور اسے

تقویت پہنچانے کا ذریعہ بنی ہے۔ سوائے ان حالات کے جن میں خود کلیسا کا مفاد غریبوں کے مفاد کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا، اس نے کبھی اپنا اثر و قوت کمزوروں کی آزادی اور مستبد قوتوں کی روک تھام کے لئے صرف نہیں کیا ... اس کے برعکس اس نے ہمیشہ جور و ستم اور جبر و استبداد کی حمایت کی ہے۔

اس کے بعد برفو ہسپانیہ کے پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے:۔

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق کے دائرے سے بالکل باہر کی چیز ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم کی طرف سے ہمیشہ چشم پوشی کی ہے ... ذرا سوچئے کہ سینٹ ونسنٹ فرانس کے اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیغام عام کرتا ہے اور گنہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وہ ظلم و ستم جس پر اس جہنم کا قیام ہے اس کا اسے احساس تک نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں، انسانوں کی زندگیاں اور قلوب و اذہان، غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں۔ ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں۔ وہ مٹ جائیں، فنا ہو جائیں۔ عیسائیت فقط اتنا کرے گی کہ انہیں تسلی کی تھپکیاں دیتی رہے گی۔ لیکن اس کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رہے گی۔ (P.P — 332 - 333)

یہ تھا وہ مذہب جس کے متعلق اس سے پہلے جرمن فلاسفر نیٹشے نے چیخ کر کہا تھا کہ "مجھے اس کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے اور اسے اصلی معنوں میں صلیب دینا پڑا۔" یہی تھا وہ مذہب جس کے خلاف اوون نے صدائے احتجاج بلند کی اور اس سے مارکس متاثر ہوا۔ ہیگل کا ایک اور شاگرد تھا (FEURBACH) اس نے اپنی کتاب (ESSENCE OF CHRISTIANITY) میں عیسائیت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ یہ انجلز اور مارکس کا بڑا محبوب تھا۔ انہوں نے "مذہب عوام کے لئے افیون ہے" کا نظریہ اسی سے مستعار لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مذہب تھا ہی ایسا جس کے خلاف ہر دلِ دردمند، سراپا نالہ اور ہمہ تن انقلاب بن جاتا۔ لہٰذا اگر مارکس نے بھی اس کی مخالفت کی تو اس میں وہ حق بجانب تھا۔ البتہ اس کے جذبات کی شدت اور

سوچ کی غلطی یہ تھی کہ وہ بجائے اس کے کہ وہ اس مذہب یا اسی جیسے دیگر مذاہب کی مخالفت کرتا۔ اس نے مستقل اقدار، غیر متبدل اصولِ حیات اور قانونِ مکافاتِ عمل ہی سے انکار کر دیا ۔ انہی کے انکار کو خدا ۔ وحی اور آخرت کے انکار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ :-

> اخلاق، مذہب، مابعد الطبیعیات اور اسی قسم کے دوسرے تصورات اپنا آزاد وجود کہیں نہیں رکھتے۔ نہ ان کی کوئی تاریخ ہے، نہ نشوونما۔ بجز اس کے کہ انسان جب اپنے معاشی ذرائع کو نشوونما دیتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اپنے افکار و تخیلات کو بھی بدلتا رہتا ہے۔ (انہی کا نام اخلاق اور مذہب ہے)۔ (دی کیپیٹل)

ہم سمجھتے ہیں کہ ایک اتنے بڑے مفکر سے، جس کی فکر نے نوعِ انسان کے ایک کثیر حصہ کو متاثر کرنا اور نمعلوم کب تک کرتے چلے جانا تھا، یہ توقع کرنا کچھ زیادتی نہیں ہوگا کہ اس نے جہاں یہودیت، عیسائیت اور (شاید) بدھ مت جیسے مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک نتیجہ اخذ کیا تھا، دنیا کا ایک ایسا ہی عظیم مذہب[1] (اسلام) اس کے سامنے تھا۔ اسے چاہیئے تھا کہ وہ اسے بھی سمجھنے کی کوشش کرتا۔ ایسا کرنا اس کے لئے چنداں مشکل بھی نہیں تھا، کیونکہ اس مذہب کا ضابطۂ حیات، قرآن مجید، دنیا کے کونے کونے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ اگر خالی الذہن ہو کر قرآن کریم کا مطالعہ کر لیتا تو ہمیں یقین ہے کہ اس کی فکر اس قدر تخریبی راستے اختیار نہ کرتی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس نے ایسا نہ کیا۔ اس کے لٹریچر میں کہیں قرآن کا نام تک دکھائی نہیں دیتا۔ وہ جذباتی انسان تھا، اپنے جذبات کی شدت کی رَو میں بہہ گیا۔ اس سے انسانیت کو کس قدر نقصان پہنچا، اسے تو چھوڑیئے، اس سے خود اس کا وہ نظام جس کے لئے اس نے اس قدر سختیاں جھیلیں اور مصائب برداشت کئے تھے، گونگے کا خواب، شاعر کی تخیلاتی جنت (UTOPIA) اور ناممکن العمل فلسفہ بن کر رہ گیا۔ تفصیل اس اجمال کی ابھی سامنے آتی ہے۔

مارکس کا معاشی نظام

مارکس نے کہا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل وہ معاشی نظام ہے جس میں :-

---

[1] ہم نے اسلام کے لئے "مذہب" کا لفظ مارکس کے تتبع میں لکھا ہے۔ ورنہ اسلام مذہب نہیں، دین ہے۔ یہ بات بھی مارکس کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔

(۱) ذرائع پیداوار ذاتی ملکیت کی بجائے معاشرہ کی تحویل میں رہیں۔ اور

(۲) جس میں ہر فرد اپنی اپنی استعداد کے مطابق، جان مار کر محنت کرے اور اس کی محنت کا ماحصل، معاشرہ کی مشترکہ تحویل میں رہے جہاں سے ہر فرد کو اس کی ضروریات کے مطابق ملتا جائے۔ اس طرح نہ کوئی فرد اپنی ضروریات سے محروم رہے گا اور نہ کسی کے پاس اس کی ضرورت سے زائد باقی بچے گا۔

اس پر، اس کے رفقاء جوشِ مسرت سے اچھل پڑے۔ انہوں نے "پالیا۔ پالیا" کے شور سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ابنِ آدم کو اب وہ جنت ملا ہی چاہتی ہے جسے اس نے کھو دیا تھا، اور جس کی تلاش میں وہ صدیوں سے 'آں سو رانده و ایں سو درمانده'، مارے مارے پھر رہا تھا۔ جب ان کے جذبات کی شدت میں کمی واقع ہوئی تو انہوں نے مارکس سے کہا کہ آپ کے پیش کردہ فارمولا کی شقِ اول پر تو خیر، کسی نہ کسی طرح عمل کیا جاسکتا ہے۔ معاشرہ قوت فراہم کرلے تو وہ ذرائع پیداوار کو، ان کے موجودہ مالکوں کے ہاتھوں سے چھین کر اسے اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کی شقِ دوم پر کس طرح عمل کیا جاسکے گا۔ یعنی اس شق پر کہ ہر شخص جان مار کر محنت کرے اور اس کے ماحصل سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے۔ باقی دوسروں کے لئے چھوڑ دے۔ اس کا اتنا حصہ تو قابلِ فہم ہے کہ جن لوگوں کی ضروریات ان کی محنت کے ماحصل سے پوری نہیں ہوتیں، وہ اس نظام پر لبیک کہہ دیں گے۔ اگرچہ وہ بھی رفتہ رفتہ اپنی محنت کو کم کر دیں گے، کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ ان کی تمام کی تمام ضروریات معاشرہ کی طرف سے پوری ہوتی ہیں تو انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ جان مار کر محنت کریں ــــ لیکن یہ بات تو قطعاً سمجھ میں نہیں آتی کہ جن لوگوں کی محنت کا ماحصل بہت زیادہ ہوگا اور ضروریات کم، وہ اس نظام کی طرف کیوں آئیں گے، وہ کون سا جذبۂ محرکہ ہوگا جس کی رُو سے وہ جان مار کر محنت کریں ــــ اور ایک آدھ دن ہی ایسا نہ کریں، عمر بھر ایسا کرتے رہیں اور اس میں سے کم از کم لیں۔ باقی سب دوسروں کے لئے چھوڑ دیں ــــ وہ کون سا جذبۂ محرکہ ہوگا جو انہیں اس پر آمادہ کر دے گا اور استقامت سے اس پر مسلسل چلاتا رہیگا۔ ہمیں یہ سمجھا دیجئے۔

مارکس کا عجز

اور مارکس کا جواب یہ تھا کہ یہ بات خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ اس پر تو میرا ایمان ہے کہ نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل یہی ہے۔ لیکن یہ ممکن العمل کیسے ہوگا؟ اس کے لئے جذبۂ محرکہ کیا ہوگا، یہ میں نہیں بتا سکتا۔ مارکس کی تحریریں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ وہ ان کے مسلسل تقاضوں سے جھلّا اٹھتا۔ وہ انہیں (UTOPIANS) خوابوں کی دنیا میں رہنے والے پکارتا۔ اور ان

سے کہتا کہ وہ اس بحث کو نہ چھیڑا کریں۔ ان کی پارٹی میں مارکس کے بعد، لینن آتا تھا۔ وہ اس کی طرف رجوع کرتے تو وہ بھی اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ :-

نوعِ انسان کن مراحل سے گزر کر اور کن عملی اقدامات کی رو سے اس بلند مقصد کو حاصل کر سکے گی، اس کی بابت ہم نہ کچھ جانتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی مواد ایسا نہیں جس سے ان سوالات کا جواب دیا جا سکے........ ایسا کچھ صرف رضا مندانہ ہو سکتا ہے۔ کمیونزم میں ایسا ہی ہوگا۔ لیکن یہ ہوگا کیسے؟ اس کی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

(MARX , ENGELS MARXISM ; BY LENIN P.P. 355-58)

یہ ہے وہ مقام جہاں مارکس ناکام رہ گیا ـــــ اور یہ اس لئے کہ جن حقیقتوں سے اُسے اس سوال کا جواب ملنا تھا، ان سے اُس نے انکار کر دیا تھا۔ یہ نتیجہ تھا اس کی "کافر دماغی" کا ـــــ اور مارکس ہی نہیں، یہ وہ مقام ہے جس پر آج بھی کمیونزم کا ہر داعی اسی طرح، ششدر و حیران، اور خاسر و ناکام کھڑا ہے۔ ان میں سے بھی کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہوگا اور کیسے پیدا ہوگا جس کی رُو سے کمیونزم کا نظام ممکن العمل قرار پا سکے گا۔

سوشلزم

مارکس اور اس کے رفقاء کی یہی ناکامی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے طے کیا کہ ہمیں کمیونزم کے نظام کو چھوڑ کر سرِ دست اس فارمولا کی شقِ اول کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یعنی اس شق پر عمل پیرا ہونے کی کہ ذرائع رزق، ان کے موجودہ مالکوں کے ہاتھ سے چھین کر اسٹیٹ کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ اسے سوشلزم کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ مارکس کے رفقاء نے کہا تھا، اس شق پر قوت اور تشدد کی رُو سے ہی عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو سوشلزم اور تشدد لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ لینن اپنی کتاب (STATE AND REVOLUTION) میں انجلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے لکھتا ہے :-

انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رُو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اپنا اختیار و تسلط قوت و استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی قائم کرتا ہے۔

سوشلزم میں نظامِ حکومت کس قسم کا قائم ہوگا، اس کے متعلق مارکس لکھتا ہے :-

نظامِ سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان، عبوری دَور میں وہ طریق کارفرما ہوگا جس کی رُو سے اوّل الذکر ثانی الذکر میں بتدریج تبدیل ہوگا۔ اسی نسبت سے اس عبوری دَور میں (یعنی سوشلزم) میں سیاسی نظام بھی عبوری قسم کا رائج ہوگا۔ اس میں اسٹیٹ، محنت کشوں کی ڈکٹیٹر شپ کا نام ہوگا۔

(لینن۔ صفحہ ۳۴۶)

اس ڈکٹیٹر شپ کے متعلق سٹالن اپنی کتاب لینن ازم میں لکھتا ہے:-

ڈکٹیٹر ایک ایسی مختار عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود یکسر قوت پر قائم ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظامِ حکومت کے علمبردار سن لیں اور اچھی طرح سن لیں کہ ڈکٹیٹر شپ کے معنی ہیں قوتِ لامحدود اور قاہرہ قوت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور قانون و شریعت سے کچھ واسطہ نہ ہو۔

یہ ڈکٹیٹر شپ، عام افرادِ معاشرہ ہی کو جبر و اکراہ سے اپنے قابو میں نہیں رکھے گی، خود اپنی پارٹی کا ڈسپلن بھی اسی انداز سے برقرار رکھے گی۔ انقلابِ روس ۱۹۱۷ء میں عمل میں آیا اور لینن نے ۱۹۲۰ء میں کہا تھا کہ:-

اس حقیقت کو اب ہر ایک نے محسوس کر لیا ہوگا کہ بالشویک، اڑھائی سال تو ایک طرف، اڑھائی ماہ تک بھی برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتے تھے، اگر ہماری پارٹی میں متشدد اور صحیح معنوں میں فولادی ڈسپلن قائم نہ رکھا جاتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ مارکسی نظریہ کی رُو سے، سوشلزم کا قیام تشدد اور قوت کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ تشدّد اور قوّت خود پارٹی کے اندر بھی کارفرما رہے گا، اور یہ سب کچھ ڈکٹیٹر کے قاہرانہ اختیارات کی رُو سے ہوگا۔ تشدد ہی نہیں بلکہ اس میں کسی قسم کے ضابطۂ اخلاق کی بھی پابندی نہیں ہوگی۔ لینن نے ۱۹۲۰ء میں یوتھ کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانگرس میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:-

ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت سرچشمہ (یعنی وحیٔ خداوندی) یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے۔ یہ تصور، زمینداری اور سرمایہ داری کے مفاد کی حفاظت کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے مفاد کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطۂ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا

ضابطہٴ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ (ہم اس تصور کو ٹھکراتے ہیں)۔ ہم خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں۔ اخلاق انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے۔ اس کے ماوراء جو کچھ ہے، فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔ (مارکس۔ انجلز۔ مارکسزم صفحہ ۶۵-۶۱)

جس طرح ہم تشدد کے متعلق بتا چکے ہیں کہ وہ برسرِاقتدار پارٹی (یا ڈکٹیٹر شپ) کی طرف سے عوام پر ہی روا نہیں رکھا جائے گا بلکہ خود اپنی پارٹی میں بھی انہی آہنی زنجیروں کے ذریعے ڈسپلن قائم رکھا جائے گا۔ اسی طرح جھوٹ، فریب دہی، اور دیگر اخلاقی حدود شکنی بھی عوام تک ہی محدود نہیں رکھی جائے گی۔ پارٹی کے اندر بھی یہی روش رہے گی۔ (GOLLANCZ) نے اپنی کتاب (OUR THREATENED VALUES) میں لکھا ہے کہ جب مشہور اشتراکی راہ نما (DR. G. LUCKNZ) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے افراد سے بھی جھوٹ اور فریب دہی سے کام لیں۔ تو اس نے کہا:۔

اشتراکی اخلاق کی رو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عندالضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی ہے جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ وہ انتہا ہے جس پر ٹھگوں اور ڈاکوؤں کے گروہ بھی نہیں پہنچے تھے۔ ان کا اپنا ایک آئین اور ضابطہٴ اخلاق ہوتا تھا جس پر وہ پارٹی کے اندر بڑی سختی سے عمل کرتے تھے۔ لیکن سوشلزم ایسا نظام ہے جو تشدد، جھوٹ، فریب، بددیانتی، عہد فراموشی میں، اپنے اور پرائے کسی میں بھی تمیز نہیں کرتا۔ آپ جب کسی کمیونسٹ سے بات کریں اور اس سے کہیں کہ کیا یہ ہے وہ نظام جسے آپ نوعِ انسان کی بہبود کے لئے دنیا میں رائج کرنا چاہتے ہیں، تو وہ جواب میں کہہ دے گا کہ تشدد ہو یا اخلاق باختگی، اس سے معاشی عدل تو قائم ہو جائے گا، طبقاتی تقسیم کا تو خاتمہ ہو جائے گا۔ ہمیں ذرائع کو اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ اس مقصد کو اہمیت دینی چاہیئے جس کے حصول کے لئے وہ ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں (MEANS ARE JUSTIFIED BY THE ENDS ACHIEVED)۔ قطع نظر اس امر کے کہ جس مسکت یا دلی منقولہ کو یہ لوگ اس طرح ایک حقیقتِ مسلمہ کے طور پر پیش کر دیتے ہیں وہ کہاں تک صحیح ہے — سوشلزم میں، اس قسم کے انسانیت سوز اور حدود فراموش ذرائع سے وہ مقصد بھی حاصل نہ ہوا، نہ ہی ہو سکتا ہے جس کے حصول کے لئے یہ ذرائع

استعمال کئے جاتے ہیں. مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے کمیونسٹوں میں شاید ہی ایسے ہوں (اور اگر ایسے ہوں گے بھی تو بہت کم) جنہوں نے کمیونزم یا سوشلزم کا علمی سطح پر مطالعہ کیا ہو۔ یہ بالعموم جذباتی ہوتے ہیں اور محض سنی سنائی باتوں کو دہراتے رہتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اور تو اور خود مارکس نے کہہ دیا تھا کہ سوشلزم کی رُو سے معاشی عدل حاصل نہیں ہو سکے گا۔ سنیئے، اس نے اس باب میں کیا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ:-

لوگوں کی صلاحیتیں اور حالات مختلف ہیں۔ کوئی طاقت ور ہے کوئی کمزور۔ کوئی شادی شدہ ہے کوئی مجرد۔ کسی کے بچے کم ہیں کسی کے زیادہ۔ لیکن سوشلزم کے اصولِ تقسیم کی رو سے ایک کو زیادہ ملے گا دوسرے کو کم۔ لہٰذا، ایک مقابلتہً امیر ہوگا، دوسرا غریب۔ اس لئے (لینن کے الفاظ میں) اس نظام میں مساوات اور عدل نہیں ہوگا۔ اس میں دولت کا تفاوت اور غیر منصفانہ تفاوت باقی رہے گا۔ (مارکس کے الفاظ میں) یہ اس نظام (سوشلزم) کا بہت بڑا سقم ہے۔ لیکن اس عبوری دور میں (یعنی جب تک سوشلزم کا نظام قائم رہے گا) یہ سقم باقی رہے گا۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ (لینن۔ صفحہ ۳۵۱-۳۵۰)

یہ ہے سوشلزم کا ماحصل خود مارکس اور لینن کے الفاظ میں ـــ اور اس کا ثبوت ہر وہ ملک پیش کر رہا ہے جہاں سوشلزم رائج کیا گیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یہ کہیں کامیاب نہیں ہو سکا۔ جس نظام میں طبقاتی تفاوت بدستور باقی رہے اور معاشی عدل قائم ہی نہ ہو سکے، اسے آپ کب تک ڈنڈے کے زور پر قائم رکھ سکیں گے۔ یہ حضرات جھٹ سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ دیکھئے! یہ نظام چین میں کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے؟ انہیں کون بتائے کہ چین میں یہ نظام اپنی خوبیوں کی وجہ سے نہیں چل رہا۔ یہ محض ماؤ کی شخصیت کی وجہ سے چل رہا ہے۔ اس قوم نے اپنے اس سربراہ کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ وہ اس کی پرستش کرتے ہیں اور اس کی "لال کتاب" کو آسمانی صحیفہ سے بھی زیادہ مقدس سمجھتے ہیں۔ وہاں اس نظام کے چلنے کی وجہ ماؤ کی پرستش ہے۔ اس کے بعد دیکھئے گا کہ وہاں کیا ہوتا ہے[1]؟ یاد رکھیئے! کوئی ایسا نظام جو محکم بنیادوں پر استوار نہ ہو اور محض شخصیتوں کے سہارے چل رہا ہو، کامیاب نہیں ہو سکتا ـــ سوشلزم کی بنیاد کوئی نہیں۔

(۵)

[1] یہ خطاب ۱۹۷۵ء میں پیش کیا گیا تھا جب ہنوز ماؤ زندہ تھا۔ اس کی وفات کے بعد چین میں کیا ہو رہا ہے، اس پر زمانہ شاہد ہے۔

مارکس سے آگے

سوشلزم کے متعلق یہ کچھ کہہ لینے کے بعد، ہم اس مقام کی طرف لوٹتے ہیں جہاں مارکس ناکام رہا ہے۔ ہم اس سے متفق ہیں کہ انسانیت کی معاشی مشکلات کا حل اسی اصول پر عمل پیرا ہونے میں ہے کہ :-

ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق کام کرے، اور اپنی ضروریات کے مطابق لے۔

لیکن مارکس کو وہ بنیاد نہیں مل سکی جس پر اس نظام کی رفیع الشان عمارت استوار ہو۔ وہ جذبہ نہیں مل سکا جو اتنے عظیم ایثار کا محرک بن سکے۔ لینن نے کہا تھا کہ ایسا کچھ صرف رضاکارانہ طور پر ہو سکے گا اور اس کے لئے جس جذبہ کی ضرورت ہے، ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیسے پیدا ہو سکے اور کس طرح قائم رہ سکے گا۔ یہی تھی وہ حقیقت جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے، انقلابِ روس کے بعد اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے جُستۂ اُورا اساسِ محکمے
داستانِ کہنہ شُستی باب باب فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

آیئے ہم دیکھیں کہ اُم الکتاب، وہ اساسِ محکم کس طرح مہیا کرتی ہے۔ اس اساسِ محکم کا نام ہے **ایمان** .... !

ہمارے ہاں کے (اور شاید باقی دنیا کے) کمیونسٹوں کی بھی کیفیت یہ ہے کہ جونہی ان کے سامنے ایمان یا خدا کا نام لیا جائے، یہ ایک تحقیر آمیز تبسم، بلکہ استہزا آلود قہقہہ سے اس کا استقبال کرتے اور اس قسم کے رٹے رٹائے فقرے بول کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ ایمان اندھی عقیدت کا نام ہے۔ جسے خوف سے پیدا کیا جاتا اور جہالت کے سہارے قائم رکھا جاتا ہے۔ اب اس قسم کی توہم پرستیوں کا زمانہ نہیں رہا۔ ہم نے مفاد پرستوں کی کارگہ میں ڈھلے ہوئے ان تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا ہے (وغیرہ وغیرہ)۔ وہ اس قسم کے الفاظ دہرا کر اپنی انقلاب پسندی کا رعب گانٹھنا یا علمیت کی دھاک بٹھانا چاہتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مارکس، انجلز وغیرہ نے کم از کم عیسائیت کا تو مطالعہ کیا تھا، لیکن ان حضرات نے کسی مذہب کا بھی مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ انکے مبلغِ علم کا منتہیٰ اسی قسم کی سنی سنائی باتیں ہوتی ہیں۔ ان حضرات کا سب سے بڑا سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ خدا کا وجود ثابت کیجئے ـــ اور "ثابت کیجئے" سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ انہیں بتایئے کہ وہ دیکھیے! سامنے پہاڑی پر خدا بیٹھا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان کی خدمت میں عرض کریں کہ ایمان کسے کہتے ہیں اور خدا پر ایمان سے مفہوم کیا ہے، ہم خود ان سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ کمیونزم کی بنیاد مارکس کے اس نظریہ پر ہے کہ معاشی تغیرات ایک لگے بندھے قانون کے مطابق رونما ہوتے رہتے ہیں جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ

وہ کونسی قوت ہے جس کی رُو سے ایسا کچھ التزاماً ہوتا رہتا ہے۔ مارکس نے اس کا نام تاریخی وجوب رکھا ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ تاریخی وجوب یا اس کی قوتِ محرکہ یا نافذہ کا اسی قسم کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں جس قسم کا ثبوت آپ وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق طلب فرماتے ہیں؟ آپ کبھی ایسا نہیں کر سکیں گے لیکن اس کے باوجود آپ اسے ایک حقیقت اور ابدی صداقت تسلیم کئے جائیں گے۔ آپ سوچئے کہ آپ تاریخی وجوب پر بلا ثبوت اور بلا دلیل ایمان رکھتے ہیں اور اسے اندھی عقیدت سے تعبیر نہیں کرتے۔

ایمان

لیکن اگر کوئی اور ایمان کا نام لیتا ہے تو آپ یہ تحقیق کئے بغیر کہ اس سے اس کی مراد کیا ہے، اس پر اندھی عقیدت کا لیبل لگا کر اسے استہزاء کے سیلاب میں بہا دینا چاہتے ہیں۔ معاف کیجئے! اس قسم کا انداز، ٹی یا کافی ہاؤس میں تو شایانِ شان قرار پا سکتا ہے۔ علم کی بارگاہ میں نہیں ــــ اب سنیئے کہ العلم یعنی قرآنِ کریم کے لغت میں ایمان کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں ایمان رکھنے والوں کو مومن کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور مومنین کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ:۔

إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا ۔ (۲۵/۷۳)

جب ان کے سامنے، اور تو اور، خود خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں تو یہ بہرے اور اندھے بن کر انہیں قبول نہیں کر لیتے۔

فرمائیے! کیا ایسے ایمان کو "اندھی عقیدت" کہا جائے گا؟ اس ایمان (یعنی خدا پر ایمان کی طرف دعوت دینے والے) نے پکار کر کہہ دیا تھا کہ أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۔ (۱۲/۱۰۸)۔ میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین کی بھی یہی روش ہوگی۔ ان حضرات کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ایک غیر مسلم مترجم (A.J. ARBERRY) "علیٰ بصیرۃ" کا ترجمہ (WITH SURE KNOWLEDGE) کرتا ہے، اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف (مرحوم) ان الفاظ کا ترجمہ (FIRM CONVICTION) کرتے ہیں۔ کہئے! کیا اسے اندھی عقیدت کہا جائے گا؟ قرآن اپنے مخالفین سے کہتا ہے کہ میں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں دلائل پیش کرتا ہوں۔ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۔ (۲/۱۱۱)۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو تم بھی اس کی تائید میں دلائل پیش کرو۔ ہمارے ہاں بلا دلیل و برہان نہ کوئی بات منوائی جاتی ہے، نہ مانی جاتی۔ یہ ہے قرآنِ کریم کی رو سے ایمان سے مفہوم ــــ یعنی ایسا محکم یقین جو علم و بصیرت کا پیدا کردہ اور دلائل و براہین کی رُو سے پختہ ہو۔

اب آئیے ہستیٔ باری تعالیٰ پر ایمان کی طرف ـــــ ہمارے زمانے میں، سائنس (طبیعیات) کی دنیا میں جو مقام ایڈنگٹن (EDDINGTON) کو حاصل ہے، اربابِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ وہ اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD) میں لکھتا ہے:-

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں۔ بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

(P. 44)

یعنی وجودِ باری تعالیٰ سے متعلق نظری بحثوں سے آگے بڑھ کر دیکھنا یہ چاہیئے، کہ جس راہ نمائی کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ملی ہے، وہ کس قسم کی ہے، اور اس کی صداقت کا ثبوت کیا ہے۔ جس راہ نمائی کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ وحی پر مبنی ہے، وہ کیا ہے، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر بات سامنے آئے گی۔ یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ قرآن اس کے مبنی بر صداقت ہونے کے لئے بھی نظری دلائل کافی نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے کہ اسے اس کے نتائج سے پرکھ کر دیکھو۔ اگر اس کے نتائج، اس کے دعویٰ کے مطابق ہیں تو یہ اس کی صداقت کا ثبوت ہے۔ اگر ایسا نہیں تو اس کا دعویٰ باطل ہے۔ چنانچہ قرآن کریم رسول اللہؐ سے کہتا ہے کہ تم ان لوگوں سے کہو کہ میں نظری بحثوں میں الجھنا نہیں چاہتا۔ ایک نظام میں پیش کر رہا ہوں، اور اس کے برعکس دوسرا نظام تم پیش کرتے ہو تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ میرا پیش کردہ نظام کامیاب نہیں ہو سکتا، ہمارا نظام کامیاب ہوگا۔ تمہارے اور میرے دعاوی کے پرکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ:-

اِعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَکُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۶/۱۳۶)۔

"تم اپنے پروگرام پر عمل کرو، مجھے اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے اور کون جھوٹا۔ لیکن اتنی بات میں ابھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو نظام ظلم و استبداد اور سلب و نہب (EXPLOITATION) پر مبنی ہوگا، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔"

یہ ہے وہ راہ نمائی، وہ اصول، جسے وحی نے پیش کیا ہے! سوال یہ ہے کہ اس راہ نمائی کے متعلق یہ کیوں تسلیم کیا جائے کہ یہ وحی پر مبنی ہے۔ یہ کیوں نہ مانا جائے کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہے!

مبنی بر وحی

اس کا جواب بڑا آسان اور واضح ہے۔ فکرِ انسانی (یعنی موضوعِ زیرِ نظر کی نسبت سے) مارکس نے یہ اصول پیش کیا کہ دنیا میں ہر نظریہ اور ہر نظام تغیر پذیر ہے۔ آج ایک نظام وجود پذیر ہوتا ہے۔ وہ کچھ

عرصہ تک کارفرما رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ مٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے لیتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ —— یعنی کچھ عرصہ سے نظامِ سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ وہ مداری تماشا دکھا کر چلا جا رہا ہے اور اس کی جگہ اسکی ضد، اشتراکیت کا نظام قیام پذیر ہو رہا ہے۔ جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ یہ نوعِ انسان کی ان مشکلات کو حل کر دے گا جن سے وہ اس وقت دوچار ہے۔ بہت اچھا! ہم مان لیتے ہیں کہ یہ ایسا ہی ثابت ہوگا۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ جب یہ اپنے نتائج پیش کرے گا تو اس اصول کے مطابق جسے فکرِ انسانی نے پیش کیا ہے اس کے بھی بوریہ بستر باندھنے کا وقت آ جائے گا اور اس کی جگہ وہ نظام لے لے گا جو اس کی ضد ہوگا۔ اس کے برعکس، وحی یہ اصول پیش کرتی ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)، "جو نظام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہوگا، وہ ہمیشہ باقی رہے گا"۔ اور یہ وہ اصول ہے جو بالکل تغیر پذیر نہیں۔ یہ ہمیشہ غیر متبدل رہے گا۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (۱۰/۶۴): خدا کے بنائے ہوئے اصولوں میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوگی"۔ ان اصولوں کو مستقل اقدار یا (PERMANENT VALUES) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

ہم اپنے ان دوستوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ دیانتداری سے بتائیں کہ ان کے نزدیک، وہ نظریہ یا فلسفۂ حیات بہتر اور قابلِ قبول ہوگا جس کی بنیادوں پر ایسا نظام قائم ہو سکے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو، یا ایسا نظریہ یا فلسفۂ حیات جس کی بنیادوں پر ایسا نظام قائم ہو جو کچھ وقت کے لئے انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو سکے، اس کے بعد، اس نظام کے لئے جگہ خالی کر دے جو اس کی ضد ہو یعنی جس میں پھر اسی سابقہ ظلم و استبداد اور سلب و نہب و استیصال کا دور دورہ شروع ہو جائے! سوچئے اور پھر دیانتداری سے کہئے کہ ان دونوں میں سے کونسا نظریہ یا فلسفۂ حیات نوعِ انسان کے حق میں بہتر ہوگا؟

بہرحال بات ہو رہی تھی قرآن کریم کی رُو سے ایمان کے مفہوم کی۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان کسے کہتے ہیں! ایسے اصولوں کی صداقت پر یقینِ محکم جو:-

(۱) علم و بصیرت پر مبنی ہوں اور دلائل و براہین ان کی تائید کریں۔

(۲) جو تمام ہی نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہوں۔

(۳) جن کے نتائج ان کی صداقت کا ثبوت پیش کریں۔

(۴) جو غیر متبدل ہوں۔ یعنی ان پر جب بھی عمل کیا جائے، وہ ویسے ہی نتائج برآمد کر سکیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان قلب و دماغ کی کامل رضامندی ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ۔ (۲/۲۵۶)۔ دین میں جبر و اکراہ کا کوئی کام نہیں۔ جبر و اکراہ سے قلب و دماغ کی رضامندی حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔

حیرت ہے کہ یہ حضرات علم و دانش کے اس قدر بلند آہنگ دعاوی کے باوجود (RATIONAL FAITH) اور (IRRATIONAL FAITH) میں تمیز و تفریق نہیں کر سکتے۔ مشہور سائیکالوجسٹ (ERICH FROMM) ان میں فرق کرتا ہوا کہتا ہے کہ:-

(IRRATIONAL FAITH) یہ ہے کہ کسی بات کو محض اس لئے تسلیم کر لیا جائے کہ کوئی اتھارٹی یا لوگوں کی اکثریت ایسا کہتی ہے۔ اس کے برعکس (RATIONAL FAITH) کی اصل و اساس ایک ایسے آزادانہ تیقن (CONVICTION) پر ہوتی ہے جو انسان کے تخلیقی مشاہدہ یا فکر پر مبنی ہو۔ (MAN FOR HIMSELF; P. 205)

قرآن کریم (RATIONAL FAITH) کو ایمان کہہ کر پکارتا ہے اور (IRRATIONAL FAITH) کی سخت مخالفت کرتا ہے۔

اس کے بعد آپ آجائیے اس مقام کی طرف جہاں مارکس اور اس کے ہم نواؤں نے کہا تھا کہ:-

نوعِ انسان کی مشکلات کا حل ایسا نظام ہے جس میں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق جان مار کر محنت کرے اور اس کے ماحصل سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے۔ لیکن ہمیں وہ جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) نہیں ملتا جس کی رو سے لوگ ایسا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ یہ جذبۂ محرکہ دل و دماغ کی کامل رضامندی کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیئے۔ شاید نوعِ انسان مزید مراحل طے کرنے کے بعد اس مقام تک پہنچ جائے۔ اس دوران میں ہمیں بر سبیلِ تنزل، سوشلزم کا نظام رائج کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جسے تشدد اور قوت کی رو سے قائم کیا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم نے کہا کہ اس کے لئے نوعِ انسان کو کسی مزید مرحلہ کے طے کرنے کی ضرورت نہیں — یہ جذبۂ محرکہ، دل و دماغ کی یہ کامل رضامندی — مستقل اقدارِ خداوندی پر ایمان سے حاصل ہو سکتی ہے، جسے یہ حضرات اپنی غلط نگہی، تحقیق کی کمی، جذبات کی شدت اور جلد بازی کی وجہ سے مسترد کر چکے ہیں۔ انہوں نے خود ہی کمرے کے اندر سے کنڈی لگا رکھی ہے اور پھر چیخ رہے ہیں کہ ہمیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل اس نظام میں ہے جس میں:-

(۱) تمام افراد کے رزق۔ ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری اس نظام کے سر ہو جو اقدارِ خداوندی کے مطابق قائم ہو۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ۔ (۱۱/۶)

(۲) یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ بنیادی سرچشمۂ رزق، ارض پر کسی کی ذاتی ملکیت نہ ہو۔ بلکہ یہ اس نظام کی تحویل میں رہے۔ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۔ (۴۲/۴۹)

(۳) اس میں ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق محنت کرے۔ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۔ (۵۳/۳۹)

(۴) اس محنت کے ماحصل میں سے صرف اپنی ضروریات کے لئے لے، باقی سب اپنے دل و دماغ کی کامل رضامندی سے دوسرے ضرورت مندوں کے لئے چھوڑ دے۔ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ ۔ (۲/۲۱۹)

(۵) بلکہ عند الضرورت، جن لوگوں کی ضرورت زیادہ ہو، انہیں اپنے آپ پر بھی ترجیح دے۔ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔ (۵۹/۹)

(۶) اور یہ سب کچھ اس لئے کرے کہ یہ اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔ اس کے لئے وہ نہ کسی سے ستائش کا متمنی ہو، نہ صلہ کا امیدوار۔ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۔ (۷۶/۹)

(۷) اور ایسا عمر بھر کرتا چلا جائے۔ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۔ (۳/۱۰۱)

ہم پوچھتے ہیں ان حضرات سے کہ اس ایمان میں کون سی بات قابلِ اعتراض ہے اور کون سی شق اندھی عقیدت پر مبنی ......؟

———— (۹) ————

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ایمان کی وہ کونسی بنیادی شق ہے جس پر قرآن کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے؟ جس قدر یہ سوال اہم ہے، اسی قدر قرآن کی رُو سے اس کا جواب آسان — معاشی نظام کوئی بھی ہو، اس کے دو اہم ستون ہوتے ہیں۔ ایک وسائلِ پیداوار، اور دوسرے سامانِ زیست پیدا کرنے کی انسانی صلاحیتیں۔ انہی دو ستونوں کے صحیح ہونے کی صورت میں وہ نظام صحیح ہو سکتا ہے، اور انہی کے غلط ہونے سے غلط — اب دیکھئے کہ اس کے لئے، قرآنِ کریم وہ کونسا محور تجویز کرتا ہے جس کے گرد، اس نظام کی ساری مشینری گردش کرتی ہے۔ وہ محور ان چار لفظوں پہ ایمان ہے کہ:-

وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۔ (۱۶/۵۳)

کس بات پر ایمان؟ آسان ترین زبان میں ان چار لفظوں کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کے وسائلِ رزق ہوں یا انسانی صلاحیتیں، ان میں سے کوئی چیز بھی میری اپنی نہیں۔ یہ سب خدا کی عطا فرمودہ ہیں۔ یہ میرا ایمان ہے اور اسی کے مطابق عمل پیرا ہونا، میرا نصب العینِ حیات۔ یعنی یہ ایمان کہ؎

عشق میں ایک تم ہمارے ہو — باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

آئیے! بارگہِ قرآنی سے اس اجمال کی تفصیل طلب اور تلاش کریں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

(۵)

اِس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ دنیا میں کوئی نعمت ایسی نہیں جو تمہیں خدا کی طرف سے نہ ملی ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے نعمت میں کیا کچھ شامل ہے۔

اس لفظ (نعمت) کے لغوی معنی ہیں ہر وہ شے جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہو۔ مال و دولت آسودگی اور خوشحالی۔ زندگی کی ہر آسائش۔ نیز سرفرازی اور سربلندی۔ ان تمام مفاہیم کے لئے یہ لفظ آتا ہے۔ اسکے ان معانی پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ زندگی کی کونسی خوشگواری اور سربلندی ہے جو اس میں شامل نہیں ہو جاتی۔ اور جب ایک مومن یہ کہتا ہے کہ ان میں سے جو کچھ بھی مجھے حاصل اور میسّر ہے، نہ وہ میری ملکیت ہے، نہ ہی میرے کسب و ہنر کا نتیجہ۔ یہ سب خدا کی ملکیت اور اُسی کا عطا کردہ ہے، تاکہ میں اسے اس کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صرف میں لاؤں تو وہ اپنے ایمان کا اظہار کرتا ہے۔ اس مقام پر اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ جس چیز کو خدا اپنی کہتا ہے، اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی اور اسے اسی کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق صرف میں لانا چاہیئے۔ اور دوسرے یہ کہ جن امور کا پورا کرنا خدا اپنی ذمہ داری قرار دیتا ہے، عملاً وہ ذمہ داری اس نظام کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے متعین کردہ پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے وجود میں آئے۔ اس کو نظامِ خداوندی یا اسلامی مملکت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

لفظ نعمت کے اجمالی مفاہیم کو آپنے دیکھ لیا۔ اب دیکھئے کہ قرآنِ کریم عملاً کون کون سی چیزوں کو اس میں شامل کرتا ہے۔ بغرضِ اختصار میں ان میں سے ایک ایک، دو دو، مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ان کی تفاصیل میری تصانیف میں ملیں گی۔

(۱) سب سے پہلے سامانِ زیست (رزق) کو لیجئے۔ اس میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جن پر زندگی کی بقا اور استحکام کا دارومدار ہے۔ اس کے متعلق سورۂ فاطر میں اجمالی طور پر کہا کہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ .... یَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ .... (۳۵/۳) "اے نوعِ انسان! تم اللہ کی ان نعمتوں کو ہر وقت سامنے رکھو جن سے اس نے تمہیں نوازا ہے۔ وہ تمھیں آسمانی فضا اور زمینی زرخیزی، دونوں کے ذریعے سامانِ زیست عطا کرتا ہے"۔

رزق خدا کی نعمت ہے

آپ دیکھئے کہ اس میں وہ تمام چیزیں آگئیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔

سورۃ النحل میں ہے کہ خدا نے تمہارے فائدے کے لئے سمندر کو قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا تاکہ تم اس سے تروتازہ غذا حاصل کرو۔ نیز سامانِ زیبائش و آرائش۔ مثلاً موتی — پھر زمین کو دیکھو کہ اس میں سے کیا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے بعد کہا کہ یہ تو نعمائے خداوندی کی یونہی دو چار مثالیں ہیں۔ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ (۱۶/۱۴-۱۸)۔ اگر تم ان کا شمار کرنا چاہو تو ان کا کبھی احاطہ نہ کرسکو۔ یہ اس قدر بے حد و حساب ہیں۔ (نیز ۳۵/۱۲)

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر کشتیوں (جہازوں) کا ذکر کیا ہے کہ وہ اس قدر وزنی سامانِ زیست لائے ہوئے کس طرح سینۂ بحر پر بطوں کی طرح تیرتی پھرتی ہیں۔ اس قسم کا فطری نظام قائم کر دینا تمہارے بس کی بات نہ تھی۔ یہ سب خدا کا قائم کردہ ہے اور تمہارے فائدے کے لئے ہے۔ (۳۰/۴۶ و ۳۱/۳۱ و ۴۲/۳۲)۔ ان کا شمار بھی نعمائے خداوندی میں ہوتا ہے۔

یہ تو سمندر کی بات ہے۔ اس نے کہا کہ سطحِ ارض کی طرف آؤ اور دیکھو کہ اس نے کس طرح مختلف مویشیوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم ان کا گوشت کھاتے، دودھ پیتے اور ان سے سواری کا کام بھی لیتے ہو۔ (۳۶/۷۲)۔ ان کی کھالوں کے خیمے بناتے، اور ان کی اون سے اپنے لئے لباس اور دیگر ضروریات کی چیزیں بناتے ہو — ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ۔ (۴۳/۱۲)۔ "انہیں تم نے تو نہیں بنایا۔ یہ سب تمہارے لئے نشوونما دینے والے کی طرف سے بطورِ نعمت عطا ہوئی ہیں"۔

بعض مقامات پر ان تفاصیل کو اس قسم کے مختصر الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا کہ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً .... (۳۱/۲۰-۲۱)۔ کیا تم اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے اس سب کو

خدا نے تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے اور اس طرح کھلی اور چھپی ہوئی نعمتوں کو عام کر دیا ہے"۔ اس کے بعد کہا ہے
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ۔ (۳۱/۲۰)۔ لیکن اس
کے باوجود تم دیکھو گے کہ بعض لوگ خدا کے متعلق یونہی کج بحثی کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس نہ صحیح علم
ہوتا ہے نہ سچی راہنمائی نہ کوئی واضح ضابطۂ ہدایت۔ بس یونہی جھگڑتے رہتے ہیں۔

سورۂ جاثیہ میں — وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ کے بعد کہا جَمِيْعًا مِّنْهُ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (۴۵/۱۳)۔ ارض و سما میں جو کچھ ہے اسے تمہارے فائدے کے
لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں، اصل حقیقت تک پہنچنے کے لئے
بہت سی نشانیاں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ حقیقت کیا ہے جو ان آیاتِ خداوندی میں بیان کی گئی ہے اور فکر و
تدبر کے بعد نکھر کر سامنے آسکتی ہے۔ وہ حقیقت ان دو مختصر لیکن جامع الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ ایک تو مِنْهُ
اور دوسرے لَكُمْ۔ مِنْهُ کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام وسائل پیداوار، نہ تمہارے پیدا کردہ ہیں، نہ زرخرید۔
— یہ خدا کے پیدا کردہ ہیں، اور اس کی طرف سے تمہیں، بلا مزد و معاوضہ، بطور نعمت عطا ہوتے ہیں۔ یعنی
وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ (۱۶/۵۳)۔ ہر نعمت خدا کی عطا کردہ ہے، تمہاری ملکیت نہیں۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ ان تمام آیات میں لفظ لَكُمْ یا لَهُمْ آیا ہے۔ یعنی یہ نعماتِ خداوندی
یہ سامانِ زیست جو بلا مزد و معاوضہ عطا ہوا ہے، کسی ایک فرد، ایک خاندان، ایک قبیلہ، ایک قوم یا
ایک طبقہ کے لئے نہیں تمام انسانوں کے فائدے کے لئے ہے۔ یہ سَوَاءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ (۴۱/۱۰) ہے۔ یعنی
تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں سامانِ زیست۔ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ۔ (۵۶/۷۳)۔ ہر بھوکے کیلئے خوراک
کا سامان۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (۱۷/۲۰) — جو وسائلِ رزق خدا کی طرف سے نوعِ انسان کو
عطیۂ ملے ہوں، کسی کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ ان کے آگے رکاوٹیں کھڑی کر دے اور کہہ دے کہ یہ میری ملکیت
ہیں، ان میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔

سورۂ النحل میں اس حقیقت کو اور بھی واضح انداز میں بیان کر دیا۔ پہلے ان مختلف چیزوں کا ذکر کیا، جو
انسانی زندگی کی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں اور صفحۂ ارض پر بکھری پڑی ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ كَذٰلِكَ يُتِمُّ
نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ۔ (۱۶/۸۱) اس طرح اس نے تمہیں اپنی تمام نعمتیں عطا کر دیں۔ اب تمہارے
لئے ضروری ہے کہ تم قوانینِ فطرت کے مطابق انہیں حاصل کرو، اور اقدارِ خداوندی کے مطابق انہیں نوعِ انسان

کی منفعتِ کلّی کے لئے استعمال کر و۔ اسے کہیں گے احکامِ خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا۔ اللہ پر ایمان لانا۔ اسلام قبول کرنا۔ اس کے بعد رسول اللہ سے کہا کہ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔ (۱۶/۸۲) اگر اس کے بعد بھی یہ لوگ اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے، کہ یہ سامانِ زیست تمام انسانوں کے مشترکہ مفاد کے لئے ہے، اعراض برتیں، اس سے گریز کی راہیں نکالیں، اس سے سرکشی اختیار کریں، تو تم نے ان تک صحیح بات پہنچا دی، اور نہایت واضح طور پر پہنچا دی۔ اگر یہ اُسے تسلیم نہیں کرتے تو اس کا نتیجہ خود بھگتیں گے۔ اور اس کے بعد کہا کہ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۱۶/۸۳)۔ بات یہ ہے کہ یہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں۔ اسے اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں کہ یہ تمام وسائل پیداوار خدا کی طرف سے بطور نعمت ملے ہیں۔ یہ مفت ملے ہیں۔ بلا مزد و معاوضہ ملے ہیں۔ لیکن عملاً اس سے انکار کرتے ہیں اور ان پر اس طرح قابض ہو جاتے ہیں گویا یہ ان کے زرخرید ہیں۔ یہ کفرانِ نعمت درحقیقت خدا کا انکار ہے۔ یہ اسلام نہیں کفر ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں اپنے ان عزیزوں سے جو خدا اور ایمان کے الفاظ سُن کر شکن بر جبیں، کف بر دہان، اور نعل بر آتش ہو جاتے ہیں کہ خدا کے اس تصور، اور اس پر اس ایمان میں انہیں کون سی بات قابلِ اعتراض نظر آتی ہے ۔ اور اس کے بعد وہ سوچیں کہ جب ایمان نام ہو کسی صداقت کے برضا و رغبت، بطیبِ خاطر، قبول اور اختیار کرنے کا، تو مارکس اور لینن نے جو کہا تھا کہ ان کے تصور کا معاشی نظام صرف ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہو سکے گا جو اس کے لئے برضا و رغبت آمادہ ہوں، تو کیا قرآنِ کریم کی اس حقیقت پر ایمان رکھنے والے ہی وہ لوگ نہیں ہوں گے جو اسے قائم کر سکیں۔ انہوں نے ہی پہلے اسے قائم کیا تھا اور انہی کے ہاتھوں یہ پھر قائم ہو سکے گا۔

(۲) ابھی تک بات اتنی ہی ہو رہی تھی کہ سامانِ رزق کا بافراط ملنا، خدا کی نعمت ہے اور اس حقیقت کا تسلیم کرنا کہ یہ سب سامان تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے بطور عطیہ ملا ہے، خدا پر ایمان ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھیئے اور نعمت کا ایک اور گوشہ سامنے لائیے۔ سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔ يٰبَنِيْٓ

اقوامِ عالم پر فضیلت

اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ (۲/۴۷)۔ تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو جب اس نے تمہیں اس سے نوازا تھا۔ یعنی تمہیں تمہاری ہمعصر اقوام پر افضلیت (SUPREMACY) عطا کی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی قوم کو، اس کی ہمعصر اقوام میں، ممتاز حیثیت حاصل ہونا بھی خدا کی نعمت ہے۔ بنی اسرائیل

کو یہ نعمت اس وقت حاصل ہوئی تھی جب اس قوم نے اپنی اجتماعی زندگی کو اقدارِ خداوندی کے قالب میں ڈھالا تھا، اور اس طرح وہ شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی کی وارث قرار پا گئی تھی۔ یہی وہ نعمت تھی جس کے پیشِ نظر حضرت سلیمانؑ نے کہا تھا کہ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ۔ (۲۷/۱۹)
اے میرے نشوونما دینے والے! مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیری اس نعمت کا شکریہ ادا کروں جس سے تو نے مجھے اور میرے آباء و اجداد کو نوازا ہے۔ وہ شکرِ نعمت اس طرح ادا ہوگا۔ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ۔ وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ۔ (۲۷/۱۹)۔ میں ایسے کام کروں جو عالمگیر انسانیت کو سنوارنے والے ہوں۔ اور چونکہ ایسا کچھ صرف اجتماعی نظام کی رُو سے ممکن ہوگا، اس لئے مجھے ایسی جماعت کا فرد بنا دے جو تیرے پروگرام کے مطابق اس فریضہ کو سرانجام دے۔

اس سے ظاہر ہے کہ آسائش و کشائشِ رزق ہی نہیں بلکہ اقوامِ عالم پر فضیلت بھی خدا کی نعمت ہے لیکن یہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب ایسا نظام قائم کیا جائے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ جب جماعتِ مومنین سے کہا گیا تھا کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳/۱۳۸)، تو اس سے یہی مراد تھی کہ جب تک مومن رہو گے، تم پر دنیا کی کوئی قوم غالب نہیں آسکے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم اس نظام کو قائم کر دے، جس میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہو نہ محکوم، تو یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ (۱۱۰/۲)۔ لوگ فوج در فوج اس میں داخل ہوتے چلے جائیں گے۔ اور اس طرح اس قوم کو ایسی قوت اور فضیلت حاصل ہو جائے گی کہ دنیا کی کوئی قوم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گی۔ اگر کوئی قوم ان کے مقابل آئے گی تو خاسر و نامراد رہے گی۔ اور یہ قوم فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ۔ (۳/۱۷۳)۔ نعمائے خداوندی سے جھولیاں بھر بھر کر لائے گی اور کسی قسم کا شر انہیں چھو تک نہیں سکے گا۔ یہ اس لئے کہ وَاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ۔ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ۔ (۳/۱۷۳)۔ ان لوگوں کی زندگی اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوگی — اور جو قوم اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو، اس پر فضیلتوں اور نعمتوں کی بارش ہوتی ہے — وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ۔ وہی زمین کے وارث قرار پاتے ہیں نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ۔ انہیں یہاں بھی جنتی زندگی عطا ہوتی ہے جس میں انہیں ہر طرح کا اقتدار و اختیار حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں بھی جنتی زندگی۔ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ۔ (۳۹/۷۴)۔ تم دیکھو کہ خدا کے پروگرام کے مطابق کام کرنے والوں کی محنت کا اجر کس قدر نعمت بداماں ہوتا ہے؟

—— (۞) ——

یہاں تک ہم نے وسائلِ رزق کے متعلق گفتگو کی ہے۔ لیکن فکرِ انسانی کی رو سے قائم کردہ معاشی نظام کی اصل دشواری اس سے آگے جاکر سامنے آتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مارکس نے کہا تھا کہ سوشلزم میں اتنا تو تم کرلو گے کہ قوت اور تشدّد کے ذریعے، وسائلِ رزق، لوگوں کی ذاتی ملکیت اور قبضہ سے نکال کر اُسے مملکت کی تحویل میں دے دو۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ان وسائل سے رزق حاصل کرنے، یعنی اکتسابِ رزق کی صلاحیتیں مختلف لوگوں میں مختلف ہوں گی۔ جن میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوگی وہ زیادہ مانگیں گے تو انہیں زیادہ دینا بھی پڑے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی امیر ہوگا کوئی غریب۔ لہٰذا طبقاتی تفاوت سوشلزم میں ختم نہیں ہوسکے گا۔ یہ تفریق بدستور باقی اور قائم رہے گی۔ اسی طرح جس طرح یہ کیپیٹل ازم میں باقی اور قائم ہے۔

قارونی ذہنیت

حقیقت یہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہی صلاحیتوں کے اس فرق پر ہے۔ قرآنِ کریم نے قارون کو نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے جب اس سے کہا گیا کہ تم اتنا زیادہ سمیٹ کر کیوں رکھے جارہے ہو، تو اس نے جواب میں کہا تھا کہ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ۔ (۲۸/۷۸)۔ یہ میرے اپنے کسب و ہنر، میری اپنی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ ان میں دخل انداز ہو؟ قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ یہ ذہنیت صرف قارون کی نہیں تھی۔ ہر انسان (جو وحی سے بے نیاز ہوجائے گا) یہی کہے گا۔ بَلْ هِیَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (۳۹/۴۹) فتنہ و فساد کی اصلی جڑ یہی ذہنیت ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بات بڑی معقول ہے اور مبنی بر حقیقت۔

اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو سوشلزم اور نظامِ سرمایہ داری میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا، اس لئے کہ یہ ذہنیت جسے قرآن نے فتنہ کی جڑ قرار دیا ہے، دونوں کی بنیاد میں موجود رہتی ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں ابھی عرض کروں گا، سوشلزم نظامِ سرمایہ داری سے بھی بدتر قرار پاجاتا ہے۔ صلاحیتوں کے اختلاف کو دونوں تسلیم کرتے ہیں۔ اور دونوں کے ہاں

اُجرتیں مقرر کرنے کا پیمانہ

یہ بھی مسلّم ہے کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیت (یعنی کارکردگی) کے مطابق اُجرت ملنی چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کے پاس وہ پیمانہ کونسا ہے جس سے آپ یہ ناپ سکیں کہ فلاں نوعیت کی صلاحیت، یا کام کی یہ اُجرت ہونی چاہیئے۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ اور کس طرح کیا جائے گا کہ (مثلاً) مزدور کی اُجرت یہ ہونی چاہیئے اور انجنیر کی یہ۔ نظامِ سرمایہ داری ہو یا سوشلزم، یہ فیصلہ بہرحال آجر (یعنی EMPLOYER) ہی کرے گا کہ اسے یہ ملنا چاہیئے اور اُسے وہ — جب کارخانہ کا

مالک سیٹھ تھا تو اُس کا فیصلہ وہ کرتا تھا۔ جب اس کارخانہ کو (NATIONALIZED) کرکے حکومت اپنی تحویل میں لے لے، تو اس کا فیصلہ برسرِاقتدار طبقہ کرے گا۔ مناجر (EMPLOYEE) کو دونوں شکلوں میں یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اپنی اُجرت آپ مقرر کرے۔ یہ جو آپ اس وقت محنت کشوں اور مالکوں میں اس قدر لڑائی جھگڑے دیکھ رہے ہیں، خواہ وہ مالک سیٹھ ہوں اور خواہ حکومت، تو ان کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مزدور اس معاوضہ سے زیادہ اپنا حق سمجھتا اور طلب کرتا ہے جسے مالک مقرر کرتا ہے۔ اور چونکہ اس حق کے ماپنے کا پیمانہ دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں ہوتا، اس لئے اس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ اور ہو سکتا ہی نہیں۔ سوشلسٹ نظام اس فساد کو تشدد کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس میں بُری طرح ناکام رہتا ہے۔ تشدد کے ذریعے کوئی فساد مٹ نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فساد کچھ وقت کے لئے دب جاتا ہے۔ لیکن جب یہ فساد دبا دیا جاتا ہے تو اور مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔ مزدور، جی لگا کر کام نہیں کرتا، اور یہ وہ چیز ہے جسے آپ کسی سے ..... زبردستی کرا ہی نہیں سکتے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

لیکن میں نے کہا ہے کہ سوشلزم کا نظام، نظامِ سرمایہ داری سے بھی زیادہ بدتر نتائج پیدا کرتا ہے وہ اس طرح کہ جب مختلف کارخانے (محنت گاہیں) مختلف مالکوں کے ہوں، تو کم از کم مزدور کو یہ ذہنی اطمینان ضرور حاصل رہتا ہے کہ اِس کارخانہ میں حسبِ پسند کام اور اُجرت نہ ملے گی تو میں کسی اور جگہ کام تلاش کر لوں گا۔ لیکن سوشلزم میں چونکہ تمام محنت گاہوں کا مالک ایک ہی ہوتا ہے یعنی حکومت، اس لئے مزدور سے یہ ذہنی اطمینان بھی چھن جاتا ہے، اور وہ اپنے آپ کو بے بس قیدی سمجھنے لگ جاتا ہے — غلامی اور آزادی میں یہی بنیادی فرق ہے۔ کام غلام بھی کرتا ہے اور اپنے کھیت میں ہل چلانے والا کاشتکار بھی، لیکن دونوں کی قلبی کیفیت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ غلام کی ہر وقت یہ تمنا ہوتی ہے کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ وہ اس جہنم سے نجات حاصل کرے۔ کاشتکار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اگر زیادہ وقت ملے تو وہ اور بھی جان مار کر محنت کرے۔ قرآنِ کریم نے اس نفسیاتِ غلامی کو بڑے بلیغ انداز میں واضح کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے کہا کہ میں تمہارے پاس یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ بنی اسرائیل کو اپنی غلامی کی زنجیروں سے رہا کر دو۔ فرعون نے جواب میں کہا کہ ہم نے تم پر اور تمہاری قوم پر یہ احسان کئے اور وہ احسان کئے۔ اور تم ان احسانات کا بدلہ اس طرح دینے کے لئے آئے ہو کہ اس قوم کو میرے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دو! اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ

نے جو کچھ کہا وہ غلامی اور آزادی کے فرق کو نمایاں طور پر سامنے لے آتا ہے۔ آپ نے کہا کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِي إِسْرَائِيلَ۔ (۲۶/۲۲)۔ تم جو اپنی نعمتیں گنا رہے ہو تو کیا ان کا بدلہ یہ ہے کہ تم نے قوم بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے؟ اس سے واضح ہے کہ کام کرنے والا جب بھی اپنے آپ کو کام کرنے پر مجبور سمجھے، وہ کبھی جی لگا کر کام نہیں کرسکتا۔ محنت کش جب اپنے آپ کو مجبور سمجھے گا تو اُسے کچھ بھی اُجرت دیجئے، نہ وہ اس پر مطمئن ہوگا، نہ جان مار کر کام کرے گا۔ اگر محنت کش نظامِ سرمایہ داری میں اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا تو سوشلزم میں مجبور تر سمجھتا ہے اور یہی چیز اس نظام کی ناکامی کی بنیادی وجہ ہے۔ محنت کش سے یہ کہنا کہ جو کچھ ہم تمہیں دیتے ہیں، تمہیں اس پر کام کرنا ہوگا۔ طوعاً نہ کرو گے تو کرہاً کام کرایا جائے گا اور تم اسے چھوڑ کر کہیں اور جا بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ رزق کے تمام دروازوں پر ہمارا ہی کنٹرول ہے، یہ ایک ایسا جہنم ہے جس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔

آئیے ہم دیکھیں کہ قرآنِ کریم اس مشکل ترین مسئلہ کا حل کیا بتاتا ہے، وہی حل جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ یعنی اس حقیقت پر ایمان کہ وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۔ (۱۶/۵۳)۔ ہر نعمت خدا کی عطا کردہ ہے میری اپنی نہیں ــــ ہم نے پہلے ان نعمائے خداوندی میں وسائل پیداوار کا ذکر کیا ہے۔ اب دیکھئے کہ وہ انسانی صلاحیتوں کے متعلق کیا کہتا ہے۔

انسانی صلاحیتیں بھی منجانب اللہ

قرآنِ کریم نے جس طرح وسائل پیداوار میں ارض (زمین) کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ (اور اس کی حیثیت ہے بھی ایسی) اسی طرح اس نے انسانی صلاحیتوں میں سمع (سماعت) وبصر (بصارت) اور قلب یا فواد (قوتِ فیصلہ) کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ یہ ذرائع (حواسِ خمسہ) معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور پھر قلب یا فواد، ان سے کسی نتیجہ یا فیصلہ تک پہنچتا ہے۔ ان ذرائع معلومات کے متعلق قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر کہہ دیا کہ نہ یہ تمہاری پیدا کردہ ہیں، نہ ہی خرید۔ یہ خدا کی طرف سے عطا کی گئی ہیں۔ وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا۔ تم پیدا ہوتے ہو تو بالکل کورے۔ علم سے لابلد۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۔ (۱۶/۷۸)۔ خدا نے تمہیں ذرائع معلومات اور قوتِ فیصلہ عطا کی ہے۔ اور انہیں اس نے نعمت اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ (۱۶/۸۳)۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ خدا ہی نے تمہیں قوتِ گویائی عطا کی ــــ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۔ (۵۵/۴)۔ یعنی زبان کے ذریعے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا طریق، نیز تحریر کی صلاحیت۔ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۔ (۹۶/۴)۔ اور اس طرح انسان اس قابل ہوگیا کہ جن امور کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا، ان کا علم حاصل کرسکے عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ

یَعْلَمْ ۔ (۹۶/۵)۔ اس لئے صحیح الدماغ ہونے کو بھی خدا کی نعمت قرار دیا ہے۔ جب رسول اللہ کو مخاطب کر کے (مخالفین کے اعتراض کے جواب میں) کہا کہ وَمَا اَنْتَ بِنِعْمَۃِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۔ (۶۸/۲)۔ یہ خدا کی نعمت ہے کہ تو پاگل نہیں صحیح الدماغ ہے ـــ ایک جگہ اس نے وسائلِ پیداوار (ذرائع رزق) اور انسانی صلاحیتوں کے بنیادی ذرائع کا یکجا ذکر کیا ہے جب کہا کہ قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ـــ اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ ۔ (۱۰/۳۱) ان سے پوچھو کہ کون ہے جو زمین اور آسمان سے سامانِ رزق عطا کرتا ہے اور تمہارے ذرائع معلومات پر جس کا بنیادی کنٹرول ہے؟ ـ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ تسلیم کریں گے کہ خدا ہی ایسا کرتا ہے فَسَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰہِ ۔ (۱۰/۳۱)۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُس زمانہ کے مخالفین اس حد تک خدا کو ضرور مانتے تھے، اس لئے ان کی طرف سے یہی جواب ملتا تھا، لیکن آج کے منکرینِ خدا کی طرف سے یہ جواب نہیں ملے گا۔ لیکن قرآن اس سے بحث نہیں کرتا کہ ان کی طرف سے کیا جواب ملے گا، اور اس جواب کی حیثیت کیا ہو گی؟ ان مباحث کی رُو سے وہ انسان کو جس نقطہ تک پہنچانا چاہتا ہے، اس تک ہر جواب پہنچا دے گا اور وہ نقطہ یہ ہے کہ وسائلِ پیداوار اور انسانی صلاحیتوں کے ذرائع، بہر حال انسان کے اپنے پیدا کردہ نہیں، اس لئے وہ انہیں اپنی ذاتی ملکیت قرار نہیں دے سکتا۔ اس حقیقت کو (کہ یہ انسان کے پیدا کردہ نہیں) خدا پرست اور منکرِ خدا دونوں تسلیم کریں گے۔ معاشرہ ان صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے سامان اور ذرائع بہم پہنچاتا ہے اور فرد اپنی محنت سے ان میں جلا پیدا کرتا ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم رہتی ہے کہ بنیادی طور پر یہ انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتیں۔ اور یہیں سے قرآن آگے بات چلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاشرہ میں مختلف نوعیتوں کے کام ہونے ہیں جن کے لئے مختلف قسم کی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ کسی کے لئے ذہنی صلاحیت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کسی کے لئے جسمانی قوت کی۔ اس حد تک صلاحیتوں میں تفاوت، انسان کی تمدنی ضروریات کا تقاضا ہے۔ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا۔ (۴۳/۳۲) اختلافِ مدارج سے مقصد یہ ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کے زیرِ ہدایات اور زیرِ نگرانی کام کر سکیں۔ لیکن (وہ کہتا ہے کہ) صلاحیتوں کے تفاوت کو اگر اس بات کے لئے وجہِ جواز قرار دیا اور بطور سند پیش کیا جائے کہ میں اپنی بہتر صلاحیتوں کی وجہ سے جو زیادہ دولت کماتا ہوں، وہ میری ذاتی ملکیت ہے جس میں کوئی دخیل نہیں ہو سکتا، تو یہ وہی قارونی (سرمایہ دارانہ) ذہنیت ہے، جو باطل ہے۔ دیکھئے! قرآن کریم نے اس حقیقت کو کیسے دلنشیں انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۔ اکتسابِ رزق

کے معاملہ میں بعض لوگوں کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اور بہتر صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ۔ جن لوگوں کو زیادہ صلاحیت حاصل ہوتی ہے وہ اس صلاحیت کے ماحصل کو اپنی ملکیت قرار دے لیتے ہیں اور اسے ان لوگوں کو نہیں دیتے جو ان کی ماتحتی میں کام کر رہے ہوں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم

صلاحیتوں میں اختلاف

ایسا کیوں نہیں کرتے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ۔ واہ! اس سے تو گھوڑا گدھا سب برابر ہو جائینگے۔ میری کمائی میرے لئے، ان کی کمائی ان کے لئے۔ میں اپنی کمائی انہیں کیوں دے دوں؟ اس کے جواب میں قرآن صرف دو لفظ کہتا ہے، وہ یہ کہ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ (۱۶/۷۱)۔ ان کی اس ذہنیت کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ ان کی صلاحیتیں ان کی اپنی پیدا کردہ ہیں، خدا کی نعمت نہیں ہیں جو انہیں بلامزد و معاوضہ عطا ہوئی تھیں۔ اس کے بعد قرآنِ کریم ان کے اس مفروضہ اور اس پر مبنی ذہنیت کی تردید، نہایت سادہ اور دلنشیں انداز سے روزمرہ کے واقعات کی رو سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تمہارے نزدیک اصول یہ ہے، اور تم سمجھتے ہو کہ یہ اصول بڑا معقول اور غیر متبدل ہے کہ جو جتنا کمائے اسے اتنا ہی ملنا چاہیئے، دوسرے کی کمائی میں اس کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیئے تو تم بتاؤ کہ تم اپنے گھر میں اس اصول پر کاربند کیوں نہیں رہتے؟ جو بچہ تمہارے ہاں پیدا ہوتا ہے اس میں کچھ بھی کمانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بھی یہ بچے ایک عمر تک کچھ بھی کما کر نہیں لاتے۔ لیکن اس کے باوجود، تم اپنی کمائی کا بیشتر حصہ ان پر خرچ کر دیتے ہو۔ بلکہ ان کی ضروریات اور تقاضے پہلے پورے کرتے ہو۔ تمہارا اصول اگر ایسا ہی محکم اور بے لچک ہے تو تم یہاں اس پر قائم کیوں نہیں رہتے؟ یہاں تم اس اصول پر عمل کرتے ہو کہ جو شخص کمانے کے قابل ہے وہ پوری پوری محنت سے کمائے، اور اس کی کمائی سے ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے۔ تم میں اور ہم میں فرق یہ ہے کہ تم صرف اپنے گھر کو اپنا گھر سمجھتے ہو اور ہم ساری دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ تم صرف اپنے بال بچوں کو اپنا سمجھتے ہو اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ — مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا۔ اس لئے کہ جس خدا پر ہمارا ایمان ہے۔ وہ کسی خاص خاندان کا خدا نہیں، وہ رب العالمین ہے — اور، یہ پہلا سبق ہے کتابِ ہدیٰ کا — اس کے بعد قرآن اس قسم کی قارونی ذہنیت رکھنے والوں کے متعلق کہتا ہے کہ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ۔ (۱۶/۷۲)۔ یہ لوگ باطل پر ایمان رکھتے ہیں، اور خدا کی نعمتوں سے کفر برتتے ہیں — یہ ہے قرآنِ مجید کی رُو سے کفر اور ایمان کا عملی مفہوم۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں اپنے کمیونسٹ عزیزوں سے کہ وہ بتائیں کہ اس ایمان پر انہیں کیا اعتراض ہے؟ کیا یہ وہی ایمان نہیں جس

کے فقدان کی وجہ سے مارکس یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ حل تو وہی ہے جسے میں اصولی طور پر پیش کر چکا لیکن مجھے وہ جذبۂ محرکہ نہیں ملتا جو اس حل کو ممکن العمل بنا دے۔ قرآن وہ حل بھی پیش کرتا ہے اور اسے ممکن العمل بنانے کا طریق بھی بتاتا ہے۔

کفرانِ نعمت

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم، کفرانِ نعمت کو قارونی (سرمایہ دارانہ) ذہنیت قرار دیتا اور اسے ایمان کی ضد بتاتا ہے (۱۴/۳۴ ؛ ۲۹/۴۷) وہ کہتا ہے کہ یہی وہ کفر ہے جو قوموں کو تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گراتا ہے۔ سورۃ ابراہیم میں ہے۔ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ کُفۡرًا وَّ اَحَلُّوۡا قَوۡمَہُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ۔ (۱۴/۲۸) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر کبھی غور کیا جنہوں نے کفرانِ نعمت کیا، اور اس طرح اپنی قوم کے کارواں کو اس منڈی میں جا اتارا جہاں اس جنس کاسد کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ اس لئے ان کا سارا مال و متاع تباہ ہو گیا ــــ جَہَنَّمَ یَصۡلَوۡنَہَا ؕ وَ بِئۡسَ الۡقَرَارُ۔ (۱۴/۲۹)۔ یعنی ان لیڈروں نے اپنی قوم کو جہنم میں دھکیل دیا۔ کیسی بُری تھی وہ منزل جس میں انہوں نے اُسے جا اتارا؟

کفرانِ نعمت کے مقابلہ میں، اس نے 'شکرِ نعمت' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کفرانِ نعمت کے معنی ہیں یہ عقیدہ کہ وسائلِ پیداوار (ارض) پر انسان کی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے اور رزق پیدا کرنے کی صلاحیتیں بھی اس کی اپنی ہیں اس لئے ان کی رُو سے حاصل کردہ دولت بھی صرف اس کی ملکیت ہے۔ اس کے برعکس، شکرِ نعمت کے معنی ہوں گے اس حقیقت پر ایمان کہ وَمَا بِکُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ (۱۶/۵۳) وسائلِ پیداوار ہوں یا خود میری صلاحیتیں، یہ سب خدا کی عطا فرمودہ ہیں اور انہیں میری تحویل میں اس لئے دیا گیا ہے کہ ان سے حاصل کردہ رزق کو میں اسی کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق اپنے استعمال میں لاؤں اور تقسیم کروں۔ یہ سب اس نظام کی رُو سے ہو گا جو قوانینِ خداوندی کے مطابق ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہو گا جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس طرح حاصل کردہ رزق کو قرآنِ کریم نے رزقِ حلال و طیب قرار دیا ہے اور اس کو خدا کی عبادت (اطاعت)۔ سورۃ النحل کی اس آیۂ جلیلہ پر غور کیجئے اور پھر کانپ اُٹھیئے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

رزقِ حلال

فَکُلُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا۔ خدا نے تمہیں جو رزق عطا فرمایا ہے۔ اُسے حلال اور طیب طریق سے کھاؤ۔ وَّ اشۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ۔ (۱۶/۱۱۴)۔ اگر تم اس کے مدعی ہو کہ تم خدا کے سوا کسی کی عبادت (اطاعت) نہیں کرتے (جیسا کہ تم ہر نماز میں اعتراف و اعلان کرتے ہو کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ ہم صرف تیری عبادت (اطاعت) کرتے ہیں) تو اس

طرح شکرِ نعمت کرو اور اس کی وضاحت اس نے اس سے اگلی آیت میں کر دی جس میں کہا کہ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ ..... (۱۶/۱۱۵)۔ "تم پر حرام قرار دیا گیا ہے مُردار، خون، لحمِ خنزیر۔ اور ہر وہ شے جسے خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔" ــــ اس وقت عزیزانِ من! نہ اس کی فرصت ہے نہ گنجائش کہ میں اس عظیم اور اہم ترین موضوع کی وضاحت کروں۔ (اس کی وضاحت میں نے مطالب الفرقان میں کر دی ہے جس کی پہلی جلد حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا عرض کر دینے پر اکتفا کروں گا کہ قرآن کریم کی رُو سے ہر وہ شے حرام ہے جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب وسائلِ رزق کو غیر اللہ کی طرف منسوب ہی نہیں بلکہ انہیں ان کی ملکیت قرار دے دیا جائے تو وہ رزق، رزقِ حلال کیسے قرار پا سکے گا؟ رزقِ حلال تو وہی رزق ہے جسے خدا نے کہیں رزق اللہ کہا ہے

رزق اللہ

(۱۱/۸۶) کہیں رِزْقُ رَبِّكَ۔ "تیرے رب کا رزق (۲۰/۱۳۱)۔ اسی کو وہ رِزْقًا حَسَنًا۔ کہہ کر پکارتا ہے (۱۱/۸۸) اور اس کی وضاحت یہ کہہ کر دیتا ہے۔ وَرَزَقَنِي مِنْهُ۔ یہ وہ رزق ہے جو کسی انسان سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اسی کو وہ رِزْقٌ كَرِيمٌ۔ (۲۲/۵۰)۔ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی "عزت کی روٹی"۔ حقیقت یہ ہے کہ "عزت کی روٹی" ہوتی وہ ہے جس میں انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج اور دست نگر نہ ہو۔ جونہی انسان روٹی کے لئے دوسرے انسانوں کا محتاج ہوا ــــ خواہ یہ دوسرے انسان وہ ہوں جنہوں نے ذرائع رزق کو انفرادی طور پر اپنی ملکیت میں لے رکھا ہو، یا انسانوں کا کوئی گروہ جو ان ذرائع پر قابض ہو کر بیٹھ جائے ــــ تو وہ انسان شرف و مجدِ انسانیت سے محروم، اور ذلیل و خوار ہو گیا۔ یہی وہ غیر اللہ کے ہاتھوں سے ملنے والا رزق ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی!

انسان تو ایک طرف، جو حیوان اپنے رزق کے لئے انسانوں کا محتاج ہو جائے وہ اپنی جبلّی خصوصیات کھو بیٹھتا ہے۔ جنگل کے شیر اور سرکس کے شیر کا فرق واضح ہے ــــ اور یہ بات صرف اس نظام میں ممکن ہے جو ان انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو جن کا ایمان یہ ہو کہ وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ۔ (۱۶/۵۳)۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو جان مار کر محنت کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ کمائیں گے۔ اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لیں گے اور بقایا دوسرے ضرورتمندوں کے لئے کھلا چھوڑ دیں گے[1]۔ یہ" دوسرے لوگ" کبھی اس رزق کو لطور

(1) فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

خیرات یا احسان نہیں لیں گے بلکہ اپنا حق سمجھ کر طلب اور وصول کریں گے کہ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (۲۵-۲۴/۷۰)۔ ان کے مال میں ضرورت مندوں کا ایسا حق ہے جس کا سب کو علم ہے"۔ اس نظام کی یہی وہ بنیاد ہے۔۔ یعنی یہ ایمان کہ تمام نعمتیں خدا کی طرف سے ہیں جس کے متعلق نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے جماعتِ مومنین کو تاکید کی گئی کہ وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔(۹۳/۱۱) "اپنے نشوونما دینے والے کی نعمتوں کا عام چرچا کرتے رہا کرو"۔

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انسان کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کس طرح ہوتی، اور قائم کیسے رہ سکتی ہے۔ اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تبدیلی پیدا ہوتی اور قائم رہتی ہے نظریۂ حیات سے متعلق تبدیلی سے۔ منکرینِ خدا کی غلط نگہی یہی نہیں ہوتی کہ وہ خدا کی ہستی کے منکر ہوتے ہیں۔ ان کی حقیقی غلط نگہی یہ ہوتی ہے کہ وہ انسانی زندگی کو بس اسی دنیا کی زندگی قرار دیتے ہیں جس کا خاتمہ موت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس نظریۂ حیات کے بعد، انسان میں کوئی جذبۂ محرکہ ایسا نہیں پیدا ہوتا جو اسے اس پر آمادہ کر دے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس کے ماحصل میں سے زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیدے۔ یہ جذبہ اس ایمان سے پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی صرف طبیعیاتی زندگی نہیں، وہ موت کے بعد بھی قائم رہتی اور آگے چلتی ہے۔ انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے اس کی ذات کہا جاتا ہے۔ اس زندگی میں انسان کی تگ و دو کا مقصد صرف اپنے جسم کی نشوونما نہیں، اپنی ذات کی نشوونما بھی ہے۔ اس کے جسم کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ اپنے صرف میں لاتا ہے، لیکن اس کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ اس لئے وہ زیادہ سے زیادہ محنت کر کے زیادہ سے زیادہ کماتا ہے، اور اس میں سے کم از کم اپنے لئے رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیتا ہے تاکہ اس سے اس کی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہوسکے۔ موت سے انسانی جسم تو باقی نہیں رہتا، لیکن اس کی ذات آگے جاتی ہے تاکہ وہ مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔ یہ ایمان درحقیقت خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی صداقت کے یقین پر استوار ہوتا ہے جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ میرا ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے جو میرے سامنے

(فٹ نوٹ صفحۂ گزشتہ)

۱؎ ضرورت مندوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو یا تو محنت کرنے سے معذور ہوں یا جن کی محنت کا ماحصل ان کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہو۔ اول الذکر کو محروم اور ثانی الذکر کو سائل کہہ کر پکارا گیا ہے۔

آکر رہے گا ــــ خواہ اس دنیا میں اور خواہ اس کے بعد ــــ اسے ایمان بالآخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ایمان کے

ایمان بالآخرت

بغیر نہ انسان کسی ایثار کے لئے برضا و رغبت تیار ہو سکتا ہے نہ کسی قربانی کے لئے بطیبِ خاطر آمادہ۔ اس عقیدہ سے انسان کے اندر وہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے جس سے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ۔ (۹۲/۱۸) جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے مَا+ لَہٗ وہ اسے دوسرے ضرورت مندوں کے لئے دے دیتا ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے وَ مَا لِاَحَدٍ عِنۡدَہٗ مِنۡ نِّعۡمَۃٍ تُجۡزٰۤی ۔ (۹۲/۱۹) ۔ وہ اسے دوسروں کو اس لئے نہیں دیتا کہ اسے اس کے معاوضہ میں ان سے کچھ ملے گا۔ ان کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جسے وہ اس کے معاوضہ یا صلہ میں دے سکیں ؟ نہ ہی ان پر اس کا کوئی احسان ہوتا ہے جس کا بدلہ اتارنے کے لئے اسے کچھ دیں۔ وہ دیتا ہے۔ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ رَبِّہِ الۡاَعۡلٰی ۔ (۹۲/۲۰) ۔ وہ اسے صرف خدا کے متعین کردہ عالمگیر نظامِ ربوبیت کے قیام و استحکام کے لئے دیتا ہے۔ وَ لَسَوۡفَ یَرۡضٰی ۔ (۹۲/۲۱)۔ اس سے اس کی محنت اور کاوش صحیح نتائج سے ہم آہنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی اس کا بہترین صلہ ہے جس سے اسے حقیقی مسرت حاصل ہے۔ یہ ہے وہ جماعت جس کے ہاتھوں وہ نظام متشکل ہوا اور ہو سکتا ہے، جس کا خواب تو مارکس نے دیکھا، لیکن جس خواب کی تعبیر کو ممکن العمل بنانے کے لئے اسے کوئی اساس نہ مل سکی۔ اس نظام میں نہ تو جبر و اکراہ سے وسائل پیداوار ان لوگوں سے چھینے جاتے ہیں، اور نہ ہی قوت اور تشدد سے انہیں کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ، اپنا سب کچھ بطیبِ خاطر اس نظام کے حوالے کر دیتے ہیں اور اس کے بعد، وہ کام جو ان کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں، انہیں اپنے قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ جبر و اکراہ کا اس نظام میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ اس کی بنیاد ہی لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ۔ (۲/۲۵۶) کے اصولِ محکم پر استوار ہوتی ہے۔ اس ایمان کی حامل جماعت کے سوا دنیا کی کوئی جماعت، کوئی ازم، یا کوئی نظام، نہ اسلامی کہلا سکتا ہے، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے اور نہ ہی اسے اس کا حق حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ ذرائع رزق کو زبردستی دوسروں سے چھین لے، اور ان کی کمائی پر قابض ہو جائے۔ یہ وہ ملوکیت ہوگی جو استبداد کی رُو سے متشکل ہوگی، اور تشدد کے بل بوتے پر اسے قائم رکھا جا سکے گا۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے اقبالؒ نے سوشلزم کے نظام کو سامنے رکھ کر کہا تھا کہ ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ سوشلزم نے (جسے محنت کشوں کا نظام کہہ کر دھوکا دیا جاتا ہے) جہاں جہاں بھی قدم رکھا ہے، ملوکیت کے انہی قدیم حربوں سے کام لیا گیا ہے۔ قرآن کی پیش کردہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کیجئے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)۔ کسی قوم کے خارجی حالات میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک پہلے اس میں نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ ہو جائے۔ اسی نفسیاتی تبدیلی کا نام، قرآن کریم کی اصطلاح میں ایمان ہے۔ سوشلزم قوم کے خارجی حالات (یعنی اس کی معاشی اور معاشرتی زندگی) میں نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، محض ڈنڈے کے زور پر تبدیلی پیدا کرنا چاہتی ہے جو ناممکن ہے۔ جسے وہ نفسیاتی تبدیلی کہہ کر خود فریبی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور دوسروں کو مبتلا رکھنا چاہتی ہے، وہ تبدیلی نہیں، محض انسان کے اندر خلا پیدا کرنا ہے — خدا سے بھی انکار، وحی سے بھی انکار، آخرت سے بھی انکار، ہر صداقت سے انکار۔ اور اقرار کسی بات کا بھی نہیں — نفسیاتی تبدیلی، کسی مثبت اقرار سے پیدا ہوتی ہے جسے قرآن اِلَّا کہہ کر پکارتا ہے۔ محض انکار سے نہیں جسے وہ لَا سے تعبیر کرتا اور اِلَّا تک پہنچنے کے لئے منزلِ اول قرار دیتا ہے۔ مارکس کی ناکامی کی یہ بنیادی وجہ تھی۔ اس کے فلسفہ میں لَا ہی لَا تھا۔ اِلَّا کہیں نہیں تھا۔

اور اس کے بعد اس حقیقت کو بھی یاد رکھیئے کہ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۸/۵۳)۔ کسی قوم کو اس کی داخلی تبدیلی (ایمان) کی بنا پر جو نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، وہ اس وقت تک باقی رہتی ہیں جب تک ان میں وہ تبدیلی باقی رہتی ہے جب وہ تبدیلی باقی نہیں رہتی، اس کی رو سے حاصل شدہ نعمتیں چھن جاتی ہیں۔ یہ جواب ہے اس اعتراض کا جو عام طور پر کیا جاتا ہے کہ اسلام اگر صداقت پر مبنی نظام تھا تو وہ مسلسل قائم کیوں نہ رہا۔ اسلام درحقیقت وہ ذریعہ ہے جس سے قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ اس ذریعہ سے ایک قوم نے اپنے اندر تبدیلی پیدا کی تو اسے وہ نعمتیں حاصل ہو گئیں جب تک وہ تبدیلی پیدا ہوتی رہی، وہ نعمتیں میسر آتی رہیں جب اس نے اس تبدیلی کو پیدا کرنا چھوڑ دیا وہ نعمتیں اس کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ اب اگر یہ قوم چاہتی ہے کہ وہ نعمتیں اسے پھر سے حاصل ہو جائیں تو اسے پھر سے وہ تبدیلی اپنے اندر پیدا کرنی چاہیئے۔ قرآن میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ جب بھی کوئی قوم اس کے ذریعے اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرنا چاہے، وہ تبدیلی پیدا ہو جاتے۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ کے یہی معنی ہیں۔

لیکن مسلمان بھی ہر خدا فراموش قوم کی طرح چاہتا ہے کہ اس تبدیلی کو اپنے اندر پیدا کئے بغیر وہ نعمتیں حاصل کرے۔ اسی لئے وہ کبھی مغربی جمہوریت کی طرف لپکتا ہے، کبھی سوشلزم کی طرف دوڑتا۔ لیکن خدا کا قانون اٹل ہے۔

کہ نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، خارجی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی قوم کو اس کے بغیر کسی وقت کچھ مل جاتا ہے تو وہ ایسا ہی ہے جیسے ڈاکو کسی کی متاعِ حیات لوٹ کر مطمئن ہو جائیں کہ ہم خوشحال ہو گئے ہیں۔ ابدی صداقتوں پر ایمان کے بغیر، جو کچھ بھی کوئی حاصل کرے گا وہ ڈاکہ سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھے گا، خواہ وہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے استعارہ کی زبان میں نہایت دلکش محاکاتی انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سکندرِ اعظم نے ایک بحری قزاق (ڈاکو) سے کہا کہ ؎

صلہ ترا تیری زنجیر یا شمشیر ہے میری
کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی

اس قزاق نے اُسے جواب دیا کہ ؎

سکندر! حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے   گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی؟
تیرا پیشہ ہے سفاکی، مرا پیشہ ہے سفاکی   کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی میں دریائی

لہٰذا، مشرق و مغرب کے سرمایہ دار ہوں یا کمیونزم اور سوشلزم کے علمبردار، قرآنِ کریم کی رُو سے دونوں قزاق ہیں، کہ دونوں کا پیشہ سفاکی ہے۔

اُس قزاق اور سکندر میں فرق یہ تھا کہ قزاق سے تو سکندر نے باز پُرس کر لی لیکن سکندر مطمئن اور مگن تھا کہ اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں، کیونکہ اُسے اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) حاصل ہے لیکن جو نظام اقدارِ خداوندی کے مطابق قائم ہوگا، اس میں کوئی بھی اس باز پُرس سے مامون اور مستثنیٰ نہیں ہوگا۔ اس میں ہر ایک کا ایمان یہ ہو گا کہ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ۔ (۱۰۲/۸)۔ مجھ سے ان نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا کہ تم نے انہیں کیسے حاصل کیا اور کس طرح صَرف کیا تھا۔ اس ایمان کے بغیر کوئی بھی قزاقی سے باز نہیں رہ سکتا۔

(٠)

آخر میں، میں، عزیزانِ من! اس اعتراض کو بھی سامنے لے آنا چاہتا ہوں جو سرمایہ داروں کی طرف سے قرآن کے معاشی نظام کے خلاف عاید کیا جاتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں بار بار کہا گیا ہے کہ۔ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۸۱) ہر شخص کو اس کی پوری پوری کمائی ملے گی اور کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں ہو گی۔

اعتراض اور اُس کا جواب

اعتراض یہ ہے کہ جو شخص زیادہ کماتا ہے لیکن اسے آپ دیتے ہیں اس کی ضروریات کے مطابق، تو اسے اس کی پوری پوری کمائی تو نہیں ملتی۔ کیا یہ اس پر ظلم نہیں؟ قبل اس کے کہ اس اعتراض کا جواب دیا جائے، میں ان سے، اور ان کے ساتھ سوشلزم کے علمبرداروں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ محنت کشوں کو ان کی پوری پوری کمائی کب دیتے ہیں؟ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، آپ کے پاس وہ کون سا پیمانہ ہے جس سے کسی مزدور کی اُجرت ماپی جا سکے۔ آپ مزدور کو وہی دیتے ہیں جو اس سے طے پا جاتا ہے۔ اور محتاج اور ضرورت مند سے جس طرح معاملہ طے پاتا ہے اس کا کسے علم نہیں؟ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، کام کرنے والا جس قدر کمائے، کام کرانے والا اگر اسے وہ پورے کا پورا دیدے، تو نظامِ سرمایہ داری ایک دن کے لئے بھی باقی نہ رہ سکے! وہ تو اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ محنت کرنے والا جس قدر کماتا ہے اسے اس سے کم دیا جائے۔ لہٰذا، نظامِ سرمایہ داری میں، کسی محنت کش کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا ہی نہیں جاتا ..... باقی رہی سوشلزم۔ سو اس میں مزدوروں کے ساتھ معاملہ طے پانے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ صاحبِ اقتدار طبقہ جو فیصلہ بھی کرے، انہیں اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کیا اس کو پوری پوری اُجرت دینا کہتے ہیں؟ قرآنی نظام میں ہر کام کرنے والا، **بطیبِ خاطر** یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے یہاں تو اس کی ضروریات کے مطابق دے دیا جائے۔ باقی اگلی زندگی میں ادا کر دیا جائے ۔ اس کی آرزو اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ "اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً" (۲/۲۰۱)۔ اس دنیا کی خوشگواریاں بھی اور آخرت کی خوشگواریاں بھی۔ وہاں کی خوشگواریوں کے متعلق مختصر ترین الفاظ میں یہ سُن لیجئے کہ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ (۵۰/۳۵)۔ وہاں جو یہ چاہیں گے ملے گا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

اگر آخرت کے منکر وہاں کی خوشگواریوں کے وعدہ کو درخورِ اعتنا نہ بھی سمجھیں، تو قرآن کا نظام اس دنیا میں اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ ہر ایک کی ضروریات پوری کی جائیں گی، کیا یہ مارکس کے اس خواب کی تعبیر نہیں جسے وہ ناممکن الحصول سمجھتا تھا! فرمائیے ۔ اس پر کیا اعتراض ہے؟

یہ ہے اس مشکل ترین مسئلہ کا وہ حل جو ام الکتاب کی طرف سے ملتا ہے۔ والسلام

ماؤزے تنگ ——— اور ——— قرآن

ماؤ کے فلسفۂ زندگی اور قرآنی فلسفۂ حیات کا تقابلی جائزہ

گذشتہ اوراق میں، کمیونزم یا سوشلزم کے متعلق جو کچھ سامنے آیا ہے وہ مارکس، لینن، سٹالن وغیرہ کے افکار پر مبنی اور روس میں رائج معاشی نظام کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ روس کے بعد کمیونزم کی آماجگاہ چین قرار پائی جہاں ماؤزے تنگ کی سربراہی میں اس نے (روس سے بھی بڑھ کر) عالمگیر اہمیت حاصل کرلی۔ ماؤزے تنگ نے روس سے علیحدگی سیاسی بنا پر اختیار نہیں کی تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ روس نے مارکسی کمیونزم کے فلسفے سے انحراف برتا ہے۔ اور کمیونزم کا اصلی فلسفہ وہ ہے جسے میں پیش کر رہا ہوں۔ اسی بنا پر وہ روسی زعماء کو تحریف کرنے والے (REVISIONISTS) کہہ کر پکارتا ہے۔ ماؤزے تنگ کے اس دعویٰ کے پیشِ نظر مجھ سے تقاضا کیا گیا کہ میں اس کے فلسفے کی بھی تشریح کروں اور قرآنی فلسفۂ حیات کی روشنی میں اس کا جائزہ لوں۔ ان تقاضوں کے پیشِ نظر میں نے جنوری ۱۹۶۷ء میں عنوانِ بالا کے تحت ایک مبسوط مقالہ لکھا جسے (پہلے) ماہنامہ طلوعِ اسلام میں شائع کیا گیا اور بعد میں ایک پمفلٹ کی شکل میں۔ اس مقالہ نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اب جو نظامِ ربوبیت کے جدید اڈیشن کی نوبت آئی تو مناسب سمجھا گیا کہ اسے بھی اس میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ وہ مقالہ درج ذیل ہے۔ اس کا بنیادی موضوع فلسفہ ہے۔ اس لئے اس کا مطالعہ دقتِ نظر کا متقاضی ہوگا۔ علاوہ ازیں، اس کا مطالعہ کرتے وقت اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ یہ اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب ماؤزے تنگ ہنوز زندہ تھا۔

——— (-) ———

اسلام ایک دین ہے۔ دین کے معنی ہیں ایسا نظامِ زندگی جس کی بنیاد کسی فلسفۂ حیات (IDEOLOGY) پر ہو وہ کوئی مذہب (RELIGION) نہیں۔ مذہب کا تعلق نظامِ زندگی سے ہوتا ہی نہیں۔ وہ دنیاوی کاروبار سے الگ تھلگ رہنا سکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے کسی نظامِ حیات کو جنم نہیں دیا۔ یہودیت، عیسائیت، مجوسیت، ہندومت، بدھ مت وغیرہ مذاہب ہیں جو انسان کو انفرادی مکتی یا نجات کے طور طریق سکھاتے ہیں۔ کوئی نظامِ زندگی عطا نہیں کرتے۔ دوسری طرف، (اسلام کے سوا) کوئی نظامِ زندگی ایسا نہیں جو کسی فلسفۂ حیات کی بنیاد پر استوار ہو۔ یعنی مذاہبِ عالم میں سے کسی کو نظامِ زندگی سے تعلق نہیں اور کوئی غیر مذہبی نظامِ زندگی ایسا نہیں جس کی بنیاد آئیڈیالوجی پر ہو۔ اسلام کے بعد، کمیونزم ایک ایسا نظامِ زندگی ہے جو ایک فلسفۂ حیات پر متفرع ہے۔ بالفاظِ دیگر، صرف کمیونزم ایک "دین" کی حیثیت سے اسلام کے مدِ مقابل آیا ہے۔ اس لئے اسلام کو ایک دین ماننے والوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کمیونزم کا اس نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کریں اور پھر دیکھیں کہ ان دونوں میں سے کون سا ایسا نظامِ زندگی ہے جو انسانی زندگی کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے اور اس میں باقی رہنے اور آگے چلنے کی صلاحیت ہے۔ ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں نے بالعموم اسلام کو ایک مذہب سمجھ رکھا ہے اس لئے وہ اس کا مقابلہ مذاہبِ عالم سے کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف، کمیونسٹوں کو بھی بالعموم اتنا ہی معلوم ہے کہ کمیونزم ایک معاشی نظام کا نام ہے۔ حالانکہ (جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے) یہ ایک نظامِ زندگی ہے جو ایک خاص فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے، عصرِ حاضر میں، انسانی ہئیتِ اجتماعیہ کے مستقبل کے متعلق کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے اسلام اور کمیونزم کا تقابلی مطالعہ ناگزیر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں اس سے زیادہ اہم موضوع کوئی ہے ہی نہیں۔ میں اس حقیقت کو اس سے پہلے بھی کئی بار پیش کر چکا ہوں کہ :-

(۱) ایک چیز ہے کمیونزم کا فلسفۂ حیات اور دوسری چیز ہے اس کا معاشی نظام جسے وہ اس فلسفہ حیات کی بنیادوں پر استوار کرنے کا مدعی ہے۔

(۲) جہاں تک کمیونزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے وہ قرآن کریم کے تجویز کردہ معاشی نظام کے مماثل ہے لیکن کمیونزم کا فلسفۂ زندگی اور قرآن کا فلسفۂ حیات، اصل و بنیاد کی رُو سے، ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

(۳) کمیونزم کا فلسفۂ حیات بنیادی طور پر اس قدر کمزور ہے کہ اس کے پیش کردہ معاشی نظام کی عمارت اس

کی بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے برعکس،

(۴) اس معاشی نظام کی عمارت صرف اس فلسفۂ حیات پر قائم ہو سکتی اور برقرار رہ سکتی ہے جسے قرآنِ کریم پیش کرتا ہے۔

میں نے متعدد مقامات پر ان ہر دو فلسفہ ہائے زندگی کے اصولی خطوط کو سامنے لا کر بتایا ہے کہ یہ کس طرح باہدگر متضاد ہیں۔ لیکن، عصرِ حاضر کے اس اہم ترین مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے احباب کا تقاضا ہے کہ تفصیل سے بتایا جائے کہ یہ دونوں فلسفے کیا ہیں، کس حد تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور کہاں سے ان کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ احباب کے اس تقاضا سے قطعِ نظر، مجھے خود اس کا احساس ہے کہ یہ موضوع تفصیلی گفتگو کا محتاج و مستحق ہے۔ لیکن اس قدر پیچیدہ فلسفیانہ بحث کو عام فہم انداز میں پیش کرنے اور اسے ایک مقالہ میں سمانے کی دقت میرے عناں گیر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے مباحث کے لئے موزوں یہی ہوتا ہے کہ یا تو اُسے متعدد خطبات کی شکل میں درساً درساً سامنے لایا جائے اور یا انہیں مبسوط تصنیف کی صورت میں پیش کیا جائے۔ لیکن چونکہ ان کا سردست امکان نہیں، اس لئے میں نے (بحالاتِ موجودہ) یہی مناسب سمجھا ہے کہ اسے مختصر الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کروں اور تفصیل کو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھوں۔ وما توفیقی اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم۔

کمیونزم کا فلسفہ

کمیونزم کے فلسفۂ حیات کی ابتدا ہیگل سے کرنی چاہیئے اور پھر مارکس اور لینن کو ساتھ لیتے ہوئے مادّزے تنگ تک پہنچ جانا چاہیئے۔ لیکن یہ راستہ طول طویل بھی ہے اور (فنی اعتبار سے) دشوار گذار بھی۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہیگل اور مارکس کے تصورات کے متعلق سرسری اشارات پر اکتفا کیا جائے اور مادّزے تنگ کے تصور کو تفصیل سے پیش کیا جائے، بالخصوص اس لئے کہ وہی اس دور میں اس فلسفہ کا عظیم علمبردار، اس کے پیدا کردہ انقلاب کا قائد، اور اس کی بنیادوں پر استوار معاشی نظام کا سب سے بڑا داعی و معمار ہے۔

ہیگل نے کہا کہ دنیا میں ایک تصور (IDEA) وجود میں آتا ہے۔ وہ بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ جب وہ اپنے شباب پر پہنچ جاتا ہے۔ تو اس میں سے، اس کی ضد ایک اور تصور پھوٹتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح پروان چڑھتا

ہے تو پھر ایک تیسرا تصور ایسا پیدا ہوتا ہے جو ان دونوں باہمدگر متصادم تصورات کی صفات کو لئے ہوئے ابھرتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلۂ تصورات آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ روحِ عصر (SPIRIT OF THE AGE) اس عمل پیہم کی محرک ہوتی ہے۔

مارکس، اسی مکتبِ فکر سے متعلق تھا۔ لیکن اس نے کہا کہ یہ تضاد و تغیر، تصورات میں نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے معاشی نظام میں رونما ہوتا رہتا ہے اور تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) اس کی قوتِ متحرکہ ہے۔

ماوزے تنگ بھی اصولی طور پر اسی فلسفۂ اضداد کا مؤید ہے۔ لیکن وہ ہیگل (بلکہ مارکس سے بھی ایک حد تک) اختلاف رکھتا ہے۔ اس کا فلسفہ، اس کے مجموعۂ تحریرات (WORKS) میں مختلف مقامات میں بکھرا ہوا ہے، اور اس کی اصل و بنیاد قانونِ اضداد (LAW OF COTRADICTION) ہے۔ اس کے ماحصل کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) کائنات کی نشوونما کے سلسلے میں، شروع ہی سے دو تصورات شانہ بشانہ چلے آتے نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ ایک تصور وہ ہے، جسے عام طور پر ما وراء الطبیعیاتی (METAPHYSICAL) کہا جاتا ہے اور دوسرے کو مادی جدلیت (DIALECTIC MATERIALISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۲) ما وراء الطبیعیاتی فلسفہ کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ کائنات کی ہر شے ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ وہ دیگر اشیائے کائنات سے بالکل لاتعلق اور الگ تھلگ ہوتی ہے اور شروع سے آخر تک وہی شے رہتی ہے۔ اسکی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ کچھ اور بن ہی نہیں سکتی۔ خارجی عناصر اس پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں لیکن اس سے اس کے صرف مظاہر میں تبدیلی آتی ہے، اس کی اصل و بنیاد میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یعنی اس کی تبدیلی کمیت کی (QUANTITATIVE) ہوتی ہے ــ کیفیت کی (QUALITATIVE) نہیں ہوتی۔ جن اشیاء میں کچھ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، وہ اپنے جیسی چیز ہی پیدا کر سکتی ہیں ــــ جیسے آم کی گٹھلی سے آم پیدا ہو جاتا ہے اور بکری کا بچہ، آخرکار بکری ہی بن سکتا ہے، کچھ اور نہیں۔ اسی سلسلہ میں نظریۂ ارتقاء کے حاملین (یعنی ڈارون کے متبعین) بھی اتنا ہی بتا سکتے ہیں کہ ارتقاء کی رُو سے، اشیائے کائنات کی شکل و صورت میں ہی فرق پیدا ہوتا ہے، ان کی ذات ــ (ESSENCE) ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ لہٰذا کائنات میں تخلیق کا عمل، گردشِ دولابی (REPITITION) سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی اصول، اشیائے کائنات میں کارفرما ہے اور یہی قانون، انسانی

فکر و تصورات کی دنیا میں ـــــ اصل کے اعتبار سے تبدیلی نہ اُن میں ہوتی ہے نہ اِن میں۔

(۳) اس کے برعکس، جدلیاتی فلسفہ کی رُو سے کائناتی نشو و نما کا مقصد یہ ہے کہ :-

(ا) کائنات کی ہر شے کے اندر، شروع سے اخیر تک، ہمیشہ دو متضاد عناصر موجود ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان کے اس باہمی تصادم یا ٹکراؤ کی جہت سے اس فلسفہ کو جدلیاتی (DIALECTIC) کہا جاتا ہے۔

(ب) ان متضاد عناصر میں سے ایک وقت میں ایک عنصر غالب رہتا ہے۔ اسے (PRINCIPAL) کہا جاتا ہے اور دوسرا مغلوب جسے (SECONDARY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے ایک کا پلڑا بھاری رہتا ہے اور دوسرے کا ہلکا ـــــ بھاری یا غالب عنصر کی جو کیفیات ہوں، ان کی نسبت سے وہ شے متعارف ہوتی ہے۔

(ج) باہمی تصادم سے، کچھ وقت کے بعد مغلوب عنصر، غالب ہو جاتا ہے اور غالب عنصر مغلوب! اور چونکہ ہر شے کا تشخص، غالب عنصر کی نسبت سے متعین ہوتا ہے اس لئے اس تبدیلی سے وہ شے خود ایک دوسری شے میں تبدیل ہو جاتی ہے ـــــ شکل و صورت کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ اصل و بنیاد کی رُو سے بھی بالکل جدید شے۔ اس قانون کو وحدتِ تضادات (UNITY OF OPPOSITES) سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو ماؤزے تنگ کے نزدیک عالمگیر اور بنیادی قانونِ کائنات ہے۔

اس مقام پر ایک ابہام ہے جس کی وضاحت، ماؤزے تنگ کی تحریروں میں مجھے نہیں مل سکی۔ بعض مقامات پر اس نے کہا ہے کہ اس طریق میں، غالب عنصر، مغلوب ہو جاتا ہے اور مغلوب، غالب آجاتا ہے۔ یعنی دونوں عناصر موجود تو رہتے ہیں، صرف ان کی پوزیشن بدل جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بات یوں نظر آتی ہے کہ یہ متضاد عناصر، شروع سے اخیر تک اس شے میں موجود رہتے ہیں۔ اگر عنصر (الف) غالب ہوتا ہے تو وہ شے (الف) بن جاتی ہے اور جب عنصر (ب) غالب آجاتا ہے تو وہ شے (ب) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ گردشِ دولابی (CYCLIC PROCESS) اسی طرح جاری رہتا ہے اور اس طرح وہ شے (الف) یا (ب) بنتی رہتی ہے اس کے علاوہ کچھ اور نہیں بن سکتی۔

لیکن بعض مقامات پر اس نے کہا ہے کہ غالب عنصر آہستہ آہستہ کمزور ہو کر مغلوب عنصر میں تبدیل یا مدغم ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس نے کئی جگہ اسے اس کی موت سے تعبیر کیا ہے اس

طرح اس شے میں ایک نیا عنصر وجود میں آجاتا ہے جس کی حیثیت عنصرِ غالب کی ہوتی ہے اور اس کے مدِمقابل ایک نیا مغلوب عنصر وجود میں آجاتا ہے۔ یوں وہ شے (الف) اور (ب) میں ہی تبدیل نہیں ہوتی رہتی بلکہ وہ ارتقائی طور پر کچھ اور بن جاتی ہے جو پہلی شے سے ارفع ہوتی ہے۔ اسے تضادات میں توافق کہا جاتا ہے۔

(د) اس عملِ تغیر کی رُو سے ایک شے، ایک ہی وقت میں، وہ شے بھی ہوتی ہے اور کچھ اور شے بن بھی رہی ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، اشیائے کائنات ہمیشہ وجود کوشی (BECOMING) کے مرحلہ میں رہتی ہیں، انیت (BEING) کے مقام تک کبھی نہیں پہنچتیں۔

(س) ایک شے کے اندر دونوں متضاد عناصر، ایک دوسرے کی ضد (OPPOSITE) ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کے وجود کا سبب (COMPLEMENTRY) بھی ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں سے اگر ایک کا وجود نہ ہو تو دوسرا بھی موجود نہیں ہو سکتا۔ جیسے تاریکی نہ ہو تو روشنی بھی نہیں ہو سکتی۔ موت نہ ہو تو زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا — نیز یہ ایک دوسرے کی تکمیل کا موجب بھی ہوتے ہیں — یعنی عنصرِ غالب آہستہ آہستہ مغلوب میں تبدیل ہو کر اُسے غالب بنا دیتا ہے۔

(ش) یہ طریقِ تصادم و تخلیق — یا یوں کہیئے کہ اشیاء میں استبدال و استخلاف کا عمل متواتر — شروع سے ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ یہ سلسلہ لامتناہی ہے، کبھی ختم نہیں ہوگا۔

(ص) یہ طریقِ عمل صرف اشیاء (THINGS) کے اندر کارفرما نہیں بلکہ انسانی فکر اور معاشرتی و معاشی نظامِ زندگی بھی اسی قانونِ اضداد کے تابع ہیں۔ ان میں بھی اسی طرح باہمی تصادم اور سلسلۂ تغیرات جاری و ساری رہتا ہے۔

ماؤزے تنگ نے انسانی فکر کے متعلق تو یہ کہا ہے لیکن خود انسان کے متعلق اس نے بصراحت کچھ نہیں کہا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ چونکہ اس کے نزدیک (بلکہ مادی تصورِ حیات کی رُو سے) کائنات میں مادہ کے سوا کسی اور شے کا وجود ہی نہیں، اس لئے انسان کا شمار بھی اشیاء (THINGS) میں ہوتا ہے۔ اسی لئے شاید اس کے متعلق کسی جداگانہ بحث کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ لہٰذا یوں سمجھنا چاہیئے کہ جو کچھ دیگر اشیاء کے ساتھ ہوتا ہے وہی کچھ انسان کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ (یہ نکتہ بڑا اہم ہے، اسے خاص طور پر ذہن میں رکھیئے۔)

ایک اہم استثناء

یہاں تک آپ نے دیکھ لیا کہ جدلیاتی فلسفہ کی رُو سے، اشیائے کائنات ہوں یا انسانی فکر و تصورات، ان میں سے کوئی بھی غیر متبدل نہیں، ہر ایک تغیر پذیر ہے۔

لیکن خود یہ قانون (LAW OF COTRADICTION) جس کی رُو سے یہ تمام تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں، غیر متغیر اور غیر متبدل ہے۔ ماؤزے تنگ کے اپنے الفاظ ہیں:۔

یہ ایک عالمگیر صداقت ہے جو زمان اور مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں ہو سکتی۔ یہ کائنات کا عمومی، ابدی اور غیر متبدل قانون ہے۔

دوسرے مقام پر ماؤزے تنگ نے اسے معروضی قانون (OBJECTIVE LAW) کہا ہے۔ یعنی ایسا قانون جو نہ اشیائے کائنات کا پیدا کردہ ہے نہ ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے بلکہ موجود فی الخارج ہے۔ چونکہ یہ قانون، تمام کائنات میں جاری و ساری ہے، اس لئے جب اسے موجود فی الخارج کہا جائے گا تو اس کا سرچشمہ لامحالہ کائنات (UNIVERSE) سے ماوراء قرار دیا جائے گا۔ اس نکتہ کا ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے۔

علم کسے کہتے ہیں؟

ماؤزے تنگ نے علم (KNOWLEDGE) کے متعلق کہا ہے کہ:۔

(۱) علم وہی علم ہے جسے حواس کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ اسے (PERCE-PTUAL KNOWLEDGE) کہا جاتا ہے۔

(۲) انسانی فکر چونکہ معاشرہ کے خارجی عناصر سے بھی متاثر ہوتی ہے، اس لئے کسی ایک زمانے میں انسان، صداقت (TRUTH) کا صرف اضافی اور جزوی علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح انسان کا جزوی علم بڑھتے بڑھتے ایک دن حقیقی اور کلّی علم بن جاتا ہے۔ یعنی وہ صداقتِ مطلقہ (ABSOLUTE TRUTH) تک پہنچ جاتا ہے۔

صداقتِ مطلقہ سے مراد قوانینِ فطرت ہیں۔

(۳) یہ دیکھنے کے لئے کہ انسان نے جو علم حاصل کیا ہے وہ صداقت ہے یا نہیں، اس علم کو عمل میں لانا ضروری ہے۔ اگر عملاً اس کا نتیجہ وہی ہو جو اس کا دعویٰ ہے تو وہ علم سچا ہے، ورنہ جھوٹا اور غلط۔ یعنی علم کی صداقت کی پرکھ (PPAGMATIC TEST) کی رُو سے ہو سکتی ہے۔

(۴) انسان کا جو عمل، قوانینِ فطرت کے مطابق ہوگا، وہی صحیح نتیجہ پیدا کر سکے گا۔

(۵) ظاہر ہے کہ اس طریق کی رُو سے، انسان کوئی صداقت (TRUTH) یا قانون (LAW) بناتا نہیں۔ جو صداقتیں یا قوانین کائنات میں موجود ہیں، انہیں صرف دریافت (DISCOVER) کرتا ہے۔

(۶) مختصر الفاظ میں، صداقت کے انکشاف کا طریقہ یہ ہے کہ ایک نظریہ (THEORY) کو عمل میں لایا

جائے۔ اس سے جو نتیجہ مرتب ہو اسے پھر نظریہ (یا CONCEPT) تصور کر کے اس پر عمل کیا جائے۔ اس طرح ہر عمل کے بعد علم کی سطح بلند ہوتی جائے گی۔ اس طریقِ کار کو مسلسل جاری رکھا جائے۔ اور اس طرح انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ جو عناصر اس انقلاب کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہوں گے، شروع میں بہ جبر انہیں راستے سے ہٹایا جائے گا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایسا مرحلہ آجائے گا جہاں دنیا کمیونزم کے نظام کو بطیبِ خاطر قبول کرے گی۔ داخلی انقلاب کے بغیر خارج میں کوئی انقلاب نہیں آسکتا۔ خارجی عناصر اس پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں لیکن انقلاب کی اساس داخلی تبدیلی ہی ہوتی ہے۔

یہ ہے اس فلسفہ کی رُو سے علم کا تصور اور علم و عمل کا باہمی تعلق۔

(۰)

اس فلسفہ کا جائزہ

ہم نے دیکھا یہ ہے کہ فلسفۂ جدلیت کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے (THING) کے اندر دو متضاد عناصر ہر وقت مصروفِ جدل و پیکار رہتے ہیں اور اسی تصادم کے نتیجہ میں وہ شے، کچھ عرصہ کے بعد بالکل نئی شے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک "شے" ایک جامع اصطلاح ہے جس میں غیر جاندار اشیاء، جاندار مخلوق، خود انسان، انسانی فکر اور انسانی تمدنی اور معاشی نظام سب شامل ہیں۔ جہاں تک غیر جاندار اشیاء یا (انسان کے سوا دیگر) جاندار مخلوق کا تعلق ہے، ان میں عملِ نشو و نما کا سوال ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم اس پر بحث نہیں کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادی اشیاء کی نشو و نما کے اصول و طریق کے سوال کا تعلق طبیعی علوم (PHYSICAL SCIENCE) سے ہے، اسے فلسفہ کے دائرے میں آنا ہی نہیں چاہیئے (اگرچہ آجکل یہ رجحان بھی فروغ پا رہا ہے کہ طبیعی سائنس کی بنیاد بھی فلسفہ ہی پر رکھ دی جائے) بہرحال، یہ سوال ہمارے موضوع سے متعلق نہیں۔ اس لئے ہم اس پر تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا تعلق خود انسان سے ہے اور اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے اس سوال کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، انسان کے طریقِ نشو و نما کے متعلق، ماؤزے تنگ نے بصراحت الگ بحث نہیں کی۔ اس کے نزدیک جس اصول یا طریقِ عمل کا اطلاق اشیائے کائنات پر ہوتا ہے، اسی کے مطابق انسان کی نشو و نما بھی عمل میں آتی ہے۔ یا یوں کہیئے کہ وہی قانونِ اضداد خود انسان پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

اس فلسفہ کی رُو سے کہا یہ گیا ہے کہ :-

(۱) متضاد عناصر کے باہمی تصادم کا سلسلہ لامتناہی ہے ۔

(۲) اس تصادم کے سلسلہ میں، ہر نئی شے جو وجود میں آتی ہے، پہلی شے سے بہتر اور ارفع ہوتی ہے۔

(۳) اس قانونِ ارتقاء میں رجعت (واپس لوٹنا) نہیں، آگے بڑھنا ہی ہے۔

یہاں سے ایک اہم سوال سامنے آتا ہے۔ جامد مادہ، اس طریقِ جدلیت کی رُو سے رفتہ رفتہ، پیکرِ انسانی میں تبدیل ہوگیا۔ اس میں نئی چیز اس کی فکر اور شعور، ـــــ بلکہ شعورِ خویش (SELF - CONSCIOUSNESS) ہے۔ اس لحاظ سے، یہ سابقہ کڑیوں سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جدلیت کے لامتناہی سلسلہ کی رُو سے اس کے بعد کیا ہوگا؟ ـــــ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ موت کے بعد، انسانی جسم بے جان مادہ رہ جاتا ہے جو کچھ عرصہ کے بعد منتشر (DE - COMPOSE) ہوکر مختلف کیمیائی اجزاء میں تبدیل ہو جاتا ہے ـــــ لوہا، چونا، فاسفورس وغیرہ۔ اگر انسان اسی جسم کا نام تھا تو اس کی یہ تبدیلی، اسے آگے لے جانے کے بجائے، جامد مادہ کی اُسی پہلی کڑی میں لے گئی جہاں سے سلسلۂ ارتقاء کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ ارتقاء نہیں، رجعت ہے اور رجعت بھی ایسی کہ جدلیت کی کشمکش سے جو منازل ہزارہا سال میں طے کئے تھے، موت کی ایک ضربِ کاری نے ان سب کو خاک میں ملا دیا اور بات جہاں سے چلی تھی پھر وہیں پہنچ گئی۔ قرآن کی مثال میں، بڑھیا نے جو سوت دن بھر کی محنت سے کاتا تھا، شام کو اُسے خود اپنے ہی ہاتھوں سے تار تار کرکے رکھ دیا اور دوسرے دن وہ پھر چرخہ لے کر بیٹھ گئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ موت سے ایک فرد کا تو خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن نوعِ انسانی (HUMAN SPECIES) باقی رہتی ہے ـــــ مرنے والا، اپنے جیسا انسان پیدا کر دیتا ہے ـــــ تو اس سے بھی اس فلسفہ کی تغلیط ہو جاتی ہے کیونکہ اس سے وہ شے (یعنی انسان)، کسی دوسری شے میں تبدیل نہیں ہوتی۔ ویسے کی ویسی ہی رہتی ہے۔ لہٰذا، یہ ترقی (PROGRESS) نہیں۔ اعادہ (REPITION) ہے۔ یہ خطِ مستقیم پر آگے بڑھنا نہیں، ایک دائرہ کے چکر میں گھومنا ہے۔

دوسرے یہ کہ ایک فرد، بجائے خویش ایک "شے" ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس فرد میں کیا تبدیلی آتی ہے؟ ـــــ فلسفۂ اضداد کی رُو سے، اسے اپنی موجودہ ہیئت سے مختلف اور ارفع صورت میں تبدیل ہونا چاہیئے۔ نسلِ انسانی کی بقا سے وہ فرد تو باقی نہیں رہتا، نہ ہی کسی اعلیٰ پیکر میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس کا جسم مادی اجزاء میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کا بہ حیثیت فردِ انسانیہ، خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے دو متضاد عناصر ہیں جو ایک فرد میں باہمد گر مصروفِ پیکار رہتے ہیں؟ — یہ ٹھیک ہے کہ جسمِ انسانی کے اندر، ہر آن تعمیر و تخریب (ANABOLISM & KATABOLISM) کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس کے پُرانے جرثومے (CELLS) ہر وقت فنا اور ان کی جگہ نئے جرثومے وجود پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے اس کا جسم ہر آن ایک نئے جسم میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ حتےٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد، وہ ایک بالکل نیا جسم بن جاتا ہے۔ لیکن یہ سلسلۂ تصادم تو موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے آگے نہیں چلتا — اور فلسفۂ جدلیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ سلسلۂ تصادم لامتناہی ہے۔ لہٰذا، انسان اگر عبارت ہے اس کے طبعی جسم سے تو اس سے اس فلسفہ کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔

اگر انسان کے اندر یہ تصادم، اس کے جرثوموں کا نہیں، تو پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کون سے دو متضاد عناصر ہیں جن میں ہر آن کشمکش جاری رہتی ہے۔ ان میں سے ایک عنصر اس کا جسم ہے جو ہمارے سامنے ہے، دوسرے عنصر کو جسم کی ضد (OPPOSITE) ہونا چاہیئے۔ وہ کیا ہے؟ پھر ان دونوں میں سے، اس وقت کون سا عنصر غالب یا بنیادی (PRINCIPAL) ہے اور کون سا مغلوب یا ثانوی (SECONDARY)۔ اور جب کچھ عرصہ کے بعد، ان عناصر میں باہمی تبادلہ ہو جائے گا یا ایک عنصر ختم ہو جائے گا تو انسان کیا بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جو کچھ وہ اس وقت بنے گا اُس کی نوبت موت کے بعد ہی آئے گی۔ اس سے واضح ہے کہ (فلسفۂ جدلیت کی رُو سے بھی) موت سے انسان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب فلسفۂ جدلیت یا ماؤزے تنگ کی فکر سے نہیں ملتا۔

———— (۰) ————

دوسرا اہم نکتہ

فلسفۂ جدلیت کی رُو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کائنات میں ایک ایسی شے بھی ہے جو —

(۱) خود اشیاء کے اندر موجود نہیں۔

(۲) عملِ تضاد و تصادم کی پیدا کردہ نہیں۔

(۳) ازلی و ابدی اور غیر متبدل ہے۔

(۴) ذہن انسانی کی پیدا کردہ نہیں۔

(۵) موجود فی الخارج ہے۔

(۶) عالمگیر حقیقت اور صداقت مطلقہ ہے۔

(۷) ذہنِ انسانی صرف اس کا انکشاف کر سکتا ہے اس کی تخلیق نہیں کر سکتا۔

اور یہ شے ہے خود قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION)

مادی فلسفۂ حیات کی رُو سے اس قسم کی شے کا وجود ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن جب اس کے وجود کا امکان تسلیم کر لیا گیا ہے تو پھر اگر کوئی یہ کہے کہ اس قسم کا صرف ایک قانون (قانونِ اضداد) ہی نہیں، اور بھی کئی قوانین ایسے ہیں، تو اس فلسفہ کے حامیوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایسے قوانین کے امکان سے انکار کریں یا اس تصور کے خلاف اعتراض کریں۔ اگر کوئی شخص، خود اُس معیار کے مطابق جو فلسفۂ جدلیت کے حامی، کسی دعوٰی کی صداقت کو پرکھنے کے لئے تجویز کرتے ہیں، یعنی (PRAGMATIC TEST) کی رُو سے، کسی اور قانون کو بھی صحیح ثابت کر دے تو ان حضرات پر لازم آئے گا کہ اس قانون کو بھی مطلق حقیقت (ABSOLUTE TRUTH) تسلیم کریں۔ یہ ان کے اپنے دعوٰی کا منطقی نتیجہ ہے۔

تیسرا نکتہ ماؤزے تنگ نے اپنے "اقوال" میں ایک جگہ کہا ہے کہ :۔
کمیونزم، تاریخِ انسانیت میں، مکمل ترین، ترقی پذیر، انقلابی اور معقول نظام ہے۔

یہ تصور فلسفۂ اضداد کے خلاف ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے، کوئی شے، کوئی تصور، کوئی نظام، کسی وقت بھی مکمل نہیں ہوتا۔ وہ تغیر پذیر ہوتا ہے اور ہر آن بدلتا رہتا ہے اور تغیرات کا یہ عمل لامتناہی ہوتا ہے۔

چوتھا نکتہ ماؤزے تنگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ :۔
ملوکیت یا استعماریت کا نظام اب، زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ یہ شر انگیز کام (EVIL THINGS) کرتا ہے۔

یہ خیال بھی فلسفۂ اضداد کے خلاف ہے۔ اس فلسفہ کی رُو سے، کسی نظام کے باقی رہنے یا مٹنے کا یہ اصول نہیں کہ جو نظام تعمیری کام کرے گا وہ باقی رہے گا۔ اور جو تخریبی کام کرے گا، مٹ جائے گا۔ اس فلسفہ کی رُو سے، اضداد کا قانون از خود کار فرما ہے۔ اس کے مطابق ایک نظام وجود میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ضد، دوسرا نظام موجود ہوتا ہے۔ ان دونوں میں باہمی تصادم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد، مغلوب نظام غالب آ جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر یہ چکر جاری ہو جاتا ہے۔ نہ ہی کوئی نظام اس لئے وجود میں آتا ہے کہ اُس نے اچھے کام کئے تھے، نہ ہی وہ اس لئے مٹتا ہے کہ اس سے خراب کام سرزد ہوئے تھے۔ وہ نظام کیسا ہی ہو اور خواہ کسی قسم کے کام کرے، اسے اپنی باری پر بہرحال مٹنا ہے ۔۔ تاریخی وجوب یا قانونِ اضداد کی اندھی قوتیں، نہ اچھے کو دیکھتی ہیں نہ بُرے کو۔ انہوں

نے تو ایک کو مٹانا ہے اور اس کی جگہ اس کی ضد دوسرے کو لانا ہے۔ انسان ہزار چاہے اور اس کے لئے لاکھ کوشش کرے کہ اچھا نظام مٹنے نہیں، قائم رہے، وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تغیرات لانے والی یہ قوتیں انسان کے نفع یا نقصان کی پرواہ ہی نہیں کرتیں۔ انسان، ان کی گردش دولابی کی مشین میں ایک بے بس پُرزے کی طرح ہے کہ جس قسم کا نظام وہ لائیں، یہ اس کے تابع زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں ماؤزے تنگ کا پیش کردہ قانونِ اضداد ——— اس قانون کا جو تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اس سے مقصود تنقید برائے تنقید نہیں ——— یہ قرآنی فلسفۂ حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کے لئے ناگزیر تھا۔

——— (۰) ———

بابِ دوم

قرآنی فلسفۂ حیات

کائنات کے متعلق جو فلسفہ (یا تصور) قرآنِ کریم پیش کرتا ہے، وہ ایک حد تک فلسفۂ جدلیت کے دوش بدوش چلتا ہے۔ لیکن جو اسقام فلسفۂ جدلیت میں ہیں، قرآنی تصور ان سے مبرّا ہے۔ اور جس مقام پر وہ فلسفہ رُک جاتا ہے، قرآنی تصور انسان کو اس سے آگے لے جاتا ہے۔ آئندہ صفحات میں قرآنی تصور کو مختصر الفاظ میں پیش کیا جائے گا۔ یہ بحث حسبِ ذیل گوشوں میں منقسم ہوگی۔

(۱) قرآن کا اندازِ افہام و تفہیم
(۲) تخلیقِ کائنات
(۳) انسان کی تخلیق
(۴) انسانی زندگی کی کشمکش۔
(۵) قانونِ اضداد
(۶) کائنات میں غیر متبدل کیا ہے۔
(۷) مستقل اقدار

۸۔ کشمکشِ حق و باطل۔
۹۔ اضداد میں توافق۔
۱۰۔ علم کا تصوّر۔

(۱)

۱۔ قرآن کا طریقِ افہام و تفہیم

قرآنِ کریم کا ایک اندازِ افہام و تفہیم یہ ہے کہ وہ ایک شے یا نظریہ کی ضد کو اس کے سامنے لاکر، اس کی وضاحت کرتا ہے مثلاً ـــ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ـــ اندھا اور آنکھوں والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے ـــ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ۔ نہ ہی تاریکی اور روشنی ایک جیسی ہو سکتی ہے۔ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ـــ نہ ہی دھوپ اور سایہ یکساں ہو سکتے ہیں ـــ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ـــ (۳۵/۱۹-۲۲)۔ نہ ہی مردے اور زندہ برابر ہو سکتے ہیں۔ اسی نظریات اور تصورات کے سلسلہ میں وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر، ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت، حق کے مقابلہ میں باطل، کلمۂ طیبہ کے مقابلہ میں کلمۂ خبیثہ لاکر اپنے مطالب و معانی کی وضاحت کرتا ہے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ـــ ماوزے تنگ اسی قسم کی مثالیں پیش کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ان متضاد اشیاء میں سے ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں ہوتا) لیکن قرآن کریم ان اضداد کو معانی و مطالب کی وضاحت کے لئے پیش کرتا ہے۔ وہ یہ تصور پیش نہیں کرتا کہ یہ متضاد اشیاء از خود ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہتی ہے۔ یہ تصور درحقیقت مجوسیت (MAGISM) نے پیش کیا تھا۔ قرآنِ کریم نے اپنے آپ کو کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ۔ (۳۹/۲۳)، کہا ہے۔ یعنی وہ کتاب جس کی تعلیم شروع سے اخیر تک، مرلوط اور آپس میں ملتی جلتی ہے۔ اس میں کہیں تخالف نہیں، تضاد نہیں لیکن یہ اپنے مفہوم کی وضاحت، متضاد اشیاء کو ایک دوسرے کے بالمقابل لاکر کرتی ہے (تصادم اور ٹکراؤ کے متعلق ہم آگے چل کر بات کریں گے)۔

قرآنِ کریم اشیاءِ فطرت کے اختلاف کو مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ (نشاناتِ خداوندی) میں شمار کرتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے کہ ـــ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ..... لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۲/۱۶۴) یعنی تخلیقِ ارض و سما اور اختلافِ لیل و نہار میں ان لوگوں کے لئے نشاناتِ راہ ہیں، جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں ـــ دوسرے مقام پر ہے:۔

وَ مِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَ اَلْوَانِکُمْ۔ (۳۰/۲۲)

ارض و سما کی تخلیق اور انسانوں کے رنگ اور زبان کا اختلاف بھی آیاتِ خداوندی میں سے ہے۔

لیکن وہ نسلوں اور زبانوں کے اس اختلاف کے باوجود، تمام نوعِ انسانی کو، آئیڈیالوجی کے اشتراک کی بنا پر ایک برادری (امتِ واحدہ) بنانا چاہتا ہے۔ یہ ہے اس کے نزدیک توافقِ اضداد (UNITY OF OPPOSITES) کا طریق۔

(٭)

۲۔ تخلیقِ کائنات

عملِ تخلیق کے متعلق قرآن کریم کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ کائنات کو بیک جنبش، مکمل شکل میں پیدا نہیں کر دیا گیا بلکہ یہ بتدریج، عملِ ارتقاء کی رُو سے، تکمیل تک پہنچ رہی ہے۔ واضح رہے کہ عربی زبان اور خود قرآن کریم کی رُو سے) ایک عمل ہے **فطر** کا اور دوسرا ہے **خلق** کا۔ فطر کے معنی ہیں کسی شے کو پہلی بار عدم سے وجود میں لانا۔ اور خلق کے معنی ہیں مختلف عناصر میں توازن و ترتیب سے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا (یہ لفظ عام طور پر انہی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات اسے فطر کے مفہوم میں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔) خدا کے عملِ فطرت کے متعلق تو قرآن کریم کوئی تشریح پیش نہیں کرتا کیونکہ "عدم سے وجود میں آنے کا" سوال، انسان کے شعور کی موجودہ سطح پر، اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ لیکن عملِ تخلیق کے متعلق وہ وضاحت سے بات کرتا ہے[1]۔ وہ کہتا ہے کہ۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ ــــ ایک شے کی تخلیق کی اسکیم، عالمِ امر کی بلندیوں میں طے پاتی ہے۔ پھر اس اسکیم کا عملی آغاز زمین کی پست ترین سطح سے ہوتا ہے۔ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۔ (۳۲/۵) اس نقطۂ آغاز سے وہ، بتدریج بلندیوں کی طرف ابھرتی ہے تاکہ اس اسکیم کے مطابق اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ یہ تدریجی مراحل وہ "ایک ایک دن" میں طے کرتی ہے جس کی مقدار، تمہارے حساب و شمار سے

[1] اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ وہ طبیعی امور کے متعلق تفصیلی گفتگو کرے۔ اس کا موضوع انسانی زندگی کے مسائل کو سلجھانے کے لئے راہ نمائی عطا کرنا ہے۔ وہ طبیعی امور کے متعلق محض ضمناً بات کرتا ہے لیکن چونکہ وہ اس خدا کی طرف سے ہے جو خالقِ کائنات ہے، اس لئے ہو نہیں سکتا کہ وہ ضمناً بھی کسی بات کے متعلق کچھ کہے تو وہ حقیقت کے خلاف ہو۔

ہزار ہزار سال کی ہوتی ہے بلکہ بعض صورتوں میں پچاس پچاس ہزار سال کی ۔ (۷۰/۴)

ان تخلیقی مدارج کے متعلق وہ دوسری جگہ کہتا ہے کہ ۔ وَالَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۔ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (۸۷/۲-۳) ۔ خدا وہ ہے جو اشیائے کائنات کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے ۔ ان میں سے حشو و زوائد کو الگ کرکے ، انہیں ایک خاص اعتدال پر لاتا ہے ۔ پھر ان کا ایک مقامِ تکمیل (DESTINY) مقرر کرتا ہے اور اس مقام تک پہنچنے کے لئے انہیں راستہ دکھا دیتا ہے ۔ اسی عملِ ارتقاء کو اس نے دو لفظوں میں یوں بیان کیا ہے ۔

اِنَّهٗ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ ۔ (۱۰/۴)

خدا وہ ہے جو ہر شے کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے ۔ پھر اسے گردشیں دیتا ہوا مختلف مراحل میں سے گزارتا ہے

مثلاً اس نے زمین اور اجرامِ فلکی کے تخلیقی مراحل کے متعلق کہا ہے کہ :-

۱ ۔ یہ تمام اجرام ' ابتداءً ایک ہیولیٰ (NEBULAE) کی شکل میں ایک ہی تھے ۔ پھر الگ الگ ہوتے (۲۱/۳۰)

(۲) یہ ہیولیٰ گیس کی شکل میں تھا ۔ (۴۱/۱۱)

(۳) زمین اس ہیولیٰ سے یوں الگ ہوئی جیسے گوپیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے ۔ (۷۹/۲۹)

(۴) ان اجرام کو چھ مختلف مراحل میں سے گزارا ۔ (۱۰/۳)

(۵) زمین بھی ، اس ہیولیٰ سے الگ ہونے کے بعد ، دو مراحل میں سے گزر کر اس قابل ہوئی کہ اس پر زندگی کی نمود ہو سکے ۔ (۴۱/۹)

(۶) زندگی کی نمود پانی سے ہوئی ۔ (۲۱/۳۰) ۔ اور اس طرح بتدریج ، جانداروں کی تخلیق ہوئی ۔ یعنی رینگنے والے ، دو پاؤں پر چلنے والے ، چار پاؤں پر چلنے والے ۔ (۲۴/۴۵)

اس تمام عمل (PROCESS) میں خدا کی صفتِ ربوبیت کارفرما ہوتی ہے ۔ ربوبیت کے معنی ہیں ایک شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج مقامِ تکمیل تک پہنچنے کے لئے سامانِ نشو و نما عطا کرنا ۔ ان مراحل میں سے گزرتی ہوئی ایک شے ، کچھ وقت کے لئے ایک مقام میں ٹھہرتی ہے ۔ اس کے بعد وہ اگلی منزل کی طرف چل دیتی ہے ۔ قرآن کریم نے اسے ، ان اشیاء کا " مستقر و مستودع " کہہ کر پکارا ہے (۱۱/۶) یعنی کسی شے کی عارضی قرارگاہ اور اس کے بعد وہ اگلی منزل ، جس کے سپرد اس امانت کو کر دیا جائے ۔ " اس نئی منزل میں پہنچ کر وہ شے ، کچھ اور ہی بن جاتی ہے ۔ اسے وہ ، اس شے کی نشاۃ الآخرۃ سے تعبیر کرتا ہے ۔ یعنی اس کی دوسری پیدائش ۔ سورۂ عنکبوت میں ہے ۔

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَۃَ

الْاٰخِرَۃَ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ (۲۹/۲۰)

ان سے کہو کہ دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ خدا کس طرح ایک شے کی تخلیق کا آغاز کرتا ہے اور پھر اسے کس طرح ایک نئی (دوسری) پیدائش عطا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ان پیمانوں کے مطابق ہوتا ہے جو اس نے اشیائے کائنات کے لئے مقرر کر رکھے ہیں اور جن پر اُسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔

یہ تغیر کائنات کی ہر شے میں ہر آن رونما ہوتا رہتا ہے — کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔ (۵۵/۲۶)۔ کائنات میں ہر شے ہر آن تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے اور ہر نئے مرحلہ میں اس کی نشوونما کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور خدا کی صفتِ ربوبیت اس کے تقاضوں کے مطابق سامان نشوونما عطا کئے جاتی ہے۔ یَسْئَلُہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ۔ (۵۵/۲۹)۔ کائنات کی ہر شے، ہر آن، ایک نئی ہیئت میں ہوتی ہے۔ اور اپنی نشوونما کے لئے خدا کی شانِ ربوبیت کی محتاج۔ یوں وہ شے نشوونما پاکر ایک نئی شے بن جاتی ہے۔ اس طرح کائنات میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ۔ (۳۵/۱)

وہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق مخلوق میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔

غالبؔ کے الفاظ میں ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
رہتا ہے آئینہ ابھی دائم نقاب میں

ان تخلیقی تبدیلیوں کے سلسلہ میں وہ یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اس طرح یہ تمام کارگہ کائنات رفتہ رفتہ ایک اور قالب میں ڈھل جائے گا۔

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ۔ (۱۴/۴۸)

جس مرحلہ میں یہ ارض کسی اور ارض میں تبدیل ہو جائے گی اور اسی طرح سمٰوٰت بھی[1]۔

اس لئے کہ — (ھُوَ) قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَھُمْ۔ (۱۷/۹۹) وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اس کائنات

---

[1] اس تبدیلی سے مراد وہ عالمگیر انقلابِ عظیم بھی ہو سکتا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہ عالمِ انسانیت میں رونما ہوگا اور کائنات کی طبیعی تبدیلی بھی۔

کی مثل دوسری کائنات بنا دے۔

لیکن جس طرح یہ سلسلۂ کائنات ازلی نہیں، یعنی ایسا نہیں کہ اس کی ابتدا کوئی نہ ہو، اسی طرح یہ ابدی بھی نہیں۔ کہ اس کی انتہا کوئی نہ ہو ۔۔ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى - (۱۳/۲)۔ یہ سلسلہ ایک نشان کردہ مدت تک کے لئے رواں دواں چل رہا ہے۔

ان اشیاء میں سے جو اشیاء (خارجی اثرات کے تابع) آگے بڑھنے کی صلاحیت کھو دیتی ہیں اُن کی ترقی رُک جاتی ہے۔ پھر یا تو وہ معدوم ہو جاتی ہیں اور یا اُسی مقام پر گردش کرتی رہتی ہیں۔ جس طرح آم کی گٹھلی سے اُسی قسم کا آم کا درخت پیدا ہو جاتا ہے، بکری اپنے جیسا بچہ پیدا کر دیتی ہے۔ یہ گردش دولابی (REPITITION) یا تولید (REPRODUCTION) ہے۔ ارتقاء (آگے بڑھنا) نہیں۔

(۰)

۲۔ انسان کی تخلیق

انسان بھی کائنات ہی کا ایک جزو ہے۔ اس لئے ایک خاص منزل تک یہ بھی انہی تخلیقی مراحل میں سے گزرتا ہے۔ جن سے دیگر اشیائے کائنات اور جاندار مخلوق گزرتی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں ۔۔ بَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ۔ (۳۲/۷)۔ انسانی تخلیق کی ابتداء بے جان مادہ (INORGANIC MATTER) سے ہوئی۔ جامد مادہ میں، زندگی کی نمود نہیں ہوتی۔ لیکن جب اس میں پانی کی آمیزش ہوتی ہے تو حیاتِ خوابیدہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھتی ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔ (۲۱/۳۰)۔ ہر شے کو زندگی، پانی سے عطا ہوئی ہے۔ مٹی اور پانی کے امتزاج سے (جسے قرآن نے طینِ لازب کہا ہے یعنی چپچپی مٹی) زندگی کا اولین جرثومہ (LIFE - CELL) وجود میں آیا جس میں نر و مادہ کا امتزاج نہیں تھا۔ یعنی زندگی کا آغاز (UNI - CELLULAR) طریق سے ہوا۔ اسے قرآن نے "نفسِ واحدہ" سے تعبیر کیا ہے۔ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ (۴/۱)۔ "خدا نے تمھیں نفسِ واحدہ سے پیدا کیا"۔ یہ جرثومۂ حیات، جوشِ نمو سے پھٹ کر دو ٹکڑوں میں (SISTER - CELLS) میں تقسیم ہو گیا اور یوں نر و مادہ کی تفریق و تمیز وجود میں آ گئی ۔۔ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔ (۴/۱)۔۔ اور اس طرح اس جرثومۂ واحدہ سے اس کا جوڑا پیدا کیا"۔

قرآنِ کریم نے "جوڑے" کے لئے لفظ "زوج" استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ایسے جوڑے کے ہیں جس کے

ایک جزو کے بغیر دوسرے جزو کی تکمیل نہ ہو سکے۔ یعنی وہ دونوں اجزاء ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، ایک دوسرے کی تکمیل کا موجب (COMPLEMENTARY TO EACH OTHER) ہوتے ہیں۔ یہ جوڑے صرف جانداروں میں نہیں، ہر شے میں ہوتے ہیں ـــ وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا (۳۶/۱۲)۔ اُس نے ہر شے کے جوڑے پیدا کئے جو ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی تکمیل کا باعث ہیں۔

مختلف اشیائے کائنات میں، ازدواج کا اختلاط کس طرح ہوتا ہے؟ یہ سوال ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے۔ جہاں تک انسانی تخلیق کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ (دیگر حیوانات کی طرح) نر اور مادہ (عورت اور مرد) کے جنسی اختلاط سے، رحمِ مادر میں انسانی بچے کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بچہ (جنین) ـــ دیگر حیوانات ہی کی طرح ـــ رحم میں مختلف منازل سے گزرتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ـ استقرارِ حمل کے بعد ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً ـ یہ جرثومہ آہستہ آہستہ جونک کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے ـــ فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً ـــ پھر وہ گوشت کا لوتھڑا سا بن جاتا ہے ـــ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا ـ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ سا ابھرتا آتا ہے ـــ فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ـ پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہ سی چڑھ جاتی ہے۔ (۲۳/۱۲-۱۴)۔

یہاں تک انسان اور دیگر حیوانات کے بچے یکساں مراحل سے گزرتے ہیں لیکن اس کے بعد ایک مقامِ امتیاز آجاتا ہے جو درحقیقت مادی تصورِ حیات اور قرآنی نظریۂ زندگی کا نقطۂ تفریق ہے۔ اس سے ان کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر، قرآن نے کہا ہے کہ

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ـ (۲۳/۱۴)

پھر ہم اسے ایک نئی مخلوق بنا دیتے ہیں ـ

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی تبدیلی ہے جس سے انسان، دیگر حیوانات سے مختص اور متمیز ہو کر، ایک "نئی مخلوق" بن جاتا ہے؟ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ ـ (۳۲/۹)

اس میں خدا اپنی روح (توانائی) کا ایک شمہ ڈال دیتا ہے۔

یہ الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) ہے جس کے اضافہ سے انسان، دیگر مخلوقات سے بالکل الگ اور ممتاز مخلوق بن جاتا ہے۔ یہ "نفخِ روحِ خداوندی" انسان کے علاوہ کسی اور مخلوق کے حصے میں

نہیں آیا۔ اسی کو انسانی ذات (HUMAN - PERSONALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی ہے جسے "میں" کہا جاتا ہے۔ یہ اَنا (I - AM - NESS) ہے جو اس حیوان کو انسان میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اسی کے احساس کو شعورِ خویش (SELF - CONCIOUSNESS) کہا جاتا ہے۔ اسی سے انسان اپنے ہر ارادہ، فیصلہ اور عمل کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اسی سے یہ اس قابل ہوتا ہے کہ اسے "تو" کہہ کر پکارا جائے۔ اس تبدیلی کو قرآنِ کریم نے بڑے بلیغ، لطیف اور حسین انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کا ذکر کرتے ہوئے، اسے صیغۂ واحد غائب (THIRD PERSON) سے پکارتا چلا جاتا ہے۔ (خَلْقَهٗ، نَسْلَهٗ، سَوّٰىهُ -) لیکن اس کے بعد، جب اس میں "نفخِ روح" ہو جاتا ہے تو اس صیغۂ غائب کو یک لخت صیغۂ مخاطب (SECOND PERSON) میں تبدیل کر کے کہتا ہے۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ - (۳۲/۹)

پھر خدا نے تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر دیئے۔

یعنی اس طرح وہ مخلوق (انسان) اس قابل ہو جاتی ہے کہ اسے "تو" کہہ کر پکارا جائے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں مادی تصورِ حیات اور قرآنی نظریۂ تخلیقِ انسانی میں وہ فرق نمودار ہوتا ہے جس کے بعد ان کے راستے بالکل الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ مادی تصورِ حیات کی رُو سے، انسان محض اس کے طبیعی جسم سے عبارت ہے۔ طبیعی قوانین کے مطابق دیگر حیوانات کی طرح اس کی پیدائش ہوتی ہے طبیعی قوانین کے ماتحت اس کی نشوونما ہوتی ہے اور جب طبیعی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی مشینری حرکت کرنے سے رُک جاتی ہے تو اُسے موت آجاتی ہے اور یوں اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ "نفخِ روحِ خداوندی" کے بعد جب انسان ایک خلقِ جدید (نئی مخلوق) میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں ایک ایسی شے کی نمود ہو جاتی ہے جو نہ طبیعی قوانین کی پیدا کردہ ہے، نہ طبیعی قوانین کے مطابق اس کی نشوونما ہوتی ہے اور نہ ہی جسم کی موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ انسان کی موت کے بعد زندہ رہتی اور زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

وَ قَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا - (۷۱/۱۴)

خدا نے تمہیں مختلف مدارج میں سے گزارتے ہوئے پیدا کیا۔

ان مدارج و مراحل میں، ہر نیا درجہ اور مرحلہ، سابقہ درجہ اور مرحلہ سے بلند تھا۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں

ہو سکتا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ. (۸۴/۱۹)

تم اسی طرح طبقًا طبقًا، درجہ بدرجہ، بلند ہوتے چلے جاؤ گے۔

موت سے تمہارے جسم کا خاتمہ ہو جاتا ہے، تمہارا نہیں۔ تم ایک نئی زندگی (لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ۔ ۳۲/۷) میں داخل ہو جاتے ہو۔ موت تو اس بات کا ٹسٹ (TEST) کرنے کے لئے ہے کہ تم میں آگے بڑھنے کی کس قدر صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (۶۷/۲)۔

موت اور حیات اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس کا ٹسٹ ہو جائے کہ تم نے اپنے اعمال سے اپنے اندر کس قدر حسن و توازن پیدا کر لیا ہے۔

تم سمجھتے ہو کہ جب جسمِ انسانی کے اجزاء منتشر ہو کر پھر سے لوہا اور پتھر بن گئے تو انہیں حیات نو کس طرح مل سکتی ہے؟ یہ تمہاری بھول ہے۔ ان اجزاء سے تمہارا جسم مرکب تھا "تم" ان کے مجموعہ یا امتزاج کا نام نہیں تھے۔ اسلئے جسم کے پھر سے بے جان مادہ بن جانے سے "تم" فنا نہیں ہو جاتے۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ۔ (۱۷/۵۰-۵۱)

ان سے کہو کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی اور شے، جس کے متعلق تمہارے ذہن میں ہو کہ اس کا زندہ ہونا ناممکن ہے۔

اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تم ایک ایسی "نئی مخلوق" بن چکے ہو جو طبیعی قوانین کی زد میں نہیں آتی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مادی جدلیت کا پیش کردہ نظریہ یہ ہے کہ بے جان مادہ، عملِ ارتقاء سے بڑھتا بڑھتا بکھرا آدمیت تک آ گیا اب اس کے بعد، ارتقاء کی بجائے رجعت ہو گی۔ انسان، مرنے کے بعد، پھر انہی اجزاء میں تبدیل ہو جاتے گا، جن کے ارتقاء سے وہ اس مقام تک پہنچا تھا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ارتقاء میں رجعت ہو ہی نہیں سکتی۔ زندگی کی ندی کا جو پانی آگے بڑھ گیا وہ لوٹ کر پیچھے نہیں آ سکتا۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ اس زندگی میں جن لوگوں کی انسانی صلاحیتوں کی صحیح نشوونما نہیں ہوئی ہو گی۔ وہ مرنے کے وقت کہیں گے کہ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ۔ اے میرے نشوونما دینے والے! زندگی کے دھارے کا رُخ ایک بار پیچھے کی طرف موڑ دے کہ جو مواقع میں نے پہلے کھو دیئے تھے وہ پھر حاصل ہو جائیں تو میں ایسے کام کر دوں جن سے

میری صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا۔ کَلَّا ۔ (۲۳ - ۹۹-۱۰۰)۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف نہیں لوٹا کرتا۔ عملِ ارتقاء میں رجعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں یا آگے بڑھنا ہے یا ایک مقام پر رک جانا۔ پیچھے مڑنا نہیں۔ (آگے بڑھنے کا نام، قرآن کی اصطلاح میں جنت کی زندگی ہے۔ رک جانے کا نام جہنم) اور یہ سلسلۂ ارتقاء جنت کی زندگی میں بھی بدستور جاری رہتا ہے۔ ان نکات کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ اس لئے اس وقت انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ جس مقام پر آکر فلسفۂ اضداد رک ہی نہیں جاتا بلکہ اس کی تمام عمارت نیچے گر جاتی ہے، قرآن کریم اس مقام سے انسان کو کس طرح آگے لے جاتا ہے۔

(٠)

۴۔ انسانی زندگی کی کشمکش

جس طرح انسانی بچہ کو اس کا جسم اور جسمانی صلاحیتیں، نشوونما یافتہ (DEVELOPED) شکل میں نہیں ملتے۔ ان کی نشوونما ہونی ہوتی ہے۔ انسانی جسم کی پرورش ہو یا اس کی ذات کی نشوونما، یہ اضداد کے تصادم (CONTRADICTIONS) کی رو سے ہوتی ہے۔ جسمِ انسانی میں یہ تصادم، زندگی کے جرثوموں کے ہر آن فنا ہونے اور نئے جرثوموں کے وجود پذیر ہوتے رہنے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ زندگی، صحت، بیماری، موت، اسی کشمکش کے مظاہر ہیں۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کن متضاد عناصر کے تصادم سے ہوتی ہے۔ یہ سوال غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

جس طرح انسانی جسم کی پرورش کے لئے کچھ قوانین ہیں۔ اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے بھی کچھ قوانین و ضوابط ہیں۔ انسانی جسم کی پرورش سے متعلق قوانین کو قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے اور انسانی ذات کی نشوونما سے متعلق قوانین کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہتے ہیں۔ یہ اقدار بھی، قوانینِ فطرت کی طرح، غیر متبدل اور عالمگیر ہیں۔ ان اقدار کا تفصیلی ذکر ذرا آگے چل کر آئے گا۔ اس وقت صرف ایک بنیادی قدر کو مثالاً پیش کیا جاتا ہے۔

جسمِ انسانی کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود استعمال کرتا ہے (مثلاً کھانا، پینا وغیرہ)

اس کے لئے ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سامانِ رزق اپنے لئے سمیٹتا چلا جائے۔ عقلِ انسانی اس کے اس جذبہ کی تسکین کے لئے، اسے مختلف راہیں سجھاتی اور متنوع حربے سکھاتی ہے۔ نیز اس کی اس روش کے لئے جواز کی دلیلیں (JUSTIFICATORY REASONS) تراشتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشو ونما کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنے جسم کی ضروریات سے زائد جو کچھ ہو، اُسے دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ اس طرح انسانی جسم کے تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے میں کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کشمکش اور تصادم کو قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں "ابلیس وآدم کی آویزش" سے تعبیر کیا ہے۔ ابلیس (یا شیطان) انسان کے ان جذبات کا ترجمان ہے جو اس کے طبیعی تقاضوں کے بروئے کار لانے کا ذریعہ ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں، ابلیس وآدم کی نمود ایک ہی وقت میں ہوئی ہے۔ اور ابلیس کو آخر تک، آدم کے مدمقابل رہنے کی مہلت بھی دے دی گئی ہے۔ (قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۔ (۷/۱۴)۔ خدا نے ابلیس سے کہا کہ ہاں! تمہیں مہلت دی جاتی ہے) لہٰذا، انسان کے اندر، اضداد کی یہ کشمکش شروع سے ہے اور آخر تک رہے گی ــــ ایک فرد کی زندگی میں بھی اور نوعِ انسان کی حیاتِ اجتماعیہ میں بھی ــــ (حیاتِ اجتماعیہ میں ان دو گروہوں کی شکل میں، جن میں سے ایک اپنے ذاتی مفاد کے حصول کو مقصدِ زندگی قرار دے اور دوسرا گروہ ان کا جو نوعِ انسانی کے مفادِ عامہ کو پیشِ نظر رکھیں)۔ اس ٹکراؤ سے انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نمود اور نشو ونما ہوتی ہے۔ اس سے اس کی قوت بڑھتی ہے اور جوں جوں اس کی قوت بڑھتی جاتی ہے، ابلیسی تقاضے اس سے مغلوب ہوتے جاتے ہیں۔ اسی لئے ابلیس سے کہہ دیا گیا تھا کہ تو جس قدر چاہیے زور لگالے ــــ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲)۔ جو لوگ میرے قوانین کا اتباع کریں گے، ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔

واضح رہے کہ قرآنی تصور کی رُو سے، "ابلیس کا کبھی خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ یہ" انسانی ذات کی نشو ونما یافتہ قوتوں کے سامنے جھک جاتا ہے، ان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے سلسلۂ ارتقاء میں آگے بڑھنے اور رُک جانے کے لئے اصول یہ بتایا ہے کہ

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ۔ (۷/۸-۹)

جس کا تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری ہو گا وہ کامیاب و کامران ہو گا۔ جس کا وہ پلڑا ہلکا ہو گا وہ

نقصان اٹھائے گا۔

یعنی یہ نہیں کہ آگے وہی بڑھ سکے گا جس کا تخریبی پلڑا بالکل خالی ہوگا۔ آگے وہ بڑھے گا جس کی ذات کی صلاحیتوں کا پلڑا بھاری ہوگا۔ جو تخریبی قوتوں پر غالب آچکا ہوگا۔ یہاں زندگی اور ارتقاء کا معیار، ثقل موازنہ (پلڑے کا بھاری ہونا) ہے۔

"نفس کُشی" — یعنی ابلیسی قوتوں کو فنا کر دینے — کا تصور، خانقاہیت کا پیدا کردہ فریب ہے حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت وہی ہے جس کی تصدیق قرآن کر رہا ہے۔ اگر تصادم کا امکان باقی نہ رہے تو زندگی کی جوئے رواں جوہڑ بن کر رہ جائے۔ اس میں حرکت و حرارت، اسی تصادم کی بدولت ہے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

مزی اندر جہانِ کور ذوقے!
کہ یزداں دارد و شیطاں نہ دارد

یہ ہے وہ دوگونہ عملِ اضداد، جو انسان کے اندر کار فرما رہتا ہے۔ ایک تضاد اس کے جسم کے اندر، اور دوسرا تضاد اس کے طبیعی تقاضوں اور ذات کے تقاضوں کے اندر — واضح رہے کہ قرآن کی تعلیم یہ نہیں کہ انسانی جسم کے طبیعی تقاضوں کو فنا کر دیا جائے۔ قطعاً نہیں۔ وہ جسم کی پرورش کو بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی ذات کے تقاضے میں ٹکراؤ ہو تو ذات کے تقاضا کو ترجیح دینی چاہیئے۔ کیونکہ یہ حیات کی ارفع اور آگے چلنے والی شکل کا نام ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس مقام پر بھی قرآنی فلسفۂ حیات، کس طرح مادی جدلیت کے فلسفہ سے آگے لے جاتا ہے۔

(۰)

۵۔ قانونِ اضداد

قانونِ اضداد و تصادم، خود خالقِ کائنات کا پیدا کردہ، اور اس کی اسکیم کا لاینفک حصہ ہے۔ وہ چاہتا تو انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ تعمیری اور تخریبی قوتوں کے تصادم کا امکان نہ ہوتا۔ سب انسان مجبوراً ایک ہی راستے پر چلے جاتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا اس لئے انسان کو ایسا نہیں پیدا کیا — وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ (۱۰/۹۹)۔ اگر خدا چاہتا تو وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح

کر دیتا کہ سب کے سب مومن ہوتے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام ایسا نہیں تھا۔ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے فیصلہ سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (۱۸/۲۹)

ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرلے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

اختیار و ارادہ، انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسی سے یہ حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور اسی سے یہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر وہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے جس سے اس کی خارجی دنیا کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ یہی صورت افراد کی ہوتی ہے اور یہی کیفیت اقوام کی۔ اس کا واضح فیصلہ ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۱۳/۱۱)۔

یاد رکھو! خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کرلے۔

جس قسم کی تبدیلی قوم کے اندر (یعنی اس کی نفسیات) میں پیدا ہوگی، اسی قسم کی تبدیلی اس کی خارجی دنیا میں رونما ہوگی۔ (ایمان، اسی قسم کی صحیح نفسیاتی تبدیلی کو کہتے ہیں) یہی وہ تبدیلیاں ہیں جن سے مردہ اقوام کے اندر زندگی کی نمود ہوجاتی ہے اور زندہ اقوام پر موت طاری ہوجاتی ہے۔ (يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ۔ (۶/۹۶)۔ اسی سے ایک قوم اپنی عظمت و شوکت کھو کر قعرِ مذلت میں گر جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ سورۃ توبہ میں خود جماعتِ مومنین کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ اگر تم تخریبی قوتوں کا پوری مستعدی سے مقابلہ نہیں کرو گے تو يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا۔ (۹/۳۹)۔ خدا کا قانونِ محو و ثبات تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا۔ اور تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے — یہ نہیں کہ ایک قوم کی جگہ جو دوسری قوم آتی ہے تو وہ پہلی قوم جیسی ہی ہوتی ہے۔ اس قسم کا استبدال بے معنی ہے۔ یہ (آنے والی قوم) جانے والی قوم کی مثل نہیں ہوتی۔ اس سے بہتر ہوتی ہے، تبھی تو اس کی جانشین بنتی ہے۔ اسی لئے کہا کہ وہ قوم جو تمہاری جگہ لے گی، لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ۔ (۴۷/۳۸)۔ وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ مٹتی وہی قوم ہے جس کی تعمیری صلاحیتوں کا پلڑا ہلکا ہوگیا ہو، اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جس کا یہ پلڑا بھاری ہو۔ یہی قوموں کے استبدال و استخلاف کا ابدی قانون ہے۔ اور یہ نتیجہ ہوتا ہے قوم کی داخلی (نفسیاتی) تبدیلی کا۔

کوئی قوم تو ایک طرف رہی، قرآن تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ اگر پوری کی پوری نوعِ انسانی ایسی ہو جائے کہ

اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ رہے، تو یہ بھی صفحۂ ارض سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ اور اس کی جگہ کوئی اور مخلوق لے لے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ۔ (۳۵/۱۶)۔

خدا کے قانونِ مشیت کی رُو سے یہ بھی ممکن ہے کہ (اگر تم میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ رہے تو) وہ تمھیں مٹا دے اور تمھاری جگہ ایک جدید مخلوق لے آئے۔

جب کسی قوم کی زندہ رہنے کی صلاحیتوں کا پلڑا ہلکا ہو جائے اور وہ اس طرح' مصافِ زندگی سے ہٹا دی جائے تو اسے اُس قوم کی "اجل" کہا جاتا ہے اور اس میں پھر ایک ثانیہ کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہو سکتی۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ۔ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔ (۷/۳۴)

ہر قوم اُس وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو۔ جب وہ صلاحیت ختم ہو جاتی ہے تو اُس کی مدتِ حیات بھی ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد اس میں ایک ثانیہ کی بھی تاخیر و تقدیم نہیں ہوتی۔

اور یہ کچھ یونہی علی الحساب نہیں ہو جاتا، خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے ـــــ وَ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ۔ (۱۳/۳۸)۔ ہر قوم کی اجل کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی اندھی قوت یا قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION) کی جابرانہ گردش نہیں جس سے ایک قوم' غلبہ و تسلّط کی مالک بن جاتی ہے۔ اس کے بعد' ایک اور قوم اس کی جگہ لے لیتی ہے اور اس میں، نہ مٹنے والی قوم کا کوئی جرم اور قصور ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی جگہ لینے والی قوم کی کوئی کاریگری۔ یہ محض گردشِ دولابی کی رُو سے بندھی ہوئی باریاں ہیں جو خود بخود آتی جاتی ہیں ـــــ قرآنِ کریم کے فلسفہ کی رُو سے' قومیں اپنے جوہرِ ذاتی کی بنا پر غلبہ و اقتدار کی وارث ہوتی ہیں۔ جب تک ان میں وہ جوہر باقی رہتا ہے، ان کا اقتدار بھی قائم رہتا ہے۔ جب اس جوہر میں کمی واقع ہو جائے تو وہ قوم باقی رہنے کی صلاحیت کھو دیتی ہے اور اس کی جگہ ایسی قوم لے لیتی ہے جو اس سے بہتر صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قانونِ اضداد اور قرآنی فلسفہ میں کس قدر نمایاں فرق ہے اور قرآنی فلسفہ کس طرح

علم وبصیرت کو اپیل کرتا ہے۔

(۰)

۷۔ کائنات میں غیر متبدل کیا ہے؟

فلسفہ جدلیت کی رُو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ

(۱) کائنات میں ماورائے مادہ کسی شے کا وجود نہیں۔

(۲) ہر مادی شے میں عملِ اضداد جاری و ساری ہے جس کی وجہ سے ہر شے ہر آن تغیر پذیر ہوتی ہے۔ کائنات میں ثبات و قرار کسی شے کو نہیں۔

لیکن، (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) اس کے ساتھ ہی، انہیں یہ بھی تسلیم ہے کہ خود یہ قانونِ اضداد ایک حقیقتِ مطلقہ (ABSOLUTE TRUTH) ہے۔ غیر متبدل (IMMUTABLE) ہے۔ ابدی (ETERNAL) ہے۔ اور نہ کسی شے کا پیدا کردہ ہے، نہ ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے۔ بلکہ موجود فی الخارج (OBJECTIVE) ہے۔

قرآنِ کریم کا فلسفہ یہ ہے کہ اس قسم کا غیر متبدل، موجود فی الخارج قانون ایک ہی نہیں، ایک سے زیادہ ہیں۔ ان قوانین کو دو شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک شق قوانینِ فطرت پر مشتمل ہے جن کے مطابق سلسلۂ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ دوسری شق کا تعلق ان قوانین سے ہے جن کے مطابق انسان کو اپنی زندگی بسر کرنی چاہیئے تاکہ اس کے طبیعی جسم کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جائے۔ قانونِ فطرت ہر شے کے اندر از خود موجود ہوتا ہے۔ اور وہ اس کی اطاعت پر مجبور ہوتی ہے۔ "مجبور" سے مطلب یہ ہے کہ اشیائے کائنات کو اس کا اختیار و ارادہ ہی نہیں دیا گیا کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر سکیں۔ انسانی زندگی سے متعلق قوانین قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ یہ قوانین جب نظری حیثیت سے سامنے آئیں تو انہیں کلمات اللہ کہا جاتا ہے۔ اور جب ان کا ظہور عملی شکل میں ہو تو یہ سنت اللہ کہلاتے ہیں۔ کلمات اللہ ہوں یا سنت اللہ — سب غیر متبدل ہیں۔ — ایسے غیر متبدل کہ، کائنات کی کسی شے کو (انسان سمیت) اس کی قدرت حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکے، اور خود خدا جس نے ان قوانین کو اس قسم کا بنایا ہے، قدرت رکھنے کے باوجود، ان میں تغیر و تبدل نہیں کرتا۔ خود اس کا ارشاد ہے کہ — لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ (۶/۳۴)۔ قوانینِ خداوندی کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ دوسری جگہ ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۔ (۶/۱۱۶)۔
تیرے رب کے قوانین صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ انہیں کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

اسی طرح "سنت اللہ" کے متعلق فرمایا ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (۳۳/۶۲)۔
خدا کا یہی دستور امم سابقہ میں بھی رہا۔ یہی اب کارفرما ہے۔ تم دستورِ خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

جن لوگوں کے سامنے ان قرآنی حقائق کو پہلی مرتبہ پیش کیا گیا، وہ کہتے تھے کہ یہ محض شاعری ہے — نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۔ (۵۲/۳۰)۔ تھوڑا سا انتظار کرو۔ زمانے کی گردشیں اسے خود مٹا دیں گی۔ یونہی حالات بدلے اور زمانے کے تقاضوں میں تبدیلی آئی۔ یہ باتیں، داستانِ پارینہ ہو جائیں گی۔ ان سے کہا گیا کہ یہ شاعری نہیں شاعری، ایک داعیٔ انقلاب کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتی۔ (۳۶/۶۹)۔ یہ اٹل قوانین ہیں۔ اس لئے — تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۔ (۵۲/۳۱)۔ تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ یہ ابدی حقائق ہیں یا کسی شاعری کے تخیلات — انہی میں وہ قانونِ محو و ثبات شامل ہے جس کے مطابق چیزیں مٹتی اور باقی رہتی ہیں — يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۔ (۱۳/۳۹)۔ اور ان کا سرچشمہ کائنات سے ماورا، علمِ خداوندی ہے۔ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (۱۳/۳۹)۔ یہ قوانین دیئے اس لئے گئے ہیں۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۔ (۸/۴۲)۔ جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے اور جسے تباہ ہونا اور مٹنا ہے، وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے مٹے — یہاں نہ دھاندلی ہے اور نہ ہی محض اتفاقی طور پر حوادث سرزد ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔

(۰)

۷۔ مستقل اقدار

ان میں سے جن قوانین کا تعلق انسانی زندگی سے ہے، انہیں "مستقل اقدار" کہا جاتا ہے۔ اگر انسانی معاشرہ ان اقدار کے مطابق متشکل ہو جائے تو اس میں تمام افرادِ معاشرہ کی طبیعی ضروریاتِ زندگی بھی بلا مشقت و پریشانی پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشو و نما ہوتی جاتی۔ یہ دوہرا مقصد، ان اقدار کے سوا کسی

صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان اقدار و قوانین کی فہرست تو طویل ہے لیکن ہم یہاں ان میں سے چند ایک بنیادی اقدار کا ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ مثلاً:۔

۱۔ ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب الاحترام ہے۔ (۱۷/۷۰)

۲۔ معاشرہ میں تعیّنِ مدارج کا معیار، افراد کے ذاتی جوہر اور حسنِ سیرت و کردار ہے نہ کہ اضافی نسبتیں۔ (۴۶/۱۹)

۳۔ معاشرہ میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ اپنے فرائضِ منصبی کا پابند ہے (۴۹/۱۳)

۴۔ معاشرہ کے بنیادی ستون عدل اور احسان ہیں۔ عدل کے معنی ہیں ہر ایک کے حقوق اور واجبات کی کماحقہٗ ادائیگی اور احسان کے معنی یہ ہیں کہ جس میں کسی وجہ سے کوئی کمی آجائے اس کمی کا پورا کر دینا۔ (۱۶/۹۰) اور اس کے لئے مزد و معاوضہ تو ایک طرف شکریہ تک کے بھی متمنی نہ ہونا۔ (۷۶/۹)

۵۔ اپنی جائز ضروریات سے زاید سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینا (۲/۲۱۹) بلکہ اگر دیکھا جائے کہ دوسروں کی ضرورت میری ضرورت سے زیادہ شدید ہے تو اس کی ضرورت کو اپنے اوپر ترجیح دینا۔ (۵۹/۹)

۶۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (۵۳/۳۸)

۷۔ جس میں محنت کرنے کی استعداد ہے، اسے محنت کئے بغیر کچھ نہیں مل سکے گا۔ (۵۳/۳۹)

۸۔ ذرائع رزق ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ (۴۱/۱۰)، (۵۶/۷۳)

۹۔ ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا معاشرہ کا فریضہ ہوگا۔ (۱۱/۶)، (۶/۱۵۱)

۱۰۔ کسی شخص کو دوسروں پر حکومت کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ (۳/۷۹) فرمانروائی صرف قوانینِ خداوندی کی ہوگی۔ (۱۲/۴۰)

۱۱۔ انسان کا کوئی کام ــــ حتّٰی کہ اس کے دل میں گزرنے والا خیال تک بھی اپنا نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (۹۹/۱۹) ان میں سے ہر ایک کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے اور انہی اثرات کے مجموعہ کے مطابق اس کی ذات کا مستقبل متعین ہوتا ہے۔ اگر اس کا تعمیری نتائج کا پلڑا جھکا ہوا ہے تو اس کا مستقبل خوشگوار ہے۔ اگر وہ پلڑا ہلکا ہے تو اس کے لئے تباہی ہے۔ اس قانونِ مکافات میں کسی کے لئے استثناء نہیں۔

ان قوانین یا مستقل اقدار کو الحق (THE TRUTH) کہا جاتا ہے۔ یہی حقیقت (REALITY) ہے۔ اس کے خلاف جو نظریہ، تصور یا مسلک ہے، وہ باطل ہے۔ حق تعمیری نتائج پیدا کرتا ہے اور انسانیت کے ارتقاء میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ باطل تخریبی نتائج پیدا کرتا اور کاروانِ انسانیت کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری، اس کے تین بڑے ستون ہیں۔ حق و باطل میں شروع سے کشمکش چلی آ رہی ہے۔ اور چلی جائے گی۔ انسانی تاریخ، اسی کشمکش کی محسوس تفسیر ہے۔

(۰)

۸۔ کشمکشِ حق و باطل

اب ہم پھر ایک ایسے مرحلہ میں داخل ہو رہے ہیں جہاں مادی جدلیت کے فلسفہ اور قرآنی تصور میں بنیادی فرق ہے۔ فلسفۂ جدلیت کی رُو سے، کوئی نظریہ، کوئی تصور، کوئی مسلک، نہ بنیادی طور پر حق ہے نہ باطل۔ ہر نظریہ (IDEA) اور ہر شے کے اندر دو متضاد عناصر باہمد گر برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان میں سے کبھی ایک غالب آ جاتا ہے کبھی دوسرا۔ جو غالب آ جاتا ہے اس کی ضد پھر نمودار ہو جاتی ہے اور اس طرح وہی کشمکش پھر جاری رہتی ہے اور یہ سب کچھ (مارکس کے الفاظ میں) تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) اور ماؤزے تنگ کی اصطلاح میں قانونِ اضداد کی اندھی قوت کی رُو سے، از خود ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس کے برعکس، قرآنی تصور یہ ہے کہ :-

۱۔ یہ کشمکش، حق (تعمیری قوتوں) اور باطل (تخریبی قوتوں) کے درمیان ہوتی ہے۔

۲۔ اس کشمکش میں آخر الامر حق غالب آتا ہے، اور سلسلۂ کائنات ایک ارتقائی منزل اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس نئی منزل میں باطل پھر پیکر بدل کر سامنے آتا ہے اور حق و باطل کا یہ تصادم پھر جاری رہتا ہے جس میں حق پھر غالب آ جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے اور ہر منزل کے بعد کائنات اور نکھرتی اور سنورتی چلی جا رہی ہے۔

۳۔ یہ کشمکش اور حق کا غلبہ، اس اسکیم کے مطابق جاری و ساری ہے جس کی رُو سے خدا نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اس کشمکش میں اگر انسان حق کی حمایت کے لئے اُٹھ کھڑا ہو تو یہ مرحلہ تیز رفتاری سے طے ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ مسافت اس رفتار کے مطابق طے پاتی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ "خدا کا ایک ایک

دن تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے"۔ (اس کی مزید تشریح ذرا آگے چل کر آئے گی)۔

۴۔ جو انسان، حق کی حمایت کے لئے اٹھتے ہیں، ان کی ذات کی نشو و نما ہوتی جاتی ہے اور ان کی اس دنیا اور اس کے بعد کی زندگی، خوشگواریوں کے جھولے جھولتی ہے۔ یوں خود انسان، اپنے ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

دیکھئے، قرآن کریم ان حقائق کو کن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

۱۔ نظامِ کائنات یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا گیا۔ اسے بالحق — تعمیری مقاصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۔ وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (۴۴/۳۸-۳۹)

اور ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان میں ہے، یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ یہ بالحق پیدا کی گئی ہے۔ لیکن اکثر لوگ علم و بصیرت سے کام نہ لیتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

۲۔ کائنات میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ اس تصادم میں آخر الامر باطل شکست کھاتا ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۚ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۔ (۲۱/۱۸)

ہم حق کی ضربیں باطل پر لگاتے رہتے ہیں۔ تا آنکہ حق، باطل کا بھیجہ نکال دیتا ہے اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھتا ہے۔ جو لوگ اپنے تصورات کے مطابق اس کے خلاف کچھ سمجھتے ہیں، تو ان کے حصے میں تباہی کے سوا کچھ نہیں آسکتا۔ (کیونکہ وہ حق کے غلبہ کا تصور نہیں رکھتے)۔

۳۔ مفاد پرست گروہ باطل کو غالب رکھنے کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔

وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ۔ (۱۸/۵۶)

جو لوگ حق سے انکار کرتے ہیں وہ باطل کے حیلوں سے حق کے خلاف نبرد آزما ہوتے رہتے ہیں تاکہ اس طرح حق کو مغلوب کر دیا جائے۔

۴. لیکن حق پرست جماعتیں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں اتر آتی ہیں۔

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ ۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ - (۸)

"تاکہ حق کا اثبات ہو جائے اور باطل کا ابطال۔ خواہ ایسا ہونا ان لوگوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے جو قوانین شکنی ہی میں اپنا مفاد مضمر سمجھتے ہیں۔

۵. لیکن اگر حق کی حمایت کے لئے انسانوں کی جماعت نہ بھی اُٹھے، تو بھی آخر الامر حق غالب آکر رہتا ہے اگرچہ اس میں وقت بہت لگ جاتا ہے۔

وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ۔ (۴۲)

خدا اپنے قوانین کے زور سے، باطل کو محو اور حق کو محکم اور استوار کئے جاتا ہے۔

یہ نکتہ، مزید وضاحت چاہتا ہے۔ انسانی عمل کا ایک طریق تو یہ ہے کہ وہ کسی قانون کی صداقت پر یقین رکھ کر اس کے مطابق کام کرنا شروع کر دے۔ اس سے اثباتِ حق کی مسافت بہت جلد طے ہو جائے گی۔ اور اس عمل کے نتائج اس قانون کی صداقت کی محسوس دلیل بن جائینگے۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ وہ کسی قانون یا فارمولے کو نہ مانے بلکہ اپنے قیاس کی راہ نمائی میں سفر شروع کر دے۔ قیاسِ عقل کا طریق تجرباتی (TRIAL AND ERROR) ہوتا ہے۔ اس میں عقل ایک مسلک اختیار کرتی ہے۔ صدیوں کے تجربہ کے بعد جاکر معلوم ہوتا ہے کہ وہ راہ غلط تھی۔ پھر وہ اسے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس طرح، متعدد تجارب اور سینکڑوں برس کی جانکاہ مشقتوں کے بعد وہ حقیقت تک پہنچ پاتی ہے۔ اسے عرفِ عام میں زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔ حقیقت تک پہنچنے کی یہ وہ رفتار ہے جس میں "ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے"۔ اب یہ انسان کے اپنے فیصلہ پر منحصر ہے کہ وہ اپنے سفر کا آغاز ہی حقیقت (صداقت) کی راہنمائی میں کرے اور اس طرح راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بھی محفوظ رہے اور مسافت بھی برق رفتاری سے طے کرلے، یا عقل کے تجرباتی طریق کے مطابق، ٹھوکریں کھاتا ہوا، صدیوں کے بعد وہاں جاکر پہنچے۔ اوّل الذکر طریق سے حق، ایک ہی جست میں باطل پر غالب آجاتا ہے۔ ثانی الذکر طریق سے وہ صدیوں میں جاکر غالب آتا ہے۔ غالب بہر طور حق ہی کو آنا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ آخر الامر غالب، حق ہی نے آنا ہوتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ حق یونہی خلا میں غالب آجائے گا۔ حق سے مراد ہے حق پر مبنی نظام۔ یہ نظام انسانوں کی دنیا میں رائج ہوگا، اور انسانی ہاتھ ہی اسے متشکل کرینگے۔ ایک جماعت اسے متشکل کرے گی اور دوسری جماعت اس کی مخالفت کریگی۔

اس کی حمایت کرنے والی جماعت اگر مادی قوت کے اعتبار سے، فریقِ مخالف کے مقابلہ میں کمزور بھی ہوگی تو بھی اسے کامیابی ہوگی (قرآنِ کریم اس کمزوری کو ابتداءً ایک اور دو کی نسبت سے تعبیر کرتا ہے اور آخرالامر ایک اور دس کی نسبت سے)۔

(۶) یہ پرکھنے کے لئے، کہ حق کس طرف ہے، بنیادی کسوٹی یہ ہے کہ

وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ۔ (۱۳/۱۷)

وہی نظریۂ زندگی، وہی مسلکِ حیات، وہی نظامِ انسانی باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے منفعت کا موجب ہو۔

مفاد پرست انسانوں کی گروہ مندانہ منفعت کوشیاں، اس اصول کو ناکام بنانے کے لئے مصروفِ جدوجہد رہتی ہیں لیکن خدا کی اسکیم اسے کامیاب و کامران بنا کر رہتی ہے۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ۔ وَ یَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ۔ وَ لَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ۔ (۹/۳۲)

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اس نورِ خداوندی کو پھونکیں مار مار کر بجھا دیں۔ لیکن خدا کی مشیت ان کی ان کوششوں کو بارآور نہیں ہونے دے گی۔ یہ نور اپنی تکمیل تک پہنچ کر رہے گا۔ خواہ مفاد پرست گروہوں پر یہ چیز کتنی ہی شاق کیوں نہ گزرے۔

یہی وہ نظامِ زندگی ہے جو باطل پر مبنی ہر نظام پر آخرالامر غالب آئے گا۔

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ۔ وَ لَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ۔ (۹/۳۳)

خدا نے اپنے رسول کو صحیح منزل کی طرف راہ نمائی دے کر بھیجا ہے۔ یعنی ایک ایسا نظامِ زندگی دے کر جو حق پر مبنی ہے۔ یہ نظام دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہے گا۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے جو خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت نہیں کرنا چاہتے۔

حق و باطل کی اس کشمکش کے نقطۂ نگاہ سے دنیا میں انسانوں کی دو ہی جماعتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک حق کا غلبہ چاہنے والی — اسے جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ دوسری باطل کے غلبہ کی متمنی — اسے کفار کا گروہ کہتے ہیں۔ یہ کشمکش انہی دو جماعتوں کے درمیان ہوتی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حق پرست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن

درحقیقت، چاہتے ہیں باطل کے ساتھ لپٹے رہنا۔ انہیں منافق کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ، قرآنِ کریم کی رُو سے بدترین خلائق ہوتا ہے یعنی کفار سے بھی بدتر۔

"شرک" حق اور باطل کے نظام میں مفاہمت (COMPROMISE) کو کہتے ہیں جس کی نظامِ حق میں قطعًا گنجائش نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نظام کے داعیٔ اول (حضور نبی اکرمؐ) سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ

وَلَا تَرْكَنُوٓا۟ إِلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ فَتَمَسَّكُمُ ٱلنَّارُ ‎-‏ (۱۱/۱۱۳)

یہ لوگ جو عدل کے بجائے، ظلم پر مبنی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، تم ان کی طرف ذرا سا بھی نہ جھکنا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو جس جہنم میں یہ گرفتار ہیں اس کی آگ کے شعلے تمہیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

حق و باطل کے اضداد میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر حق کے ساتھ باطل کی ذرا سی بھی آمیزش ہو جائے تو حق، حق نہیں رہتا۔

قرآنی تصور کی رُو سے حق اور باطل کے تضاد کی کیفیت یہ ہے۔ دوسری طرف فلسفۂ جدلیت ہے جو یہ تصور پیش کرتا ہے کہ دو باہمدگر متخاصم قوتیں کچھ وقت کے بعد ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتی ہیں — یعنی کچھ عرصہ کے بعد، حق — باطل ہو جاتا ہے اور باطل، حق ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ نظام جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ نظامِ زندگی جس میں مستقل اقدارِ حیات یا غیر متبدل قوانین محسوس عملی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہ نظام زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہوتا ہے۔ مکان کی حدود سے اس طرح کہ یہ عالمگیر نظام ہے جو کسی خاص خطۂ زمین میں محدود نہیں رہ سکتا، نہ ہی کسی خاص قوم پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں نظام ہے۔ جہاں تک زمان کا تعلق ہے اس نظام کے محسوس پیکر میں تو زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں ہو سکتی ہیں لیکن اس کی اصل و بنیاد ہمیشہ وہی رہتی ہے یعنی وہ غیر متبدل قوانین جن پر اس کی عمارت استوار ہوتی ہے، اسے دین کہا جاتا ہے۔

———— (۰) ————

۹۔ اضداد میں توافق

حق و باطل کی کشمکش دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو ان جماعتوں کے درمیان جو حق و باطل کی حامی ہوتی ہیں۔ اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ دوسرے افراد کے سینے کے اندر (داخلی کشمکش، جس میں ایک طرف انسان کے بیباک

جذبات، طبعی مفاد کے حصول کے لئے ہیجان خیز رہتے ہیں اور دوسری طرف اس کی ذات کی نشو ونما کے تقاضے حق کی حمایت کے داعی ہوتے ہیں۔ انسانی جذبات کو فنا کر دینے کا تصور، انتہائی غلط نگہی اور خود فریبی ہے۔ جذبات ہی تو وہ قوتِ محرکہ ہے جو انسان کو آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ قرآن کا اندازِ تربیت یہ ہے کہ وہ جذبات کو مستقل اقدار کے تابع مرگرم عمل رہنا سکھاتا ہے۔ نبی اکرمؐ کے الفاظ میں "اس طرح ابلیس مسلمان ہوجاتا ہے"۔ اس سے ان افراد کے سینے کا داخلی اضطراب مبدل بہ سکون ہوجاتا ہے۔ اس کیفیت کے متعلق قرآنِ کریم کہتا ہے کہ ___ لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ ___ (۶/۱۲۸)۔ خدا کی صفتِ ربوبیت کے زیرِ سایہ انہیں ایسا مقام حاصل ہوگا جس میں ہر سمت سے سلامتی کی آوازیں وجہ نشاطِ روح ہوں گی۔ (وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ۔ (۱۰/۱۰) اُس وقت انسان کے ارضی معاملات اور سماوی اقدار (غیر متبدل قوانین) ایک ہی مرکز میں مرکوز ہوں گے (۳۹/۹۴) اور انسانی معاشرہ کی حالت یہ ہوگی کہ ___ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ___ کسی انسان کا دوسرا انسان پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوگا ___ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ۔ (۸۲/۱۹)۔ حکومت انسانوں کی نہیں بلکہ قوانینِ خداوندی کی ہوگی۔

وَ أَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا۔ (۳۹/۶۹)

اور زمین اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

(٥)

۱۰۔ علم کے متعلق تصوّر

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، فلسفۂ جدلیت کی رُو سے علم وہی علم کہلانے کا مستحق ہے جو حواس کے ذریعے سے حاصل کیا جائے۔ اور نظریہ وہی درست تسلیم کیا جا سکتا ہے جس کی تائید اس کے نتائج کریں۔ اس عملی طریق سے انسان بتدریج قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرے گا۔ حقائق انہی قوانین کو کہا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم بھی انسانی علم اسی کو قرار دیتا ہے جسے حواس (SENSE PERCEPTION) کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۔ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۔ (۱۷/۳۶)۔

جس بات کا تمھیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو! تمھاری سماعت بصارت اور قلب ہر ایک

سے پوچھا جائے گا (کہ انہوں نے اس بات کے علم ہونے کی شہادت دی تھی یا نہیں)۔
یعنی حصولِ علم کے لئے ضروری ہے کہ انسانی حواس معلومات حاصل کر کے، قلب (MIND) تک پہنچائیں اور وہ ان سے کوئی نتیجہ مستنبط کرے۔ چنانچہ قرآن کریم قدم قدم پر مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔ وہ "علماء" کہتا ہی انہیں ہے جو کارگہِ فطرت کے مشاہدہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اس میں قوانینِ خداوندی کس حسن و خوبی سے کارفرما ہیں (۳۵/۲۸-۲۷)۔
نظامِ فطرت کے ساتھ ہی وہ انسانی تاریخ کے مطالعہ پر بھی بڑا زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اقوامِ سابقہ کی سرگذشتوں پر غور کرو اور دیکھو کہ جس قوم نے زندگی کے صحیح قوانین کے مطابق نظام متشکل کیا اس کا نتیجہ کیا نکلا اور جس نے غلط راہ اختیار کی اس کا انجام کیا ہوا۔
نظامِ فطرت کے مشاہدہ اور تاریخ انسانی کے مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر انسان پہنچے قرآن اسے ایک نظریہ قرار دیتا ہے۔ وہ نظریہ صحیح ہے یا غلط، اسے پرکھنے کے لئے وہ کہتا ہے کہ اس نظریہ پر عمل کر کے دیکھو۔ اگر اس کے نتائج اس کے دعویٰ کی تائید کرتے ہیں تو وہ صحیح نظریہ ہے۔ اگر نتیجہ اس کے مطابق نہیں نکلتا تو وہ نظریہ درست نہیں۔
یہی وہ طریق تھا جسے خود نبی اکرمؐ نے اپنے دعاوی کی صداقت کے ثبوت کے لئے پیش کیا۔ آپؐ نے اپنی قوم مخالف سے کہا کہ میں نے قوانینِ خداوندی تمہارے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ اب ان کی صداقت کے پرکھنے کا طریق یہ ہے کہ

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۶/۱۳۶)

ان سے کہو، کہ اے میری قوم! تم اپنے طریق پر عمل کرو، میں اپنے طریق پر عمل کرتا ہوں۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ منزل تک کون پہنچتا ہے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ جو لوگ دوسروں کی محنت کو غصب کر کے ظلم کرتے ہیں، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

جس دعویٰ کا اثبات اس کے عملی نتائج نہیں کرتے وہ دعویٰ صداقت پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس طریق سے حقیقت تک پہنچنے کے لئے لمبی مدت درکار ہوتی ہے۔ جہاں تک مستقل اقدار کا تعلق ہے، اس طویل مدت کو مختصر کر لینے کے لئے خالقِ کائنات کی طرف سے ایک اور طریق تجویز کیا گیا۔ اسے وحی کہا جاتا ہے یعنی ان قوانین کو کسی انسان پر براہِ راست منکشف کر دیا جاتا اور وہ انہیں دوسرے انسانوں تک پہنچا کر ان سے کہتا کہ تم ان پر عمل کر کے خود ان کی صداقت کے متعلق اطمینان کر لو۔

وحی کا یہ سلسلہ چودہ سو سال ہوتے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ لہٰذا، اب انسانی علم کا ذریعہ مطالعہ و مشاہدہ اور فکر و شعور کے علاوہ کوئی نہیں۔ وحی کے ذریعے جو علم آخری مرتبہ دیا گیا تھا، وہ اپنی اصلی شکل میں قرآنِ کریم کے اندر موجود ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ تم ان قوانین پر غور و فکر کرو اور ان پر عمل کر کے دیکھو۔ اگر اس طرح تمہیں ان کی صداقت کے متعلق اطمینان ہو جائے تو انہیں صحیح تسلیم کر لو۔ غور و فکر سے انسانی ذہن ایک نظریہ کے متعلق اتنا اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ مبنی بر حقیقت ہے یا نہیں۔ اگر وہ اسے اس طرح مبنی بر صداقت خیال کرے تو یہ بات اسے اس پر آمادہ کر دیتی ہے کہ وہ اس پر عمل کر کے دیکھے۔ اس وقت اس نظریہ کے نتائج ہنوز اس کے سامنے نہیں ہوتے۔ اس طرح اَن دیکھے نتائج پر اعتماد کر کے، آمادہ بہ عمل ہو جانے کو "ایمان بالغیب" کہتے ہیں۔ یعنی اُن نتائج پر یقین جو ہنوز مشہود طور پر سامنے نہیں آئے۔ یہ یقین اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے بغیر انسان، اس کے مطابق عملی قدم اٹھانے کے لئے بطیبِ خاطر تیار نہیں ہو سکتا۔ جب نتائج اس دعوے کی تائید کر دیں تو وہی "ایمان بالغیب" حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں پہلے درجہ کے یقین کو علم الیقین کہا جاتا ہے اور دوسرے درجہ کے یقین کو عین الیقین۔ (۱۰۲/۵-۷)۔ یعنی نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کرنا۔

یہ ہے قرآن کریم کی رُو سے علم کی تعریف (DEFINITION) اور علم و عمل کا باہمی تعلق۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جو قوانین یا مستقل اقدار تمہارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ تم ان پر عقل و فکر اور دلیل و برہان کی رُو سے غور کرو۔ اگر وہ تمہیں قابلِ قبول نظر آئیں تو ان کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کرو۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ ان قوانین کی صداقت کی زندہ شہادت بن جائیں گے۔ (۲۴/۵۵)۔ یوں وہ انسان کو اس محنتِ شاقہ سے بچا لیتا ہے۔ جو عقل کے تجرباتی طریق سے منزل تک پہنچنے کے لئے لاینفک ہوتی ہے۔

(۰)

فلسفہ کا اثر معاشی نظام پر

اب ہم اپنے سفر کی آخری منزل میں پہنچ رہے ہیں۔ ہم نے یہ ساری فلسفیانہ بحث اس لئے کی ہے، کہ کمیونزم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کے معاشی نظام کی بنیاد فلسفۂ جدلیت پر ہے۔ اس کے برعکس، قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ

یہ بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ یہ اتنے عظیم معاشی نظام کی عمارت کا بوجھ اٹھا نہیں سکتی۔ اس نظام کے لئے قرآن کا فلسفۂ حیات ہی اساسِ محکم عطا کر سکتا ہے۔ اس لئے انسانیت کی نجات کی راہ یہ ہے کہ قرآنی فلسفہ کی بنیادوں پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار کی جائے۔ دونوں فلسفے ہمارے سامنے آ گئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مادی جدلیت کا فلسفہ اس عمارت کے بوجھ کا متحمل کیوں نہیں ہو سکتا۔

مادی فلسفہ، خواہ وہ جدلیت کا ہو یا کچھ اور، اس کا فطری نتیجہ نظامِ سرمایہ داری کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ مادی فلسفۂ حیات کی رُو سے انسان کی زندگی صرف حیوانی ہوتی ہے اور قوانینِ فطرت کے تابع رہتی ہے۔ یہ وہ قوانین ہیں جن کا اطلاق، دیگر حیوانات پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح انسان پر۔ اس طرح اس فلسفہ کی رو سے انسانی زندگی کے تقاضے محض طبیعی تقاضے ہوتے ہیں۔

طبیعی زندگی کے تین تقاضے ایسے ہیں جنہیں بنیادی یا جبلّی (INSTINCTIVE) قرار دیا جاتا ہے۔

(۱) تحفظِ خویش کا تقاضا (SELF - PRESERVATION)

(۲) تغلبِ خویش کا تقاضا (SELF - AGGRESSION) — یہ درحقیقت تقاضا (۱) ہی کی تکمیل کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور

(۳) افزائشِ نسل کا تقاضا (SELF - REPRODUCTION)

تقاضا (۱) کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر فرد، زیادہ سے زیادہ سامانِ زیست سمیٹنے کی فکر کرے تاکہ اس سے اس کا زیادہ سے زیادہ تحفظ ہو سکے۔ اگر اس مقصد کے حصول میں اس کے راستے میں کوئی حائل ہو جائے تو یہ اس کا مقابلہ کر کے اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ تقاضا (۲) ہوا۔ اور جب اپنے تحفظ کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو پھر اپنی اولاد کے تحفظ کی فکر کرے۔ یہ تقاضا (۳) ہے۔ اس تصورِ زندگی کے ماتحت، کسی فرد کے لئے، کسی دوسرے فرد کے تحفظ یا مفاد کا سوال پیدا ہو نہیں سکتا۔ کوئی حیوان کسی دوسرے حیوان کے مفاد کا تصور نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک حصولِ مفادِ خویش کے علاوہ کوئی مقصد ہوتا ہی نہیں، ہو سکتا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس فلسفہ کا ماننے والا اس سوال کا اطمینان بخش جواب کبھی نہیں دے سکتا کہ

میں دوسروں کی مدد کیوں کروں؟

آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی کا تقاضا باہمی تعاون ہے یعنی میرے لئے

کسی محتاج کی مدد کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اگر کل کو میں محتاج ہو جاؤں تو دوسرے میری مدد کریں۔ لیکن ایسا کہتے وقت یہ نہیں سوچا جاتا کہ یہی جذبہ تو وہ ہے جس کے تابع ہر شخص زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے۔ یعنی وہ ایسا انتظام کرنا چاہتا ہے کہ وہ کسی وقت بھی دوسروں کا محتاج نہ رہے۔ یہی وہ منافست (RACE) ہے جو ایک فرد کی حاجیہ ضروریات پوری ہونے کے بعد بھی اسے اطمینان سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ وہ ہر وقت سمیٹنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے اور اسی سے معاشرے میں ناہمواریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ زیادہ عقل و ہنر (WITS) کے مالک زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیتے ہیں اور دوسرے بیچارے محتاج سے محتاج تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو زیادہ سمیٹ لیتا ہے وہ دوسروں کے تعاون کا محتاج نہیں رہتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس تعاون کو روپے سے خرید سکتا ہوں۔ اس لئے تعاون کی ضرورت اسے اس پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ وہ دوسروں کی امداد کرے۔ اسی کا نام سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ یہ مادی فلسفۂ زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔

فلسفۂ جدلیت، انسانی زندگی اور اس کے تقاضوں کا تصور تو یہ پیش کرتا ہے۔ لیکن اس بنیاد پر معاشی نظام وہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں زیادہ سے زیادہ ایثار کرنا پڑتا ہے۔ کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ:-

> ہر شخص سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے اور اس میں سے اُسے بقدر اُس کی ضرورت کے دے کر، باقی تمام دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے لے لیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ (مادی تصورِ حیات کی رُو سے) وہ کون سا جذبۂ محرکہ ہے جس کے ماتحت ایک فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں سے کم از کم خود لے کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دے دے۔ اس قسم کا مطالبۂ زندگی کے طبیعی تقاضے کے خلاف ہے۔ تحفظِ خویش کی جبلت (INSTINCT) اس کی کبھی اجازت نہیں دے سکتی۔ یہ اس مطالبہ کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ آپ ہنگامی طور پر عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے (جو نشہ پلا کر مدہوش کرنے ہی کی دوسری شکل ہوتی ہے) اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ مفادِ خویش کو نظر انداز کر دیں۔ لیکن اسے ان کا مستقل نہج زندگی نہیں بنا سکتے۔ روس کا تجربہ اس کا شاہد ہے۔ انہوں نے عوام (محتاجوں اور غریبوں کو یہ کہہ کر کہ "اٹھو اور امیروں کو لوٹ لو۔ ان کی دولت و حشمت کے مالک تم بن جاؤ گے" انہیں بے پناہ قربانیوں کے لئے آمادہ کر دیا۔ انہوں نے اس نشہ سے مدہوش ہو کر ہنگامی طور پر وہ کچھ کر دیا جسے دیکھ کر دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ لیکن جب ان کا نشہ اُتر گیا تو ایثار اور قربانی کا وہ جذبہ بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد جب ان محنت کشوں

سے کہا گیا کہ تم زیادہ سے زیادہ محنت کرو اور اس میں سے صرف بقدر اپنی ضرورت کے لو تو انہوں نے کہا کہ پھر اس میں اور قدیم نظامِ سرمایہ داری میں کیا فرق ہے؟ اس میں کارخانہ دار ہم سے زیادہ سے زیادہ محنت کراتا تھا اور ہمیں بقدر ہماری ضروریات کے دیتا تھا۔ یہی کچھ اب آپ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ایسا کیوں کریں؟ اس کا کوئی اطمینان بخش جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ انہوں نے اپنا نظام قائم رکھنے کے لئے ڈنڈے سے کام لینا چاہا۔ یہ کچھ وقت کے لئے تو چلا لیکن پھر ناکام رہ گیا۔ کوئی نظام قوت کے بل بوتے پر مسلسل نہیں چل سکتا۔ اس سے مجبور ہو کر روس والوں کو اپنے نظام میں تبدیلی کرنا پڑی۔ یہ جو وہاں اپنے مؤقف سے رجعت ہوئی ہے ــ جسے چین تحریف (REVISIONISM) قرار دے رہا ہے ــ یہ کسی سیاسی دباؤ یا مصلحت کا پیدا کردہ نہیں۔ یہ اس فلسفہ کی بنیادی کمزوری کا فطری نتیجہ ہے۔ چین ابھی اس منزل میں نیا نیا داخل ہوا ہے۔ اس لئے اس کا مقام یوں سمجھیے کہ وہی ہے جو لینن کے زمانے میں روس کا تھا۔ اس لئے اسے ابھی اس تحریف کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جب یہ بحران ختم ہو جائے گا تو وہاں (چین میں) بھی وہی صورت پیدا ہو جائے گی جو روس میں پیدا ہوئی ہے اس لئے کہ اس نظام کی بنیاد یہاں بھی وہی ہے جو روس میں تھی۔ یہ کسی خارجی اثرات کا نتیجہ نہیں۔ یہ اس فلسفہ کی بنیادی کمزوری کا لازمی اثر ہے۔ چنانچہ ماؤزے تنگ کو ابھی سے اس احساس نے ستانا شروع کر دیا ہے کہ چین کی نئی نسل کمیونزم کے مسلک سے ہٹتی جا رہی ہے اسے سنبھالنا چاہیئے۔ اس کے لئے وہاں نوجوانوں پر مشتمل حفاظتی عسکر (RED GUARS) کے ہاتھوں از سرِ نو اس انقلابی جدوجہد کو شروع کرایا جا رہا ہے جس میں سے ماؤزے تنگ اور اس کی پارٹی کے دیگر رفقا گزرے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس تحرک (IMPETUS) سے، یہ نظام چند قدم اور آگے بڑھ جائے لیکن اس سے اسے استحکام اور بقا نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ اس کی بنیادی کمزوری ہے جو خارجی محرکات سے رفع نہیں ہو سکتی۔

اس کے برعکس، قرآن کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ :-

(۱) انسان کی زندگی محض طبیعی زندگی نہیں۔ انسان جسم کے علاوہ ایک اور شے سے بھی عبارت ہے جسے اس کی ذات کہا جاتا ہے۔

(۲) مقصدِ زندگی جسم کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی ہے اور ذات کے تقاضوں کا پورا کرنا بھی۔ اگر ان دونوں تقاضوں میں ٹکراؤ نہ ہو تو ہو المراد ــ لیکن اگر ان میں کسی وقت ٹکراؤ ہو جائے تو پھر ذات کے تقاضوں کو جسم کے تقاضوں پر ترجیح دی جائے گی۔

(۳) ذات کے تقاضوں کو پورا کرنے سے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جاتی ہے اور اس طرح یہ جسم کی موت کے بعد زندہ رہ کر آگے بڑھتی اور مزید ارتقائی منازل طے کئے چلی جاتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۴) جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے آپ خود اپنے استعمال میں لائیں۔ مثلاً آپ کے جسم کی پرورش صرف اس شے سے ہوگی جسے آپ خود کھائیں گے۔ اس کے برعکس، انسانی ذات کی نشوونما ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے آپ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیں۔ بالفاظ دیگر، جسم کی نشوونما "لینے" سے ہوتی ہے اور ذات کی نشوونما "دینے" سے۔ قرآن کے الفاظ میں ـــ اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی۔ (۹۲/۱۸)۔ یعنی اس شخص کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے جو اپنی چیزوں کو دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیتا ہے۔

یہ ہے وہ فلسفۂ حیات جس کی بنیادوں پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ اس کے معاشی نظام کے اصولی خط و خال یہ ہیں۔

(۱) خدا نے سامانِ زیست تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے بلامزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس لئے ذرائع پیداوار پر کسی کی انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا کرنا خدا کے مقابلہ میں دوسرے خدا کھڑے کر دینے کے مرادف ہے۔

(۲) چونکہ اصل مقصدِ حیات، انسانی ذات کی نشوونما ہے اور وہ اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان، دوسروں کی نشوونما کے لئے زیادہ سے زیادہ دے اس لئے اس نظام میں، ہر فرد کی خواہش اور کوشش یہ ہوگی کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت سے کمائے۔ اپنی کمائی کے ماحصل میں سے، اپنی بنیادی طبیعی ضروریات پوری کرنے کے بعد، باقی سب دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ ۔ قُلِ الۡعَفۡوَ۔ (۲/۲۱۹)۔ (یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری بنیادی ضرورت سے زائد ہے، سب کا سب) تاکہ اس سے اس کی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو جائے۔ اس عمل (PROCESS) کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس وقت زکوٰۃ کا مفہوم صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ سرمایہ دار جس قدر جی چاہے سمیٹتے چلے جائیں لیکن اس میں سے اڑھائی فیصد خیرات کر دیں لیکن قرآن کی رُو سے اس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ زکوٰۃ کے معنی نشوونما ہیں۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں ـــ دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا ـــ یہ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے (۲۲/۴۱)۔ اس میں ہر فرد زیادہ سے

زیادہ محنت کرنا اور زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیئے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا موقعہ آپڑے) تو وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتا ہے (۵۹/۹)۔ وہ یہ کچھ کسی خارجی دباؤ یا سیاسی مصلحت کے ماتحت نہیں کرتا۔ یہ اس کی ذات کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس میں وہ زیادہ سے زیادہ اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ (یعنی زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیئے جانے) کا جذبۂ محرکہ، حیاتِ آخرت پر ایمان کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ (۴/۲۷) یہ صرف، اسی تصورِ حیات کے ماتحت ممکن ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ کام کرے اور اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دے (دوسروں سے مراد اپنی جماعت کے افراد ہی نہیں، بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسانی ہے)

اور جب اپنی ضروریات سے زائد، سب کچھ دوسروں کے لئے دے دیا جائے گا تو فاضلہ دولت (SUR-PLUS MONEY) — جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے — کسی کے پاس رہے گی ہی نہیں۔ نہ ہی جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوگا۔ نہ ہی روپیہ سمیٹنے کے لئے باہمی دوڑ (RACE) ہوگی۔ اس میں جو منافست (RACE) ہوگی، وہ زیادہ سے زیادہ کام کرکے زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دینے کے لئے ہوگی۔ (۸۳/۲۶)

یہ ہے وہ فلسفۂ حیات جس کی بنیادوں پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ ان ہر دو فلسفوں میں سے کون سا فلسفہ ایسا ہے جس کی بنیادوں پر وہ نظام قائم رہ سکتا ہے جس کا تصور کمیونزم پیش کرتی ہے۔ وہ صرف قرآن کے فلسفۂ حیات کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے۔

(۰)

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، فلسفۂ جدلیت میں دوسرا نقص یہ ہے کہ اس میں قانونِ اضداد (LAW OF CONTRADICTION) کے سوا، کسی قانون، کسی تصور، کسی نظام کو غیر متبدل تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تصور یہ ہے کہ قانونِ اضداد کی رُو سے ایک نظام ظہور میں آتا ہے۔ پھر اس میں اس کی ضد کھڑی ہو جاتی ہے اور دونوں میں تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت کے بعد وہ پہلا نظام مغلوب ہو جاتا ہے اور دوسرا غالب آجاتا ہے۔ پہلے نظام کا دور دورہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرے نظام کا عہد شروع ہو جاتا ہے۔ یہ گردشِ دولابی اسی طرح سے جاری چلی آرہی ہے۔ اسی طرح جاری رہے گی۔ اس وقت، اس گردش کی رُو سے سابقہ نظامِ سرمایہ داری پر اس کی ضد (نظامِ سوشلزم) غالب آرہا ہے (اس کی اگلی منزل کمیونزم ہوگی) اب اسے

محض اتفاق سمجھئے کہ ہم اس زمانے میں پیدا ہوتے ہیں جب اس نظام کے غلبہ کی باری ہے جو مزدوروں اور محنت کشوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ اس میں نہ مارکس کی فکر کا کوئی دخل ہے' نہ لینن کی عملی کارفرمائی کا۔ نہ روس کا کوئی کمال ہے نہ چین کا اعجاز۔۔۔ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی رُو سے ایسا ہونا تھا، ایسا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد جب گردش کا دوسرا رُخ آئے گا تو یہ نظام مٹ جائے گا اور اس کی جگہ اس کی ضد کوئی دوسرا نظام لے لیگا۔ اُس وقت روس اور چین تو ایک طرف، ساری دنیا کے انسان مل کر بھی چاہیں کہ اس قسم کے عادلانہ نظام کو برقرار رکھ لیں تو ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس وقت اگر نظامِ سرمایہ داری مٹ رہا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ نظام عدل و انصاف پر مبنی نہیں تھا۔ اس لئے اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اور اس کی جگہ سوشلزم کا نظام برسرِ اقتدار آرہا ہے تو یہ بھی اس لئے نہیں کہ یہ نظام نوعِ انسان کے لئے زیادہ منفعت بخش ہے۔ یہ تو صرف اپنی اپنی باری کا سوال ہے۔ اُس کی باری ختم ہو رہی ہے اس لئے وہ جا رہا ہے۔ اِس کی باری آرہی ہے اس لئے یہ آرہا ہے۔ کل کو جب اِس کی باری ختم ہو جائے گی تو یہ بھی چلا جائے گا اور مزدوروں اور محنت کشوں کی ہزار آہ و فغان اور ان کے حامیوں کی لاکھ سعی و کاوش بھی اسے برقرار نہیں رکھ سکے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کمیونزم کی طرف سے دنیا کے سامنے اس کا معاشی نظام پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کا فلسفہ نہیں۔ اس نظام کے متعلق بدلائل و شواہد بتایا جا رہا ہے کہ یہ' سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں انسانیت کے لئے آیۂ رحمت ہے (اور یہ واقعہ بھی ہے)۔ سوال یہ ہے کہ جب اس نظام کی باری ختم ہو جائے گی اور یہ اپنی مسند خالی کر رہا ہوگا اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے رہا ہوگا جو اس کی ضد ہوگا تو اس وقت کمیونزم کے حامی دنیا کو کیا کہیں گے؟ اس وقت ان کے تمام دلائل و شواہد' جو یہ موجودہ نظام (کمیونزم) کے حق میں پیش کر رہے ہیں' سب باطل قرار پا جائیں گے۔ اُس وقت انہیں بھی اُس آنے والے نظام کی حمایت کرنی ہوگی۔ ورنہ جو درگت اِس وقت نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کی بن رہی ہے' وہی کچھ ان کے ساتھ بھی ہوگا۔ اس لئے کہ نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کا قصور اتنا ہی ہے ناکہ وہ جدید نظام کا ساتھ نہیں دے رہے، جانے والے نظام کے ساتھ لپٹے ہوئے ہیں۔ اگر اُس وقت کمیونزم کے حامیوں نے اس جدید نظام کا ساتھ نہ دیا تو وہ بھی اسی جرم کے مرتکب قرار پائیں گے جس جرم کی بنا پر اِس وقت نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کو موردِ الزام قرار دیا جا رہا ہے۔

پھر یہ عمل بھی قابلِ غور ہے کہ اس وقت ماؤزے تنگ اپنی قوم کو سوشلزم کے معاشی نظام کی برکات کی بنا پر اس مقام تک لے آیا ہے۔ کل کو جب اس نظام کی باری ختم ہو جائے گی تو پھر اس قوم سے کیا کہا جائے گا

اور ان کے لئے وجہِ جامعیت کیا چیز ہوگی؟

اصل یہ ہے کہ مادّے سے تنگ کا فلسفہ اضداد، فلسفہ جبریت (DETERMINISM) ہی کی ایک شاخ ہے، جس کی رُو سے انسان کی حیثیت کائنات کی عظیم مشینری میں ایک بےبس پرزے سے زیادہ کچھ نہیں، جو مشین کی حرکت کے ساتھ چلنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ، یونان کی فکرگاہوں سے ابھرا اور انسانیت کو تباہ کرتا ہوا مختلف بھیس بدل کر یہاں تک آپہنچا ہے۔ یہی وہ فلسفہ تھا جس سے متأثر ہو کر ہندوؤں نے تناسخ (آواگون) کا عقیدہ وضع کیا۔ اور عیسائیت نے "اولین گناہ" (ORIGINAL SIN) کے کلنک کا ٹیکہ انسانیت کی پیشانی پر لگایا جو کسی کے دھوئے دُھل نہیں سکتا۔ مغرب کے مفکرین اور سائنس دانوں نے عیسائیت کو تو خیرباد کہہ دیا لیکن وہ اس کے اس فلسفہ کے چکر سے نہ نکل سکے۔ چنانچہ ان کی ہر تحقیق کا رُخ اسی سمت جاتا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ اسی سے ہیگل متأثر تھا اور یہی مارکس کے اعصاب پر سوار رہا۔ اب وہی تصور، فلسفہ اضداد کے روپ میں سامنے آیا ہے۔ جس میں نظام خود بخود بدلتے رہتے ہیں اور انسان ہر آنے والے نظام کا ساتھ دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ نہ اس کی برائیاں کسی مروجہ نظام کا کچھ بگاڑ سکتی ہیں، نہ اس کی اچھائیاں اس کا کچھ سنوار سکتی ہیں۔

اس کے برعکس، قرآن کہتا ہے کہ ایک نظام فی ذاتہٖ اچھا ہوتا ہے اور دوسرا نظام فی ذاتہٖ خراب ہوتا ہے۔ جو اچھا ہوتا ہے اس میں قائم رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے، جو خراب ہوتا ہے وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اچھے نظام کا معیار یہ ہے کہ مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

جو نظام تمام نوعِ انسان کے لئے نفع بخش ہوتا ہے وہی نظام اچھا ہوتا ہے اور اسی میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

اس کے برعکس، إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۔ (۶/۱۳۵)۔ جو نظام سلب و نہب اور ظلم و جور پر مبنی ہوگا اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ چونکہ محو و ثبات کا یہ قانون غیر متبدل ہے اس لئے اس کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ بات ساری وقت (TIME) کی ہے۔ اگر انسانوں کی جماعت اس کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی، تو یہ ظلم پر مبنی نظام مٹ جائیگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس میں وقت لگ جائے گا۔ قرآن کریم نے اس کی ایک مثال بھی دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نظامِ جاگیرداری (FEUDAL SYSTEM) جس میں زمین کے بے حد و نہایت رقبے افراد کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں، ظلم پر مبنی نظام ہے، یہ مٹ کر رہے گا۔ خدا کے کائناتی قانون کی رُو سے ایسا بتدریج ہوگا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا ۔ وَاللَّهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ

لِحُكْمِهٖ ۔ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۔ (۱۳/۴۱)۔

کیا یہ لوگ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو جاگیرداروں کی ملکیت سے کم کرتے جا رہے ہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے جسے کوئی پلٹا نہیں سکتا۔ وہ بہت جلد حساب کر دیتا ہے (لیکن اس کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔)

لیکن جب عہدِ نبی اکرمؐ میں، جماعتِ مومنین اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تو وہی انقلاب جسے اپنی رفتار سے ہزاروں سال میں جا کر مکمل ہونا تھا، چند سال کے عرصہ میں ظہور میں آگیا۔ عہدِ نبی اکرمؐ میں، زمین کو بٹائی، یا کرایہ پر دینے کی ممانعت کر دی گئی اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں تمام زمین، نظامِ معاشرہ کی تحویل میں آگئی۔ اس کے بعد، جب اس جماعت کے جانشینوں نے اس قانونِ خداوندی سے اعراض برتا تو اس قانون نے پھر اپنی کائناتی رفتار سے آگے چلنا شروع کر دیا اور اب یہ صدیوں کی مسافت طے کرنے کے بعد پھر عملاً متشکل ہوتا نظر آرہا ہے۔ یہی مثال دوسرے غلط نظامہائے حیات پر بھی صادق آتی ہے۔

یہ ہے قرآن کا پیش کردہ قانونِ محو و ثبات ـــ یہ تاریخی وجوب کی اندھی قوت کی پیدا کردہ گردش دولابی نہیں۔ اس میں اصول یہ ہے کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۔ (۸/۴۲) جو مٹتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے مٹتا ہے، جو زندہ رہتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہتا ہے اور وہ دلیل و برہان یہ ہے کہ

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

زندہ وہ رہتا ہے جو نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

اس نقطۂ خیال سے بھی آپ دیکھئے کہ جدلیت کے فلسفہ اور قرآنی فلسفہ میں سے کس میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ ایسے نظام کو قائم کر سکے اور باقی رکھ سکے جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو!

―――― (۰) ――――

حرفِ آخر

نظامِ کائنات پر غور کرنے سے چند ایک اہم حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً

(۱) صفحۂ ارض پر زندگی کی نمود سے پہلے ہی یہاں سامانِ زیست موجود تھا اور موجود چلا آرہا ہے۔ زندگی خواہ اوّلین جرثومہ کی شکل میں ہو اور خواہ بلند ترین حیوانی پیکر میں، جن اشیاء پر اس کے قیام و بقا کا انحصار ہے ـــــ پانی، روشنی، حرارت، ہوا، خوراک وغیرہ ـــــ وہ سب کچھ ساتھ موجود رہتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سلسلہ یونہی اتفاقاً وجود میں نہیں آگیا، یہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت کار فرما ہے اور سراسر حکمت پر مبنی۔

(۲) یہ سامانِ زیست ان اشیاء کا خود پیدا کردہ نہیں، کسی اور کا عطا کردہ ہے۔ یعنی جس نے انہیں زندگی دی ہے اس نے سامانِ زندگی بھی پیدا کر دیا ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:-

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ۔ (۱۱/۶)

زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں۔

(۳) صفحۂ ارض پر کوئی شے (انسان کے سوا) ایسی نہیں جو سامانِ زیست کو انفرادی ملکیت میں لے بیٹھے۔ وہ صرف اس سے اپنی ضرورت پوری کرتی ہے ـــــ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۔ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۔(۲۹/۶۰)۔ ذرا سوچو تو سہی کہ کتنے ذی حیات ہیں جو اپنا رزق اپنی پیٹھ پر لادے پھرتے ہیں؟ سامانِ زیست' مادۂ ارض پر تمہارے لئے اور ان کے لئے بکھرا پڑا ہے۔

ان میں سے جو ذی حیات رزق کا ذخیرہ بھی کرتے ہیں (مثلاً چیونٹیاں یا شہد کی مکھیاں وغیرہ) تو وہ بھی ان سب کی اجتماعی ضرورت کے لئے ہوتا ہے۔ انفرادی ملکیت کا سوال وہاں بھی نہیں ہوتا۔

(۴) انسانوں کے لئے بھی اسی انداز کی زندگی بسر کرنا منشائے فطرت تھا۔ اسے قرآن (قصۂ آدم کے تمثیلی رنگ میں)، اس زمین پر جنت کی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ زندگی جس میں کیفیت یہ ہو کہ:-

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۔(۲۰/۱۱۸)۔

اس میں تجھے نہ بھوکے رہنے کا غم ستائے نہ پیاس پریشان کرے۔ نہ اس میں لباس کیلئے متفکر ہونا پڑے، نہ مکان کے لئے سرگرداں۔

اس میں کیفیت یہ ہونی چاہئے کہ ـــــ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۔ (۲/۳۵)۔ جہاں کسی کو ضرورت ہو، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتے۔ ذرائع رزق ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں ـــــ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۔ (۴۱/۱۰)۔

(۵) لیکن انسان کی مفاد پرستیوں نے، سامانِ زیست پر انفرادی ملکیت کا تصور پیدا کر کے اس جنت کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ اس پستی کو قرآن نے ہبوطِ آدم سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر فرد دوسرے کا دشمن ہو گیا۔ (وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (۲/۳۶)۔

(۶) اب مقصودِ فطرت یہ ہے کہ انسانی دنیا میں پھر سے وہی جنتی زندگی کا نقشہ قائم ہو جائے اور اس طرح جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے جنت کو پا لے۔ "خدا کا کائناتی قانون، اسی نقشہ کو قائم کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، اس کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کے مطابق) بہت سست ہے۔ اس کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہے۔

اس رفتار کو تیز کرنے کے لئے آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعی، حضرات انبیاء کرامؑ وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ وہ اپنے حلقۂ اثر میں اس نقشہ کو قائم کرتے ــــ یعنی سامانِ زیست کو تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے عام کر دیتے۔ (اسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے) ــــ لیکن ان کے بعد مفاد پرست گروہ پھر آگے بڑھ آتا اور اس نقشہ کو الٹ کر پھر سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر دیتا ــــ یہ کچھ ایسے لوگوں کی مدد سے ہوتا جو مقدس لباسوں میں ملبوس ہو کر عوام سے کہتے کہ منشاءِ خداوندی بھی یہی ہے۔ انہیں مذہبی پیشوا کہا جاتا ہے۔ آخری مرتبہ "وہ" جنتی نقشہ" خدا کے آخری نبیؐ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں متشکل ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد، مفاد پرست گروہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی شکل میں پھر آگے بڑھ آیا۔ انہوں نے باطل کا نظامِ سرمایہ داری قائم کر دیا اور خدا کا کائناتی قانون پھر سے اپنی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔

اب نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اس لئے اب اس جنتِ ارضی کی تشکیل کی دو صورتیں تھیں۔

ا۔ جس اُمت کو اس آخری نبیؐ کے پیغام (قرآن) کا وارث قرار دیا گیا تھا، وہ اس نظام کو اپنے دستِ بازو سے قائم کرتی اور باقی رکھتی ــــ اور اگر وہ ایسا نہ کرتی تو

ب۔ زمانے کے تقاضے انسان کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے۔ اس شکل میں دشواری یہ ہوتی ہے کہ یہ نظام بیک جست اپنی منزہ صورت میں سامنے نہیں آ سکتا۔ ابتداءً بڑی دھندلی سی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اور پھر تجرباتی طریق سے بتدریج اپنی منزہ شکل تک پہنچتا ہے۔

ہم (وارثینِ کتاب اللہ) نے اپنا فریضہ ادا نہ کیا، تو اس انقلاب نے دوسری شکل اختیار کر لی۔ عصرِ حاضر میں اس

کی پہلی نمود مارکس کی فکر میں سامنے آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کے سینے میں قلبِ حساس تھا جو مظلوم ومقہور انسانوں کی حرماں نصیبی پر ـــــ جن پر بالادست انسانوں کی چیرہ دستیوں نے رزق کے دروازے بند کر دیئے تھے ـــــ خون کے آنسو روتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان کے دکھ دور ہو جائیں۔ وحی کی حقیقی روشنی (قرآنی تعلیم) اس کے سامنے نہیں تھی۔ اس کے سامنے عیسائیت تھی۔ جو لفظاً انسانیت کے دکھوں پر آنسو بہانے کی مدعی ہونے کے باوجود، عملاً اس نقشہ کو قائم رکھنے کا موجب تھی جس سے یہ تمام دکھ وجود میں آتے ہیں ـــ جب آپ خدا پرستی کے لئے دنیا کو تیاگ دینے یا اسے قابلِ نفرت سمجھنے کو اوّلین شرط قرار دے دیں اور مظلوموں کے دکھ دور کرنے کے لئے عدل کے بجائے رحم کی بھیک مانگیں، تو مستبد قوتیں دندناتی پھریں گی۔ انہیں ظلم وستم سے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مارکس نے اس حقیقتِ حال پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان چیرہ دستیوں کا بنیادی سبب مذہب کا تصور ہے۔ اس لئے اس نے مذہب کو انسانیت کا اوّلین دشمن قرار دے دیا۔ اگر اس کے سامنے "مذہب" کے بجائے "دین" (قرآن کریم) ہوتا تو وہ اس نتیجہ پر نہ پہنچتا۔

روس میں بھی، اسی عیسائیت کا دور دورہ تھا اس لئے لینن بھی خدا کے متعلق، اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس کا تصور مفاد پرستوں کا پیدا کردہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب خدا پر ایمان نہ رہے تو انسانی ذات، وحی، حیاتِ آخرت پر ایمان خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

چین میں مذہب کے سلسلہ میں حالات اس سے بھی بدتر تھے۔ وہاں، ایک چھوڑ، تین تین قدیم مذاہب مروج تھے۔ اور تینوں کے تینوں توہم پرستی کے مظاہر۔ کنفیوشس ازم کی تعلیم خالصتہً اسلاف پرستی تھی جس میں جمود وتقلید سب سے بڑی نیکی اور تغیر واصلاح کا تصور سب سے بڑا گناہ تصور کیا جاتا ہے (بعینہٖ اس طرح جس طرح ہمارے ہاں مذہبی پیشوائیت تقلید کو عین دین بنا کر پیش کرتی، اور ہر تغیر اور جدّت کو جہنم کے عذاب کا مستوجب قرار دیتی ہے)۔ طاؤ ازم، گیان دھیان میں مست رہ کر دنیا تیاگ دینے کی تعلیم دیتا تھا۔ بدھ مت اس سے بھی چار قدم آگے تھا۔ اس میں منتہائے زندگی نروان حاصل کرنا ہے جس سے مراد اپنے آپ کو قاطبتہً فنا کر دینا ہوتا ہے۔ ماؤزے تنگ کے سامنے یہ مذاہب تھے۔ اس لئے اس کا ردّعمل ظاہر ہے۔ اس نے فکری طور پر ہیگل، بلکہ مارکس سے بھی اختلاف کیا۔ لیکن مذہب کے خلاف اس کی شدت ان سے بھی زیادہ بڑھ گئی ـــ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اتنا بڑا انقلابی ذہن، جمود وتعطل کے اس جذام کو کیسے گوارا کر لیتا؟

لیکن چونکہ دین اس کے سامنے بھی نہیں تھا، اس لئے اس نے بھی اپنے فلسفہ کی بنیاد اپنے قیاسات ہی پر رکھی۔ وہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔

یہ ہے وہ فلسفہ جس کا اجمالی تعارف ہم نے شروع میں کرایا تھا اور جس کی بنیادوں پر، وہ اتنے عظیم معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی بنیادوں پر یہ عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ جب چین میں السابقون الاولون (POINEERS) کی موجودہ نسل ختم ہو جائے گی تو پھر (آئندہ نسل کے لئے) اتنی بڑی قربانیوں کے لئے کوئی جذبۂ محرکہ نہیں رہے گا۔ اور چینی انقلاب بھی اسی تحریف (REVISIONISM) پر مجبور ہو جائے گا جس کا طعنہ وہ اس وقت روس کو دے رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے روس اور اس کے بعد چین کی اِن انقلابی جماعتوں نے کائناتی قانون کی تائید کے لئے ہاتھ اٹھا کر، اس کی رفتار میں تیزی پیدا کر دی ہے لیکن چونکہ ان کے انقلاب کی اساس و بنیاد محکم نہیں ہے، اس لئے یہ انقلاب ایک حادثہ بن کر رہ جائے گا اور اس کے بعد، اگر کائناتی قانون نے اپنے حساب سے "ایک دن" کی بھی مزید تاریخ ڈال دی" تو انسانیت کو صدیوں تک پھر سرمایہ داری کے آہنی شکنجہ میں جکڑے رہنا پڑے گا۔ لیکن اگر اس وقت اس معاشی انقلاب کو قرآن کی اساسِ محکم مل جائے تو پھر نظامِ سرمایہ داری سر نہیں اٹھا سکے گا اور جنت سے نکلا ہوا آدم اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لے گا۔ اقبالؔ نے، نیٹشے کے فکر کی بلندی اور اس کی بنیاد کی پستی کو دیکھ کر کہا تھا کہ ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے!

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُس "مجذوب فرنگی" سے کہیں زیادہ ضرورت آج اس "مسلک چینی" کو مقامِ کبریا سے آگاہ کرنے کی ہے۔ یہ اس لئے کہ مقامِ کبریا کے راستے میں جو خار دار جھاڑیاں دامنگیر ہوتی ہیں، چین نے انہیں راستے سے الگ کر دیا ہے ــــ وہاں بادشاہی، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کی قوتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور یہی وہ خار دار جھاڑیاں ہیں جو انسان کو "خدا" تک پہنچنے نہیں دیتیں ــــ یہ وہ حصّہ لَآ ہے جسے طے کئے بغیر انسان اِلَّا اللّٰہ تک پہنچ نہیں سکتا۔ چین ان منفی منازل کو طے کر لینے کے بعد، دین کی منزلِ اِلَّا کی سرحد پر کھڑا ہے۔ اگر اس وقت، اُسے اس مقام کی نشان دہی کر دی جائے اور وہ اس راستے کو اختیار کر لے تو صرف چین ہی نہیں، عالمگیر انسانیت اُس جہنم سے بچ سکتی ہے جس میں اُسے بصورتِ دیگر نمعلوم کتنے عرصہ

تک ابتلاء و مصائب رہنا پڑے اور اس سے نکلنے کے لئے خدا جانے اسے کتنی خون کی ندیاں پیرنی، اور آگ کے دریا عبور کرنے پڑیں — مسلم ممالک میں سے اس وقت کوئی بھی اس کے لئے آمادہ نظر نہیں آتا، کہ وہ قرآن کے انقلابی پروگرام کو اپنے ہاں عملاً متشکل کر دے۔ یہ ممالک ابھی حصّہ لا ہی سے نہیں نکلے، حصّہ اِلّا تک کیسے پہنچ سکیں گے۔ پاکستان کا تصوّر پیش کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اس سے "اسلام اس ٹھپے کو مٹا سکے گا جسے عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر دیا تھا"۔ — لیکن یہاں جس تیزی سے مذہبی پیشوائیت اپنا تسلّط جما رہی ہے اس کے پیشِ نظر یہاں دین کے تمکن کے امکانات بہت پیچھے جا پڑے ہیں۔ یاد رکھیئے! مذہبی پیشوائیت کا اقتدار، نظامِ سرمایہ داری کے ماپنے کا پیمانہ ہوتا ہے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کے بڑھنے سے دوسری بڑھتی ہے اور ایک کے گھٹنے سے دوسری گھٹتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں دین کے انقلابی پروگرام کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں۔ خواہ وہ وحی کی راہ نمائی میں وجود کوشش ہو، اور خواہ زمانے کے تقاضوں سے — یہ وجہ ہے، جو میں سمجھتا ہوں کہ اگر قرآن کا پیغام کسی طرح ماوزے تنگ تک پہنچ جاتے اور وہ اسے سمجھنے پر آمادہ ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس سے نوعِ انسان کی تقدیر بدل جائے۔ اور اقبالؒ نے حکیم سنائیؔ کے اس مصرعہ کے اندر چھپی ہوئی جس "قیامت پیش از قیامت" کا خواب دیکھا تھا، جنّت سے نکلا ہوا آدم، اس خواب کی تعبیر کو اپنی آنکھوں کے سامنے متشکل دیکھ لے — یہ خواب اس نظم کے ایک بند میں مرقوم ہے جسے علامہؒ نے حکیم سنائیؔ کے مزار کے سرہانے کھڑے ہو کر کہا تھا، یعنی:

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا
نہ ایراں میں رہے باقی، نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ!
یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ
حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے

"گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!"　　(یہ مصرع حکیم سنائی کا ہے)

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تاریخ نے ہمیں ایک عجیب مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ایک طرف مغربی جمہوریتیں ہیں جن کا نظام سرمایہ دارانہ ہے لیکن وہ (عیسائی یا یہودی ہونے کی جہت سے) اپنے آپ کو خدا پرست کہتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم اس قسم کی خدا پرستی کو خدا پر ایمان قرار ہی نہیں دیتا۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ نہیں کہ آپ اپنے ذہن کے تراشیدہ (یا اپنے مذہب کے پیش کردہ) خدا کے تصور کے مطابق خدا کو مانیں۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ آپ خدا کے اس تصور پر ایمان رکھیں جو تصور اس نے خود اپنے متعلق دیا ہے۔ اور وہ تصور قرآن کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کریم نے اہلِ کتاب سے بھی یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ خدا پر ایمان لائیں۔ لہٰذا، قرآنی نقطۂ نگاہ سے، نہ اہلِ مغرب خدا پرست ہیں اور نہ ہی ان کا نظام، قرآنی نظام کے مماثل ہے۔ بلکہ وہ اس کی ضد ہے۔ ان کی طرف سے یہ نعرہ کہ:

"دنیا کے خدا پرستو! آؤ اور اشتراکیت کے خدا فراموش نظام کے خلاف متحدہ محاذ بناؤ۔"

محض ایک سیاسی نعرہ ہے جو مسلم اقوام کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

دوسری طرف کمیونزم ہے جس کا نظام تو قرآنی نظام کے مماثل ہے لیکن اس کا فلسفۂ حیات قرآنی فلسفۂ زندگی کی نقیض ہے۔ اس لئے وہ بھی، قرآنی نقطۂ نگاہ سے، مسلمان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ واضح رہے کہ جس طرح قرآن اپنے نظام کو فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کرتا، اسی طرح کمیونزم بھی اپنے معاشی نظام کو اپنے فلسفۂ زندگی سے جدا نہیں کرتی۔ کمیونسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کے فلسفۂ حیات اور اس پر متفرع معاشی نظام کو ایک وحدت کی طرح تسلیم کرے۔ یہ وجہ ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ نہ ایک کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ ایک مسلمان کمیونسٹ۔

تیسری طرف ہم مسلمان ہیں جن کے ہاں قرآن کریم کے الفاظ تو بے شک محفوظ ہیں لیکن عملاً نہ ہمارا نظام قرآنی ہے، نہ فلسفۂ زندگی قرآنی۔ ہم بھی درحقیقت اسی مقام پر ہیں جس مقام پر مغرب کے اہلِ کتاب ہیں — اس فرق کے ساتھ کہ ان کے پاس خدا کی راہ نمائی اپنی اصل شکل میں موجود نہیں اور ہمارے پاس وہ (غلافوں میں لپٹی ہوئی) محفوظ رکھی ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ "اگر اشتراکیت کے ساتھ خدا کو شامل کر لیا جائے تو وہ

اسلام کے مماثل ہو جاتی ہے، تو یہ فارمولا کاروانِ انسانیت کے لئے منزلِ مقصود کی صحیح نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کے لئے مسلم ممالک ابھی آمادہ نہیں۔ وہ اس تصورِ حیات سے ہنوز بہت دور ہیں۔ لیکن دینِ خداوندی پر کسی خاص قوم کی اجارہ داری نہیں کہ وہ اسے چلانا چاہے تو وہ چل سکے اور اگر وہ اسے قصۂ پارینہ بنا بیٹھے تو دین' بے بس و مجبور بیٹھا، اس کا منہ تکتا رہے۔ یہ تمام نوعِ انسانی کی مشترکہ وراثت ہے۔ دنیا کی جو قوم بھی اسے اپنانا چاہے، دین اسی کا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر مخاطب قوم سے کہتا ہے کہ دین کا نقشہ تمہارے سامنے آچکا ہے — فَإِن تَوَلَّوْا ..... يَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ۔ اگر تم اسے اپنانا چاہتے ہو تو ہو المراد۔ لیکن، اگر تم اس سے روگردانی کرنا چاہتے ہو تو خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا، جو اسے اپنا لے گی — وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا۔" اور تم اس کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکو گے۔ دین' ایک خاص فلسفۂ حیات کے مطابق نظامِ زندگی متشکل کرنے کا نام ہے۔ جو قوم بھی ایسا کرنا چاہے' دین لپک کر اُسے سینے سے لگا لے گا۔

اُٹھا لے جو بڑھا کر ہاتھ میں بادہ اُسی کا ہے

لہٰذا، بہ حالاتِ موجودہ کشادگی کی راہ ایک ہی نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ اگر اشتراکی ذہن پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ جس فلسفہ پر وہ اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرنا چاہتا ہے اس کی بنیادیں اس عمارت کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ یہ عمارت قرآنی فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر ہی استوار ہو سکتی ہے۔ تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے۔ اس وقت اشتراکی ذہن کا سب سے بڑا نمائندہ ماؤزے تنگ ہے۔ چین کے ستر کروڑ نفوس اس کی فکر کی پرستش کرتے ہیں اور چین سے باہر کس قدر اذہان اس فکر سے بالواسطہ متاثر ہیں' اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ پوزیشن دنیا میں اس وقت کسی اور مفکر کو حاصل نہیں اور نہ ہی عملی اعتبار سے اس وقت کوئی دوسرا انسان ایسا نظر آتا ہے جو اسلام جیسے عالمگیر انقلاب کو اپنے ہاں عملاً نافذ کرنے کی ہمت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر اس ایک ذہن کی فکر میں قرآنی تبدیلی آجائے تو عالمِ انسانیت میں اس سے بڑا انقلاب اور کون سا ہو سکتا ہے۔ اس سے فی الواقعہ دنیا میں قیامت سے پہلے وہ قیامت برپا ہو سکتی ہے جس کا تصور اقبالؒ نے پیش کیا تھا اور اس نے "پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے" کی جو تاریخی حقیقت بیان کی تھی، چہ عجب کہ اس کی تائید میں ایک اور شہادت دنیا کے سامنے آجائے۔

مجھے اس کا احساس ہے کہ ہمارے ہاں (ہر کمزور قوم کی طرح) یہ ذہنیت چلی آرہی ہے کہ دنیا میں جونہی کسی بڑے آدمی نے غلبہ و اقتدار حاصل کیا تو اس کے متعلق یا تو ہم نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ "وہ اندر سے مسلمان ہی ہے"

اور یا اس کے مسلمان ہونے کی دعائیں مانگنے لگ گئے۔ لیکن میرے اس خیال کی محرک یہ ذہنیت نہیں — میں اس نتیجہ پر جن دلائل و وجوہات کی بنا پر پہنچا ہوں، انہیں میں نے تفصیل سے پیش کر دیا ہے۔ اگر اربابِ فکر و نظر کو اس تجزیہ حالات میں کوئی سقم نظر آئے تو اس کی نشاندہی کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔ میری قرآنی بصیرت نے بہرحال مجھے اسی نتیجہ پر پہنچایا ہے اور وہی مجھے اس پر بھی مجبور کر رہی ہے کہ میں اسے اربابِ علم و بصیرت کے سامنے کھلے الفاظ میں پیش کر دوں۔ کیونکہ کتمانِ حقیقت قرآن کی رُو سے انسانیت کے خلاف جرمِ عظیم ہے۔

(۰)

آخر میں، میں اتنا اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ سابقہ صفحات میں ماؤزے تنگ کی فکر پر جو تنقید کی گئی ہے تو اس سے اس کی تنقیص مقصود نہیں۔ قرآنِ کریم عقلِ انسانی کا مقام بہت بلند قرار دیتا ہے اور اس سے کام لینے کی بڑی تاکید کرتا ہے۔ اس لئے جو شخص بھی عقل و فکر سے کام لے کر زندگی کے مسائل سلجھانے کی کوشش کرے گا، وہ ہمارے نزدیک مستحقِ تحسین و ستائش ہے۔ لیکن (وہ کہتا یہ ہے کہ) جس طرح (مثلاً) انسانی نگاہ کی ایک حد ہے جس سے آگے کی چیز اسے نظر نہیں آ سکتی، اسی طرح عقلِ انسانی کی بھی ایک حد ہے جس سے آگے وہ جا نہیں سکتی۔ وحی کی راہ نمائی ایک دوربین ہے جس سے عقلِ انسانی کی آنکھ اپنی عام حد سے بہت آگے کی چیز دیکھ سکتی ہے۔ ماؤزے تنگ (اور دیگر مفکرین) کی حدِ نگاہ یقیناً عام انسانوں سے زیادہ وسیع ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اسے وحی کی راہنمائی کی دوربین مل جائے تاکہ وہ راستے کے ان مقامات کو یقین کی آنکھ سے دیکھ سکے جنہیں اس وقت وہ محض قیاس کی لکڑی سے ٹٹولتا ہے اس لئے غلطی کھا جاتا ہے۔ ہم اگر اس وقت اس سے زیادہ دور کی چیزیں دیکھ سکتے ہیں تو اس میں ہماری آنکھ کا کوئی کمال نہیں۔ یہ اس دوربین کی خوبی ہے — یہ دوربین اگر اس مفکر کے ہاتھ میں دیدی جائے تو وہ ہم سے بہت زیادہ آگے دیکھ سکے گا۔ اس لئے خود بھی راستے کے خطرات سے محفوظ رہے گا اور کاروانِ انسانیت کو بھی بحفاظت اس کی منزل تک لے جا سکے گا[۱]۔ — یہ ہے میری آرزو کا مقصود، اور سعی و کاوش کا مطلوب۔

یارب! ایں آرزوئے من چہ خوش است!

---

[۱] افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا اور ماؤزے تنگ ویسے ہی دنیا سے چلا گیا۔ اس کے بعد چین کی جو حالت ہو رہی ہے وہ ہمارے سامنے ہے (۱۹۷۸ء)

ربوٰ کی بحث

میں اس کتاب کو سابقہ باب کے ساتھ ختم کر رہا تھا کیونکہ میرے نزدیک اس (کتاب) میں معاشیات سے متعلق کم و بیش جملہ مباحث آگئے ہیں ـــ اکثر تفصیلاً اور بعض مجملاً ـــ لیکن میں نے دیکھا کہ ان دنوں (۱۹۷۸ء میں) ہمارے ہاں دو موضوعات نے بڑی اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ ایک ربوٰ کا مسئلہ جس کے ضمن میں کہا جا رہا ہے کہ ملک میں بلاسود معاشی کاروبار، بالخصوص بنکاری کا نظام قائم کیا جائے گا۔ اور دوسرے یہ کہ نظامِ زکوٰۃ رائج کیا جائے گا۔ جو جملہ معاشی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کر دے گا۔ ربوٰ اور زکوٰۃ کے متعلق سابقہ صفحات میں ضمنی طور پر لکھا جا چکا ہے لیکن ان مسائل نے اس وقت جس درجہ کی اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مختصر الفاظ میں دوبارہ سامنے لے آیا جائے۔ پہلے ربوٰ کو لیجئے جسے عام طور پر سود کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

ربوٰ

قرآن کی رُو سے ربوٰ کی تعریف قرآن کی رُو سے ربوٰ کی جامع اور مانع تعریف ان چار الفاظ کے اندر موجود ہے۔ جو سورۃ بقرہ کی آیت ۲۷۹ میں آئے ہیں۔ یعنی:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ۔

اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے تمہارا راس المال ہے۔

اس سے پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم ربٰو لینے سے باز نہ آئے تو اسے خدا اور رسول کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ اس کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا ہے کہ اگر تم ربٰو لینے سے باز آجاؤ اور توبہ کرو تو تم اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو۔ اس کے بعد ہے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (۲۷۹/۲)۔ اس سے نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہوگا۔ اس سے واضح ہے کہ:

(۱) اگر صرف اصل زر واپس لیا جائے تو اس سے مقروض پر ظلم نہیں ہوتا۔

(۲) اگر اصل زر سے کچھ بھی زیادہ لیا جائے تو یہ مقروض پر ظلم ہوگا۔

اسی کا نام ربٰو ہے۔ یعنی زرِ اصل سے کچھ بھی زیادہ لینا۔ ربٰو کی اس قرآنی تعریف کی رُو سے اس مسئلہ میں نہ کسی قسم کا الجھاؤ رہ جاتا ہے نہ التباس۔ نہ کوئی دشواری پیش آتی ہے نہ مشکل۔

۲۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سود در سود (سود مرکب) تو حرام ہے لیکن سود مفرد حرام نہیں، تو یہ بوجوہ غلط ہے۔ اس کی تائید میں حسب ذیل آیت پیش کی جاتی ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۔ (۱۲۹/۳)۔

اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

اے ایمان والو! یہ دوچند سہ چند ہونے والا ربٰو کھانا چھوڑ دو۔

یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ امام راغب نے کہا ہے کہ اس آیت میں مُضَاعَفَةً دراصل ضُعْفٌ سے ہے جس کے معنی "کم کرنے" کے ہیں۔ ضِعْفٌ سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ ربٰو جسے تم سمجھ رہے ہو کہ اپنے روپے کو بڑھانا ہے، بڑھانا نہیں بلکہ درحقیقت (ضُعْفٌ) کم کرنا ہے۔ ربٰو سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے اور سود خوار کی کمانے کی صلاحیتوں اور قوتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے قومی معیشت بہت گھٹ جاتی ہے، بڑھتی نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ ربٰو سے افراد کی کمانے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں اور قومی دولت میں کمی آجاتی ہے۔

---

(۱)

قرآن کی رُو سے ربٰو کے معنی ہوئے، اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک جامع اصول ہے اور قرآنی نظامِ معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ، محنت (LABOUR)

کا ہے یا سرمایہ (CAPITAL) کا بھی۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ (۵۳/۳۹) انسان صرف

معاوضہ کس چیز کا جائز ہے؟

اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ لہٰذا، لین دین کے جس معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ کا معاوضہ لیا جاتے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ وہ ربوٰ ہے۔ جو قرآنِ کریم کی رُو سے حرام ہے اور "خدا اور رسول" کیطرف سے اعلانِ جنگ کا مستوجب۔ آپ غور کیجئے کہ ایک کاشتکار آپ سے ایک ہزار روپیہ قرض

ربوٰ کی مختلف شکلیں

مانگتا ہے تاکہ وہ ایک قطعۂ اراضی خرید کر اس میں کاشت کرے اور اسکی آمدنی سے اپنا پیٹ بھی پالے۔ اور آہستہ آہستہ آپ کا قرضہ بھی ادا کر دے۔ آپ اسے ایک ہزار روپیہ قرض نہیں دیتے۔ لیکن اسی روپے سے وہ قطعۂ اراضی خرید کر اُسے بٹائی یا پٹہ پر دے دیتے ہیں۔ وہ اس میں سال بھر محنت کر کے فصل بوتا ہے اور اس میں سے نصف پیداوار آپ لے جاتے ہیں۔ یہ ہر سال ہوتا ہے اور اس کے باوجود آپ کا قرض اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے ــ کیا یہ ربوٰ نہیں ؟

یا ایک دکاندار آپ سے کچھ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ اس سے اپنے روزگار میں کچھ اضافہ کر سکے۔ آپ اسے روپیہ دے دیتے ہیں لیکن بطور قرض نہیں بلکہ بطور حصہ دار۔ وہ دن رات کی محنت شاقہ سے کاروبار کرتا ہے لیکن اس کے منافع میں آپ برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔ وہ آپ کو منافع کا حصہ دیئے جاتا ہے لیکن آپ کا اصل زر اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے ــ کیا یہ ربوٰ نہیں ؟

یا، آپ اس کاروباری آدمی کو براہِ راست قرض نہیں دیتے۔ آپ اپنا روپیہ بینک میں جمع کر دیتے ہیں۔ اور بینک والے اس روپے کو بطور قرض، اس کاروباری آدمی کو دے دیتے ہیں۔ وہ اس قرض پر جو سود ادا کرتا ہے اس میں سے ایک متعین حصہ آپ کو ملتا رہتا ہے اور آپ کا اصل زر بینک کے پاس محفوظ رہتا ہے ــ کیا یہ ربوٰ نہیں ؟ یہ سب ربوٰ ہے اور قرآن کی رُو سے ناجائز۔ خواہ اسے سودِ مفرد کے حساب سے شمار کیا جائے یا سودِ مرکب کے حساب سے۔

جو کچھ ہم لیتے ہیں

آپ غور کیجئے تو یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً :۔

(۱) عطیہ :۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے واپس لینے کے خیال کے بغیر تحفۃً دیتا ہے۔ لہٰذا اسے لین دین کی مد میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی صورت اس "صدقہ" کی ہے جسے کسی ضرورت مند کی مدد کے لئے حسبۃً للہ دیا جاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے وہ ضرورت مند اس امداد کو معاشرہ

سے بطورِ اپنے حق کے طلب کر سکتا ہے۔ اس لئے اس میں بھی لین دین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) **اُجرت**:۔ یہ محنت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اس میں سرمایہ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) **ربٰو**:۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے زاید وصول کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دینے والا، محنت نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وصول کر لیتا ہے۔

(۴) **منافع** (تجارت)۔ اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(۵) **قمار**:۔ (جوا) اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے نہ محنت کی جاتی ہے۔

(شق اول کو چھوڑ کر) آپ باقی شکلوں کو دیکھیے۔ جہاں معاوضہ محنت کا نہیں، اسے قرآن جائز قرار نہیں دیتا۔ اس

معاوضہ محنت کا ہے

کا اصول یہ ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربٰو میں فرق کیا ہے؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچتا ہے۔ اسے دس روپے اصل زر سے زائد وصول ہو جاتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپیہ قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے۔ اس سے اُسے بھی دس روپے اصل زر سے زیادہ ملتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں، اصل زر پر زائد ہیں تو ان میں فرق کیا ہے؟ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا۔ (۲/۲۷۵) وہ بیع اور ربٰو کو ایک جیسا سمجھتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ ان کی بھول ہے۔ یہ دونوں ایک نوعیت کا معاملہ نہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ قیمت فروخت میں سرمایہ بھی شامل ہوتا ہے اور دکان دار کی محنت کا معاوضہ بھی۔ یہ حلال ہے کیونکہ

بیع اور ربٰو میں فرق

یہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔ لیکن ربٰو میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے جو حرام ہے۔ اس لئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اصول یہ ہے کہ:۔

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو وہ ربٰو ہے۔ کیونکہ یہ سرمایہ کا معاوضہ ہوگا۔ محنت کا نہیں۔ اس بات کا تعین معاشرہ کرے گا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ ہونا کیا چاہیئے۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں انسان (RISK) لیتا ہے۔ لیعنی

اس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور ربوٰ میں (RISK) نہیں ہوتا۔ لیکن حلت اور حرمت کے لئے یہ معیارِ تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (RISK) ہی ہو تو جوا عین حلال ہونا چاہیئے کیونکہ اس میں تو ہر داؤ میں (RISK) ہوتا ہے۔ بیع اور ربوٰ میں فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ بیع میں (رأس المال + محنت کا معاوضہ) واپس ملتا ہے اور ربوٰ میں (رأس المال + رأس المال کا معاوضہ) ملتا ہے۔ محنت کا معاوضہ حلال ہے۔ رأس المال کا معاوضہ حرام۔

دشواریاں کیوں پیش آتی ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم کی رو سے ربوٰ کا مسئلہ کس قدر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس میں جو دشواریاں آجکل پیش آرہی ہیں ان کی وجہ یہ ہے کہ :-

(۱) ربوٰ کی بہت سی شکلیں ایسی ہیں جنھیں قرآنِ کریم حرام قرار دیتا ہے لیکن (بدقسمتی سے) ہماری "مروجہ شریعت" اسے حلال قرار دیتی ہے۔ (مثلاً زمین کی بٹائی یا مضاربت۔ یعنی کاروبار میں ایسی شراکت جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع وصول کرتی ہے۔ یا تجارت میں جس قدر بھی منافع لیا جاسکے وغیرہ)۔

(۲) سرمایہ دار طبقہ، بلامحنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر خوگر ہوچکا ہے کہ محنت کے تصور سے انہیں پسینہ آجاتا ہے۔ اس لئے وہ ربوٰ کے قرآنی تصور کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔

(۳) اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس

پیوند سازی سے کام نہیں چلے گا

نظام کو قرآنی نظام سے بدلیں، چاہتے یہ ہیں کہ اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ قرآنی ہوگیا ہے۔ لیکن وہ پیوند، اصل کے ساتھ فِٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لئے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ کتر بیونت کرکے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیا جائے۔ لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ اس میں غیر قرآنی پیوند کبھی فِٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے :-

(۱) زمین ذریعہ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (ہوا۔ پانی۔ روشنی کی طرح) نوعِ انسان کی پرورش کے لئے بلامزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ امت کی تحویل میں رہے گی تاکہ وہ اس سے تمام افراد کو رزق پہنچانے کا انتظام کرے ۔ زمین سے مراد ہے ہر وہ چیز جو زمین سے برآمد ہو۔ اس میں اناج اور مصنوعات کے لئے خام مسالہ سب آجاتے ہیں۔

(ب) اس نظام میں کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت (SURPLUS MONEY) رہ نہیں سکتی۔ اس لئے افراد کے لئے جائدادیں کھڑی کرنے یا ویسے ہی روپیہ (INVEST) کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) اس میں تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی کا دستِ نگر نہیں ہونا پڑتا۔ لہٰذا اس میں سودی لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(د) حتیٰ کہ اس میں انفرادی تجارت کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس میں دکاندار اشیائے ضروریات تقسیم کرنے کی ایجنسی ہوگا۔ اسے نفع اندوزی کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا۔ اسے اس کی محنت کا معاوضہ نظام کی طرف سے ملے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں ربوٰ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دو متضاد نظام

حقیقت یہ ہے کہ ربوٰ سود کا نام نہیں۔ یہ ترجمان ہے اس معاشی نظام کا جو قرآن کے معاشی نظام کی یکسر ضد ہے۔ قرآنی نظام میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرکے، کم از کم اپنے پاس رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے۔ غیر قرآنی نظام میں، ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اسے بلا محنت زیادہ سے زیادہ ملتا جائے۔ یہ دونوں نظام اس قدر ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ قرآن نے اس نظام کو "خدا اور رسول کے خلاف بغاوت" قرار دیا ہے۔ یہ نظام فی الواقعہ قرآنی نظام سے بغاوت ہے۔ اب اس کے بعد آپ سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ہمارا نظام تو غیر قرآنی رہے اور ہم اس کے اندر رہتے ہوئے ربوٰ کے مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش کرلیں۔ اس قسم کی کوشش ہم نے اس سے پہلے اپنے جاگیرداری اور زمینداری دور (عہدِ عباسیہ) میں کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے زمین کی بٹائی، مضاربت، تجارت میں غیر محدود منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ اگر ہم نے اب اپنے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو علیٰ حالہٖ رکھتے ہوئے اس میں سود (ربوٰ) ختم کرنے کی کوشش کی تو اس میں کبھی کامیابی نہیں ہوسکے گی۔ قرآن کے معاشی نظام میں ربوٰ خود بخود ختم ہوجاتا ہے۔ اور غیر قرآنی (سرمایہ دارانہ) نظام میں یہ ختم نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی شکلیں بدل سکتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے ہوچکا ہے۔

زکوٰۃ

زکوٰۃ کے قرآنی مفہوم کو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کا مروجہ مفہوم سمجھ لیا جائے۔ اس کی رُو سے جب کسی شخص کے پاس ایک خاص مقدار کے مطابق مال جمع ہو اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک خاص حصہ (عام طور پر ۲ ۱/۲ فی صد) خدا کی راہ میں دیدے۔ مال کی اس مقدار کو جس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے، نصاب کہتے ہیں اور جس نسبت سے اس میں سے زکوٰۃ نکالی جائے اسے شرح کہا جاتا ہے۔ عام طور پر نصاب حسب ذیل بتایا جاتا ہے۔

(۱) چاندی ۵۲ ۱/۲ تولہ
(۲) سونا ۷ ۱/۲ تولہ
(۳) اونٹ (۵) پانچ راس
(۴) گائے تیس راس
(۵) بکریاں چالیس راس وغیرہ وغیرہ۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت قائم ہو تو اسے چاہیئے کہ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے۔ اگر ایسی حکومت نہ ہو تو لوگ اپنے اپنے طور پر زکوٰۃ خرچ کر دیں۔ لیکن حکومت ہو یا افراد، زکوٰۃ خرچ کی جائے گی انہی مصارف پر جن کا تعین کر دیا گیا ہے۔

(۲) قرآنِ کریم میں "زکوٰۃ" دینے کا حکم تو آیا ہے (جس کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے) لیکن جن باتوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (یعنی نصاب، شرح، مدت وغیرہ) ان میں سے کوئی بات بھی قرآن مجید میں نہیں ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ (کم ازکم) مصارفِ زکوٰۃ کی تصریح تو خود قرآنِ کریم نے کر دی ہے اور اس کے لئے ذیل کی آیت پیش کی جاتی ہے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰکِیْنِ وَ الْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِی الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِیْنَ وَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ۔ فَرِیْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ○ (۹/۶۰)۔

شاہ رفیع الدینؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:۔

سوائے اس کے نہیں کہ خیرات واسطے فقیروں کے اور محتاجوں کے اور عمل کرنے والوں کے اور تحصیل اس کی کے اور جن کو کہ الفت دلائے جاتے ہیں دل ان کے۔ اور بیچ آزاد کرنے گردنوں کے اور قرضداروں کو اور بیچ راہ اللہ کے، اور مسافروں کو۔ فرض ہے اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اس میں غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ مصارف "صدقات" کے بتائے ہیں (جس کا ترجمہ شاہ صاحبؒ "خیرات" کرتے ہیں)۔ یہ "زکوٰۃ" کے مصارف نہیں۔ قرآن کریم نے "زکوٰۃ" کے لئے "زکوٰۃ" ہی کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے مصارف کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا، ہم نے جو کہا تھا کہ زکوٰۃ کے متعلق ان امور کا، جن سے اسے متعین کیا جاتا ہے، قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں آیا، تو یہ ایک حقیقت کا بیان ہے۔ ان میں نصاب اور شرح کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لئے ہم انہیں ذرا وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ آجکل چاندی کا بھاؤ قریب پانچ روپے فی تولہ ہے اور سونے کا نرخ چھ سو روپے فی تولہ۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مروجہ نصاب کے مطابق جس شخص کے پاس قریب اڑھائی سو روپے کی مالیت کے چاندی کے زیورات ہوں گے اس پر تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ لیکن جس کے پاس ساڑھے چار ہزار روپے تک کی مالیت کے سونے کے زیورات ہوں گے وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوگا؟ یعنی اڑھائی سو روپے رکھنے والے پر تو زکوٰۃ پڑ جائے گی لیکن ساڑھے چار ہزار روپے رکھنے والے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی؟ یہ تو پھر بھی کم فرق ہے، اس نصاب کی رُو سے جس شخص کے پاس اڑھائی سو روپے کی مالیت کا چاندی کا زیور ہوگا اُسے تو زکوٰۃ دینی پڑے گی لیکن اگر اس کے پاس انتیس گائے ہوں جن کی مالیت ہزاروں روپے ہوتی ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ یعنی غریب پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اس سے نسبتاً امیر پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ یہ صرف مروجہ نصاب کے متعلق ہے۔ باقی جزئیات کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۰)

زکوٰۃ — قرآنِ کریم کی روشنی میں

آئیے اب ہم دیکھیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے۔ الزکوٰۃ کے بنیادی معنی ہیں نشوونما، بالیدگی، (DEVELOPMENT) بڑھنا، پھولنا، پھلنا یعنی (GROWTH) اور

قرآنِ کریم میں " اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ " کا حکم متعدد بار آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نظام کے یہ دوستون ہیں۔ " اقامت صلوٰۃ " سے کیا مفہوم ہے، اس کے متعلق ہم اس وقت گفتگو نہیں کرتے۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہوتے نشو و نما دینا۔ کسی کے بڑھنے، پھولنے، پھلنے کا انتظام کرنا۔ اس کی (DEVELOPMENT) کا سامان مہیا کرنا۔

اسلامی نظامِ مملکت (جسے حکومتِ خداوندی کہا جاتا ہے) کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے جنہیں انسانوں کے متعلق خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ وہ حکومت، جب خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے تو اس کا فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کے ان واجبات کو پورا کرے جن کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے۔
خدا نے قرآنِ کریم کی سب سے پہلی آیت میں اپنے آپ کو رب العلمین کہا ہے۔ یعنی وہ ربوبیتِ عالمین کا ذمہ دار ہے۔ ربوبیت کے معنی ہوتے ہیں، کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے نشو و نما دیتے ہوئے اس کی تکمیل تک پہنچا دینا۔ اس سے واضح ہے کہ (دیگر اشیائے کائنات کے علاوہ) نوعِ انسان کی عالمگیر نشو و نما کا ذمہ بھی خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔ اس ذمہ داری کے سلسلہ میں اس کا ارشاد ہے کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ۔ (۱۱/۶)

زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔

اور خود انسانوں کے سلسلہ میں فرمایا۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ إِيَّاهُمْ ۔ (۶/۱۵۲)

ہم ان کے اور ان کی اولاد کے رزق (سامانِ زیست) کے ذمہ دار ہیں۔

خدا کی یہ وہ ذمہ داریاں ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے جماعتِ مومنین (اسلامی نظام) کو متشکل کیا گیا تھا۔ یعنی ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ ایسا نظام قائم کریں جس سے تمام افرادِ انسانیہ کو ان کی نشو و نما کا سامان ملتا رہے۔ اسے اس نے "ایتائے زکوٰۃ" ۔۔ سامانِ نشو و نما دینے ۔۔ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ دیکھئے، اس حقیقت کو قرآنِ کریم کس قدر وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ سورۃ الحج میں ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ ۔۔۔۔ (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں حکومت مل گئی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی حکومت کا فریضہ "ایتائے زکوٰۃ" ۔۔ زکوٰۃ دینا ۔۔ ہے۔ یعنی نوعِ انسان (یا افراد

معاشرہ) کو سامانِ نشوونما عطا کرنا۔ اس اعتبار سے حکومت کی ساری آمدنی (REVENUE) کو "زکوٰۃ" (یعنی سامانِ نشوونما مہیا کرنے کا ذریعہ) کہا جائے گا، جسے وہ افرادِ معاشرہ اور اس کے بعد عالمگیر انسانیت کو دینے کے لئے حاصل کرے گی۔ اس کے لئے وہ کیا انتظام کرے گی۔ لوگوں کی کمائی میں سے کس قدر لے گی۔ اس کا تعین ضروریات کے لحاظ سے کیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہا جائے گا کہ:۔

اسلامی مملکت کا ایک بنیادی فریضہ ایتائے زکوٰۃ ہے۔ یعنی تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، اس کی تمام متعینہ آمدنی زکوٰۃ۔ یعنی ذریعہ نشوونما۔ کہلا سکتی ہے۔

اب آگے بڑھیئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض وقت ہنگامی حالات ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن کے لئے بجٹ میں گنجائش (PROVISION) نہیں ہوتی۔ مثلاً سیلاب۔ زلزلہ۔ وبا۔ جنگ وغیرہ۔ ان کے لئے ملت سے خاص عطیات کی اپیل کرنی پڑتی ہے۔ انہیں قرآن کریم نے "صدقات" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ میں (جو پہلے درج کی گئی ہے) جن "مصارف" کا ذکر ہے وہ صدقات کے مصارف ہیں ۔"زکوٰۃ" کے نہیں۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ:۔

(۱) جو کچھ آجکل زکوٰۃ کے نام سے دیا جاتا ہے وہ زکوٰۃ نہیں۔ اسے آپ خیرات کہہ سکتے ہیں۔

(۲) زکوٰۃ کے لئے اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔

(۳) اسلامی حکومت "زکوٰۃ دیتی" ہے۔ یعنی لوگوں کے لئے سامانِ نشوونما بہم پہنچاتی ہے۔

(۴) اس فریضہ کی ادائیگی کے پیشِ نظر اسلامی مملکت کی ساری آمدنی زکوٰۃ (یعنی ذرائع نشوونما) کہلا سکتی ہے۔ اس آمدنی کی نہ کوئی غیر متبدل شرح ہے نہ خاص نصاب۔ حکومت اسے ضروریات کے مطابق خود متعین کرتی ہے (نبی اکرمؐ اور خلافتِ راشدہ نے اسے اُس وقت کی ضروریات کے مطابق مقرر کیا ہوگا)۔

(۵) ہنگامی حالات کے لئے عطیات کو صدقات کہا جاتا ہے۔

(۰)

قطع نظر جزئیات کے، اگر بہ ہیئتِ مجموعی دیکھا جائے تو بادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ زکوٰۃ کا مروجہ تصور، قرآن کے معاشی نظام میں فِٹ ہی نہیں بیٹھتا۔ جیسا کہ آپ سابقہ ابواب میں دیکھ چکے ہیں، قرآن کے معاشی نظام کے اساسی عناصر یہ ہیں کہ فاضلہ دولت افراد کے پاس نہیں رہتی اور دولت جمع کی ہی نہیں جا سکتی۔ اس کے برعکس، زکوٰۃ کا مروجہ تصور یہ ہے کہ ایک شخص اپنی فاضلہ دولت اپنے پاس جمع رکھتا ہے اور اس پر ایک سال

گزرنے کے بعد، اس میں سے اڑھائی فی صد روپیہ بطور زکوٰۃ دے دیتا ہے۔ بقایا (۹۷½) پھر اپنے پاس رکھتا ہے اور اس طرح لامتناہی طور پر دولت جمع کر سکتا ہے۔

زکوٰۃ کا مروجہ تصور پیدا کیسے ہوا، اس کی تفصیل دلچسپ بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ سورۃ توبہ کی حسب ذیل آیات سابقہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکی ہیں۔

...... وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۔ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۔ (۹/۳۴-۳۵)

جو لوگ چاندی، سونا (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں دے نہیں دیتے۔ اے رسول! تو انہیں الم انگیز عذاب کی "بشارت" سنا دے۔ (یہ عذاب اس دن واقع ہوگا) جب چاندی سونے کے ان جمع کردہ سکوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور کمر کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب اس جمع شدہ مال کے لائے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو۔

زکوٰۃ کیسے فرض ہوئی؟

یہ آیات اپنے مطالب کے لئے بالکل واضح ہیں۔ ان کی رُو سے مال و دولت کا جمع کرنا، شدید ترین عذاب کا مستوجب ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ:۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی (وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ......) تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا۔ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ خداوند تعالےٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے......

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا......

(ابوداؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ کتاب الزکوٰۃ۔ اردو ترجمہ شائع کردہ۔ نور محمد کارخانہ تجارت۔ کراچی۔ صنا۳۰۹-۳)

تھوڑے سے تدبر سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ یہ روایت وضعی ہے اور اس زمانے کی تراشیدہ جب مسلمانوں میں نظامِ سرمایہ داری رائج ہو چکا تھا۔ اس میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم نازل ہوتا ہے اور (کہا یہ گیا ہے کہ) وہ صحابہؓ کبار پر (معاذاللہ) گراں گزرا۔ خدا کا حکم تو ایک طرف، قرآنِ مجید میں نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ "خدا اس امر پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے ہر نزاعی معاملہ میں تجھے اپنا حَکَم مقرر نہ کریں اور پھر ——

> تیرے فیصلے کے خلاف اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں اور اس کے سامنے سرِ نیاز خم کر دیں۔ ($\frac{4}{65}$)

آپ سوچئے کہ کیا ان صحابہؓ کرام پر خدا کا حکم گراں گزریگا؟ یہ تو وہ مومن تھے جنھوں نے "اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھ فروخت کر دیئے تھے" ($\frac{9}{111}$)

پھر، اتنی کبیدہ خاطر، صحابہؓ کی نیابت کے لئے اپنے آپ کو پیش کون کرتا ہے۔ (حضرت) عمرؓ جن کی حالت یہ تھی کہ ان کی خلافت کے زمانے میں بھی ان کے تہبند پر بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے تھے!

اور، خدا کے حکم کے علی الرغم، ($2\frac{1}{2}$، ۹۷) فیصد مال و دولت جمع رکھنے کے جواز کا فیصلہ وہ ذاتِ گرامی دیتی ہے جس نے، سربراہِ مملکت ہونے کے باوجود، کبھی ایک فالتو پیسہ بھی اپنے گھر میں نہیں رکھا۔ جیسا کہ (روایت میں ہے کہ)

> مرض الموت کے ایام میں حضورؐ کے ہاں سات دینار تھے۔ حضورؐ فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کر دو۔ لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہوگئی اور سب لوگ آپ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپ کو ہوش آیا تو فرمایا، وہ دینار لے آؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا جب کہ وہ اپنے رب کو ملے اور اس کے پاس یہ دینار ہوں۔ پھر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا۔
>
> (بحوالہ اصح السیر، حکیم داناپوری)

کیا یہ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) اپنی امت کے لئے روا رکھیں گے کہ وہ "بے حد و نہایت" مال جمع کرتے رہیں اور اس میں سے صرف ($2\frac{1}{2}$) فیصد سالانہ خیرات کر دیا کریں۔ باقی مال حلال و طیب ہو جائے گا؟

———— (۰۶) ————

آج تک کہا یہ جاتا رہا کہ زکوٰۃ کا نصاب اور شرح، نبی اکرمؐ کی مقرر فرمودہ ہیں اور ہمیشہ کے لئے غیر متبدل لیکن اب زمانے کے تقاضوں نے خود ان حضرات کو اپنا مؤقف تبدیل کر دینے پر مجبور کر دیا ہے۔ (مثلاً) جماعت اہلِ حدیث، احادیث کا اتباع بڑی شدت سے کرتی ہے۔ اس کے ترجمان ہفت روزہ "اہلحدیث" (لاہور) کی ۱۶ اگست ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا جس میں کہا گیا:

اس مؤقف میں تبدیلی

> خوشحال معاشرہ کا قیام اسلام کا بنیادی نظریہ ہے...... زکوٰۃ کی فرضیت بھی اسی نقطۂ نظر سے ہوئی ہے۔ تاہم جس معاشرہ اور ماحول میں اس عمل کو فرض کیا گیا ہے وہ آجکل کے ماحول اور معاشرے سے قدرے مختلف تھا..... اس سلسلہ میں "قانونِ ضرورت" کو بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ شرعی قانون کی رُو سے زکوٰۃ چار اشیاء پر فرض ہے۔
>
> (۱) مویشی (۲) غلّہ اور پھل (۳) نقدی (سونا، چاندی) (۴) تجارت
>
> پہلی تین مدات تو بحالہ قائم ہیں مگر جہاں تک مال کی تجارت کا تعلق ہے، اس کا میدان اب بہت وسیع ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں اب مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ نصاب زکوٰۃ بھی اسلام میں مقرر ہے لیکن اس معاملہ میں تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ کی کم از کم مد ہے۔ زکوٰۃ کا یہ نظام جب رائج کیا گیا تو اس وقت طلب اور رسد کی ضرورت کے مطابق تھا۔ زکوٰۃ کا مقصد صرف یہ نہیں کہ مقررہ اموال میں سے معینہ مقدار ادا کر دی جاتے چاہے وہ معاشرتی ضروریات کا ایک فی صد ہی پورا کرے..... زکوٰۃ کو فقراء اور محتاج لوگوں کی تمام ضروریات کا کفیل ہونا چاہیئے۔ لہٰذا آجکل اس امر کی ضرورت ہے کہ "ضرورت" کا اندازہ لگا کر نظامِ زکوٰۃ کو از سرِ نو منظم کیا جائے۔

اور آگے بڑھیئے۔ اتباعِ حدیث، مملکتِ سعودی عرب کا سرکاری مسلک ہے۔ اور رابطۃ العالم الاسلامی (مکہ مکرمہ) ایک طرح حکومت کا تنظیمی ادارہ۔ اس ادارہ کے ترجمان "رابطۃ العالم الاسلامی" کے رجب ۱۳۹۸ھ (جون ۱۹۷۸ء) میں، اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے کہ کیا زکوٰۃ کے متعلق رسول اللہؐ کی متعین فرمودہ جزئیات میں تبدیلی کی جا سکتی ہے یا نہیں، لکھا ہے۔

> على ان المقصود بالزكوٰة ان تسد حاجة المحتاجين و تفرج الازمات. فان لم تنفرج الازمة فان وضع القدر المفروض لا يعفى من المسئولية و على

القادرین الاسھام وعلی الدولۃ ان تأخذ من القادرین۔ کان رسول اللہ حدد مقدار الزکوٰۃ بحاجۃ عصرہ ولم یحدد القرآن مقادیرھا۔ وباب الاجتہاد مفتوح۔ (ص۲۶)

زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ وہ حاجتمندوں کی ضروریات کو پورا کرے اور ان کی پریشانیوں کو دور کرے۔ اگر مروجہ شرح سے حاجتمندوں کی پریشانیاں دور نہیں ہوئیں تو پھر اس شرح سے زکوٰۃ ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا کرنے والے کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ کا انتظام کرنے والوں اور حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ صاحب نصاب لوگوں سے زیادہ شرح سے زکوٰۃ وصول کریں، کیونکہ رسول اللہ نے جو شرح مقرر کی تھی وہ آپ کے زمانے کی ضروریات کے مطابق تھی اور قرآن مجید نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ اس کے لئے اس نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خود ہمارے قدامت پرست حضرات کے نزدیک بھی زکوٰۃ کی مروجہ جزئیات ناقابلِ تغیر و تبدل نہیں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا، اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے۔ یہ اسلامی مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے (قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے) جن ذرائع سے بھی عہدہ برآ ہو سکے گی، انہیں "زکوٰۃ" کہا جائے گا۔ قرآنِ کریم کی رُو سے "ایتائے زکوٰۃ" اسلامی حکومت کا فریضہ ہے۔ (۲۲/۴۱)۔